ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان

پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو/ این۔ پی ۹۲

لائسنس نمبر ۲۴ ۲۰۸۴۱۷/۲۰۰۸۸

دفتر فون ۴۶۱۳۰۵

فون رہائش گاہ ۴۴۴۵۶

ایڈیٹر:- محمد حسین شمس علوی

(قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند)

مجلس ادارت:

عبدالقوی دریابادی (بی۔اے)

سعادت علی صدیقی (ایم۔اے)

محمد حسنین علوی (ایم۔اے)

شمارہ ۱-۲ مئی۔جون ۱۹۸۱ء جلد (۲۸)

ترتیب

مجلس ادارت

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

جناب نسیم قریشی ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی لکھنؤ یونیورسٹی

ڈاکٹر انوار الحسن

ڈاکٹر فضل امام راجستھان یونیورسٹی جے پور

پروفیسر حکم چند نیر بنارس یونیورسٹی

ڈاکٹر سید محمود الحسن لکھنؤ یونیورسٹی

سالانہ اعزازی: بیس روپے

عوام سے: پندرہ روپے

فی پرچہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ

ادارہ فروغ اردو ۳۱ امین آباد پارک لکھنؤ

محمد انصار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳۱ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

Accession Number. 83885
Date 6-11-87

نعت شریف

از قلم
میر مشتاق احمد

حضرتِ خیر البشر ماہِ تمام — ہو اگر چشمِ کرم بن جائے کام
ساقیٔ کوثر ہمہ عالی مقام — جنتِ فردوس میں مل جائے جام

حق نگاہ و حق نگر حق کے پیام
آپؐ کی روحِ مقدس پر سلام

ہادیٔ دوراں دو عالم کے امامؐ — آپ کے در کا ہوں میں ادنیٰ غلام
آپ کا مجھ پر رہے لطفِ دوام — آپ تو ہیں حاصلِ حسنِ کلام

آپؐ کی ذاتِ مقدس پر حضورؐ
صد درود و صد صلوٰۃ و صد سلام

آپ کا ممکن نہیں کوئی جواب — آپ ہی ہیں مرجعِ ہر خاص و عام
ظالموں کے ظلم پر بندہ نواز — آپ ہی ثابت ہوئے عفوِ تمام

اے رسولِ ہاشمی فخرِ انام
خود خدائے پاک کا تم کو سلام

امتِ عاصی کے کامل مہرباں — ہادیٔ کونین حق عالی مقام
آپ کا جس کو سہارا مل گیا — اس کی مشکل ہوگئی آساں تمام

آ رہی ہے ہر طرف سے یہ صدا
آفتابِ برجِ وحدت السلام

اس پہ بھی چشمِ کرم فرمائیے — میر بھی ہے آپ کا ادنیٰ غلام
صاحبِ خلقِ عظیم و کبریا — وارثِ کونین با فضلِ تمام

شمعِ بزمِ نورِ حسن عرشِ حق
[illegible] سلام

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

یکم مئی ۱۹۸۱ء سے فروغ اردو اپنی عمر کے اٹھائیسویں سال میں داخل ہو رہا ہے اس ستائیس سال کی مدت میں، اس نے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں تھوڑی بہت جو کچھ خدمات انجام دیں وہ قارئین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایسے نازک دور میں جب اردو کا نام لینا، غداری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اتر پردیش میں لسانی سامراجیت، اردو اور اردو والوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہی ہے ہر جگہ سے اس کو ختم کیا جا رہا تھا۔ کسی اردو ماہنامہ کا تحفظ و ترقی اردو کے لئے نکالنا خطرات اور مشکلات کو دعوت دینے سے کم نہ تھا۔ فروغ اردو کے اراکین ان خطرات سے بھی واقف تھے، لیکن اپنی مادری زبان کے تحفظ اس کی بقا اور ترقی کے لئے جدوجہد کرنا۔ بنیادی اور جمہوری حق تھا۔ نیز اردو دنیا پر بیت گئی، مرعوبیت اور مغلوبیت دور کرنا اولین فرض تھا اس لئے یہی فیصلہ کیا گیا کہ یقین محکم اور عزم مستحکم کے ساتھ "فروغ اردو" نکالا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے والے اردو دنیا کے مشہور و ممتاز حضرات یعنی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم۔ حامد اللہ افسر مرحوم، پروفیسر احسن فاروقی مرحوم۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی۔ سید امیر حسن نورانی۔ حکیم عبدالقوی دریابادی اور راقم الحروف تھے، مولانا محمد حسین شمس علوی کاکوروی اس کے محرک اور روح رواں تھے ادارہ کے صدر حامد اللہ افسر مرحوم اور جنرل سکریٹری راقم الحروف بنائے گئے۔ ماہنامہ فروغ اردو کے مدیر اعلیٰ پروفیسر نور الحسن ہاشمی اور معاونین مدیر سید امیر حسن نورانی، عبدالقوی دریابادی اور راقم الحروف منتخب ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کہ پرچہ شائع ہوتے ہی مقبول ہوا۔ اور اس کو ہند و پاک کے مشاہیر ادب کی سرپرستی اور قلمی اعانت حاصل ہونے لگی۔ انھیں حضرات کے تعاون اور اشتراک سے فروغ اردو نے درجنوں مہتم بالشان نمبر شائع کئے۔ جن کی اہمیت و افادیت اردو دنیا میں تسلیم کی گئی اپنے ستائیس سالہ دور میں ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود پرچہ مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی شائع ہوتا رہے گا۔

اپریل کا مہینہ، یو۔پی میں اردو زبان کے لئے فال نیک ثابت ہوا، اسی مہینے میں لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر اردو کے ادیبوں، شاعروں اور خادموں کی مختلف اداروں اور تنظیموں کی طرف سے عزت افزائی کی گئی، اسی مہینہ میں سرکاری سطح پر یقینی [illegible] ۱۹۸۰ء [illegible] قبل ازیں [illegible]

ہمارے موجودہ وزیراعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاف ذہن اور کھلے دل و دماغ
کے انسان ہیں۔ ان پر ابھی پُرفریب سیاست کا سایہ نہیں پڑا ہے، خدا کرے کبھی نہ پڑے اور وہ
"ستیہ اور اہنسا" کی علامت بن جائیں۔ اس لئے توقع ہے کہ اُردو کے وہ تمام حقوق تسلیم کرلئے جائیں۔
جو سیاسی بازی گروں نے، اکثریت اور اقتدار کے زعم میں غصب کرلئے تھے۔ حد یہ ہے کہ امین الد
پارک لکھنؤ میں قومی پرچم کے نیچے لکھی ہوئی اُردو تحریر کو جھنڈا لہرانے سے پہلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ہی کو کھ
رچ کر مٹا دیا گیا۔ جو آج بھی تیس ۳۰ سال گذر جانے کے باوجود نہیں لکھی گئی اور کانگریس کے کسی ممبر کو بھی یہ تو
نہیں ہوئی کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کرے۔ یہ عمل اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا کہ آزاد اور جمہوری ہندوستا
میں اُردو کا نام و نشان تک باقی نہ رکھا جائے گا۔

لیکن عوامی اور جمہوری زبان کی اپنی طاقت ہوتی ہے۔ وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن ہوتی ہے
اس لئے اُردو کی مقبولیت عوام میں کم نہیں ہوئی۔ ہندی کے اخبارات و رسائل میں عام فہم اُردو الفاظ
استعمال کئے جاتے ہیں۔ سنیماؤں میں اسی زبان کا رواج ہے۔ عوام اسی کے گیت اور اشعار گاتے ہیں۔
حکومت کو یہ حقیقت سامنے رکھنا چاہئے اور عوام سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے، اُردو رسم خط کو بھ
استعمال کرنا چاہئے۔ ہر محکمہ میں ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی کارروائی ہونی چاہئے۔ اگرچہ
وزیراعلیٰ نے یقین دلایا ہے کہ اُردو میں درخواستیں قبول کی جائیں گی اور جوابات اُردو میں دیے جائیں گے مگر یہ
اسی وقت ممکن ہے جب ہر محکمہ میں اُردو داں حضرات کا تقرر کیا جائے۔ ورنہ یہ یقین دہانی بے نتیجہ ثابت
ہوگی۔ مثال میں وزیراعلیٰ کی اس یقین دہانی کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو انھوں نے تین چار ماہ قبل
دلائی تھی کہ ریاست میں چلنے والی بسوں کی تختیوں پر اُردو میں لکھا جائے گا جس پر عمل آج تک
نہیں ہو سکا۔

بعض ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے فروغ اُردو کا گزشتہ مئی کا شمارہ شائع نہ ہو سکا جس کے
لئے ادارہ قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

ہم کو یہ خبر دیتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ لکھنؤ میں ایک ادارہ دینی مذہبی کتب کی
ترویج و اشاعت کا "انوار قرآن ہاؤس" امین آباد پارک لکھنؤ کے نام سے قائم کیا گیا
ہے جہاں قرآن مجید اور اسلامی مطبوعات مل سکتی ہیں۔ مقامی و بیرونجات کے شائقین
کما حقہٗ مستفید ہو سکتے ہیں اس لئے وہ اس کی جانب متوجہ ہوں۔

تہنیت مبارکباد

۵ اپریل ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب کی صاحبزادی پروین شجاعت سلمہا کا عقد نکاح
محمد شکیل الدین سلمہ خلف الرشید محمد جمیل الدین مرحوم کے ساتھ بحسن و خوبی کے ساتھ ہو گیا۔
اس تقریب سعید میں شہر و بیرون شہر کے ممتاز حضرات کافی تعداد میں شریک ہوئے۔ ادارہ فروغ اُردو
دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

از : مانک ٹالا

مولانا عبدالماجد دریابادی کے دو اہم خطوط

منشی پریم چند کے نام

نوٹ :— محترم مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے یہ دو خط امرت رائے اور مدن گوپال صاحب کی مرتب کردہ کتاب ـ چٹھی پتری ـ جلد نمبر ۱ ـ صفحہ نمبر 280 اور 281 سے نقل کئے گئے ہیں چٹھی پتری ـ چٹھی پتری (ہندی) میں منشی پریم چند کے خطوط شائع کئے گئے ہیں ـ آخر میں اُن کے چند ہم عصروں کے خطوط بھی شائع کئے گئے ہیں ـ امرت رائے صاحب کے الفاظ میں —" منشی جی خود بھی چٹھیاں سنبھال کر رکھنے کی عادت نہ تھی ـ جواب دینے ہی پھاڑ کر پھینک دیتے تھے ـ تو بھی نہ جانے کیسے اور کیوں اُن کے کاغذوں میں بہت سی الٹی سیدھی بے کار چٹھیوں کے ڈھیر میں دس پانچ اچھی چٹھیاں بھی مل گئیں ..
..... پڑھنے والوں کو ان میں دلچسپی ہوگی اس خیال سے ان چھٹکر چٹھیوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے "

اُمید کرتا ہوں کہ محترم مولانا کی یہ چٹھیاں قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گی ـ اور وہ جو گاندھی جی کے بارے میں مولانا کے خیالات سے مستفید ہوں گے ـ مولانا نے اِن خطوط میں جہاں جہاں انگریزی کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ وہاں ہو بہو انگریزی ہی میں نقل کر دیئے گئے ہیں ـ مولانا کو دنیائے اسلام میں جس توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ـ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ـ اسلام کے بارے میں مولانا نے خود اپنے آپ کو FANATIC لکھا ہے ـ اور اگر پریم چند یا دوسرا کوئی اسلام یا مسلمانوں کے خلاف بین السطور ہی میں کچھ لکھتا تو مولانا چپ بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھے ـ

————— مانک ٹالا ـ

خط نمبر (۱)

دریاباد ـ بارابنکی ـ
۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء

بندہ نواز ـ تسلیم ـ

جی بہت چاہتا تھا کہ "ہمارا ..." کے لئے خود ہی ریویو لکھوں گا لیکن بس تفصیل سے لکھنے کو جی چاہتا تھا ـ اس کی فرصت نہ ملتا تھی نہ ملی، آخر آج ایک کاپی ایک دوست کے پاس بھیجنا پڑی کہ وہ

"بازارِ حسن" کی سیر البتہ ابھی تک نہیں کی۔ آپ سے یہ دریافت کرنا بھول گیا تھا کہ وہ ملے گی کہاں؟

ایک ڈرامے کا مجمل پلاٹ عرصے سے ذہن میں ہے، آپ سے بہتر اسے کون لکھے گا۔ ایسا ہو کہ اسٹیج پر ضرور آسکے اور نام ہی سے سارے پلاٹ کو سمجھ لیں گے.... "طلسم فرنگ" یا زیادہ سادہ و عام فہم نام "گوری بلا"۔ بس وہی جان سیوک والا کیریکٹر ذرا خوب کھول کر دکھا دیا جائے۔ نہرو رپورٹ اور لکھنؤ کانفرنس کے سلسلے میں مجھے پوری طرح اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے آزاد خیال بھی اپنی ساری جنگ [illegible] محدود رکھنا چاہتے ہیں نہ کہ "انگریزیت" کے خلاف۔ انگریز کو نکال کر خود انگریزیت کے رنگ میں غرق ہو جانا چاہتے ہیں۔ "انگریزیت" کے سسٹم کی برائی اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ پانڈے پور والی ترکیبیں اور جان سیوک والے اصولِ زندگی سارے ہندوستان میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں پھیلانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اس ذہنیت کو پوری طرح EXPOSE کرنا ہے۔

[illegible] کے ڈرامے کو آپ سے بہتر کون لکھ سکتا ہے [illegible] چاہیں تو بہت جلد لکھ ڈال سکتے ہیں۔ زیادہ تسلیم

عبدالماجد

(۷)

دریاباد بارہ بنکی۔
25 اکتوبر سنہ 1928ء

کرم گستر۔

"خاکِ پروانہ" پہونچ گئی تھی شکریہ ادا کرنا الگ رہا آج کے قبل رسید تک لکھنے کی توفیق نہ ہوئی، بہرحال رسید و شکریہ آج دونوں عرض ہیں۔ ریویو بھی اگر خدا کو منظور ہے کچھ روز میں نکل جائے گا۔

"چوگانِ ہستی" میں نے ایک مسلمان نوجوان دوست کو دے دی تھی۔ جو کلکتہ یونیورسٹی کے تازہ ایم۔ اے (ہسٹری) ہیں اور اردو ادب کا بھی اچھا خاصہ مذاق رکھتے ہیں۔ اُن سے اور کئی کتابوں پر بھی ریویو لکھوا چکا ہوں۔ آپ کی کتاب جب اُن کے پاس آ گئی تو مختصراً بعض POINTS لکھ دیئے تھے کہ ان پہلوؤں کو ریویو میں دکھائیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے کتاب کے متعلق ایک بالکل دوسری رائے قائم کی اور آج خدا خدا کرکے ریویو لکھ کر بھیجا۔ میں اس ریویو کو بجنسہٖ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس سے متفق نہیں اور اس لئے اسے شائع بھی نہ کروں گا۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ آپ کے نوٹس میں یہ بات آ جائے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس کتاب کو اس پہلو سے بھی دیکھ رہا ہے۔ میں ریویو نگار کے دعوے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ مجھے کہیں بھی AGGRESSIVE اور ANTI ISLAMISM قسم کی ہندویت نظر نہیں آئی۔ (حالانکہ میں ریویو نگار صاحب سے کہیں زیادہ FANATIC قسم کا مسلمان ہوں) تاہم آپ کے علم میں یہ ضرور آ جانا چاہیئے کہ ایک جماعت کے نزدیک آپ کی عبارت سے ایسا مفہوم بھی نکلتا ہے۔

بعد ملاحظہ یہ ریویو واپس فرما دیا جائے۔ میں اُن صاحب کو واپس کر کے کسی دوسرے صاحب سے لکھواؤں گا۔ خود لکھنے کی فرصت کہاں سے نکالوں۔

زیادہ تسلیم۔

عبدالماجد۔

از: مانک ٹالہ

"سوزِ وطن" کی تحقیق میں
ابو محمد شبلی صاحب کی "محققانہ" ایمانداری

سوزِ وطن کے سلسلے میں منشی پریم چند کا خط بنام دیا نرائن نگم ("پریم چند کے خطوط" مرتبہ مدن گوپال صفحہ نمبر ۱۳۰ پر) شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے ــــ

"........ نواب رائے تو غالباً کچھ دنوں کے لئے اس جہاں سے گئے دوبارہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے، مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں کوئی مضمون خواہ کسی مضمون پر، ہا تھی دانت پر ہی کیوں نہ لکھوں، مجھے پہلے وہ جناب فیض یاب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا ہوگا۔

خط کشیدہ الفاظ ذرا غور سے پڑھیئے اور ذہن نشین کر لیجیئے۔ اور اب یہی اقتباس جو قبلہ ابو محمد شبلی صاحب نے فروغ اُردو / نیرہ دخیرا عظیم آباد ایکسپریس میں پیش کیا ہے اس کی عبارت بھی غور سے ذہن نشین فرمائیے ــــ

"....... تم نے معاہدہ (کی پابندی) میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔"

قوا شبلی ... [illegible]

"(کی پابندی)" کے الفاظ کا اپنی طرف سے اضافہ فرما دیا ہے اور اس طرح ساری تحریر کا مطلب ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔

(۱) پہلی تحریر کا مطلب ہے کہ تم نے جو معاہدہ ہمارے ساتھ کیا تھا گو اس معاہدہ میں تم نے یہ تحریر نہیں کیا تھا کہ تم اخباری مضامین نہیں لکھو گے لیکن ہمارے نزدیک اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا"۔

(۲) شبلی صاحب کی ترمیم اور اضافہ شدہ تحریر کا مطلب بالکل ہی الٹ ہو جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ "تم نے معاہدہ کی پابندی میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے (یعنی صرف کہانیاں ہی لکھی ہیں) مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا"۔

محمول کیا شبلی صاحب کی اس جسارت کو محققانہ ایمانداری پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ صریحاً بے ایمانی نہیں؟ اسی طرح انھوں نے اکثر جگہوں پر پریم چند۔ مدن گوپال۔ امرت رائے اور دوسروں کی تحریروں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے

[illegible]

فرقہ پرست تھے۔ اور اب اپنی طرف سے اُن کی تحریر میں اضافہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند نے اپنا امیج بنانے کے لئے اور شہرت کے بام پر چڑھنے کے لیے "سوزِ وطن" کا واقعہ گھڑا تھا۔ ورنہ ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی ــــ

شبلی صاحب کی اس مذموم حرکت نے "سوزِ وطن" کی ساری کی ساری بحث کو نہ صرف غلط لائن پر چڑھا دیا بلکہ ڈاکٹر قمر رئیس اور نجانے کتنے دوسرے لوگوں کو پٹری ہی سے اُتار دیا۔

جس ریت کی زمین پر یعنی "(کی پابندی)" کے اضافے کے ساتھ شبلی صاحب نے اپنی تحقیق کا ہوائی قلعہ تعمیر کیا تھا وہ تو زمین بوس ہو گیا ہے۔ اور "سوزِ وطن" کے مناقشہ کی بحث یہیں پر ختم ہو جاتی ہے لیکن لگے ہاتھوں قارئین کی آنکھوں سے شبلی صاحب کے اس طلسم کا پردہ ہٹانے کی خاطر شبلی صاحب کی دوسری کئی غلط بیانیوں کی نشان دہی بھی ضروری ہے۔

شبلی صاحب نے اکثر و بیشتر مارچ ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کا حوالہ دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ پریس ایکٹ چونکہ مارچ ۱۹۱۰ء میں پہلی مرتبہ نافذ ہوا تھا۔ اس لئے اس سے پہلے "سوزِ وطن" کی ضبطی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

شبلی صاحب نے یہاں بھی آدھی سچائی کا دامن تھاما ہے۔ یا شاید شبلی صاحب کو معلوم نہیں کہ پریس ایکٹ سب سے پہلے آج سے تقریباً ایک سو تیرہ سال پہلے اور ۱۹۱۰ء سے تقریباً ترسٹھ (63) سال پہلے نافذ ہوا تھا۔

(۱) اس ایکٹ کا نام تھا ــــ

"THE PRESS AND REGISTRATION OF BOOKS ACT, 1867 (XXV OF 1867)"

اس ایکٹ کے مطابق ہر اخبار، رسالے، کتاب، پمفلٹ غرضیکہ ہر چھپی ہوئی تحریر کی مقررہ تعداد میں کاپیاں سرکار کی نامزد کسی ایجنسی کے پاس شائع ہونے کے ایک ماہ کے اندر جمع کروا کے اُس کی رسید حاصل کرنا ضروری تھا اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی تھا کہ شائع شدہ کتابوں وغیرہ پر مصنف کا نام / پرچے کے ایڈیٹر کا نام / پریس کا نام اور دیگر ضروری تفصیلات موجود ہوں۔ بلکہ اُن کے ساتھ اِن تفصیلات کا ڈیکلریشن بھی پیش کیا جائے۔ اس ایکٹ کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک میں جو کچھ شائع ہو رہا ہے اُس پر سرکار کی نگاہ رہے۔ اور ملک کی سیاسی تحریکوں / مختلف ادیبوں / جرنلسٹوں وغیرہ کے ذہنی TRENDS پر بھی جانکاری اور نگرانی رہے۔

اسی لئے پریم چند اور دیا نرائن نگم نے ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ پریس ایکٹ کی "نافرمانی" کے باعث تحقیق شروع ہوئی تھی اور کہ یہ غلطی عمداً نہیں تھی۔ اسی ایکٹ رو سے اخبارات اور رسائل پر پرنٹ لائن کا ہونا بھی ضروری تھا۔

اس کے بعد اس ایکٹ کے اندر وقتاً فوقتاً ترمیمیں اور اضافے ہوتے رہے لیکن ترمیمیں کم ہوئیں اضافے زیادہ ہوئے تاکہ شائع شدہ چیزوں پر سرکار کا شکنجہ مضبوط ہوتا رہے۔

(۲) ایک ترمیم / اضافہ ۱۸۹۰ء میں بھی ہوا تھا۔ لیکن چونکہ یہ ایکٹ اس معاملے کے زیر بحث نہیں میں نے اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اس ایکٹ کا مقصد بھی شائع شدہ چیزوں پر حسب ضرورت شکنجہ اور مضبوط کیا جا سکے۔

(۳) "شبلی صاحب کے نافذ کردہ مارچ ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ" سے تقریباً دو ڈیڑھ دو سال پہلے سرکارِ نامدار نے 8 جون ۱۹۰۸ء میں ایک اور پریس ایکٹ نافذ کیا تھا۔ اس کا نام تھا۔

"NEWS PAPER

کر گئے ہیں۔ وہ اقتباس درج ذیل ہے :۔ " ..... لیکن ایک ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کی مداخلت سے (جو مدن گوپال کی تحقیق کے مطابق پریم چند کی تحریروں کے دل دادہ ایک ادب دوست مسلمان تھے) پریم چند کے خلاف عدالتی کارروائی کی تجویز مسترد ہو گئی ...... اس واقعہ کے ایک عینی شاہد جناب اونکار جھا ابھی زندہ ہیں۔ تقریباً ۹۶ سال کی عمر ہے۔ الٰہ آباد میں قیام ہے۔ وہ بھی اسوقت محکمہ تعلیم کے ایک عہدہ دار تھے۔ اور ہمیرپور ہی میں تھے۔ انھوں نے ۲۷ فروری ۱۹۸۵ء کو ایک انٹرویو میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے سامنے اِن واقعات کی تصدیق کی اور کہا کہ پریم چند سے محکمہ جاتی کارروائی کے طور پر UNDER TAKING لے لی گئی تھی کہ آئندہ وہ کوئی تحریر محکمے کے افسرِ اعلیٰ کو جو کلکٹر ہوتا تھا دکھائے بغیر شائع نہیں کروائیں گے..."

شبلی صاحب نے اس تحریر کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا کہ اس سے اُن کے موقف کے قلعے میں دراڑیں پڑ جانا یقینی تھا۔ لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق اب اس عینی شاہد کی تصدیق کو بھی جھوٹا کہیں گے۔ اس لئے انہیں چاہیے کہ بجائے اس کے کہ جھا صاحب بھگوان کو پیارے ہو جائیں وہ اُن کے ہاتھ پر گیتا رکھ کر انھیں قسم دلوا کر اس واقع کی تحریری تصدیق یا تردید حاصل کر لیں بہت سے مستند محقق اپنی تحقیق کے سلسلے میں ہزاروں میل کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ لکھنؤ سے الٰہ آباد کا سفر تو بمشکل ایک رات کا راستہ ہو گا۔ بہرحال وہ اگر یہ سب نہیں کر سکتے تو اُن کے لئے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی تحریر پر بے اعتباری کا کوئی جواز نہیں۔ (ویسے اگر بے اعتباری ہوتی تو اپنے جواب میں وہ اس تحریر کو گول نہ کر جاتے)

(۲) دیا نرائن نگم اور منشی پریم چند کی تحریروں میں "سوز وطن" کی اشاعت اور / یا بے ضابطہ ضبطی کے بارے میں تاریخوں / سنوں وغیرہ کے سلسلہ میں جو اختلاف ہے اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ واقعہ من گھڑت ہے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ نگم اور پریم چند نے تقریباً دو دہائیوں کے بعد اس واقعہ کا اپنی اپنی یادداشت کے سہارے ذکر کیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر قمر رئیس نے زمانہ کے پرچوں کا مطالعہ کر کے تحقیقی اندازہ لگایا ہے کہ یہ کتاب جون ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ بے ضابطہ ضبط ہوئی ہو گی۔ کیونکہ اس کے بعد زمانہ میں اسکا اشتہار نہیں چھپا۔ پریم چند نے اکثر جگہوں پر اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ اُن کی یادداشت بہت کمزور ہے اور پھر اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد تاریخوں اور سنوں کی غلطی ہر کسی سے ہو سکتی ہے۔

(۳) قبلہ شبلی صاحب کی یہ دلیل تو بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ پریم چند نے کچھ لوگوں کے استفسار پر تو اس واقع کا ذکر کیا ہے لیکن دوسرے کچھ لوگوں کے استفسار پر اس واقع کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ دیکھا جائے تو شبلی صاحب کی یہ دلیل خود اُن کے موقف کے خلاف جاتی ہے یعنی اگر پریم چند شہرت کے بھوکے ہوتے تو وہ ہر استفسار کرنے والے کو "سوز وطن" کی ضبطی کے قصے یوں مرچ لگا کر بیان کرتے۔ کیونکہ انھوں نے (شبلی صاحب کے موقف کے مطابق) اپنی "شہرت کے شاندار" محل کی بنیاد تو ۱۹۱۰ء ہی میں رکھ دی تھی۔

(۴) شبلی صاحب نے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی اس تحریر کا بھی ذکر نہیں کیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس زمانہ میں پریم چند اور اُن کے ہم عصر ادیب افسانہ / قصہ / مضمون کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے اسی سلسلہ میں کئی مثالیں بھی دی تھیں جو نکہ شبلی صاحب نے ساری محنت کو اس "غلط نامہ" [illegible]

غلط لائن پر چڑھا دیا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اُن کی اِس "ترپ چال" کو پہچانا نہیں تھا اِس لئے انھیں یہ سب کچھ لکھنا پڑا اور مثالیں بھی دینا پڑیں۔ اُن کی اِس غلط بیانی کو ظاہر کر دینے کے بعد اب ان مثالوں کی ضرورت بھی نہیں رہی پھر بھی قارئین اور شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے میں چند مثالیں پریم چند ہی کی تحریروں سے دیتا ہوں۔

(الف) پریم چند کے جس خط کو پکڑ کر انھوں نے پریم چند کی "بدھیا بٹھائی" ہے اُسی خط میں ایک جگہ پریم چند لکھتے ہیں:—

"...... یہ سب مضامین جن کا آغاز گذشتہ ہوا ہے (مدن گوپال نے فٹ نوٹ دیا ہے — افسانہ گناہ کا اگن کنڈ" کی طرف اشارہ ہے) اور ایشور نے چاہا تو شاید کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہے۔......"

(ب) "...... مشغلِ ہدایت ارسالِ خدمت ہے..... ۳۳ روپئے اور رہے۔ اس میں اِس مضمون کو اور اضافہ فرما دیں ...." (صفحہ 61 - 62)

(ج) "........ قصہ ارسالِ خدمت ہے۔...... ایسے وضع کرنے کے بعد ۳۳ روپئے رہ گئے۔ اب یہ مضمون جاتا ہے ۱۵ روپئے اس کے بھی محسوب فرمائیے .... یہ مضمون میں نے صاف نہیں کیا۔ بہت طویل ہے ...." (صفحہ 64-65)

(د) "کہکشاں کے لئے قصہ زنجیرِ ہوس ارسال ہے... .... اگر کسی وجہ سے کہکشاں (میں) نہ نکل سکے تو یہ مضمون واپس ارسال فرمائیے......" (صفحہ 70 - 71)

میرے خیال میں یہی چار مثالیں کافی ہیں حالانکہ پریم چند کے خطوط میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ جہاں پریم چند نے افسانہ/قصہ اور مضمون کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

(۵) کتابوں کے جلائے جانے یا نہ جلائے جانے کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں کتابیں جلائی گئیں ہوں۔ یا دریا بُرد ہوئی ہوں یا دیمکوں نے کھائی ہوں ایک ہی بات ہے۔ اگر پریم چند نے انہیں لکھ دیا کہ کتابیں لے کر جلا ڈالی گئیں تو اِس میں اُن کے موقف میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شبلی صاحب نے یہ واقعہ لے کر رائی کا پہاڑ اور چیونٹی کا ہاتھی بنا ڈالا ہے۔ پورے معاملے کو مکمل تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اسی طرح یہ بات کہ پریم چند نے کتنی کتابیں محکمے کے افسرِ اعلیٰ کے حضور میں پیش کیں، کتابیں پریم چند نے اپنے پاس سے دیں یا نگم صاحب سے حاصل کر کے دیں یا نگم صاحب کے اسٹاک میں کتابیں پڑی رہ گئیں اور آہستہ آہستہ بکتی رہیں۔ کتابیں پریم چند نے خود اپنے خرچ سے چھپوائیں یا نگم صاحب نے "زمانہ" کے دفتر سے شائع کیں اِن باتوں کا بھی اِس بحث سے کوئی سیدھا تعلق نہیں مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں شبلی صاحب کا یہ اعتراض بھی فروعی ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر فراق، پریم چند، شاکر، نگم سبھی نے یہ واقعہ اپنی اپنی یاد داشت کے مطابق بیان کیا ہے۔

(۶) فروغِ اُردو (فروری ۱۹۸۰ء، صفحہ نمبر ۳۵) میں شبلی صاحب فرماتے ہیں "گمان غالب ہے کہ منشی پریم چند پر اُن کے مضمون 'یو۔ پی۔ میں ابتدائی تعلیم' کی وجہ سے عتاب نازل ہوا......"۔ بغیر کسی ثبوت کے کوئی بھی محقق کسی بات پر گمان غالب نہیں کرے گا۔ شبلی صاحب نے اپنے موقف کی حمایت میں ایک بھی مثال نہیں پیش کی۔ اس لئے اُن کا یہ موقف قابلِ اعتنا نہیں ہے۔

(۷) اگر پریم چند کو اپنا امیج ہی بنانا تھا یا اپنی شہرت

کا محل کھڑا کرنا تھا تو وہ "سوزِ وطن" کی بجائے "سمر یاترا" کی ضبطی کا ڈھنڈورا پیٹتے کہ وہ تازہ ترین واقعہ تھا۔ اور باضابطہ طور پر ضبط ہوئی تھی۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی مندرجہ ذیل تحریر (فروغِ اُردو شعبہ نمبر ۵، ۶۔ اپریل ۱۹۸۰ء) کے جواب کو بھی جان بوجھ کر نظرانداز کر گئے ہیں۔ تحریر ملاحظہ فرمائیے ——

"..... پریم چند کے ہندی افسانوں کا ایک دوسرا مجموعہ "سمر یاترا" جب ۱۹۳۰ء میں باضابطہ طور پر ضبط کیا گیا تھا تو پولیس باقاعدہ طور پر اُن کے گھر پر چھاپا مار کر ساری جلدیں لے گئی تھی۔ اس کا ذکر بھی پریم چند نے ایک اداریئے میں کیا ہے ...."

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات حتمی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "سوزِ وطن" کے سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے جو اہم دلائل پیش کی تھیں اور اپنے موقف کے ثبوت میں شبلی صاحب کی طرف سے جن کا جواب دینا بہت ضروری تھا۔ شبلی صاحب اِن باتوں کو جان بوجھ کر نظرانداز کر گئے اور یہ بات کسی بھی مستند محقق کے شایانِ شان نہیں ہے۔ دیسے بھی اُن کے مستند ہونے کی مثال اس مضمون کے پہلے ہی صفحہ پہ پیش کر دی گئی ہے۔

شبلی صاحب نے منشی پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرنے اور "سوزِ وطن" کا شاخسانہ کے سلسلہ میں اکثر جگہوں پر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی مختصر الفاظ میں چند حقائق پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ فروغِ اُردو کے قارئین بھی سارے معاملے پر غور فرما سکیں۔

(۱) شبلی صاحب نے "آریہ سماجی" ہونے کو ایک گالی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حالانکہ آریہ سماج کی تحریک ہندو دھرم کی ایک مذہبی اصلاحی تحریک تھی اور ہندو دھرم ہی کا ایک حصہ ہے۔ جیسے شیعہ سنی۔ وہابی وغیرہ مذہب اسلام کی مختلف تحریکیں ہیں۔ انھوں نے جان بوجھ کر آریہ سماج کو جن سنگھ۔ ہندو مہاسبھا مسلم لیگ اور جماعت اسلامی جیسی پولیٹکل جماعتوں کے برابر رکھا ہے۔ اسی لئے کسی کے "آریہ سماجی" ہونے کا طعنہ دینا اُسے گالی دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے قبلہ شبلی صاحب کو اس طرح کی باتیں کرتے وقت ہوش و خرد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔ آریہ سماجی ہونے کا طعنہ دے کر پریم چند کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہرا کر بھی شبلی صاحب نے اپنے غیر ذمہ دار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

(۲) اگر پریم چند نے اپنے ایک مذہبی ادارے میں شرکت کی۔ اُس کی سالانہ کانفرنس یا جلسے کی صدارت کی۔ آریہ بھاشا کے جلسے کی صدارت کی۔ ہندی پرچار سبھا میں شرکت یا اُس کی صدارت کی تو اس کا یہ جواز کہاں سے پیدا ہو گیا کہ انھوں نے اُردو کی مخالفت کی۔ اُردو کے خلاف کہا ہوا پریم چند کا ایک بھی جملہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند ہمیشہ اُردو اور ہندی والوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔ انھوں نے زندگی بھر اس بات کی حمایت کی کہ اُردو اور ہندی اپنے اپنے رسم خط کے ساتھ پھلیں پھولیں۔ انھوں نے ہمیشہ "ہندوستانی" کی حمایت کی اور صاف صاف کہا اور لکھا کہ "ہندوستانی" دونوں رسم خط کے ساتھ لکھی جائے۔

(۳) اب رہی اُن کی ترقی پسند ہونے کی بات ——

تو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ۱۹۳۶ء میں جو ترقی پسند

(باقی مضمون صفحہ [illegible] پر)

ابو محمد شبلی
۱۱۶/۸۳ گھسیاری منڈی لکھنؤ ۱

منشی پریم چند اُور جارحانہ فرقہ پرستی

جناب مالک رام کا مضمون درج بالا عنوان کے تحت "فروغ اردو" اپریل ۱۹۸۱ء کے شمارے میں نظر سے گزرا پریم چند اور فرقہ واریت کی بحث تقریباً دو سال سے چل رہی ہے اگر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو صرف ایک نتیجہ برآمد ہوگا کہ مسلمان فرقہ پرست ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں اور ہندو ہو ہی نہیں سکتے علمی اور ادبی تحقیق و تنقید میں بھی یہ نفسیاتی حقیقت کارفرما ہے اگر جناب مالک رام لکھیں کہ

"آج تک اُن کی (مولانا فضل حق خیرآبادی کی) نسبت جو بعض باتیں مشہور رہی ہیں دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انھیں ...... جنگ آزادی میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے ..... اب کہ یہ حقیقت دو ٹوک ہو کر ہمارے سامنے جلوہ افروز ہو گئی ہے ہمیں اپنی غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیئے ...... مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انھیں اُن کے صحیح مقام پر بٹھائیں نہ کہ غلط باتیں اُن سے منسوب کر کے اُن کا ایک فرضی بت بنا کر رکھیں جو ممکن ہے خوبصورت تو ہو لیکن اصل سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہ ہوگا"

(تحریک جون ۱۹۷۹ء [illegible] دسمبر ۱۹۷۹ء)

تو صحیح اور اگر میں کہوں کہ

"منشی پریم چند کا ذہن اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے صاف نہ تھا ..... اگر یہ صحیح ہے کہ افسانہ نویس اپنے زمانہ اپنے ماحول کا عکاس ہوتا ہے تو منشی پریم چند کے وہ افسانے جن میں مسلم کردار کو جگہ دی گئی ہے یا اسلام کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہے خود اُن کے کانٹے پر پورے نہیں اترتے۔ اور اگر انھوں نے پوری ایمانداری اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے تو اُن کے یہ افسانے آزادی ہند کی تاریخ کا دوسرا پہلو بھی پیش کرتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اس دور کے ہندو مسلم اتحاد کے سنگم کی تہ میں آنکھوں سے اوجھل تعصب کی تہ دبی ہوئی بہہ رہی تھی جس نے آزادی کے

ساتھ ساتھ مادر وطن کے دو ٹکڑے بھی کردیئے"۔

(فروغ اردو۔ پریم چند نمبر ۱۹۶۲ء)

غلط۔ حالانکہ دونوں ہی معاملہ میں واضح حقیقتیں موجود ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا موقف جو بھی رہا ہو یہ ثابت ہے کہ انھیں حبس دوام بہ عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا ہوئی اور وہیں قید و بند میں پیغام اجل کو لبیک کہا۔ منیر شکوہ آبادی بھی ایک باغی تھے مگر انگریزوں نے انھیں ایک رنڈی کے قتل کے سلسلے میں پھانسا تھا۔ وہ بھی انکاری تھے۔ مگر انھیں بھی یہی سزا دی گئی تھی۔ اور اُن کے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر الہ آباد سے کلکتہ تک گرانڈ ٹرنک روڈ پر پیدل گھسیٹا گیا تھا تو کیا ہم رنڈی کے قاتل کو قومی ہیرو تسلیم نہ کریں گے؟ اگر ہمارا یہی اصول رہا۔ تو خودی رام بوس۔ بال گنگا دھر تلک۔ رام پرشاد بسمل کی ساری قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔

محترمہ عطیہ نشاط صاحبہ نے جناب اوپندر ناتھ اشک سے جو انٹرویو لیا۔ ہے گو یہ تحریری ہے الفاظ بہت ہی ناپ تول کر استعمال کئے گئے ہیں مگر پھر بھی قیمتی ہے۔ اشک صاحب نے پہلے سوال کے جواب میں بڑے تپے کی بات کہی ہے کہ "ادیب کو اس کی تخلیقات کی روشنی میں ہی پرکھنا چاہیئے"۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ دستر خوان پر ایک ساتھ پلاؤ قورمہ کھانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جناب گوپال متل کے والد کے دوست شب برات ہندو حلوائی سے حلوہ بنوا کر اسی حلوائی کے سر پر رکھوا کر متل صاحب کو پہونچاتے تھے۔ مگر ذہنی سطح پر دونوں ایک تھے مگر آج فساد میں ہم لوگ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے پڑوسیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے حالانکہ سب ایک دوسرے کے تحفے قبول کرتے اور ساتھ ساتھ کھاتے بھی ہیں۔

زکی انور کو مارنے والے کون تھے؟ سب اُن کے "اپنے" تھے جنکے لیے انھوں نے مسلم علاقہ چھوڑ کر ہندو علاقہ میں گھر بنوایا تھا۔ مورتی کے جلوس کے لئے بھوک ہڑتال کی تھی۔ جلوس کی قیادت کی تھی۔ جلوس کو مسلم علاقہ سے نکال لے گئے تھے مگر پھر بھی مار ڈالے گئے کیوں؟ اس لئے کہ اسلام اُسے وراثت میں ملا تھا اور نام اُسکا زکی انور تھا۔ ساری سیکولرزم رائیگاں گئی۔ ساتھ رہنا۔ ساتھ کھانا پینا کچھ کام نہ آیا۔ پتہ نہیں مانک ٹالہ صاحب نے زکی انور۔ ایک ادیب ــــــ "ایک انسان کا خون" ہونے پر کیا لکھا؟ ابتک مجھے خبر نہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونا میرے نزدیک اہم نہیں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "پنچایت" کے الگو اور جمن میں ذہنی سطح پر ہم آہنگی ہے یا نہیں؟ "ڈگری کے دیئے" میں کیلاش کو نعیم پر اعتماد کیوں نہیں ہے؟ اور یہ بے اعتمادی مضحکہ خیز حد تک کیوں پہونچ جاتی ہے؟ "کیلاش کی بیباک صحافت کا سوا کرنا افسانہ کا تقاضہ تھا یا کیلاش کو مجبور کرکے مسلمان بتانا؟" الزام "کی دیوی رضا حسین کے ساتھ کمیوں بھاگتی ہے؟ منوہر کے ساتھ کیوں نہیں؟ افسانہ نویس اور نقادان فن ہمیں بتائیں کہ اس افسانہ میں رضا حسین کی کیا ضرورت تھی؟ وہ افسانے کے تقاضے سے آیا ہے یا منشی پریم چند کی ذہنی کیفیت کی پیداوار ہے؟ "شدھی" کا پریم ناتھ الفت حسین کیوں بن جاتا ہے؟ جبکہ اسے اسلام سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی۔ (اُسکے) "جذبات ہندو تھے۔ خیالات ہندو تھے۔ تعلقات ہندو تھے۔ ہمدردیاں ہندو تھیں" پھر بھی وہ پریم ناتھ سے الفت حسین کیوں بن گیا؟ جبکہ حسنہ رنڈی کی طرف سے ایسی کوئی تحریک بھی اس افسانہ میں نہیں ہے۔ میں جناب مانک ٹالہ سے دریافت کروں گا کہ کیا رنڈیاں بھی تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام

دیتی تھیں؟ یا منشی پریم چند ہندو ادباشوں کو یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر منہ کالا کرنا ہی ہے تو ہندو رنڈیوں کے یہاں جایا کرو تاکہ کم از کم "دھرم" سے تو ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ اگر مانک ٹالہ صاحب میری اس تلخی کو گھونٹ نہیں سکتے۔ تو جواب دیں کہ افسانہ کا پیغام کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ منشی پریم چند کی ذہنی علیحدگی پسندی اور عصبیت کی انتہا ہے۔

مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ فرقہ واریت کے خلاف ہماری تحریک نے لوگوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ پریم چند کو پڑھیں اور پرکھیں۔ کوئی اپنی لائبریری سے "قلم کا مزدور" نکال رہے ہیں کوئی دو دو ہزار پرسنگ کی ضخیم جلدوں کو کھنگال رہے ہیں۔ جو کام وگیان بھون نئی دہلی میں پریم چند کے نام پر پیسہ کمانے والوں سے نہ ہو سکا "وہ شرپسند فرقہ پرستوں" نے انجام دیا ہے۔ ایک مثال "ہماری زبان" ۸ فروری ۱۹۸۱ء کے صفحات پر بھی نظر آئی ہے۔ ڈاکٹر ٹی۔ این کھنہ صاحب نے پریم چند کے دفاع میں "پریم چند اور فرقہ واریت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے حوالے اُن کے ناولوں یا افسانوں سے نہیں بلکہ دوسری تحریروں سے دیئے گئے ہیں۔ (یہ مضمون فروغِ اُردو مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں چھپ چکا ہے)

مجھے اس بات سے بھی خوشی ہوئی کہ جناب مانک ٹالہ میری "گھناؤنی اور قابل نفرت حرکت" کا پردہ فاش کرنے واپس آگئے۔ میں صدقِ دل سے انکا استقبال کرتا ہوں۔ حالانکہ خود وہ اس "گھناؤنی حرکت" کے مرتکب ہوئے ہیں مگر میں انھیں پیش نہیں کروں گا کہ مجھے "فروغِ اُردو" کے صفحات اور قارئین کا وقت زیادہ عزیز ہے۔ نیز میں اس بحث کو فرقہ واریت کی حد تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوں

[illegible]

پھنس کر وقت برباد کروں۔

"آپ خود ہندو سہی لیکن آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں" سے میرے موقف کی تائید مزید ہوتی ہے کہ پریم چند "ہندو پانی" اور "مسلم پانی" کی طرح "ہندو افسانے" اور "مسلم افسانے" لکھا کرتے تھے اس طرح ایک سیکولر ذہن کے حامل ادیب ہندوؤں اور مسلمانوں کو علمی اور ادبی سطح پر بھی علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو کوئی نہیں بتلائے کہ "جج اکبر" کو مہا تیرتھ میں تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ صرف نام ہی نہیں کردار بھی بدلے گئے کیا ہندوستان کے ہندو "جج اکبر" نہیں سمجھ سکتے تھے؟ یا مسلمان "مہا تیرتھ" سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے؟ "جج اکبر" میری نظر سے گذرا بھی نہیں "مہا تیرتھ" ہی کو اُردو کے جامے میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ادبی اثرات مرتب ہوئے جو "جج اکبر" سے ہو سکتے تھے اسی طرح منشی جی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوئی کی دیوار کھڑی کر رہے تھے اور دوسری طرف علامہ اقبال جنھیں اس بحث میں گھسیٹنے کی دھمکی دی جا رہی ہے گا رہے تھے ؎

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

(بانگ درا۔ نیا شوالہ)

میں جناب مانک ٹالہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے پریم چند پر دو سو پندرہ صفحے کی کتاب پڑھ ڈالی حالانکہ یہ کتاب آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے۔ اس کے مصنف لکھتے ہیں۔

[illegible]

نائدہ اٹھایا گیا ہے" (ادیوار ۳۱ اگست سنہ ۱۹۸۰ء)۔ اُن کا دوسرا ماخذ ہے" پریم چند کے خطوط "جس میں بہت سے خطوط ہیں جو چھٹی پتری جلد ۱ و ۲ میں موجود ہیں جبکہ چھٹی پتری سنہ ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی اور "پریم چند کے خطوط" کو مکتبہ جامعہ نے سنہ ۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا۔ بہرحال مانک ٹالہ صاحب کے حوصلے بلند ہیں وہ "سوزِ وطن" کے نسخا خشانہ کی تحقیق بھی کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ مبارک کرے آخر کانی داس گپتا رضا کی دوستی کب کام آئے گی مگر میری درخواست ہے کہ وہ اس کوچہ میں قدم رکھنے سے پہلے "فن اور شخصیت" کے آپ بیتی نمبر میں منشی پریم چند کی آپ بیتی کو پڑھ ڈالیں۔ کہیں کا انیٹ کہیں کا روڑا کس نے بھان متی کا کنبہ جوڑا؟ مجھے خبر نہیں۔ البتہ معلوم ہے کہ اس آپ بیتی نمبر کے نگران جناب کالی داس گپتا رضا تھے جن کی تحقیقی صلاحیتوں کے ہملنگ تو قائل ہیں ہی جناب مانک ٹالہ بھی انھیں محقق تسلیم کرتے ہیں وہی اُن سے دریافت فرمائیں کہ پریم چند کی آپ بیتی سے درج ذیل سطور کیوں محذوف ہیں؟ کیا رضا صاحب منشی جی کے اس بیان کو غلط سمجھتے ہیں؟ اور یہ بھی دریافت فرمائیں کہ اس آپ بیتی کے مرتب کو حذف و اضافہ کا اختیار کس نے دیا؟ اور کس ادبی ضابطے کے تحت یہ خدمت انجام دی گئی؟

"پانچ کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے سنہ ۱۹۰۹ء میں چھپا۔ اس وقت تقسیم بنگال کا ہنگامہ رہا تھا۔ کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حبِ وطن کی عظمت کو پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت میں محکمۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو چھپے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک رات میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے نام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا پروانہ پہونچا کہ مجھ سے فوراً ملو۔ جاڑوں کے دن تھے۔ صاحب دورے پر تھے۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ صاحب کے سامنے "سوزِ وطن" کی ایک جلد رکھی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اسوقت میں نواب رائے کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ پتہ مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی تلاش میں ہے۔ سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور اسی کی جواب دہی کے لئے مجھے طلب کیا گیا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا "یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟" میں نے اقرار کیا۔

صاحب نے مجھ سے ایک ایک کہانی کا مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے اپنے کو خوش قسمت سمجھو کہ انگریزی عملداری میں ہو مغلوں کی حکومت ہوتی تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ لئے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یکطرفہ ہیں تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے وغیرہ وغیرہ

فیصلہ یہ ہوا کہ میں "سوزِ وطن" کی ساری کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور صاحب کی اجازت کے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں سمجھا چلو سستے میں چھوٹے۔ ایک ہزار کتابیں چھپی تھیں ابھی مشکل سے تین سو بکی تھیں باقی سات سو جلدیں میں نے "زمانہ" آفس سے منگوا کر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں میں نے

سمجھا بلاٹل گئی لیکن افسران اتنی آسانی سے مطمئن نہ ہو سکے مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ صاحب نے اس مسئلہ پر ضلع کے دوسرے افسروں سے مشورہ کیا سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر (مدارس) جنکا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے کہانیوں سے اقتباسات پیش کرکے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے آخر تک سیڈیشن کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور سیڈیشن بھی معمولی نہیں بلکہ باغیانہ پولس کے دیوتاؤں نے کہا ایسے خطرناک آدمی کو ضرور سخت سزا دینی چاہئے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑ جائے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ دوستانہ طریقے سے میرے سیاسی خیالات معلوم کریں اور کمیٹی کے سامنے پیش کریں۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے سمجھا دیں اور رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف صاحب قلم ہے اور سیاسی تحریک سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ کمیٹی نے انکی تجویز کو پسند کیا۔ حالانکہ پولس کے دیوتا اسوقت بھی پینترے بدل رہے تھے۔

اچانک کلکٹر نے ڈپٹی انسپکٹر سے پوچھا آپ کو امید ہے کہ وہ آپ سے اپنے دل کی بات کہہ دیگا؟ آپ دوست بن کر اس کے راز معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ یہ تو مخبری ہے میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔

ڈپٹی صاحب متحیر ہو کر ہکلاتے ہوئے بولے میں، تو حضور کے حکم ۔۔۔۔

صاحب نے بات کاٹی نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم دینا نہیں چاہتا اگر کتاب سے بغاوت کی کوشش بغاوت ثابت ہو تو کھلی عدالت میں مقدمہ چلایئے ورنہ دھمکی دے کر چھوڑ دیجئے۔ میں رام رام بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔

جب اس واقعہ کا ذکر ڈپٹی صاحب نے مجھ سے کئی دن بعد کیا تو میں نے پوچھا کیا آپ سچ مچ مخبری کرتے؟ وہ ہنس کر بولے نا ممکن کوئی لاکھ روپئے بھی دیتا تو نہ کرتا۔ میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا اور وہ رک گئی۔ مقدمہ عدالت میں آتا تو سزا ہو جانا یقینی تھا۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا بھی کوئی نہ ملتا مگر صاحب ہیں شریف آدمی۔

میں نے تسلیم کیا بہت ہی شریف۔

یہ بیان صحیح ہو یا غلط یہ منشی پریم چند کے ماہنامہ "ہنس" فروری ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں "جیون سار" کے عنوان سے چھپنے والی آپ بیتی کا اقتباس ہے۔ (میں نے ہنس پرکاشن الہ آباد کے "کفن" نامی کتابچے سے ترجمہ کیا ہے)۔ اس آپ بیتی کا اردو ترجمہ زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء میں چھپا تھا۔ میر فن اور شخصیت کے آپ بیتی نمبر سے کیوں محذوف ہے؟ کیا فرماتے ہیں جناب مانک ٹالہ جی اس "گھناؤنی حرکت" کے بارے؟ کیا حوالے کی کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ایسی حرکتیں جائز ہیں؟

اگر مانک ٹالہ صاحب کو تحقیق کا شوق ہے تو پریم چند کی زندگی کے بہت سے پہلو تحقیق طلب ہیں۔ حالانکہ انہیں انتقال کئے ہوئے پینتالیس سال سے زائد نہیں ہوئے ان کے بہت سے ہم عصر ابھی زندہ ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنا امیج بنانے کی جو کوششیں کی تھیں ان کی وجہ سے بہت ساری باتیں پردے کے پیچھے رہ گئی ہیں وہ ان پردوں کو اٹھا کر [illegible]

ہو گئی مثلاً ۔۔۔

"وہ فرشتۂ رحمت کون تھا جو منشی جی کو کتابوں کی دکان سے اترتے وقت ملا تھا اور انھیں اٹھارہ روپئے کی پہلی ملازمت طشت میں سجا کر پیش کر رہا تھا۔ منشی جی اس تحفہ کو پاکر اتنے شاداں و فرحاں تھے کہ ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس خوشی میں وہ اس فرشتہ کا نام بتانا بھول گئے۔

ٹریننگ اسکول الہ آباد میں ایک مضمون (حساب) میں فیل ہونے کے بعد بھی پاس کر دیئے گئے۔ کیا انگریزوں کے دور میں ایسا بھی ہوتا تھا؟ ماڈل ٹریننگ اسکول، الہ آباد کے ہیڈ ماسٹر کیوں بنائے گئے تھے؟ اس کے بعد پھر کسی بھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کیوں نہ بن سکے؟ انتہا یہ کہ بی۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد بھی دس سال تک اس کی امید نہیں تھی (چٹھی پتری جلد ۱ خط ۱۱۲)

کیا واقعہ منشی جی نے ۱۶ فروری ۱۹۲۱ء کو استعفیٰ دیا تھا؟ وہ استعفیٰ کہاں ہے؟ "ہنس" ۔۔۔، جو پہلی بار ضمانت طلب کی گئی تھی کیا یہ حقیقت ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنارس کی سفارش پر وہ حکم منسوخ ہو گیا تھا؟ ۱۹۳۴ء میں منشی جی یو۔ پی کے چیف سکریٹری سے "جاگرن" کی ضمانت کی منسوخی کے لئے ملے تھے۔ اور حکومت برطانیہ سے اپنی وفاداری کے ثبوت پیش کئے تھے۔ (پریم چند کے خطوط ص ۲۴۷) وہ ثبوت کیا تھے؟ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے انھیں رائے بہادر کا خطاب دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ کیا یہ سچ ہے؟ حکومت انگلشیہ کن لوگوں کو خطاب اور اعزاز سے نوازتی تھی؟

پریم چند کا یہ وہ آئینہ ہے جس پر لوگوں نے گرد و غبار ڈال دیا ہے اسے صاف کیجئے تو پریم چند کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آ جائے گی اس لئے کہ ۔۔۔

"مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انھیں ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کر کے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں جو ممکن ہے خوبصورت ہو لیکن اصل سے اس کا دور کا بھی تعلق نہ ہوگا۔"

جناب مانک ٹالہ نے "اسلام کا وِش ورکش" کے سلسلے میں منشی جی کے رد عمل پر بھی داد تحقیق دینے کی لاحاصل کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے دو باتیں کہی تھیں۔

پہلی بات یہ کہ منشی پریم چند نے اس کتاب کے خلاف خود کچھ نہیں لکھا۔ ان کے خطوط جو آج پیش کئے جا رہے ہیں اس وقت منظر عام پر نہیں آئے تھے جب ان کی ضرورت تھی۔ بلکہ مکتوب الیہ کی جیبوں میں پڑے تھے۔ اس لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ دوسروں کے مضامین اپنے اخبار میں چھاپنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اڈیٹر مضمون نگار کی رائے سے متفق بھی ہو۔ نیز دوسروں کے مضامین چھاپنا اور کسی واقعہ پر خود اڈیٹوریل نوٹ سپرد قلم کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ صفائی پیش کرنے والے آج تک اس کتاب کے خلاف منشی پریم چند کا کوئی نوٹ "ہنس" "جاگرن" یا کہیں اور نہ دکھا سکے۔

دوسری بات میں نے یہ کہی تھی کہ جس سال (۱۹۳۳ء میں) چترسین شاستری کی یہ کتاب چھپی تھی اسی سال منشی جی نے "میرے بہترین افسانے" کو ہندی میں مرتب کیا تھا اور چترسین شاستری کی خاموش ہمنوائی میں "عفو" یا معافی کا درج ذیل آخری پیراگراف حذف کر دیا تھا۔

"ڈیوڈ بخیریت گھر پہونچ گیا مگر اب وہ ڈیوڈ نہ تھا جو اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ اسکے خیالات میں ایک گونہ تغیر ہو گیا تھا۔ اب وہ مسلمانوں کی قدر کرتا اور مسلمانوں کا نام عزت لیتا تھا۔

(پریم چالیسا اول اور فردوس خیال) ۔۔۔

مانک ٹالہ صاحب ہمیں بتائیں کہ اس پیراگراف کو حذف کرنے کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس پیراگراف کو حذف کرنے کے بعد افسانہ کا پیغام یکسر بدل نہیں گیا؟ ان سطروں کو حذف کرکے افسانہ نویس اپنے قارئین پر مسلمانوں کے بارے میں کون سا تاثر چھوڑنا چاہتے تھے۔؟

جناب علی احمد فاطمی اور جناب سعید عارفی نے امرت رائے صاحب سے ایک انٹرویو میں بڑی صفائی کے ساتھ دریافت کیا تھا کہ

> جب پنڈت چترسین شاستری نے جب کتاب "اسلام کا وِش ورکش" لکھی تو انھوں نے (پریم چند نے) ایسی زہریلی کتاب سے متعلق خود کچھ نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے دوستوں سے لکھوانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ اس موضوع سے متعلق آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔"
>
> (سہیل گیا۔ پریم چند نمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۹)

جناب امرت رائے نے ضمنی باتوں کے جواب میں لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی مگر سہ

> جو بات سارے فسانے کی جان تھی بسمل
> یہ "اتفاق" کہ آئی وہ داستاں میں نہیں

جناب مانک ٹالہ نے خواجہ حسن نظامی صاحب کی سند بھی پیش کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ ایک ہی سیاسی مسلک کے حامل تھے۔ دونوں کے دلوں میں انگریزوں کے لئے نرم گوشے تھے۔ پھر بھی دونوں میں ایک واضح فرق تھا۔ خواجہ صاحب کبھی بھی اپنے حدود سے باہر نکل کر دوسروں کے حدود میں داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک صاحبِ دل صوفی کی طرح مسلمانوں کو کرشن جی کی فضیلتوں سے واقف کرانے کے لئے ایک کتاب "کرشن بیتی" لکھی تھی۔ جو اُردو داں ہندوؤں میں بے حد پسند کی گئی۔۔۔ جناب ۔۔۔

سری رام شرما نے اس حد تک پسند کیا کہ اس کا ہندی ترجمہ کر کے منشی پریم چند کو بھیجا کہ وہ اسے نولکشور پریس سے شائع کرادیں مگر منشی جی نے ایک مدت کے بعد معذرت کے ساتھ مسودہ واپس کر دیا۔ (پریم چند کے خطوط ص ۲۱۲)

اس طرح منشی جی سرگرمی سے اپنے طور پر ہندوؤں کو مسلمانوں سے ذہنی سطح پر علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ اس سمت میں مسلمانوں کی پیش قدمی کو بھی اپنی امکانی حد تک روک دینا چاہتے تھے اور خواجہ صاحب ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

غالباً خواجہ صاحب کی اس سند کو پڑھنے کے بعد جناب مانک ٹالہ نے پیش کیا ہے۔ پنڈت نند دلارے باجپئی صاحب نے لکھا تھا۔

> خواجہ حسن نظامی صاحب نے دلی کی ایک سبھا میں پریم چند کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس زمانہ میں ہندو اور گمراہ ہو کر مسلمان مرتد ہو رہے تھے۔ اس میں پریم چند درد بھری کہانیاں لکھ کر جب قومی سندیس دے رہے تھے۔ شاید خواجہ صاحب نے پریم چند کا "کایا کلپ" ناول نہیں پڑھا ہوگا۔ قومی تحریک کے ٹھنڈے ہو جانے پر ... میں پریم چند ہندو سنگھٹن کے نیتا کا روپ بھی دھارن کر چکے تھے۔ اس وقت کا یہی اودیہ تھا پریم چند بھی وقت کے ساتھ ہے۔"
>
> (ہندی ساہتیہ بیسویں شتابدی میں ص ۸۸)

منشی جی کے مداح ایسے موقعوں پر ان کا ڈراما "کربلا" بھی پیش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک "کربلا" کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ منشی جی ہندوؤں کو حق کی راہ میں قربانی دینے کے لئے ساہس (ہمت) دلانا چاہتے تھے اسی لئے ساہس راؤ کا کردار اس میں لایا گیا ہے۔ جس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔

مسلمانوں کی جاں بازی اور سرفروشی نے مہاتما گاندھی کو بھی مجبور کیا تھا کہ وہ خلافت کمیٹی کے صدر بن کر ہندوؤں میں جیل جانے کی ہمت پیدا کریں ورنہ عام ہندو تو خلافت کے معنی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس تحریک کو انگریزوں کی "خلافت" (مخالفت) سمجھتے تھے۔ یہی خدمت منشی جی "کربلا" کے ذریعہ انجام دے رہے تھے۔

یہ بالکل غلط ہے کہ میں منشی جی کو صرف اس لئے فرقہ پرست کہتا ہوں کہ وہ اردو چھوڑ کر ہندی میں لکھنے لگے تھے۔ میں نے ابتک اُنکی جتنی تحریریں پیش کی ہیں ان میں زیادہ تر اُردو کی ہیں یا اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ہندی پڑھنے کا تو ابھی موقع ہی نہیں ملا۔ وہ ہندی کی طرف تو اس لئے گئے تھے کہ وہاں شاید پیسہ زیادہ ملنے لگا تھا۔ (دولت مند بانجھ عورت اسی طرح دوسروں کے بچوں کو اپناتی ہے) ہندی میں جانے کی ایک وجہہ اور بھی تھی۔ وہ کھل کر اپنا مافی الضمیر ہندی میں لکھ سکتے تھے اور اُردو والوں کے محاسبہ سے بچ سکتے تھے۔ سب سے پہلے محاسب تو منشی دیا نرائن نگم صاحب ہی تھے۔ "کربلا" ہی کو لیجئے پہلے ہندی میں چھپا کچھ نہ ہوا۔ اُردو میں سب سے پہلے نگم صاحب ہی معترض ہوئے تھے۔ اور پریم چند کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کو "ساہس راؤ" کے کردار ہی پر اعتراض تھا کہ یہ کوئی تاریخی حقیقت نہ تھی۔

مانک ٹالہ صاحب نے اِن بارہ افسانوں سے پیش کئے گئے اقتباس پر بھی شبہ کا اظہار کیا ہے حالانکہ میں نے بڑی صفائی کے ساتھ لکھا تھا کہ اقتباسات محض نشاندہی کے لئے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد ہی اس اسپرٹ کا اندازہ ہوسکے گا جسے منشی پریم چند نے ان افسانوں کے لکھتے وقت ملحوظ رکھا تھا۔ (فروغ اُردو پریم چند نمبر ۱۹۷۹ء) یقین ہے کہ ان افسانوں کے پڑھنے کے بعد مانک ٹالہ صاحب کا دل میری طرف سے صاف ہو جائیگا اور وہ تسلیم کرلیں گے کہ پریم چند [illegible] حامل تھے۔

کیا بہتر ہوتا کہ مانک ٹالہ صاحب ان بارہ افسانوں کو (جو ابتک دریافت ہوسکے ہیں) اپنے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ ایک کتابی شکل میں شائع کر دیتے۔ یہ اُنکی طرف سے پریم چند کو خراج عقیدت ہوگا۔ اس سلسلہ میں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں بلا معاوضہ حاضر ہوں۔

جناب مانک ٹالہ نے ملکانا راجپوتوں کی شدھی کے سلسلے میں بھی منشی پریم چند کے رول کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں منشی پریم چند کے اس مضمون (شدھی) کو ابتک نہیں پڑھ سکا لیکن سری رام شرما صاحب کے جواب کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس جواب میں منشی جی کے مضمون "شدھی" کا اقتباس بھی دیا گیا ہے اسی اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ منشی جی نے اپنے مضمون میں بین السطور کن خیالات کا اظہار کیا ہوگا۔ شری رام شرما صاحب لکھتے ہیں۔

"مئی ۱۹۲۳ء کے "زمانہ" میں ملکانہ راجپوت مسلمانوں کی شدھی کے عنوان سے منشی پریم چند نے اس تحریک پر نکتہ چینی کی ہے جو ہندوؤں کے ہر ایک طبقہ کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئی ہے جس میں آریہ سماج سناتن دھرم، جینی اور سکھ سب شریک ہیں۔۔۔۔۔۔۔ آپ (پریم چند) یہ مانتے ہیں کہ ا ا ا رے میں ہندوؤں نے سبق مسلمانوں سے سیکھا لیکن اس پر بھی آپ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے ایک لفظ تک کہنے کو تیار نہیں ہیں۔۔۔۔۔ آپ خود تسلیم کرتے ہیں" جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں ہندوؤں کو آسائش و اطمینان میسر نہیں، اُنکی لڑکیاں، اُنکی بیوائیں ہمیشہ اسلامی دست بُرد کا شکار ہوتی رہتی ہیں" (زمانہ جون ۱۹۲۳ء)

میں حیران ہوں کہ لوگ کب تک آنکھوں میں دھول جھونکنے

کی کوشش کرتے رہیں گے؟ منشی پریم چند کے یہ الفاظ۔

"جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں ہندوؤں کو آشا کشی اور اطمینان میسر نہیں۔ اُن کی لڑکیاں اُن کی بیوائیں ہمیشہ "اسلامی" دست برد کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔"

کس ذہن کے غماز ہیں؟ انھیں باتوں کو ذہن میں رکھ کر منشی جی نے اپنی کہانیاں "دینداری" "الزام" اور "تالیف" ہندی میں لکھی تھیں یہ کہانیاں ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھیں۔

میں نے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے مضمون "منشی پریم چند اور فرقہ واریت" (عصری آگہی جولائی ۱۹۷۹ء) کے جواب میں بہت ڈرتے ڈرتے لکھا تھا کہ

"تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر دور میں ہندو فرقہ پرستوں کا ایک گروہ (جو ہمیشہ اقلیت میں رہا ہے) مختلف شکلوں میں اپنی پوری جارحانہ ذہنیت کے ساتھ ہندوستانی سماج اور سیاست [illegible] رہا ہے۔ منشی پریم چند [illegible] نے دور میں اُسی خاص گروہ کے ایک [illegible]" (فروغِ اردو نومبر ۱۹۸۰ء)

[illegible] برس پہلے کہہ چکے تھے کہ [illegible] پریم چند کے [illegible] میں مسلمانوں کے خلاف [illegible] طبقہ ایک پلیٹ فارم پر جمع تھا۔ پھر بھی مانک ٹالہ صاحب مجھے ہی "غازی دوراں" کا خطاب عطا فرماتے ہیں یہ اُن کی انصاف پسند طبیعت کو زیب نہیں دیتا مجھے تو "شر پسند فرقہ پرست" ہی رہنے دیجئے کہ یہ خطاب اِن خالص سوادیشی مارکہ سیکولر لوگوں کی طرف سے ملا ہے جنکی خود اپنی وطن پرستی بھی مشکوک ہے۔ اس لئے مجھے یہ اعزاز مسلم لیگوں کی ماں بہن کی گالیوں سے زیادہ عزیز ہے۔

مانک ٹالہ صاحب نے امتیاز علی تاج سے پریم چند کے پریم کی گہرائی ناپنے کی کوشش کی ہے۔ آگے چل کر "رام لکھن" (محمد علی اور شوکت علی) کا ذکر بھی فخریہ انداز میں کیا گیا ہے۔ جناب امرت رائے بھی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر اپنے اخبار "ہمدرد" میں پریم چند کی کوئی کہانی شائع کرتے تو انھیں معاوضہ کے طور پر ایک اشرفی مخمل کی ڈبیہ میں رکھ کر پیش کرتے تھے (قلم کا سپاہی، ص ۱۵۳) منشی دیانرائن نگم بھی تصدیق فرماتے ہیں "اردو میں مسٹر محمد علی اپنے اخبار "ہمدرد" کے لئے کئی افسانے تیس روپئے فی افسانہ کے حساب سے لکھائے تھے" (زمانہ پریم چند نمبر) لیکن "رام" کے لئے "قلم کے سپاہی" کے دل میں کتنی گنجائش تھی اس کا اندازہ منشی دیانرائن نگم کو ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لکھے گئے خط کے درج ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔

"ممکن ہے آپ کا "اودھ اخبار" میں پہونچنا میرے لئے کوئی بہتری کی صورت پیدا کرے کیا ضرورت کہ میں اپنے خونِ جگر (یا انگلیوں سے نکلنے والے قطرۂ خون) کو کسی غیر جگہ پھینکوں۔ اگر اپنے گھر میں قدر ہو تو کیوں دوسروں کا دست نگر ہوؤں۔ حالانکہ میں نے "ہمدرد" کو کوئی اچھا قصہ نہیں دیا تاہم اگر اِن (قصوں) کے لئے اور کوئی گنجائش ہوتی تو میں وہاں نہ دیتا۔" (پریم چند کے خطوط ص ۲۷)

اِس اقتباس سے پریم چند کی کیسی تصویر اُبھرتی ہے؟ ایک اشرفی اور تیس روپئے میں بھی "کوئی اچھا قصہ نہیں دیا۔" پھر بھی افسوس ہے کہ اگر ان کی اشاعت "اپنے یہاں" ہوتی تو اچھا ہوتا۔ یہی وہ جذبہ تھا جو انھیں اُردو سے ہندی کی طرف

لے گیا۔ اسی خط میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ منشی دیا نرائن نگم انھیں فی افسانہ شاید پانچ یا چھ روپے دیتے تھے اور اب آٹھ روپے دینا منظور کئے تھے۔

اس اقتباس کے بعد مانک ٹالہ صاحب کے یہ جملے لائق ملاحظہ ہیں جو انھوں نے منشی جی کے امتیاز علی تاج سے دوستانہ خط و کتابت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کئے ہیں۔

"آپ مندرجہ بالا خط کو درخورِ اعتنا نہ سمجھئے اسے بس یہی سمجھئے کہ منشی پریم چند کی کاروباری مصلحتیں تھیں کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ہندو مسلمان کے مقابلے میں زیادہ مصلحت کوش ہوتا ہے"۔

یقیناً یہ مصلحت کوشیاں تھیں جن کی وجہ سے علی برادران و رام احمد لکھن بنے تھے۔ ایک اشرفی یا تیس روپے میں یہ اعزاز بہت ہی سستا تھا۔ اس اقتباس کے آخری جملہ کا تو جواب نہیں۔ اللہ ایسی مصلحت کوشیوں سے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو محفوظ رکھے اور خلوص و محبت کا دامن ہر حال میں تھامے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ●

سلسلہ مضمون صفحہ ۱۲ (پریم چند کے نام دو خط)

تحریک تھی وہ ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء والی تحریک نہیں تھی۔ اگر اس وقت پریم چند زندہ ہوتے تو اُن کی بھی وہی گت بنائی جاتی جو خواجہ احمد عباس صاحب اور اُن کے ہم خیال ادیبوں کی بنائی گئی تھی۔ اور اگر خود خروشچوف نے ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ ستالن کے عہد کا خاتمہ نہ چھوڑا ہوتا تو شائد میرے جیسے بہت سے سادہ لوح اب تک اس تحریک کے ساتھ ہوتے۔

اور اگر ترقی پسندوں نے اپنی مطلب برآری کے لئے پریم چند کے نام کو اُچھالا اور اس سے کچھ فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے تو اس میں پریم چند کا کیا قصور؟ ● ●

ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ اودھ مکمل دو جلد	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	[illegible]/-
اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	5/-
تنقیدی نظریات۔ حصہ اوّل	سید احتشام حسین	5/-
" " حصہ دوم	"	5/-
تنقید و عملی تنقید	"	7/-
ذوق ادب و شعور	"	8/-
روایت و بغاوت	"	3/-
تنقیدی جائزے	"	9/-
عکس اور آئینے	"	9/-
سید احتشام حسین نمبر	"	30/-
انتخاب جدید نثر اُردو	"	5/-
ساحل گہرو	"	5/-
نقش حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر مجلد - /15 غیر مجلد		8/-
اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	8/-
سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	6/-
فروغ اُردو جگر نمبر		10/-
فروغ اُردو پریم چند نمبر		15/-
چکبست نمبر		12/-
امیر خسرو نمبر		15/-
عبد الماجد دریابادی نمبر		15/-
محسن کاکوروی نمبر		3/50
نول کشور نمبر		4/-
فرحت کاکوروی نمبر		6/-
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء		8/-

چودھری غیاث الدین اشرف :

ضلع بارہ بنکی ماضی اور حال کے آئینہ میں

یہ مقالہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے تلخیص کر کے نشر کیا گیا تھا مگر قارئین اختصار سے تشنگی محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے ایڈیٹر ماہنامہ فروغ اُردو نے باذوق علم و ادب کے ذوق کی تسکین کی خاطر اس کو مکمل طور پر شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ تاکہ قارئین کو ضلع بارہ بنکی کے مکمل جغرافیہ کا علم ہو جائے (ایڈیٹر)

کہا جاتا ہے کہ شاہان اودھ کے زمانہ میں آس پاس کے
ضلاع سے کچھ علاقہ نکال کر ضلع دریاباد بنا دیا گیا۔ سرکار
انگریزی نے مزید علاقہ شامل کر کے ضلع کا ہیڈ کوارٹر موضع
... کی آراضی پر افسران کی کوٹھیاں بنا کر بڑا بنکی نام رکھا
بارہ بنکی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دریاباد کے متعلق مشہور
ہے کہ پرانے زمانے کے دستور کے بموجب ایک بزرگ کو لا کر یہاں
... کیا گیا جن کا نام دریا خاں تھا۔ چنانچہ انہی کے نام پر دریاباد
... میں آباد ہوا۔ ان کے دوسرے بھائی فتح خاں کے نام پر فتحپور
... ساتھ ہی ساتھ قائم ہوا۔ ضلع کی تاریخ بہت مبہم ہے، لیکن
... اہمیت مسلم ہے (قصبہ دریاباد کو جناب عبدالماجد مرحوم) دریابادی سے بڑی شہرت حاصل ہوئی
... مولانا صاحب مرحوم کے رشتہ کے بھائی شفاء الملک حکیم
عبدالحسیب صاحب مرحوم مشہور اور حاذق طبیب تھے
... کے ایک داماد اور بھتیجہ جناب حکیم عبدالقوی صاحب
اور دوسرے محمد ہاشم قدوائی صاحب مشہور لوگ ہیں۔
ڈاکٹر رائے راجیشور بلی صاحب ہمارے صوبے کے اول

وزیر تعلیم تھے۔ یہ تعلقدار دریاباد تھے۔ اس خاندان کو انگریزوں
نے رائے صاحب کا موروثی خطاب ۱۸۵۸ء میں دیا۔ خاندان
میں نیک، شریف، خوش مذاق اور خوش اخلاق لوگوں کی
کمی نہیں ہے۔ بعض بڑے بڑے عہدوں پر اب بھی فائز ہیں
ڈاکٹر رائے راجیشور بلی صاحب بھات کھنڈے صاحب
کو دریاباد لائے۔ جو ملک کے مشہور گلوکار تھے اور پھر انھیں
کے ... پر لکھنؤ کا مشہور میوزک کالج بھات کھنڈے مہاودیالے
کے نام سے وجود میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے قومی تحریک آزادی
میں حکومت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد
نے بھی استعفیٰ دیدیا تھا جو ہوم ممبر تھے۔ مہاراجہ صاحب
جنگ آزادی میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا
آزاد اور مولانا محمد علی صاحبان کے شریک کار رہے۔ ان کا
بہت بڑا علاقہ اور قریبی رشتہ داری ضلع بارہ بنکی میں تھی اور
ہے۔ ہندوستان میں صرف دو مسلمان مہاراجہ بنائے گئے۔
اول محمود آباد سر محمد علی محمد خاں صاحب اور دوسرے سر شیخ
محمد اعجاز رسول خاں صاحب جہانگیر آباد۔

نے کیا۔ اسی خط میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ منشی دیا نرائن نگم انھیں فی افسانہ شاید پانچ یا چھ روپئے دیتے تھے اور اب آٹھ روپئے دینا منظور کئے تھے۔

اس اقتباس کے بعد مانک ٹالہ صاحب کے یہ جملے ایسے معلوم ہوتے ہیں جو انھوں نے منشی جی کے امتیاز علی تاج سے دوستانہ خط و کتابت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کئے ہیں۔

"آپ مندرجہ بالا خط کو در خور اعتنا نہ سمجھئے اسے بس یہی سمجھئے کہ منشی پریم چند کی کاروباری مصلحتیں تھیں۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ہندو مسلمان کے مقابلے میں زیادہ مصلحت کوش ہوتا ہے"۔

یقیناً یہی مصلحت کوشیاں تھیں جن کی وجہ سے علی برادران رام لکشمن بنے تھے۔ ایک اشرفی یا تیس روپئے میں یہ اعزاز بہت ہی سستا تھا۔ اس اقتباس کے آخری جملے کا تو جواب نہیں۔ اللہ ایسی مصلحت کوشیوں سے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو محفوظ رکھے اور خلوص و محبت کا دامن ہر حال میں تھامے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بسلسلہ مضمون صفحہ ۱۲ (پریم چند کے نام دو خط)

تحریک تھی وہ ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۳ء والی تحریک نہیں تھی۔ اگر اس وقت پریم چند زندہ ہوتے تو اُن کی بھی وہی گت بنائی جاتی جو خواجہ احمد عباس صاحب اور اُن کے ہم خیال ادیبوں کی بنائی گئی تھی۔ اور اگر خود خرشچوف نے ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ سٹالن کے عہد کا غبارہ نہ پھوڑا ہوتا تو شائد میرے جیسے بہت سے سادہ لوح اب تک اس تحریک کے ساتھ ہوتے۔

اور اگر ترقی پسندوں نے اپنی مطلب برآری کے لئے

پریم چند کے نام کو اُچھالا اور اس سے کچھ فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے تو اس میں پریم چند کا کیا قصور؟ ●●●

ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ ادب اردو مکمل دو جلد	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	75/-
اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	15/-
تنقیدی نظریات۔ حصہ اوّل	سید احتشام حسین	15/-
" " حصہ دوم	"	15/-
تنقید اور عملی تنقید	"	9/-
ذوق ادب و شعور	"	8/-
روایت و بغاوت	"	9/-
تنقیدی جائزے	"	9/-
عکس اور آئینے	"	9/-
سید احتشام حسین نمبر	"	30/-
انتخاب جدید نثر اُردو	"	5/-
سلک گہر	"	5/-
نقش حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر ۲ - /۱۵ نمبر ۱		8/-
اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	8/-
سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	6/-
فروغ اُردو جگر نمبر		10/-
فروغ اُردو پریم چند نمبر		15/-
چکبست نمبر		12/-
امیر خسرو نمبر		15/-
عبدالماجد دریابادی نمبر		15/-
محسن کاکوروی نمبر		3/50
نول کشور نمبر		4/-
فرحت کاکوروی نمبر		6/-
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء		8/-

ودھری غیاث الدین اشرف :

ضلع بارہ بنکی
ماضی اور حال کے آئینہ میں

یہ مقالہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے تلخیص کر کے نشر کیا گیا تھا مگر قارئین اختصار سے تشنگی محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے ایڈیٹر ماہنامہ فروغ اردو نے باذوق علم و ادب کے ذوق کی تسکین کی خاطر اس کو مکمل طور پر شائع کرنے کا ارادہ کیا تاکہ قارئین کو ضلع بارہ بنکی کے مکمل جغرافیہ کا علم ہو جائے۔ (ایڈیٹر)

کہا جاتا ہے کہ شاہان اودھ کے زمانہ میں آس پاس کے
لاع سے کچھ علاقہ نکال کر ضلع دریاباد بنا دیا گیا۔ سرکار
ریزی نے مزید علاقہ شامل کر کے ضلع کا ہیڈ کوارٹر موضع
ی کی آراضی پر افسران کی کوٹھیاں بنا کر بڑا بنکی نام رکھا
بارہ بنکی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دریاباد کے متعلق مشہور
کہ پرانے زمانے کے دستور کے بموجب ایک بزرگ کو لا کر یہاں
دکیا گیا جن کا نام دریا خاں تھا۔ چنانچہ انہی کے نام پر دریاباد
شاء میں آباد ہوا۔ ان کے دوسرے بھائی فتح خاں کے نام پر فتحپور
ساتھ ہی ساتھ قائم ہوا۔ ضلع کی تاریخ بہت مبہم ہے، لیکن
امت دا ہمیت مسلم ہے (قصبہ دریاباد کو جناب پدم شری مولانا
بدالماجد مرحوم) دریابادی سے بڑی شہرت حاصل ہوئی
لانا صاحب مرحوم کے رشتے کے بھائی شفاء الملک حکیم
بدالحبیب صاحب مرحوم مشہور اور حاذق طبیب تھے
ن کے ایک داماد اور بھتیجے جناب حکیم عبدالقوی صاحب
ر دوسرے محمد ہاشم قدوائی صاحب مشہور لوگ ہیں۔
کٹر رائے راجیشور بلی صاحب ہمارے صوبے کے اول

وزیر تعلیم تھے۔ یہ تعلقدار دریاباد تھے۔ اس خاندان کو انگریزوں نے رائے صاحب کا موروثی خطاب ۱۸۵۸ء میں دیا۔ خاندان میں نیک شریف، خوش مذاق اور خوش اخلاق لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ بعض بڑے بڑے عہدوں پر اب بھی فائز ہیں ڈاکٹر رائے راجیشور بلی صاحب بھارت کھنڈے صاحب کو دریاباد لائے۔ جو ملک کے مشہور گلوکار تھے اور پھر انھیں کے نام پر لکھنؤ کا مشہور میوزک کالج بھات کھنڈے مہاودیالیہ کے نام سے وجود میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے قومی تحریک آزادی میں حکومت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے بھی استعفیٰ دیدیا تھا جو ہوم ممبر تھے۔ مہاراجہ صاحب جنگ آزادی میں حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد اور مولانا محمد علی صاحبان کے شریک کار رہے ان کا بہت بڑا علاقہ اور قریبی رشتہ داری ضلع بارہ بنکی میں بھی اور ہے۔ ہندوستان میں صرف دو مسلمان مہاراجہ بنائے گئے۔ اول محمود آباد سر محمد علی محمد خاں صاحب اور دوسرے سر شیخ محمد اعجاز رسول خاں صاحب جہانگیر آباد۔

یہاں بہت مشہور اور قدیم و تاریخی مقامات بتائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کورو اور پانڈو کی لڑائی سے پہلے پانڈو نے یہاں بن باس کے دن گزارے۔ پانڈو کی والدہ کا نام مہارانی کنتی تھا۔ وہ جس جگہ آکر ٹھہریں وہاں اب ایک گاؤں کنتور آباد ہے۔ شاید اس کا نام پہلے کنتور رہا ہو۔ جہاں بڑے ذی علم اور صاحبان کمال لوگ پیدا ہوئے دیوی شریف کے مشہور عالم بزرگ حافظ سید وارث علی شاہ کے

[illegible] جب نیشاپور سے ہندوستان آئے تو کنتور کی بستی کے قریب سکونت اختیار فرمائی۔ مہارانی کنتی نے کنتور کے قریب گنیشور مہادیو کا مندر بنایا۔ چونکہ جنگ کا امکان ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس لئے مشہور پنڈتوں سے مشورہ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جوتشیوں نے بتایا کہ کنول کے سونے کے سو پھول یا پاری جات کا ایک پھول مندر میں جو چڑھائیگا اُس کو فتح حاصل ہوگی پانڈو کے پاس سونا کہاں تھا۔ البتہ ارجن اپنی روحانی طاقت سے ترلوک جاکر پاری جات کی ایک [illegible] لائے جس میں ایک پھول لگا ہوا تھا۔ وہ گنیشور مہادیو پر چڑھا دیا۔ شاخ کو زمین لگا دیا۔ جو لگ گئی۔ اور بڑھ کر اسقدر زبردست درخت تیار ہوگیا جس کی مثال ہندوستان میں نہیں ہے۔ لوگوں کا [illegible] کہنا ہے کہ دنیا میں نہیں ہے لیکن [illegible] کہتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ایک درخت افریقہ میں ہے۔ [illegible] زیارت کے لئے روزانہ سیکڑوں آدمی جاتے ہیں۔ اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ درخت کا تنا اسقدر موٹا ہے کہ لوگ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

ایک پیر بار [illegible] یہاں زد خلائق ہے کہ ایک لودھ کاشتکار جو بہت غریب اور زبوں حال تھا ایک دن اپنا ایک کھیت جوت رہا تھا دوران حل کشی شنکر جی کی ایک لاٹ برآمد ہوئی۔ اس نے منت مانی کہ اگر وہ خوشحال ہو جائے [illegible] بنا دے گا۔ بہت جلد [illegible] قابل ہوگیا جتنا کچھ مہادیو بنوا لیا جس کا نام لودھیشور رکھا۔ یہ اس نے تعمیر کرایا۔ یہ بھی پانچ ہزار سال سے قدیم بتایا جاتا ہے۔ لودھیشور نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ لودھ کا بنوایا ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ اس نے شنکر جی کو خواب میں دیکھا اور یہ کہتے ہوئے سُنا کہ لاٹ ہٹ نہیں سکتی ہے مہادیوا میں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ ایک میلہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ زائرین دُور دراز کے فاصلے سے گنگا جل لاکر شنکر جی کی لاٹ پر چڑھاتے ہیں۔

نواب شجاع الدولہ نے موضع پیپار کی دو سو بیگہ آراضی پر نواب گنج کا گاؤں آباد کیا۔ چونکہ کچھ آراضی موضع فیض آباد کی بھی تھی اُن کا دارالحکومت اجودھیا تھا اور وہ چھ ماہ بعد کسی نہ کسی راجہ یا نواب پر حملہ کیا کرتے تھے اور لکھنؤ پہونچنے سے پہلے یا لکھنؤ سے نکل کر ایک منزل کا سفر مکمل کر کے قیام نواب گنج میں ہوتا تھا۔ اس لئے اپنے لئے کچھ عمارتیں بھی بنوالیں۔ کیونکہ خیمہ میں رہنے سے گرمی سردی اور بارش میں تکلیف ہوتی تھی۔ دو عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ [illegible] نواب گنج کی آراضی بنردی قرار دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ جو چاہے یہاں اپنا مکان بنالے نواب گنج کے قیام پر پرگنہ نواب گنج تحصیل نواب گنج اور نواب گنج میونسپلٹی نام رکھے گئے۔ بارہ بنکی جب ضلع بنایا گیا تو پرانے لوگ اسے نواب گنج ضلع بارہ بنکی کہتے تھے ۱۸۷۲ء میں یہ گاؤں کافی بڑا ہوگیا تھا اور اس کی آبادی 10606 تھی۔ اب موضع فیض اللہ گنج کی آراضی شامل کر کے اسکا رقبہ 67 ا۔ ایکڑ ہوگیا تھا۔

ضلع بارہ بنکی کے قصبات بہت قدیم ہیں۔ اکثر قصبات مثلاً زید پور جسے ۱۳۳۲ء میں سید عبدالواجد نے آباد کیا بسہر کھو۔ دیوی فتحپور۔ ردولی وغیرہ کی تاریخیں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ جہانگیر بادشاہ نے لکھا ہے کہ قصبات اودھ میرے ملک کا شیرازہ ہے۔ مطلب یہ ان قصبات میں بڑی بڑی تاریخی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں۔ بالخصوص علماء اور اولیاء جن سے پورے ہندوستان نے فائدہ اُٹھایا

یہاں بہت مشہور اور قدیم و تاریخی مقامات بتائے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کورو اور پانڈو کی لڑائی سے پہلے پانڈو نے یہاں بن باس کے دن گذارے۔ پانڈو کی والدہ کا نام مہارانی کنتی تھا۔ وہ جس جگہ آکر ٹھہریں وہاں اب ایک گاؤں کنتور آباد ہے۔ شاید اس کا نام پہلے کنتور ہو۔ جہاں بڑے ذی علم اور صاحبان کمال لوگ پیدا ہوئے دیوہ شریف کے مشہور عالم بزرگ حافظ سید وارث علی شاہ کے [illegible] جب نیشاپور سے ہندوستان آئے تو کنتور کی بستی کے قریب سکونت اختیار فرمائی۔ مہارانی کنتی نے کنتور کے قریب گنیشور [illegible] کا مندر بنایا۔ چونکہ جنگ کا امکان ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس لئے مشہور پنڈتوں سے مشورہ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جوتشیوں نے بتایا کہ کنول کے سونے کے سو پھول یا پاری جات کا ایک پھول مندر میں جو چڑھائیگا اُس کو فتح حاصل ہوگی پانڈو کے پاس سونا کہاں تھا البتہ ارجن اپنی روحانی طاقت سے ترلوک جاکر پاری جات کی ایک شاخ لائے جس میں ایک پھول لگا ہوا تھا۔ وہ گنیشور مہادیو پر چڑھایا شاخ کو زمین لگا دیا۔ جو لگ گئی۔ اور بڑھ کر اسقدر زبردست درخت تیار ہو گیا جس کی مثال ہندوستان میں نہیں ہے۔ لوگوں کا [illegible] کہنا ہے کہ دنیا میں نہیں ہے لیکن [illegible] 80 [illegible] شاید ایسا ہی ایک درخت افریقہ میں ہے [illegible] زیارت کے لئے روزانہ سیکڑوں آدمی جاتے ہیں۔ اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ درخت کا تنا اسقدر موٹا ہے کہ لوگ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

ایک بار [illegible] زد خلائق ہے کہ ایک لودھ کا شتکار جو بہت غریب اور زبوں حال تھا ایک دن اپنا ایک کھیت جوت رہا تھا دوران حل کشی شنکر جی کی ایک لاٹ برآمد ہوئی۔ اس نے منت مانی کہ اگر وہ خوشحال ہو جائیگا [illegible] سے گا۔ بہت جلد وہ [illegible] قابل ہو گیا چنانچہ مہادیو جس کا نام لودھیشور بھی ہے اس نے تعمیر کرایا۔ یہ بھی پانچ ہزار سال سے قدیم بتایا جاتا ہے۔ لودھیشور نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ لودھ کا بنوایا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے شنکر جی کو خواب میں دیکھا اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ لاٹ ہٹ نہیں سکتی ہے مہادیو میں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ ایک میلہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ زائرین دور دراز کے فاصلے سے گنگا جل لاکر شنکر جی کی لاٹ پر چڑھاتے ہیں۔

نواب شجاع الدولہ نے موضع بیہار کی دس سو بیگہ اراضی پر نواب گنج کا گاؤں آباد کیا۔ چونکہ کچھ اراضی موضع فیض آباد کی بھی تھی اُن کا دارالحکومت اجودھیا تھا اور وہ چھ ماہ بعد کسی نہ کسی راجہ یا نواب پر حملہ کیا کرتے تھے اور لکھنؤ پہونچنے سے پہلے یا لکھنؤ سے نکل کر ایک منزل کا سفر مکمل کر کے قیام نواب گنج میں ہوتا تھا۔ اس لئے اپنے لئے کچھ عمارتیں بھی بنوالیں۔ کیونکہ خیمہ میں رہنے سے گرمی سردی اور بارش میں تکلیف ہوتی تھی۔ دو عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ موضع نواب گنج کی اراضی بنر دی قرار دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ جو چاہے یہاں اپنا مکان بنالے نواب گنج کے خیال پر ہر گنہ نواب گنج تحصیل نواب گنج اور نواب گنج میونسپلٹی نام رکھے گئے۔ بارہ بنکی جب ضلع بنایا گیا تو پرانے لوگ اسے نواب گنج ضلع بارہ بنکی کہتے تھے [illegible] میں یہ گاؤں کافی بڑا ہو گیا تھا اور اس کی آبادی 10606 تھی۔ اب موضع فیض الہ گنج کی اراضی شامل کر کے اسکا رقبہ 67 ا۔ ایکڑ ہو گیا تھا۔

ضلع بارہ بنکی کے قصبات بہت قدیم ہیں اکثر قصبات مثلاً زید پور جسے [illegible] میں سید عبدالوحد نے آباد کیا [illegible] دیوا فتحپور۔ ردولی وغیرہ کی تاریخیں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ جہانگیر بادشاہ نے لکھا ہے کہ قصبات اودھ میرے ملک کا شیراز ہیں۔ مطلب یہ ان قصبات میں بڑی بڑی تاریخی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں۔ بالخصوص علماء اور ادلیا جن سے پورے ہندوستان نے فائدہ اُٹھایا اور

جنکی شہرت سارے ملک میں پھیلی رہی۔

ضلع میں بہت سے ٹیلے جگہ جگہ موجود ہیں اگر کھدائی اور تحقیقات کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ زمانہ قدیم کی مختلف اشیاء برآمد ہوں جن سے اس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا حال معلوم ہو سکے اس ضلع کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بمقابلہ تمام اضلاع اودھ کے یہاں پر تعلقداروں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۱۸ تھی۔ دوسرے یہ کہ اس ضلع میں 43 مسلمان تعلقدار تھے جن کا قبضہ ضلع کے 139 مسلم مواضعات و محال اور 612 گاؤں میں اُن کے متفرق قطعات اراضی یا حصہ تھا۔ بارہ بنکی میں جتنے قلعے بنے ہوئے تھے کسی اور ضلع میں نہیں تھے۔ بچے کھیل میں قلعہ بناتے پھر اس پر چڑھائی کرتے اور اسے مسمار کرتے۔

بارہ بنکی ضلع کے باشندے بہادری اور دلاوری میں بھی نمایاں تھے۔ ضلع بارہ بنکی کے بہت بڑے تعلقدار راجہ رام نگر تھے۔ ان کے وارث راجہ رام چندر تھے۔ یہ لوگ سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ ہوگئے ہندوستان آئے قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ان کے بزرگ امیر و وزیر رہے۔ رام سنگھ نے ریاست رام نگر دھمیڑی کی بنیاد رکھی۔ نواب صفدر جنگ وزیر تھے۔ دہلی میں قیام تھا۔ ان کے نائب راجہ نول رائے خیرآباد کے بنگش نے پٹھانوں کو شکست دیکر مار ڈالا خود نواب وزیر کے پچاس ہزار لشکر کو شکست دی ان حالات کے پیش نظر راجپوت راجاؤں نے ادھر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا روانہ ہوئے مگر گھاگرا ندی کے قریب راجہ محمود آباد راجہ بلہرہ اور شیخ زادگان نے انوپ سنگھ راجہ رام نگر کے لشکر سے ۱۷۵۸ء میں مقابلہ کیا جو لکھنؤ پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور جس میں بلرام پور اور گونڈہ والے بھی شامل تھے۔ انوپ سنگھ مارے گئے اور لشکر کو شکست ہوئی لیکن ۱۷۷۴ء میں آصف الدولہ کے لشکر کے ساتھ بھر... سنگھ راجہ رام نگر نے روہیلوں کو شکست دی اور ایک بڑا علاقہ اپنے قبضہ میں شامل کیا۔ ہر دو لوگ ... علاقہ بادشاہ اکبر نے دیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ آزاد رہے اور ... دہلی کی برتری تسلیم کرتے۔ ۱۸۵۷ء تک اس ضلع کی تعلقداروں نے انگریزوں سے تعاون نہیں کیا۔ البتہ ... کی کوشش سے یہ اختلاف ختم ہوا۔ اور بھٹوامئو کے راجہ ... خاں نے جن کے شانہ پر گولی کا زخم موجود تھا مخالفت ترک کی۔

جنرل سر ہوپ گرانٹ محمود آباد کے قریب موضع باری پہنچ گئے جہاں لکھنؤ میں شکست کے بعد فیض آباد کے مولوی کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ دراصل ضلع ہردوئی کے موضع گوپامئو کا ایک خاندانی ارکاٹ کا نواب تھا۔ یہ مولوی احمد اللہ شاہ تھے۔ نواب ارکاٹ عالیجاہ نواب محمد علی کے بڑے دلیر بیٹے اور انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ فیض آباد کا قید خانہ توڑ کر شورش کی۔ چنہٹ کی لڑائی میں انگریزوں کو شکست دیکر ریزیڈنسی کا محاصرہ کیا۔ جنرل مذکور بلہرہ ہوتے ہوئے نواب گنج جون ۱۸۵۸ء میں پہونچے جہاں مجاہدین آزادی کی فوج نے نواب گنج پر قبضہ کر لیا تھا۔ رات کے وقت انگریزی فوج بارہ میل چل کر زبردست توپ خانہ کے ساتھ اس مقام پر پہونچ گئی جہاں مجاہدین آزادی جمع تھے۔ انگریزی توپخانہ نے ہندوستانی توپوں کو خاموش کر دیا۔ ہندوستانی فوج کو انگریزی فوج کے اچانک پہونچنے کا پہلے نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے وہ منظم ہو کر جنگ نہیں کر سکی۔ ہندوستانی فوج چار حصوں میں تقسیم ہو گئی اور ہر حصہ کا علیحدہ ایک کمانڈر ہو گیا۔ بڑی بیباکی سے ہندوستانی سپاہ کی دو توپیں انگریزی سپاہ کے پیچھے نکال لیگئی اور مقابلہ بہت بہادری سے شروع کیا۔ انگریزی جنرل کہتا ہے کہ ہندوستان میں بہت لڑائیاں وہ ایسی فوج سے لڑ چکا تھا جو

یہ ارادہ کئے ہوئے تھیں کہ یا فتح حاصل کریں گی۔ اور یا جان دیدینگی۔ لیکن ایسی MAGNIFICENT یعنی شاندار و عظیم الشان بارونق و باشکوہ معرکہ آرائی اس سے پہلے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ قریب چھ سو ہندوستانی مارے گئے لڑائی تین گھنٹے جاری رہی۔ ہندوستانیوں نے رات نواب گنج میں گذاری۔ دوسرے دن پھر کچھ لوگ مارے گئے۔ اور نواب گنج سے انہیں نکلنا پڑا۔ رام نگر کے خاندان کے راجہ بھٹوتی گور بخش سنگھ آخر وقت تک انگریزوں سے برسرپیکار رہے۔ تاآنکہ ان کا علاقہ ضبط کرکے راجہ راجگان مہاراجہ کپورتھلہ کو دیدیا گیا۔ جو انگریزوں کے بڑے مددگار تھے۔ تعلقدار للونی لالہ پرشاد بھی انگریزوں کی پوری مخالفت کرتے رہے ۱۸۵۸ء میں وہ انگریزوں کے تابع ہوئے۔ ہمارا ملک ہمیشہ سے اسقدر کشادہ دل رہا ہے کہ ہر اجنبی کے لئے اپنے آغوش وا کئے اس کے فن و غیر ملکی دستور و طریقوں تک کو بھی اپنا لیا۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ بمقابلہ دیگر اضلاع کے مسلمان اس ضلع میں بہت سے پہلے ۱۰۲۰ء میں آئے مسلمانوں کی مستقل پہلی آبادی ۱۰۳۰ء میں ستر کھ سے شروع ہوئی۔ یہ لوگ سلطان محمود کے بھانجہ سید سالار مسعود کے ساتھ یہاں پہونچے تھے۔ اس ضلع اور اضلاع کے جو اس کے پورب میں آباد ہیں نمایاں خاندانوں کا کہنا ہے۔ کہ وہ سلطان محمود کے زمانہ میں آئے۔ سید سالار مسعود نے اپنا صدر مقام ستر کھ کو بنایا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سید سالار مسعود کے والد سالار ساہو کڑہ اور مانک پور ہوتے ہوئے یہاں آکر ٹھہرے جنکی درگاہ اب بھی موجود ہے یہیں سے بہرائچ۔ مہونا۔ گوپامئو اور بنارس وغیرہ کی جانب مسلمان پہونچے ستر کھ کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا نام ست رشی تھا۔ یہ علم و ادب کا بہت بڑا گہوارہ تھا یہاں سات رشی اسقدر ذی علم تھے کہ راجہ رامچندر جی ان سے پڑھنے آئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ستر کھ ایک بہت بڑا شہر تھا اور دستکاری کا بڑا مرکز۔ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ بستی راجہ "ستر ک" نے بسائی اور اپنے نام پر اس کا نام رکھا تھا۔ ستر کھ کے شیوخ کے مورث مولانا شیخ صلاح الدین سید سالار ساہو کے ساتھ آئے یہاں قیام فرمایا۔ ان کے پوتے محمد عارف کو شاہان دہلی نے قاضی کا عہدہ دیا۔ قاضی سرفراز اللہ کو علاقہ کی سند ملی۔ دوسرے پوتے رضا علاء الدین نے علاقہ کر کیا جو پپیار کہلایا کی پپیار رکھی جس کی سند انکی اولاد کو ملی۔ ستر کھ کی اہمیت اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ عہد شاہان جونپور جن کی حکومت بہار مظفر پور دربھنگہ سے لیکر قنوج تک تھی۔ جن سترہ علما کا نام حیات شبلی میں علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے ان میں تین بزرگ ستر کھ کے تھے۔

ضلع بارہ بنکی کے شیوخ کا سب سے بڑا اور نمایاں خاندان قدوائیوں کا ہے۔ ان کے مورث قاضی قدوۃ الدین عرف قاضی قدوہ کو اودھ میں جاگیر ملی۔ یہ سلطان روم یا ترکی کے بیٹے بتائے جاتے ہیں یہ سلطان شہاب الدین محمد بن سام کے عہد میں آئے۔ اور موضع جگور ضلع لکھنؤ میں آباد ہوئے جگور بارہ بنکی کی سرحد سے ملا ہوا ہے۔ پرانا نام جگدیو پور تھا۔ یہاں کے راجہ کو شکست دی۔ اس خاندان نے باون گاؤں پر قبضہ کیا جو قدوارہ کہلاتا ہے۔ قاضی صاحب نے اجودھیا میں انتقال فرمایا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔ فیض آباد کے نامور ایڈوکیٹ حمایت علی صاحب قدوائی نے مجھے بتایا کہ قاضی صاحب خواب میں دکھائی دیئے اور فرمایا کہ مجھے ہٹاؤ زمین گھاگرہ کاٹ رہا ہے۔ مزار منورہ کھودا گیا تو کفن اسقدر صاف و شفاف نکلا کہ جیسے کہ ابھی پہنایا گیا ہو۔ لوگوں کو حیرت ہوگئی۔ بقول آتش۔

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

انہیں خاندان میں ممتاز شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں جو شاہی زمانہ میں

بڑے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ قاضی شوال دہلی کے قاضی تھے
قاضی عبدالمالک اور قاضی محمد حامد منصب دار تھے۔ اورنگ زیب
کے زمانہ میں محمد قاسم دکن کی ایک فوج سپہ سالار تھے۔ منشی محمد حسین
وزیر علی نقی خاں کے نائب تھے۔ خاندان میں کئی علاقہ رہے جن میں
ممتاز ترین جہانگیر کے نام مرآباد کیا گیا تھا تعلقہ میلا رائے گنج۔
ممتاز ترین جہانگیر آباد جو شہنشاہ جہانگیر کے نام مرآباد کیا گیا تھا تعلقہ میلا
رائے گنج، گدیہ اور جسٹر یاد غیرہ ہمیشہ کیطرح اب بھی افراد خاندان متواتر
منیر حسین قدوائی کو مرآغا خاں جو اُن کے بڑے دوست تھے۔
راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (Round Table Conference)
میں دلائے لے گئے۔ جنگ بلقان میں بڑی خدمات انجام دیں۔ ان کے
نام فرانس نے تمغہ "نی گلاب" بنایا دوسرے بھائی شیخ مقبول بن
قدوائی اس زمانہ میں کمشنر تھے جبکہ علاوہ کنور رمہاراج سنگھ
دوسرا ہندوستانی کمشنر نہیں تھا۔ اُن کے بیٹے اقبال مشہیر
قدوائی I.C.S. تھے۔ اور نواسے محمد نذیر احمد قدوائی بھی I.C.S.
آسام کے چیف سکریٹری اور Presiden TSRULE میں گورنر
کے Advisor رہے بشیر حسین کے بیٹے جسٹس مبشر حسین قدوائی
ہائی کورٹ کے نوجوان ترین جج اور اسقدر ذہین تھے کہ بڑے
وکلاء کا قول تھا کہ انکی عدالت پر وکیل کی اسوجہ سے ضرورت
نہیں کہ وہ فوراً معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ بہت جلد
مقدمات کی سماعت اور فیصلہ کرلیتے تھے اس معاملہ میں بھی لوگ
انھیں بے مثال بتاتے تھے۔

حکور کے احمد علی شوق قدوائی کو آخرکار پورے ملک نے
استاد تسلیم کرلیا۔ انھوں نے زبان بیگمات لکھنؤ کی ڈیوڑھیوں
پر بیٹھ کر سیکھی۔ اگر زبان کے کسی معاملہ میں اختلاف ہوتا تو سارا
ملک اُن کے فیصلہ کو مان لیتا۔ ولادت ۱۸۵۲ء میں ہوئی آخر تک
تعلقہ ستر کہہ میں گزرا بیگموں کو بہت سا بارے اُردو مولوی عبدالحق

صاحب نے لکھا کہ وہ سحرالبیان شاعر وشاعر او ر تسلیم التیوت استاد
تھے زبان پر کمال علم حاصل تھا شوق صاحب نے اپنی عمر کے آخری
سال ستر کہہ میں گذارے۔ انتقال ۱۷ اپریل ۱۹۲۴ء کو ہوا اور
وہیں مدفون ہوئے ملک کے نامور ادیب اور شاعر انکی خدمت
میں حاضری دیا کرتے تھے۔ اُن کے زمانہ میں قاضی وجیہ الدین صاحب
المخلص بوحید بھی التقید حیات اور اچھے شاعر تھے۔ اکثر نشستیں
ہوتیں۔ تعلقہ ستر کہہ میلہ کے زمانہ میں ایک مشاعرہ بھی کرتے۔
جس میں بارہ بنکی اور لکھنؤ کے شاعر شریک ہوتے سب کی ضیافت
ہوتی پر تکلف کھانے اور ملائی کی برفی کھلائی جاتی۔ شروع شروع
میں جب سنیما ٹاکی بنا تو مشہور فلم یہودی کی لڑکی میں ان کی
غزل گائی گئی تھی مطلع اور ایک شعر ملاحظہ ہو

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
بُت کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا

جب اتنی بیوفائی پر دل اُسکو پیار کرتا ہے
تو وہ کافر ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

کہا جاتا ہے کہ محاورہ نظم کرنے کے فن میں ان کا جواب پیدا نہیں
ہوا بطور نمونہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ابرو ہے کعبہ آج سے یہ نام رکھ دیا
ہمنے اٹھا کے طاق پہ اسلام رکھ دیا

نشے سے جاگرا جو میں مسجد میں سر کے بل
زاہد نے مجھ پہ سجدہ کا الزام رکھ دیا

قدوائیوں میں ایک بڑی ہر دلعزیز منکسر المزاج جوان چند سیاسی
رہنماؤں میں تھے جن پر پنڈت جواہر لال نہرو کو انتہائی بھروسہ
تھا بڑی صفات اور خوبیوں سے پر رفیع احمد قدوائی کی شخصیت
گذری ہے۔ ملک کے کونہ کونہ میں انکی یادگاریں وجود میں آچکی
انکی یاد میں جلسے کئے جاتے ہیں۔ اسلئے زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں

فکر تونسوی

میں نے تقریر کی!

جنابِ صدر! آپ معزز ہیں مگر اب معزز ترین لگ رہے ہیں
کیونکہ آپ کرسیِ صدارت پر تشریف رکھتے ہیں۔ ثابت ہو گیا ہے کہ کرسی
کسی نادار و ذلیل نہیں رہنے دیتی۔

اور سامعینِ کرام! آپ اردو کی اس محفل میں شریک ہوئے
ظاہر ہے کہ اہلِ ذوق انسان ہیں۔ اگرچہ اردو کو آج کل نہ ذوق کی ضرورت
ہے نہ اہلیت کی۔ اور اگر ہم اسی طرح مزید چند برس ان مرجع بلند لوگوں
میں بیٹھ کے سیمینار کرتے رہے تو انشاءاللہ اردو کی ضرورت نہیں رہے گی۔
کچھ دنوں سے ایک نئی چیز پیدا ہو رہی ہے جسے "اردو کا کرب"
کہا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سامعین حضرات! آپ کرب زدہ لوگ
ہیں۔ اور اردو زبان اگر آج زندہ ہے تو شاید اسی کرب کے طفیل۔
آئندہ بھی کرب زدہ لوگ ہی اہلِ ذوق کہلائیں گے۔ اور ایسی محفلوں
میں شرکت کیا کریں گے۔ باقی حضرات اس محفل کے دعوت نامے کو
بس ٹکٹ سمجھیں گے جو بس سے اترتے ہی فرش پر پھینک دیا جاتا ہے۔

بہرحال میرے اہلِ ذوق سامعین!
ماضی آپ کے ساتھ تھا۔ آپ حال کے ساتھ ہیں۔ اور مستقبل ان
دونوں کے ساتھ نہیں ہے۔ ہر شخص کہتا ہے کہ اردو ایک بلند پایہ زبان
ہے۔ چونکہ کسی نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا اس لیے ہم سب اسے
آپ کو بلند پایہ ادیب سمجھنے لگے۔ دو تین برس پہلے میں نے ایک جیوتشی کو اپنے
ہاتھ کی لکیریں دکھا کر پوچھا۔ "جناب میرا مستقبل کیا ہے؟"

وہ بولا "آپ کی موت بلند پایہ مقام سے گر کر ہوگی۔"

جب اس نے موت کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ آج کل جب بھی کوئی
جنازہ گزرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو راہ گیروں سے ہمیشہ یہ فقرہ سنتا ہوں۔
"لیجیے ایک اور اردو والا مر گیا۔"

میرا خیال ہے جیوتشی نے میرا ہاتھ دیکھا تھا، مستقبل اردو کا
بتا دیا تھا کہ اس کی موت بلند مقام سے گر کر ہوگی ——— ویسے حضرات!
میں نے ہر بلندی سے پرہیز کرنا شروع کر دیا ہے۔ بلند عمارت سے
بلند عہدے سے بلند بانگ دعووں سے۔ حتیٰ کہ بلند خیالی سے بھی،
اردو تہذیب کی ہی دین ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا اور ویسے
بھی دنیا میں کون ہے جو مرنا چاہتا ہے۔ لوگ موت سے بچنے کے لیے تہذیب
تک کو مار دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک سیاسی لیڈر کی تقریر سن
رہا تھا۔ وہ بڑی شد و مد سے میز پر زور سے مکا مار کر کہہ رہے تھے "میں
دعویٰ کرتا ہوں کہ اردو زبان کبھی نہیں مٹ سکتی۔"

میں نے کھڑے ہو کر کہا: "کیسے نہیں مٹ سکتی؟ یونان و
مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے۔"

اس نے جواب دیا ۔ "ناممکن! کیونکہ اردو نے ہمیں "انقلاب زندہ باد" کا لافانی لفظ عطا کیا ہے"۔

میں نے کہا ۔ "انقلاب پہلے مر گیا۔ اب اردو کی باری ہے"۔

وہ بولا ۔ "مگر یہ ناممکن ہے! اگر اردو مر گئی تو میں اس سے پہلے جان دے دوں گا"۔

چنانچہ اس تقریر کی بدولت وہ الیکشن جیت گیا۔ ہمارے ملک میں صرف تقریروں کی بدولت ہی ایسی ٹریجڈیاں ہوتی ہیں اور ٹریجڈی نمبر دو یہ ہوئی کہ وہ چیف منسٹر بھی بن گیا۔ ایک دن میں نے اسے گدی پر بیٹھے ہوئے پالیا اور پوچھا:

جناب آپ کب تک اپنی جان دے رہے ہیں۔

بولے ۔ "آپ نے سنا نہیں"۔

"نہیں ۔ آپ کی تقریر سنی تھی اس کے بعد کچھ نہیں سنا"۔

کہنے لگے "اس کے بعد میں نے انکوائری کمیشن بٹھا دیا ہے"۔

"کمیشن نہیں ۔ میں جان دینے کی بات کہہ رہا ہوں"۔

بولے "وہ کمیشن کی رپورٹ پر منحصر ہے"۔

حضرات! پہلے یہ ہوتا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لئے لوگ تہذیب کو مار دیتے تھے اب انکوائری کمیشن بٹھا دیتے ہیں۔ مارنا قائم ہے۔ مارنے کی ٹکنیک بدل گئی ہے۔ میں گزشتہ ۳۰ برس سے دیکھ رہا ہوں۔ انکوائری کمیشن بھی بدل جاتے ہیں ٹکنیک نہیں بدلتی ہے ایک مرتبہ تو یوں بھی ہوا کہ ٹکنیک وہی رہی مگر انکوائری کمیشن کا چیرمین انتقال کر گیا۔ انتقال سے دو منٹ قبل میں نے اس سے پوچھا۔

"جان دینے کا وعدہ چیف منسٹر نے کیا تھا آپ کیوں جان دے رہے ہیں؟"

وہ بولا "میں آخر کب تک انتظار کرتا۔ دو سال میں انکوائری کمیشن کی ایک بھی میٹنگ نہیں ہوئی۔ اور ادھر مجھے خدا کو منھ دکھانا ہے"۔

میں نے ہنس کر کہا ۔۔۔ "ضرور دکھایئے مگر جاتے جاتے اردو کے لئے کوئی پیغام دے جایئے"۔

وہ کہنے لگے "اردو سے کہہ دیجئے گا کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سامعین کرام! آپ مجھ پر الزام لگائیں گے کہ میرے لہجے اور سوچ میں قنوطیت آرہی ہے میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ زبان کو نہ کوئی منسٹر مار سکتا ہے۔ نہ انکوائری کمیشن۔ زبان اگر ایک تہذیب ہے تو ۔ ت کوئی بھی اپنی جان بچانے کے لئے نہیں مار سکتا۔ بلکہ میں تو اس مصرعہ کا بھی قائل ہو گیا ہوں کہ ؎

ہر ایک تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

لہٰذا میں بڑے حوصلے اور پامردی سے اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں اردو کی بقا کا جو سامان ہو رہا ہے تو حضرات کا جو قافلہ خنجر ہاتھ میں لئے چل پڑا ہے وہ اس سے خودکشی ہرگز نہیں ۔ اسی لئے نہیں کر سکے گا کہ آج کل خنجر بھی تو نقلی بن رہے ہیں ویسے چند برس پہلے میں نے دیکھا کہ ایک صوبے کی اردو اکاڈمی نے ایک مشاعرہ کے بعد کلام پر ثقافتی انعام مرحمت فرمایا تو دہلی کے کافی ہاؤس میں ایک ادیب نے دوسرے ادیب کی ہتھیلی پر شیشے کا گلاس اٹھا کر رگڑ دیا۔ اس شدت سے کہ ہتھیلی لہولہان ہو گئی۔

لہولہان کا سبب یہ تھا کہ ایک ادیب کہہ رہا تھا ۔۔۔

"اس مشاعرہ کی تمام غزلیں وزن سے خارج ہیں"۔

اور دوسرا کہہ رہا تھا "شٹ اپ! میں تقطیع کر کے ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ وزن میں ہیں"۔

دونوں میں شدید اختلاف رائے تھا۔ اگرچہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ جو گالیاں وہ ایک دوسرے کو دے رہے تھے وزن میں ہیں"۔

میں ان دونوں میں مداخلت کرنا چاہتا تھا مگر کافی ہاؤس میں

کے مجاہد! شعر اصرف تمھاری گالیاں وزن میں ہیں۔ بلکہ اس شاعرہ
کا حسن وجمال بھی تقطیع پر پورا اترتا ہے۔ لیکن یہ میری دخل در معقولات
ہوئی ورنہ معقولات تو یہ تھی کہ مجھے خود بھی ایک اُردو اکاڈمی نے انعام
واکرام سے نوازا تھا اس لئے یہ کہنا آسان نہیں کہ اکیڈمیاں وزن
[illegible] ہیں اور اپنے خنجر سے آپ خودکشی کر رہی ہیں۔ کیونکہ کچھ
[illegible] ہوتی ہیں۔

حضرات! قنوطیت کے الزام پر بھی آپ سے اختلاف
[illegible] میں تو اس بات سے بھی اختلاف نہیں کرتا کہ اُردو کے
[illegible] یہ زیادہ کہا جانے لگا ہے کہ ؎

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر
[illegible] زدہ ہیں تو کچھ بیچارے بھی ہیں۔

[illegible] زبان کہنے سے اب بھی باز نہیں آتے ہیں میں نے تو
[illegible]، جنگی، پٹواری اور عرضی نویس تک کو دیکھے ہیں
جو کسی زبان میں بھی رسید لکھیں لیکن کہتے اسے رسید ہی ہیں۔ رسید پر
اب تک برق نہیں گری۔ کیونکہ رسید ایک سیکولر چیز ہے۔ ہندو
مسلم، سکھ، عیسائی سبھوں کی زندگی کی ایک ضرورت ہے۔
یہ الگ بات ہے کہ اسکولوں میں لفظ "رسید" پڑھانے کا چلن
اٹھ گیا ہے۔ مگر میں نے ایک اسکول ٹیچر کو دیکھا۔ اس کے کلاس
کے لوگ پوچھ رہے تھے۔ ماسٹر جی! "[illegible] کے معنی کیا ہیں؟"

ماسٹر نے بے ساختہ جواب دیا:

"بچو! [illegible] طلب [illegible]"

[illegible] ماسٹر جی [illegible]۔

"[illegible]"

[illegible]

وہ ماسٹر جی آدھا بکا اور آدھا بکا ہو کر رہ گئے۔ سمجھ میں
شاید سودائی ہوں حالانکہ میں اُردو والا تھا۔ اور اُردو والے
کو ہمیشہ اعتماد رہا کہ اُردو زندگی کے لہو میں دوڑتی پھرتی ہے۔ اور
یہ اس وقت تک خودکشی نہیں کر سکے گی جب تک اس کے ہاتھ میں
خالص کوالٹی کا خنجر نہ دے دیا جائے۔

مگر جناب! کئی مرتبہ خنجر کی خالص کوالٹی بھی کام نہیں کرتی۔
خودکشی کے لئے نیت بھی خالص چیز ہے لیکن ایک مرتبہ وہ سواری
کے لئے جب کچھ خریدنے گیا تو گھوڑے کے بجائے گائے خرید لایا۔
کیا میں امید کروں کہ میرے قنوطی لب و لہجہ کو بھی آپ ایسی
ہی ایک مزاحیہ بات سمجھ کر ٹال جائیں گے کیونکہ [illegible] میں
طنز و مزاح کو سنجیدہ سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ آسان ہوتا ہے۔

مجھے حکم ملا تھا کہ میں اُردو ادب میں طنز و مزاح پر اظہار خیال
کروں۔ ایک حکیم حاکم مرگ مفاجات میں نے ایسی مفاجات ایک چھوٹی
سی تختی پر لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا:

"نہرو اسٹریٹ"

حضرات! اُردو ادب کو "نہرو اسٹریٹ" کی چھوٹی سی گلی
گلی بنانے کے لئے بڑی جرأت رکھنا چاہئے۔ یہ جسارت رندانہ محققوں
اور نقادوں میں تو ہو سکتی ہے، مگر تو کسی میں نہیں۔ جو طنز و مزاح
کو نہرو اسٹریٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ میرا ورد بات ہے کہ دو عظیم ترین
طنز نگار اُردو ادب میں ڈیرہ ڈالے پڑے رہے ہیں۔ کرشن چندر سے
کنھیا لال کپور تک (دونوں کے درمیان کی خالی جگہ خود پر کر لیجئے)
کیونکہ دونوں طنز نگار ہیں۔ اُردو ادب میں نہ ہوتے تو طنز نگار
ہوتے کسی بھی زبان میں کسی بھی ملک کسی بھی عہد میں۔ اعلیٰ ادب
[illegible]

مگر ٹھہریئے طنز نگار کی پوزیشن خدا سے قدرے مختلف ہے۔ اسے سبھوں کو منہ دکھانا ہے۔ ایسے اندھیرا، ٹوکیو، لندن، واشنگٹن، دہلی یا پنجاب میں بھی قید رکھنا مشکل ہے۔ پوری انسانی سوسائٹی اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ بمبئی شہر میں کوڑے کرکٹ کا ایک ڈول رکھا ہے۔ جس میں ایک آدھ ننگا بھوکا بچہ ٹٹول رہا ہے اور اپنے پیٹ کے لئے آم کے چوسے ہوئے چھلکے ڈھونڈنے میں مصروف ہے۔ اسی ڈول میں کتے کا ایک پلا بھی شکم سیری کے لئے گوشت کی چچوڑی ہوئی ہڈی تلاش کر رہا ہے۔ اگر ایمپلائمنٹ ایکس چینج کے کیو میں ایک بے روزگار گدھا بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔

کیا یہ منظر صرف بمبئی میں ہے۔ دہلی میں نہیں ہے۔ تہران میں نہیں ہے، قاہرہ میں نہیں ہے۔ خدا نے جیسی یہ دنیا بنائی ہے، اس میں ڈول ہر جگہ رکھا ہے۔ طنز نگار اسے دیکھتا ہے تو زبان سے ہنساتا ہے، قلم سے رلاتا ہے۔ منٹو بمبئی میں رہا تو اس نے وہاں "موذیل" دیکھی۔ لاہور میں گیا تو کہانی "کھول دو" لکھی۔ طنز نگار بمبئی سے لاہور تک سفر نہیں کرتا ہے۔ گدھے سے گریجویٹ تک کا فاصلہ طے کرتا ہے بلکہ ڈول سے ڈول تک کا سفر کرتا ہے۔ ہند پاک تقسیم کے فسادات پر منٹو نے جو لطیفے لکھے ان میں ہند و پاک کے ہر شہر میں کیوں کرب محسوس کیا گیا۔ اس نے جب لکھا کہ لاہور میں، گنگا رام کے بت پر جب انسان ایک دوسرے پر پل پڑے تو کئی زخمی ہو گئے۔ اور پھر زخمیوں کو جس اسپتال میں مرہم پٹی کے لئے لے جایا گیا اس کا نام سر گنگا رام اسپتال تھا۔

اور حضرات! کیا وجہ ہے کہ جب کرشن چندر نے بمبئی میں بیٹھ کر گدھے کی سرگزشت لکھی تو اس گدھے کو چلتے دیکھ کر ہمالیہ سے راس کماری تک اور کولمبو سے لندن تک کے بیوروکریٹس کیوں کانپ اٹھے۔ بیوروکریسی ہر جگہ ہے، ناہمواری ہر گلی کوچہ میں ہے۔ معاشرہ گزشتہ ۳۰ برس سے زنجیر عدل کھڑکا رہا ہے۔ مگر اس کو بتلایا جاتا ہے کہ جہانگیر باتھ روم میں ہے۔

معاشرہ پوچھتا ہے "جہانگیر کب تک باتھ روم میں رہے گا؟"

جواب ملتا ہے "اگلے الیکشن سے پہلے کوئی امکان نہیں ہے۔"

اور پھر یہ سن کر کہ جہانگیر کے اب تو پی۔ اے۔ بھی باتھ روم میں رہنے لگیں ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی چپراسی اٹھاتا ہے اور کہتا ہے "پی۔ اے۔ صاحب باتھ روم میں ہے۔"

"اور مسٹر چپراسی! آپ باتھ روم میں کب تشریف لے جائیں گے؟"

اور چپراسی جواب دیتا ہے "یہ بتانے کے لئے مجھے باتھ روم سے پوچھنا ہوگا... دیجیئے۔"

یہ ناہمواری مضحکہ خیز ہے۔ مگر چونکہ ایک آزاد اور ترقی پذیر معاشرے کی ناہمواری ہے۔ اس لئے اسے صرف تفریح طبع سمجھ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ نئی مشین، نئی سائنس، نئے رشتے، نئی ناگواریاں، اب ہمیں صرف گدگدی تک محدود نہیں رہنے دیتیں۔ بلکہ کچھ کرب، کچھ تفکر، کچھ سوز ہمارے رگ و ریشے میں پیدا کر رہی ہے۔ کل کے ہنسوڑ اور آج کے طنز نگار کے قلم میں ایک امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ جو اسے ادب عالیہ کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ نقاد حضرات اسے سوشل اکنامکس کے پس منظر سے ابھرتا ہوا ادب کہتے رہتے ہیں۔ مگر ٹھہریئے میرے لب و لہجے میں نقاد قبیلے کا فرد نہیں ہوں۔ بن بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ نقاد خاص طور پر اردو کا نقاد بڑی نڈر چیز ہے۔ سوشل اکنامکس پس منظر کی شرط لگا کر بھی طنز و مزاح کو ادب عالیہ میں مقام دینے سے کترا کاٹ جاتا ہے۔ بلکہ بڑے بڑے ضخیم و لحیم و شحیم الفاظ و تراکیب سے بیچارے طنز نگار کو ہراساں کئے رکھتا ہے۔ مثلاً ایمائیت، تلازمات، محاکاتی حسن، تناقص، حقائق، ذہنیت تمثیلی کینونس، ارتقائی جمالیاتی تحسین، جمالیات...

ہاں حضرات وہ بڑے عالم فاضل لوگ ہیں... کو مرعوب کن تراکیب سے ... دیتے ہیں ...

نگار کی تحریروں میں وہ گہرائی بھی موجود ہو جو ان تراکیب میں ہے۔ مگر طنز نگار کو نظر نہ آتی ہو۔ وہ بیچارہ صورتحال کا سیدھا سادہ مصور ہے۔ لفظوں کا کھلاڑی نہیں۔ ایک مولانا چند برس تک عرب ممالک میں رہے۔ دہلی لوٹے تو ایک عطار کے پاس پہونچ کر پوچھنے لگے۔

"کیا آپ کے پاس عرق گاؤ زبان ہے؟"

عطار نے جواب دیا "ہاں جناب! ہے تو سہی مگر اتنا گاڑھا نہیں ہے"۔

مولانا نے عرق کی "ق" کو معرب کر کے گاڑھا بنا دیا۔ ہمارا طنز و مزاح بھی اتنا گاڑھا نہیں ہے۔ جتنا نقاد کا عرق ہوتا ہے، وہ تو سیدھا سادہ عرق ہے۔ خود اہل ادب تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ بیماری دور کرنے کے لئے طنز و مزاح کے عرق کی مانگ ہمیشہ بہت رہی ہے۔ چہ جائے کہ وہ گاڑھا نہ ہو"۔

مگر جناب! آخر میں یہ کہہ کر ہی ختم کروں گا کہ نقاد حضرات کا بے حد احترام کرتا ہوں کیونکہ وہ رہنما قسم کی چیز ہیں۔ ہمیشہ قافلے سے آگے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک نقاد سے میں نے پوچھا:—

"میری گھڑی پر ایک بجا ہے۔ آپ کی گھڑی پر کیا وقت ہے"۔

وہ بولا:—

"ایک بج کر ۵ منٹ!"

اس نے صحیح فرمایا۔ کیونکہ وہ ہم سے ہمیشہ پانچ منٹ آگے رہتے ہیں۔ جیسے ایک مرتبہ ایک قوم نے دوسری قوم پر حملہ کر دیا۔ کسی نے پوچھا:—

"آپ نے اس قوم پر حملہ کیوں کیا؟"

اس نے کہا:—

"کیونکہ وہ ہم سے کم وحشی ہیں"۔

●●

فروغ اُردو لکھنؤ سے
حسب ذیل کتب طلب فرمائیے

۱۔ غزل انسائیکلو پیڈیا۔	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	25/-
۲۔ نظم	" "	18/-
۳۔ تجلیات (سیرت پاک مع نعتیہ کلام	"	8/-
۴۔ مطالعہ (تنقید و تاریخ	"	8/-
۵۔ اعمال نامہ (تنقید	"	
۶۔ جلیل مانکپوری حیات و کارنامے	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	5/-
۷۔ تلخیص تاریخ اودھ (جلد اول)	از علامہ نجم الغنی صاحب	30/-
۸۔ تلخیص و مقدمہ	ذکی کاکوروی (جلد دوم)	40/-
۹۔ چند شعراء بریلی	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	10/-
۱۰۔ نسیم دہلوی۔ حیات و شاعری۔	ڈاکٹر رفیع عثمانی	8/-
۱۱۔ فسانۂ عبرت۔ رجب علی بیگ سرور	مرتبہ ذکی کاکوروی	8/-
۱۲۔ واجد علی شاہ۔	ڈاکٹر تقی احمد	8/-
۱۳۔ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئیاں		2/-
۱۴۔ رخسانہ (ناول)	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	8/-
۱۵۔ نسرین و نسترن	"	8/-
۱۶۔ سار دل	"	2/50
۱۷۔ دھڑکنیں	"	3/50
۱۸۔ غزلیں و گیت (ہندی رسم الخط میں)	"	4/-

ملنے کا پتہ:—
فروغ اُردو ۱۲۶ امین آباد پارک لکھنؤ

مانک ٹالہ صاحب کے بقیہ خطوط

(۱)

بخدمت جناب مدیر محترم "فروغِ اُردو" لکھنؤ　　1-4-81

محترم بندہ۔ تسلیمات

"پریم چند کی بحث" کے سلسلے میں آپ کی طرف سے ارسال کردہ پرچوں کا وی۔پی چھڑا لیا گیا تھا۔
انہیں پڑھ کر پورے حقائق نظر کے سامنے آگئے۔

اس بات کی بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے عظیم آباد ایکسپریس میں بھی جو بحث چلی تھی۔ اُس کی بھی مکمل روداد چھاپی ہے۔ کہیں اپنی طرف سے اور کہیں جناب ابو محمد شبلی صاحب کی مرتب کردہ۔

اس سلسلے میں میرا ایک مضمون "پریم چند اور جارحانہ فرقہ پرستی" عظیم آباد ایکسپریس کے یکم فروری کے شمارے میں چھپا تھا۔ دراصل یہ میرا پہلا مضمون تھا جو میں نے پریم چند اور دوسروں کی تحریروں کی پوری تحقیق کرنے کے بعد لکھا تھا۔ اور میری خواہش ہے کہ آپ یہ مضمون بھی "فروغِ اُردو" کے کسی شمارے میں نقل فرمادیں آگے آپ کی مرضی۔

اسی سلسلے میں میرا دوسرا مضمون بھی عظیم آباد ایکسپریس کے پاس ہے۔ جو غالباً جلد ہی شائع ہوگا۔ اُس میں جناب مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا ایک اہم خط (پریم چند کے نام) بھی پورے کا پورا نقل کیا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر گھنہ صاحب کے مضمون کے بھی حوالے دیئے گئے ہیں (ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون ہماری زبان اور فروغِ اُردو میں چھپ چکا ہے)

اب آپ کی خدمت میں ایک مضمون "سوزِ وطن کا شاخسانہ اور جناب ابو محمد شبلی صاحب کی محققانہ ایمانداری" ارسال خدمت ہے۔ آپ کو اس مضمون کے پہلے صفحے ہی میں پتہ چل جائیگا کہ قبلہ شبلی صاحب نے پریم چند کا ایک اہم خط نقل کرتے وقت اپنی طرف سے الفاظ بڑھا کر پورے خط کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور ان تبدیل شدہ الفاظ کی بنا پر سوزِ وطن کا شاخسانہ کھڑا کر دیا۔

اگرچہ "سوزِ وطن" پر بحث پچھلے سال ہوئی تھی۔ لیکن یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ اسے دوبارہ پیش نہ کرنا نہ صرف پریم چند کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ بلکہ پریم چند پر تحقیق کرنے والے لوگوں کا بالکل غلط لائن پر چڑھ جانے کا بھی احتمال ہے۔

چوں کہ یہ بحث شبلی صاحب نے عظیم آباد ایکسپریس میں بھی چھیڑی تھی اس لئے اسی قبیل کا ایک مضمون (جو کہ مندرجہ بالا مضمون سے زیادہ طویل ہے) عظیم آباد ایکسپریس کو بھی الگ سے ارسال کر رہا ہوں۔

آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

خلوص کار

مانک ٹالہ

خط نمبر (۲)

Bombay 3.5.81

جناب مدیر محترم ماہنامہ "فروغ اُردو" لکھنؤ
محترم بندہ۔ تسلیمات

میں نے آپ کی خدمت میں سوزِ وطن کے سلسلہ میں ایک مضمون ارسال کیا تھا۔ جس میں جناب ابو محمد شبلی صاحب کی دروغ بافیوں کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ اس مضمون کے ارسال کرنے کے بعد مجھے جناب امرت رائے صاحب کا ایک خط موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے "سمر یاترا" کے ضبط ہونے کے سلسلہ میں صحیح روشنی ڈالی ہے۔ یہ خط ۲۱ مارچ ۱۹۸۱ء کا لکھا ہے جو مجھے اپریل کے اوائل میں موصول ہوا تھا۔ لیکن اُس وقت میں دہلی۔ پنجاب کے سفر کے سلسلہ میں پابہ رکاب تھا دو ہفتہ کی واپسی کے بعد بہت مصروف رہا۔ اس لئے یہ خط تاخیر سے ارسال کر رہا ہوں۔

میں نے جناب ہنس راج رہبر صاحب کی کتاب " پریم چند " کا حوالہ دے کر لکھا تھا کہ "سمر یاترا" نامی کتاب ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ضبط ہوئی تھی۔

اس دوران میں میں نے جناب امرت رائے صاحب کی خدمت میں بھی ایک خط ارسال کیا تھا۔ جس میں میں نے "سمر یاترا" کے بارے میں مزید وضاحت طلب کی تھی۔ جناب امرت رائے" کے خط سے "سمر یاترا" کے سلسلے میں اُنکا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

" جہاں تک مجھے علم ہے "سمر یاترا" نام کی انکی کہانیوں کا مجموعہ کبھی ضبط نہیں ہوا۔ ...."

اس وضاحت کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہنس راج رہبر صاحب نے اپنی کتاب میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ غلط بیانی جان بوجھ کر بھی ہوسکتی ہے لیکن اس میں سہو یا تن آسانی کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے کیونکہ ان کہانیوں میں کی ایک کہانی جب "ہنس" میں شائع ہوئی تھی تو "ہنس" کا وہ پرچہ ضبط ہوگیا تھا اور غالباً پریس سے بھی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ اور غالباً رہبر صاحب اسی بات کو لے کر اڑے ہونگے۔

بہر حال "سوزِ وطن" کے سلسلہ میں میرے موقف میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر فرق بھی پڑتا تو بھی میں اس اطلاع کو نذر کرتا کیونکہ ایک ایماندار محقق کا رویہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی سچی بات اُس کے علم میں آتی ہے تو اُس کا اظہار کرنے سے باز نہیں آتا۔ چاہے اس سے کسی کا بُت ٹوٹتا ہو یا سر پھوٹتا ہو۔ لیکن ابو محمد شبلی صاحب کی قسم کے محقق اپنی مطلب براری کے لئے دوسروں کی تحریروں میں اپنی طرف سے اضافہ کرکے اُس کا مطلب ہی بدل ڈالنے کی گھناؤنی حرکت سے بھی باز نہیں آتے۔ سیاق و سباق سے کاٹ کر تو انھوں نے پریم چند کی بہت سی تحریریں پیش کرکے اُن کا امیج بگاڑنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ سوزِ وطن کے سلسلے میں انھوں نے اپنی طرف سے اضافہ فرما کر تحقیق کی جو ٹانگ توڑی ہے وہ تو سخت مذمت کے قابل ہے۔ اگر امرت رائے صاحب پریم چند کے امیج کو اور زیادہ بُوسٹ (Boost) کرنا چاہتے تو وہ "سمر یاترا" کا "شاخسانہ" بھی کھڑا کرکے پریم چند کی شہرت کا ڈھنڈورا پیٹ سکتے تھے۔ لیکن امرت رائے اور ابو محمد شبلی کے مسلک میں بہت فرق ہے۔ اُمید کہ آپ یہ خط بھی میرے مضمون کے آخر میں شائع فرمادیں گے۔ لیکن اگر وہ مضمون اس خط کے موصول ہونے سے پہلے چھپ چکا ہو تو براہِ مہربانی یہ خط اگلے شمارے میں شائع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

خلوص آہنگ
مانک ٹالہ

سعادت علی صدیقی

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہیں)

باقیاتِ اسلم : مرتبہ سلیم عمر
صفحات : ۲۹۶ قیمت بیس روپے
ناشر : مرتب طابع : نامی پریس لکھنؤ
ملنے کا پتہ : علوی پبلشرز لکھنؤ

ممتاز مجاہدِ آزادی و مشہور شاعر حضرت اسلم لکھنوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ مرحوم گفتار کے غازی ہی نہیں کردار کے غازی بھی تھے۔ ان کا کلام ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں و بے لوث قربانیوں کا آئینہ دار بھی ہے اور ان کے دلی جذبات و احساسات کا مظہر بھی۔ ان کا شمار انھیں شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے وقت اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور جو ہر حال میں حریت، آزادی، اور انقلاب کے علم بردار رہے ہیں۔ رسن و دار کی آزمائشیں ہوں یا زنداں کی تاریک کوٹھریاں وطن کی محبت اور خدمت کا جذبہ ان سے چھینا نہیں جا سکا۔ اسلم صاحب کی داستانِ حیات ایسے مجاہد کی داستان ہے جس کی زندگی سرفروشانہ کارناموں سے عبارت ہے۔ انھوں نے قید و بند کے مصائب بھی جھیلے، چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی۔ اور حق گوئی و بیباکی "آئینِ جواں مرداں" پر عمل پیرا بھی رہے۔

باقیاتِ اسلم سے قبل اسلم لکھنوی کی قومی نظموں کے مجموعے "مراثے" اور "مشعل" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ان کا وہ کلام شامل ہے جو ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ جسے مرحوم کے فرزند جناب سلیم عمر نے نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔ اس مجموعہ کی غزلوں و نظموں میں ایک سچے محبِ وطن شاعر کی روح جلوہ گر ہے۔ ان کے کلام میں حساس دل کی دھڑکنیں ہیں، بادلوں کی گھن گرج ہے، بجلیوں کی تڑپ ہے، انقلاب کی گونج ہے۔ آزادی کا جذبہ ہے، حریت کی لے ہے، سرفروشی کی تمنا ہے، غلامی سے نفرت ہے، فرقہ پرستی و مفاد پرستی کے خلاف للکار ہے۔ غرض کہ ان کے کلام میں وہ سب کچھ ہے جو ایک حساس شاعر کے یہاں ہونا چاہیئے۔

عجیب اسلم کی ہے طبیعت ملی ہے غنچوں کی جیسے فطرت
خوشی ہے تو مسکرا رہے ہیں الم ہے تو مسکرا رہے ہیں

میخانہ میں ساغر بھی چلے پھول بھی برسے
میں بیٹھا رہا میری طرف جام نہ آیا

یہ سچ ہے کہ آزادِ وطن ہو گیا لیکن
سمجھو نہ علاجِ غم و آلام یہی ہے

مدت ہوئی بہار کو آئے ہوئے مگر
تاراج گل کی طرح گلستاں ہے آج بھی

لیا جو جائزہ ایک روز جا کر صحنِ گلشن کا
لگی وہ چوٹ دل پر آنکھ سے آنسو نکل آئے

خط نمبر (۲)

Bombay 3.5.81

جناب مدیر محترم ماہنامہ "فروغِ اردو" لکھنؤ
محترم بندہ ۔ تسلیمات

میں نے آپ کی خدمت میں سوزِ وطن کے سلسلہ میں ایک مضمون اِرسال کیا تھا۔ جس میں جناب ابو محمد شبلی صاحب کی دروغ بافیوں کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ اس مضمون کے اِرسال کرنے کے بعد مجھے جناب امرت رائے صاحب کا ایک خط موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے "سمر یاترا" کے ضبط ہونے کے سلسلہ میں صحیح روشنی ڈالی ہے۔ یہ خط ۳۱ مارچ ۱۹۸۱ء کا ہے جو مجھے اپریل کے اوائل میں موصول ہوا تھا لیکن اُسوقت میں دہلی۔ پنجاب کے سفر کے سلسلہ میں پابہ رکاب تھا دو ہفتہ کی واپسی کے بعد بہت مصروف رہا۔ اس لئے یہ خط تاخیر سے اِرسال کر رہا ہوں۔

میں نے جناب ہنس راج رہبر صاحب کی کتاب "پریم چند" کا حوالہ دے کر لکھا تھا کہ "سمر یاترا" نامی کتاب ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ضبط ہوئی تھی۔

اس دوران میں میں نے جناب امرت رائے صاحب کی خدمت میں بھی ایک خط اِرسال کیا تھا جس میں میں نے "سمر یاترا" کے بارے میں مزید وضاحت طلب کی تھی۔ جناب امرت رائے کے خط سے "سمر یاترا" کے سلسلے میں اُنکا اقتباس پیشِ خدمت ہے،

"جہاں تک مجھے علم ہے "سمر یاترا" نام کی انکی کہانیوں کا مجموعہ کبھی ضبط نہیں ہوا۔ ...."

اس وضاحت کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہنس راج رہبر صاحب نے اپنی کتاب میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ غلط بیانی جان بوجھ کر بھی ہو سکتی ہے لیکن اس میں سہو یا تن آسانی کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ ان کہانیوں میں کی ایک کہانی جب "ہنس" میں شائع ہوئی تھی تو "ہنس" کا وہ پرچہ ضبط ہو گیا تھا اور غالباً پریس سے بھی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ اور غالباً رہبر صاحب اسی بات کو لے کر اڑے ہونگے۔

بہر حال "سوزِ وطن" کے سلسلہ میں میرے موقف میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر فرق بھی پڑتا تو بھی میں اس اطلاع کو نہ روک سکتا کیونکہ ایک ایماندار محقق کا رویہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی سچی بات اُس کے علم میں آتی ہے تو اُس کا اظہار کرنے سے باز نہیں آتا۔ چاہے اس سے کسی کا بُت ٹوٹتا ہو یا سر پھوٹتا ہو۔ لیکن ابو محمد شبلی صاحب کی قسم کے محقق اپنی مطلب براری کے لئے دوسروں کی تحریر میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے اُس کا مطلب ہی بدل ڈالنے کی گھناؤنی حرکت سے بھی باز نہیں آتے۔ سیاق و سباق سے کاٹ کر تو انھوں نے پریم چند کی بہت سی تحریریں پیش کر کے اُن کا امیج بگاڑنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ سوزِ وطن کے سلسلے میں انھوں نے اپنی طرف سے اضافہ فرما کر تحقیق کی جو ٹانگ توڑی ہے وہ تو سخت مذمت کے قابل ہے۔ اگر امرت رائے صاحب پریم چند کے امیج کو اور زیادہ بوسٹ (Boost) کرنا چاہتے تو وہ "سمر یاترا" کا "شاخسانہ" بھی کھڑا کر کے پریم چند کی شہرت کا ڈھنڈورا پیٹ سکتے تھے۔ لیکن امرت رائے اور ابو محمد شبلی کے مسلک میں بہت فرق ہے۔ اُمید کہ آپ یہ خط بھی میرے مضمون کے آخر میں شائع فرما دیں گے لیکن اگر وہ مضمون اس خط کے موصول ہونے سے پہلے چھپ چکا ہو تو براہِ مہربانی یہ خط اگلے شمارے میں شائع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

خلوص آہنگ
مانک ٹالہ

سعادت علی صدیقی

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہیں)

باقیاتِ اسلم : مرتبہ سلیم عمر
صفحات : ۲۹۶ قیمت بیس روپے
ناشر : مرتب طابع : نامی پریس لکھنؤ
ملنے کا پتہ : علوی پبلشرز لکھنؤ

ممتاز مجاہد آزادی و مشہور شاعر حضرت اسلم لکھنوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ مرحوم گفتار کے غازی ہی نہیں کردار کے غازی بھی تھے۔ اِن کا کلام ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں و بے لوث قربانیوں کا آئینہ دار بھی ہے اور ان کے دلی جذبات و احساسات کا مظہر بھی۔ ان کا شمار انھیں شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے وقت اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور جو ہر حال میں حریت آزادی، اور انقلاب کے علم بردار رہے ہیں۔ رسن و دار کی آزمائشیں ہوں یا زنداں کی تاریک کوٹھریاں وطن کی محبت اور خدمت کا جذبہ ان سے چھینا نہیں جا سکا۔ اسلم صاحب کی داستانِ حیات ایسے مجاہد کی داستان ہے جس کی زندگی سرفروشانہ کارناموں سے عبارت ہے۔ انھوں نے قید و بند کے مصائب بھی جھیلے، چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رکھی۔ اور حق گوئی و بیباکی "آئین جواں مرداں" پر عمل پیرا بھی رہے۔

باقیاتِ اسلم سے قبل اسلم لکھنوی کی قومی نظموں کے مجموعے "ترانے" اور "مشعل" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ان کا وہ کلام شامل ہے جو اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ مرحوم کے فرزند جناب سلیم عمر نے نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔ اس مجموعہ کی غزلوں و نظموں میں ایک سچے محب وطن شاعر کی روح جلوہ گر ہے۔ ان کے کلام میں حساس دل کی دھڑکنیں ہیں، بادلوں کی گھن گرج ہے، بجلیوں کی تڑپ ہے، انقلاب کی گونج ہے، آزادی کا جذبہ ہے، حریت کی لے ہے، سرفروشی کی تمنا ہے، غلامی سے نفرت ہے، فرقہ پرستی و مفاد پرستی کے خلاف للکار ہے۔ غرض کہ ان کے کلام میں وہ سب کچھ ہے جو ایک حساس شاعر کے یہاں ہونا چاہیئے۔

عجیب اسلمؔ کی ہے طبیعت ملی ہے غنچوں کی جیسے فطرت
خوشی ہے تو مسکرا رہے ہیں الم ہے تو مسکرا رہے ہیں

میخانہ میں ساغر بھی چلے پھول بھی برسے
میں تکتا رہا میری طرف جام نہ آیا

یہ سچ ہے کہ آزادِ وطن ہو گیا لیکن
سمجھو نہ علاجِ غم و آلام یہی ہے

مدت ہوئی بہار کو آئے ہوئے مگر
تاراجِ گل کی طرح گلستاں ہے آج بھی

لیا جو جائزہ ایک روز جا کر صحن گلشن کا
لگی وہ چوٹ دل پر آنکھ سے آنسو نکل آئے

خط نمبر (۲)

Bombay 3.5.81

جناب مدیر محترم ماہنامہ "فروغِ اُردو" لکھنؤ
محترم بندہ ۔ تسلیمات

میں نے آپ کی خدمت میں سوزِ وطن کے سلسلہ میں ایک مضمون اِرسال کیا تھا۔ جس میں جناب ابو محمد شبلی صاحب کی دروغ بافیوں کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ اِس مضمون کے اِرسال کرنے کے بعد مجھے جناب امرت رائے صاحب کا ایک خط موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے "سمریاترا" کے ضبط ہونے کے سلسلہ میں صحیح روشنی ڈالی ہے۔ یہ خط ۲۱ مارچ ۱۹۸۱ء کا لکھا ہے جو مجھے اپریل کے اوائل میں موصول ہوا تھا لیکن اُسوقت میں دہلی۔ پنجاب کے سفر کے سلسلہ میں پابہ رکاب تھا دو ہفتہ کی واپسی کے بعد بہت مصروف رہا۔ اِس لئے یہ خط تاخیر سے اِرسال کر رہا ہوں۔

میں نے جناب ہنس راج رہبر صاحب کی کتاب "پریم چند" کا حوالہ دے کر لکھا تھا کہ "سمریاترا" نامی کتاب ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ ضبط ہوئی تھی۔

اِس دوران میں میں نے جناب امرت رائے صاحب کی خدمت میں بھی ایک خط اِرسال کیا تھا۔ جس میں میں نے "سمریاترا" کے بارے میں مزید وضاحت طلب کی تھی۔ جناب "امرت رائے" کے خط سے "سمریاترا" کے سلسلے میں اُنکا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

"جہاں تک مجھے علم ہے "سمریاترا" نام کی انکی کہانیوں کا مجموعہ کبھی ضبط نہیں ہوا۔ ...."

اِس وضاحت کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہنس راج رہبر صاحب نے اپنی کتاب میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ غلط بیانی جان بوجھ کر بھی ہو سکتی ہے لیکن اِس میں سہو یا تن آسانی کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ ان کہانیوں میں کی ایک کہانی جب "ہنس" میں شائع ہوئی تھی تو "ہنس" کا وہ پرچہ ضبط ہو گیا تھا اور غالباً پریس سے بھی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ اور غالباً رہبر صاحب اِسی بات کو لے کر اڑے ہونگے۔

بہرحال "سوزِ وطن" کے سلسلہ میں میرے موقف میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر فرق بھی پڑتا تو بھی میں اِس اطلاع کو نشر کرتا کیونکہ ایک ایماندار محقق کا رویہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی بھی بات اُس کے علم میں آتی ہے تو اُس کا اظہار کرنے سے باز نہیں آتا۔ چاہے اِس سے کسی کا بُت ٹوٹتا ہو یا سَر پھوٹتا ہو۔ لیکن ابو محمد شبلی صاحب کی قسم کے محقق اپنی مطلب برآری کے لئے دوسروں کی تحریر میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے اُس کا مطلب ہی بدل ڈالنے کی گھناؤنی حرکت سے بھی باز نہیں آتے۔ سیاق و سباق سے کاٹ کر تو انھوں نے پریم چند کی بہت سی تحریریں پیش کر کے اُن کا امیج بگاڑنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ سوزِ وطن کے سلسلے میں انھوں نے اپنی طرف سے اضافہ فرما کر تحقیق کی جو ٹانگ توڑی ہے وہ تو سخت ملامت کے قابل ہے۔ اگر امرت رائے صاحب پریم چند کے امیج کو اور زیادہ بوسٹ (Boost) کرنا چاہتے تو وہ "سمریاترا" کا "فسانہ" بھی کھڑا کر کے پریم چند کی شہرت کا ڈھنڈورا پیٹ سکتے تھے۔ لیکن امرت رائے اور ابو محمد شبلی کے مسلک میں بہت فرق ہے۔ اُمید کہ آپ یہ خط بھی میرے مضمون کے آخر میں شائع فرما دیں گے لیکن اگر وہ مضمون اِس خط کے موصول ہونے سے پہلے چھپ چکا ہو تو براہِ مہربانی یہ خط اگلے شمارے میں شائع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

خلوص آہنگ
مانک ٹالہ

سعادت علی صدیقی

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہیں)

باقیات اسلم : مرتبہ سلیم عمر
صفحات : ۲۹۶ قیمت بیس روپئے
ناشر: مرتب طابع :نامی پریس لکھنؤ
ملنے کا پتہ : علوی پبلشرز لکھنؤ

ممتاز مجاہد آزادی و مشہور شاعر حضرت اسلم لکھنوی کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ مرحوم گفتار کے غازی ہی نہیں کردار کے غازی بھی تھے۔ ان کا کلام ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں و بے لوث قربانیوں کا آئینہ دار بھی ہے اور ان کے دلی جذبات و احساسات کا مظہر بھی۔ ان کا شمار انھیں شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے وقت اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور جو ہر حال میں حریت آزادی، اور انقلاب کے علم بردار رہے ہیں۔ رسن و دار کی آزمائشیں ہوں یا زنداں کی تاریک کوٹھریاں وطن کی محبت اور خدمت کا جذبہ ان سے چھینا نہیں جا سکا۔ اسلم صاحب کی داستانِ حیات ایسے مجاہد کی داستان ہے جس کی زندگی منفرد شانہ کارناموں سے عبارت ہے۔ انھوں نے قید و بند کے مصائب بھی جھیلے، چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی۔ اور حق گوئی و بیباکی "آئین جواں مرداں" پر عمل پیرا بھی رہے۔

باقیات اسلم سے قبل اسلم لکھنوی کی قومی نظموں کے مجموعے "مراثے" اور "مشعل" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں ان کا وہ کلام شامل ہے جو ادھر۔ اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ جسے مرحوم کے فرزند جناب سلیم عمر نے نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔ اس مجموعہ کی غزلوں و نظموں میں ایک سچے محب وطن شاعر کی روح جلوہ گر ہے۔ ان کے کلام میں حساس دل کی دھڑکنیں ہیں، بادلوں کی گھن گرج ہے، بجلیوں کی تڑپ ہے، انقلاب کی گونج ہے، آزادی کا جذبہ ہے، حریت کی لے ہے، سر فروشی کی تمنا ہے، غلامی سے نفرت ہے، فرقہ پرستی و مفاد پرستی کے خلاف للکار ہے۔ غرض کہ ان کے کلام میں وہ سب کچھ ہے جو ایک حساس شاعر کے یہاں ہونا چاہیے۔

عجیب اسلم کی ہے طبیعت ملی ہے غنچوں کی جیسے فطرت
خوشی ہے تو مسکرا رہے ہیں الم ہے تو مسکرا رہے ہیں

میخانہ میں ساغر بھی چلے پھول بھی برسے
میں بیٹھا رہا میری طرف جام نہ آیا

یہ سچ ہے کہ آزاد وطن ہو گیا لیکن
سمجھو نہ علاج غم و آلام یہی ہے

مدت ہوئی بہار کو آئے ہوئے مگر
تاراج گل کی طرح گلستاں ہے آج بھی

لیا جو جائزہ ایک روز جا کر صحن گلشن کا
لگی وہ چوٹ دل پر آنکھ سے آنسو نکل آئے

اتنا کر دی تم نے بھی بیداد کی
خیر اپنے ہوا اب ہم تمھیں کیا کہیں
ہمارا نام تاریخ زمانہ کیا بھلائے گی
رہتے ہیں گلستاں میں ہم بہار گلستاں ہو کر

"عرض مرتب" میں اسلم صاحب کی حیات پر مختصر اً روشنی ڈالی ہے۔ مجموعے میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، جناب مالک رام، جناب مائل ملیح آبادی، جناب عرفان عباسی کے تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں۔ جن میں اسلم کے فن و شخصیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ باقیاتِ اسلم ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ اور اسلم لکھنوی کے آزادی تخلیق و حریت فکر کی جو شمعیں روشن کی ہیں۔ ان سے ہمارے ایوان جگمگاتے رہیں گے۔

(۳)

افکارِ پریشاں : اثر انصاری

صفحات : ۱۲۴ قیمت ۱۵ روپئے

نکھار پبلی کیشنز مؤ ناتھ بھنجن

"افکارِ پریشاں" اس شاعر کا مجموعہ کلام ہے جس کا کہنا ہے "زمانے کی کرم گستری بے التفاتیوں نے پہلے تو مجھے شاعر بنا کر خیال و فکر کی دل کش رومان انگیز فضا میں گم کر دیا اور اب تخلیقات کی تمام وسعتوں کو سمیٹ کر ترکِ سخن کی منزل سے قریب کر دیا۔ فکر و عمل کی دنیا میں قدم رکھا تو غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کو بھی گلے لگانا پڑا۔ نا مساعد حالات کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور مجھے کہنا پڑا۔

ملی وہ زیست کہ جس میں خوشی کا نام نہیں
سکوں کی صبح نہیں عافیت کی شام نہیں

جناب اثر انصاری کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا تو انکی انحصار پسند طبیعت غزل کی حسین و نازک صنف کی پر کشش گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دامن فکر گہر ہائے سخن سے بھر گیا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۶ء تک انھوں نے صرف غزلیں کہیں جو ان کے مجموعے "کم دیکھنا" میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں بہ قول اثر

تیرے انفاس کی خوشبو ہے مرے شعروں میں
میری غزلوں میں جھلکتا ہے تیرے پیار کا رنگ

"افکار پریشاں" میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۶ء کے دوران کہا ہوا منتخب کلام شامل کیا گیا ہے۔ ابتدا میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے شاعر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے "اثر انصاری صاحب کا نام کبھی کبھی رسائل اور اخبارات کے صفحوں میں نظر آجاتا تھا۔ اور ان کے دو کے شعر بھی پسند آجاتے تھے لیکن یہ سب کچھ اتنے طویل وقفوں کے بعد ہوتا تھا کہ کبھی پسندیدگی کا تاثر اچھی طرح یا دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ لیکن اب ان کے کلام اور اس کے اثر انگیزی سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس مجموعہ کے شاعر میں واقعی بڑی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں جنکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ــــ غزل جس سوز و گداز اور حسن پختگی بیان کا مطالبہ کرتی ہے وہ ان کی غزلوں میں فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔ اور مزاج میں وہ شائستگی ہے جو سطح کی سطحیت، ابتذال اور غیر متوازن جذباتیت سے بچاتی ہے ــــ"

احتشام صاحب کی اس وقیع اور گرانقدر رائے کے بعد اثر انصاری صاحب کے فن پر کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی مجموعے میں شامل غزلوں میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی حکایات بھی ہیں، عصری تقاضوں کی آئینہ داری بھی۔ تنوع، وسعت اور ہمہ گیری بھی ہے اور لطافت حسن بیان اور سوز و گداز بھی۔ اور اثر انصاری کے اس شعر کی ترجمانی بھی۔

مشعلِ فکر ذرا اتنی بلندی سے جلاؤ
دور تک اہلِ بصیرت کا اُجالا جائے

(باقی صفحہ ۱۰۸)

نریندر کمار۔ دہلی

پریم چند

پریم چند جی کا نام بچپن سے سنتا، دیکھتا آیا تھا۔ یہ نام کچھ اس طرح دماغ میں رچ بس چکا تھا جیسے قدیم رشیوں کے نام۔ جیسے وہ دل کی بستی کے باسی ہوں۔ اُن کا کوئی جسمانی وجود بھی ہے اور وہ ہم آپ کی طرح دنیاوی کام دھندا بھی کرتے ہیں —— اس قسم کی کوئی بات ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں یا ۱۹۲۷ء میں انکا ناول "رنگ بھومی" ہاتھ لگا۔ اسے پڑھنے کے بعد تو میرے لئے وہ اور بھی ما فوق البشر ہو گئے۔

لیکن دن نکلتے گئے اور ادھر میرا شعور بھی بالغ ہوتا گیا۔ ادھر اُدھر کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ پریم چند جی مصنف ہی نہیں اور کسی آسمانی سرزمین میں ہی نہیں رہتے۔ وہ ہم آپ جیسے انسان بھی ہیں یہ جان کر مجھے مسرت ہوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ معلومات عجیب ضرور معلوم ہوئیں اور ان سے ملنے کا مجھے اشتیاق پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں اچانک ایک کہانی لکھ بیٹھا اور میری جرأت دیکھیے کہ پہلی چیز کو ہی اس زمانہ کے مشہور ہندی رسالے "مادھوری" کے اور اس کے معروف ایڈیٹر پریم چند جی کو بھیج دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کہانی شکریہ کے ساتھ واپس آ گئی۔ اتنا ہی نہیں یہ بھی مجھ سے پوچھا گیا کہ لکھئے یہ کسی کہانی کا ترجمہ تو نہیں ہے۔ کچھ دنوں بعد میں نے ایک اور کہانی انھیں بھیجی۔ اس بار انھیں لکھ دیا کہ یہ کہانی قابلِ اشاعت تو ہو گی نہیں لیکن پریم چند جی اس پر اپنی رائے دیں۔ یہ میری تمنا ہے۔ رائے نہیں دو سطروں کا یہ خط ملا۔

"محترمی۔ دو مہینے بعد "مادھوری" کا خاص نمبر نکلنے والا ہے۔ آپکی کہانی اس کے لئے چن لی گئی ہے۔"

اور یوں پریم چند جی سے میرا تعارف ہوا۔ اور پھر باقاعدہ خط و کتابت ہونے لگی اور بالآخر سنہ ۱۹۳۰ء میں جب کمبھ کے میلے پر الٰہ آباد گیا تو مجھے اُن کا یہ خط ملا —— "امین الدولہ پارک کے پاس لال مکان ہے۔ لوٹتے وقت آؤ گے ہی۔ ضرور آؤ۔"

جنوری کا مہینہ تھا۔ گاڑی لکھنؤ رات کے تقریباً ۲ بجے جا پہونچی تھی۔ اندھیرا تھا اور سردی بھی کم نہ تھی۔ ایسے عالم میں امین الدولہ پارک کے قریب لال مکان تو مل جائیگا۔ ممکن ہے کچھ دقت بھی ہو۔ ایسا میں سوچ رہا تھا لیکن فی الواقع جو دقت اور پریشانی اٹھانی پڑی اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔

کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں پریم چند کے یہاں جا رہا ہوں؟ جی ہاں وہی جو شہنشاہ ادب ہیں گھر گھر جن کے نام کا چرچا ہے۔

[illegible] تھا اور بڑے فخر کے ساتھ میں ہر کسی کو یہ بتانے کے لئے بے چین تھا
کہ میں اُن کے۔ انھیں کے یہاں جا رہا ہوں پانچ بجے کے لگ بھگ میں
امین الدولہ پارک کی سڑک کے بیچوں بیچ اُکھڑا ہوا سامان شامیانے کی
ایک بند دکان کے تختوں پر لٹکا دیا اکا دکا شریف لوگ سیر کی غرض سے
آجا رہے تھے میں نے تقریباً ہر ایک سے پوچھا "جی معاف کیجئے۔ پریم چند
جی کے مکان کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں۔

"پریم چند" ہر کسی نے بڑے تعجب سے کہا "کون پریم چند"؟
بھی وہی بلند پایہ ادیب۔ ناولسٹ۔ صاحب وہ اڈیٹر بھی ہیں
ــــ مشہور آدمی ہیں:

لیکن ہر کسی نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر مجھ سے معافی مانگی اور
سیر کے لئے آگے بڑھ گیا اس سڑک پر ہی مجھے چھ بج گئے ساڑھے
چھ بجنے لگے۔ اس عرصہ میں درجنوں اصحاب کو معاف کر چکا تھا۔

آس پاس مکان کم نہ تھے اور لال مکان بھی کم نہ تھے اور جہاں
میں کھڑا تھا وہاں سے پریم جی کا مکان مشکل سے بیس گز دور تھا۔
لیکن اس روز مجھے مہذب اور معزز لوگوں کی رہنمائی میں اس بیس گز
کے معمولی سے فاصلے کو طے کرنے میں کافی دیر لگی اور کیا اسے محض اتفاق
نہ کہا جائے کہ بالآخر جس شخص کی رہنمائی میں میں اِن بیس گزوں کا
فاصلہ طے کرکے پریم چند جی کے پاس پہونچا سماجی حیثیت سے
وہ غیر معزز اور غیر مہذب ہی تھا۔

مکان پر پہونچ کر آواز دی گئی اور جب اوپر کا کواڑ کھلا
تو زینے کے نیچے سے اُوپر جھانکنے پر جو کچھ مجھے نظر آیا اس کے لئے بھی
میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ جو صاحب اُوپر کھڑے تھے اُن کے بڑی
گھنی مونچھیں تھیں۔ پانچ روپے والی لال املی کی چادر اوڑھے
ہوئے تھے جو کافی بوسیدہ اور جھکی تھی بالوں نے آگے بڑھ کر ماتھے
کو کچھ ڈھانپ لیا تھا اور ماتھا کافی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔
سر ضرورت سے زیادہ چھوٹا نظر آیا کیا جیتے جی پریم چند انھیں جیسے
کو سمجھنا ہوگا۔ اتنی دور سے اتنے اشتیاق کے ساتھ میں اس شخص کے
نیاز حاصل کرنے آیا تھا۔ ایک بار تو جی میں آیا کہ اگر اپنے ذہن
میں پریم چند جی عظمت کو برقرار رکھنا ہے تو مجھے فوراً وہاں سے
لوٹ جانا چاہئے۔ پریم چند کے نام پر یہ سامنے کھڑا شخص کس
درجہ معمولی۔ کس درجہ عام۔ کس درجہ دیہاتی تھا۔

خیر میں اُوپر پہونچا۔ سب کام چھوڑ کر پریم چند جی مجھے لیکر بیٹھ گئے
سات بج گئے ساڑھے سات بج گئے آٹھ بجنے کو آئے باتوں کا سلسلہ ٹوٹتا
ہی نہ تھا۔ اس دوران میں میں بہت کچھ بھول گیا ــــ یہ بھول گیا کہ وہ
پریم چند ہیں۔ ہندی اُردو کے عظیم ادیب ہیں یہ بھی بھول گیا ــــ کہ
میں ادب کے کنارہ پر پہونچا کھڑا ایک معصوم بچہ ہوں۔ یہ بھی بھول گیا کہ
تو پھر پہلے اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ ناپسندگی سی پیدا ہوئی تھی
دیکھتے دیکھتے میں انتہائی گہری اپنائیت میں گھر پڑا دیری سب باتوں کو بھول
گیا اُن کے چہرے پر بہت کچھ لکھا تھا جو پڑھنے کے قابل تھا۔ میں
سوچتا ہوں کہ بادام کی میٹھی گری کے لئے کیا یہ نہایت ضروری اور
ناگزیر نہیں ہے کہ اُس کے اوپر کا چھلکا بہت سخت ہو۔ اگر ایسا نہ
ہو تو بادام کو کبھی بادام بننے کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب
وہ کسی بھی لباس میں کسی بھی رنگ روپ میں ہوتے میں اُن کے پیر
چھوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اب نو بج چکے تھے باتوں کا سلسلہ برابر چل رہا تھا کہ اندر
سے اطلاع آئی کہ ابھی ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لاکر نہیں رکھی گئی۔
ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ پریم چند جی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور
مجھے حاجات ضروریہ سے فارغ ہونے کو کہہ کر انھیں کپڑوں میں
سلیپر پہن کر باہر نکل گئے۔

میرے دل پر پریم چند کی شخصیت کی پہلی چھاپ یہ پڑی کہ
یہ شخص جو کچھ بھی ہے اس سے ذرہ برابر [illegible] دکھاوے ریاکاری [illegible]
نہیں اس شخص کو اپنے بارے میں صرف اتنا ہی علم ہے کہ لاکھوں کروڑوں

انسان کے لئے وہ بھی ایک انسان اس سے زیادہ کچھ ہونے کا یا پانے کا وہ دعویدار نہ بنے گا۔

ان دنوں اپنے سرسوتی پریس بنارس سے وہ ہندی ماہنامہ "ہنس" نکالنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ سرسوتی پریس چھوڑ کر اپنے گاؤں (گھر) چھوڑ کر یہاں لکھنؤ میں ملازمت کریں۔ آپکو ایسی کیا لاچاری ہے؟

میری ان سے پہلی ملاقات تھی ہم میں کوئی برابری نہ تھی اس قسم کے ذاتی سوال کو نامناسب سمجھا جا سکتا تھا لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ اس پہلے موقع پر ہی ان کے تئیں میں اپنی تمام دوری کھو چکا تھا۔ میں لاکھ چھوٹا ہی سہی لیکن پریم چند جی اتنے بڑے تھے کہ اپنی موجودگی میں وہ مجھے ذرہ بھر بھی اپنے تئیں چھوٹا محسوس نہ ہونے دیتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے بلا جھجک اپنی اقتصادی حالت یا یوں کہئے کہ اقتصادی بدحالی کی داستان کہہ سنائی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ پریم چند جو لکھتے ہیں وہ صرف لکھتے ہی نہیں ہیں ان کو مانتے بھی ہیں اس پر زندہ بھی رہتے ہیں۔ سول نافرمانی کے دنوں میں انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی کچھ دنوں تک تو ابتدا تحریک میں کام کرتے رہے پھر کچھ دنوں تک کانپور کے ایک اسکول میں پڑھایا کئے پھر کاشی ودیا پیٹھ میں آئے تحریک اس وقت مدھم پڑ چکی تھی۔ سوچنے لگے کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اور میری تنخواہ ودیا پیٹھ پر بار ہو رہی ہو اور یہ سوچ کر اسے بھی چھوڑ دیا۔ اب کیا کریں؟

"کیوں؟" میں نے کہا "آپ کے ہاتھ میں قلم ہے پھر یہ کیسا سوال کہ اب کیا کریں"؟

"نہیں جے نیندر" انھوں نے کہا "تمھارا خیال درست نہیں ہے یہ ملک ولایت نہیں ہے۔ ولایت بن جائے یہ بھی شاید میں نہیں جیا ہوں گا"

پھر بتایا کہ مجھے لکھنے سے کام نہیں چلتا۔ دل کو بھی تسکین نہیں ملتی اور اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے پھر کن کن حالتوں میں سے گزرنا پڑا یہ بھی سنایا۔ آخر یہاں وہاں سے کچھ پونجی بٹور کر پریس کھولا لیکن بازار والوں سے نپٹنا نہ آتا تھا۔ پریس ایک ایسا لقمہ سخت بن گیا جو نہ نگلا جاتا تھا نہ اگلتے بنتی تھی اپنا لینا ملتے نہیں۔ دینداروں کو دینا بہر صورت پڑے۔ ان حالات میں پریم چند جی ایسے شخص کی حالت ناقابل بیان ہو گئی۔ اور کچھ نہ سوجھا تو پریس میں تالا ڈال کر گھر بیٹھ گئے۔ پریس چلے نہ چلے جان کو کب تک گھلایا جائے؟

"اب بتاؤ جے نیندر" وہ بولے "کیا ایسی حالت میں بھی نوکری نہ کرتا۔ اب اتنا تو ہے کہ روٹی چلی جاتی ہے"

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا دفتر چلوگے"؟

میں چلنے کو پہلے سے تیار تھا۔ جس ڈھنگ سے انھوں نے یکہ والے کو پکارا۔ اس کو پٹایا۔ یکے میں بیٹھے بیٹھے اس کی خیر خیریت پوچھ ڈالی جس آسانی اور جلدی سے انھوں نے یکے والے سے اپنائیت پیدا کر لی وہ سب کہنے کی جگہ شاید یہاں نہ ہو لیکن میرے ذہن میں وہ سب کچھ بڑے خوبصورت انداز میں مرتسم ہے

راستے میں معاً بولے "کہو جے نیندر جیوتش ودیا کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟"

میں نے پوچھا "کیا آپ یقین رکھتے ہیں؟"

بولے "کیا بتاؤں دفتر میں ایک صاحب بہت اچھا ہاتھ دیکھنا جانتے ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی کئی باتیں ایسی ٹھیک بیٹھی ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ پوری ودیا پاکھنڈ ہے"

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپکو یقین ہے مجھے تو کبھی نہیں ہوا"

"بولے اتنے لوگ اتنے زمانہ سے پوری ایمانداری کے ساتھ اس کھوج میں لگے ہوئے ہیں ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کو ہم یکسر

نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا۔ میں نے کہا "تو کیا اسی بنا پر یقین کرنا ہوگا؟ خدا میں تو آپ یقین نہیں رکھتے"۔

پریم چند جی سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "میں نیند ر میں کہہ چکا ہوں۔ میں خدا تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے یقین نہیں کر سکتا۔ کیسے یقین کروں جب میں دیکھتا ہوں کہ بچہ بلک رہا ہے مریض تڑپ رہا ہے۔ یہاں بھوک ہے۔ افلاس ہے مصیبتیں ہیں۔ اس صورت میں مجھے یہاں خدا کی حکومت نظر نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مشکل یہ ہے کہ خدا کو مان کر اسے رحمدل بھی ماننا پڑتا ہے۔ مجھے وہ رحمدلی کہیں نظر نہیں آتی ——— کیا تمھیں خدا پر یقین ہے؟"

میں نے کہا "اس سے بچنے کا راستہ مجھے نظر نہیں آتا"

پریم چند جی خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں گویا جم سی اور دُور کسی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔

دفتر پہونچ کر ان صاحب کو میرا ہاتھ دکھایا گیا۔ انھوں نے کافی بحث طلب باتیں کیں۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ جو کچھ بتایا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ دفتر سے لوٹتے وقت پریم چند جی نے پوچھا "کہو اب کیا کہتے ہو"۔

میں نے کہا "جیوتش بدیا پر میرے یقین کے نہ ہونے کی بات پوچھتے ہیں تو وہ جوں کا توں ہے"۔

یہ سُن کر پریم چند جی کو افسوس ہوا۔ اس جواب میں انھیں دوسروں کے تجربوں کی توہین معلوم ہوئی۔ پریم چند جی کے دل میں بنیادی عنصر یعنی خدا کے بارے میں اگرچہ لایقینی تھی لیکن انسان کی تخلیق کردہ سائنس اور اس کے نتائج پر ان کا یقین مستحکم تھا۔ توہین چاہے وہ کسی قسم کی ہو اس سے انھیں نفرت تھی وہ کچھ بھی تھے لیکن کٹر ہرگز نہیں تھے۔ مذہب کی مخالفت لیکن جیوتش بدیا میں اُن کا اس قسم کا یقین ——— یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ دیکھ کر کبھی کبھی مجھے تجسس بھی ہوا مگر میں نے اُن کی زندگی میں ہمیشہ اِن دونوں متضاد قسم کے نظریات کو نبھتے دیکھا ہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہ جوں کا توں مان لیتے تھے اور کئی بڑی بڑی باتوں میں وہ بڑے بیباک اور نڈر مصلح تھے۔

رات کو جب چلنے کی بات آئی تب بولے "تو آج ہی تم چل بھی دوگے۔ میں سمجھتا تھا کہ کچھ روز رہو گے"۔

اِن کے الفاظ میں کچھ زیادہ اصرار نہیں تھا۔ اُن کے مزاج میں اصرار تھا ہی نہیں۔ کسی کے آنے جانے کی آسانی کے درمیان وہ کبھی اپنی خواہش کو حائل نہیں کرتے تھے۔ کسی کے کام میں دخل انداز ہونے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں سے ملتے ہوئے بھی انھیں تذبذب ہوتا تھا کہ کہیں وہ اِن کا وقت تو نہیں ضائع کر رہے۔ آج کے مشینی دور میں اُن کے مزاج کی یہ خصوصیت بہت ہی بیش بہا تھی۔ اب دوستوں کو بھلے ہی یہ پسند نہ آئے۔

پھر ۱۹۳۰ء کی قومی تحریک آگئی جس میں بہت سے لوگ جیل چلے گئے۔ اس دوران میں پریم چند جی نے "ہنس" نکالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خوش قسمتی ہی ہوئی کہ وہ جیل نہیں گئے۔ اِنکا جیل سے باہر رہنا زیادہ سخت عبادت تھی۔ جیل میں مجھے جو اُنکے خطوط ملے اِن سے مجھے معلوم ہوا کہ پریم چند جی کی بدلت مجھے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ شروع میں ہی پریم چند جی نے اطلاع دی ——— "میری بیوی صاحبہ پکیٹنگ کے جرم میں دو مہینے کی سزا پا گئی ہیں۔ کل فیصلہ ہوا ہے۔ ادھر پندرہ دن تک اسی میں پریشان رہا۔ میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ انھوں نے خود جا کر میرا راستہ بند کر دیا"۔

اِن کے خطوط میں ہندی ادب پر بھی اصل بحث ہوتی تھی۔ اور کچھ اپنے دل کی۔ اپنے حالات کی اور سکھ دُکھ کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

Accession No. 83885
Date 7-11-85

ایک خط میں انھوں نے لکھا۔

"......: غبن " ابھی تیار نہیں ہوا۔ ابھی سو صفحات اور ہوں گے یہ ایک سماجی واقعہ ہے میں پُرانا ہو گیا ہوں اور پُرانے طرز تحریر کو نبھائے جا رہا ہوں۔ کہانی کو درمیان سے شروع کرنا یا اس طرح شروع کرنا کہ جس سے ڈرامہ کا سا انداز پیدا ہو جائے میرے لئے مشکل ہے

انکی اقتصادی حالت کا اندازہ اس خط سے کیجئے۔

"پیارے جے نیندر تمھارا خط کئی دن کے بعد ملا۔ مجھے امید تھی کہ دہلی (گھر) سے آ رہا ہو گا لیکن آیا لاہور (جیل) سے۔ خیر لاہور (جیل) ملتان (جیل) سے کچھ کم دُور ہے۔ اس سے کئی دن پہلے میں نے ملتان بھی ایک خط بھیجا تھا شاید وہ لوٹ کر آ گیا ہو تمھیں مل گیا ہو۔ اچھا میری کہانی "سوہنس" کی ضمانت مانگی گئی۔ میں سمجھا تھا آرڈی ننس کے ساتھ ضمانت بھی ختم ہو جائیگی لیکن نیا آرڈی ننس آگیا اور اس کے ساتھ ضمانت بھی بدستور قائم رہی جون اور جولائی کا شمارہ ہم نے چھپانا شروع کر دیا ہے۔ لیکن جب منیجر صاحب نیا ڈکلیریشن دینے گئے۔ تو مجسٹریٹ نے رسالہ جاری کرنے کی اجازت نہ دی۔ اگر ضمانت اُٹھ گئی تو رسالہ فوراً نکل آئے گا چھپ کٹ سل کر تیار ہے۔ اگر اجازت نہ ملی تو معاملہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ میرے پاس نہ روپے ہیں نہ پرامیسری نوٹ نہ سیکیورٹی۔ کسی سے قرض لینا نہیں چاہتا۔ یہ سال کا آغاز ہے۔ چار پانچ سو وی۔ پی جاتے تو کچھ روپے ہاتھ آتے۔ لیکن اب شاید ایسا نہیں ہو سکے گا۔

اس دوران میں میں نے "جاگرن" (ایک رسالہ) لے لیا ہے۔ "جاگرن" کے بارہ شمارے نکلے لیکن خریداروں کی تعداد دو سو سے آگے نہ بڑھی۔ اشتہار تو ویاس جی نے بہت کیا لیکن کسی وجہ سے رسالہ نہ چلا۔ انھیں اس پر لگ بھگ پندرہ سو کا گھاٹا رہا وہ رسالے کو بند کرنے جا رہے تھے۔ مجھ سے بولے اگر آپ اسے نکالنا چاہیں تو لے لیں میں نے اسے لے لیا۔ ہفتہ وار اخبار کی صورت میں نکالنے کا ارادہ ہے۔ پہلا شمارہ اس جنم اشٹمی سے شائع ہو گا۔ تمھارا ارادہ بھی ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا تھا یہ سب سامان تمھارے ہی لئے ہے۔ میں جب تک اسے چلاتا ہوں اس کے بعد یہ تمھاری ہی چیز ہو گی۔ سرمائے کا فقدان ہے "ہنس" میں کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں لیکن ہفتہ وار اخبار نکالنے کے لالچ کو روک نہ سکا۔ کوششیں کر رہا ہوں کہ اخبار عوام الناس کے رجحانات کا آئینہ دار ہو۔ اس کام میں بھی ہزاروں کا گھاٹا ہو گا لیکن کیا کروں یہاں تو زندگی ہی ایک مسلسل گھاٹا ہے۔"

ایک گلے کا خط دیکھئے

"پیارے جے نیندر۔ آداب عرض۔

بھئی واللہ مانتا ہوں۔ جون گیا۔ جولائی گیا اور اگست کا بھی میٹر جانے والا ہے۔ لیکن حضور کو یاد ہم نہیں کیوں یاد آئے۔ بڑا آدمی ہونے میں یہی تو عیب ہے۔ روپے تو ابھی کہیں سے ملے نہیں لیکن شہرت تو مل ہی گئی ہے اور شہرت یافتہ شخص سرمایہ دار شخص سے کم جھلکڑ اور مغرور نہیں ہوتے۔

اچھا دل لگی چھوڑو۔ یہ بات کیا ہے تم کیوں مجھ سے تنے بیٹھے ہو نہ کہانی بھیجتے ہو نہ خط کہانی نہ بھیجو خط تو بھیجتے رہو میں تو ادھر بہت پریشان رہا۔ یاد نہیں آ رہا کہ پہلے بھی یہ داستان لکھ چکا ہوں یا نہیں بیٹی کے یہاں بچہ پیدا ہوا اور زچگی میں ہی اُسے بخار نے جکڑ لیا۔ مرتے مرتے بچی۔ ابھی تک نیم جان ہے۔ بچہ بھی کسی طرح بچ گیا ہے۔ آج بیس روز ہوئے یہاں آگئی ہے۔ اس کی ماں بھی دو مہینے اس کے ساتھ رہی۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ بیمار پڑا۔ دانتوں میں تکلیف ہوئی۔ مہینوں اس میں لگے۔ دست آئے اور ابھی تک کچھ نہ کچھ شکایت باقی ہے دانتوں کے درد سے بھی پنڈ نہیں چھوٹا۔ بڑھاپا بذاتِ خود ایک مرض ہے اور اب اس نے قبول کروا لیا ہے کہ میں [illegible] آ چکا ہوں۔

نظر انداز کر سکتے ہیں "۔

مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا۔ میں نے کہا "تو کیا اسی بنا پر یقین کرنا ہوگا؟ خدا میں تو آپ یقین نہیں رکھتے "۔

پریم چند جی سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "جب نیند ر میں کہہ چکا ہوں۔ میں خدا تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے یقین نہیں کر سکتا۔ کیسے یقین کروں جب میں دیکھتا ہوں کہ بچہ بلک رہا ہے، مریض تڑپ رہا ہے۔ یہاں بھوک ہے۔ افلاس ہے مصیبتیں ہیں۔ اس صورت میں مجھے یہاں خدا کی حکومت نظر نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مشکل یہ ہے کہ خدا کو مان کر اسے رحمدل بھی ماننا پڑتا ہے۔ مجھے وہ رحمدلی کہیں نظر نہیں آتی ۔۔۔ کیا تمھیں خدا پر یقین ہے؟ "

میں نے کہا "اس سے بچنے کا راستہ مجھے نظر نہیں آتا "

پریم چند جی خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں گویا جسمی اور دُور کسی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔

دفتر پہونچ کر ان صاحب کو میرا ہاتھ دکھایا گیا۔ انھوں نے کافی بحث طلب باتیں کیں۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ جو کچھ بتایا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ دفتر سے لوٹتے وقت پریم چند جی نے پوچھا "کہو اب کیا کہتے ہو "۔

میں نے کہا "جیوتش بدیا پر میرے یقین کے نہ ہونے کی بات پوچھتے ہیں تو وہ جوں کا توں ہے "۔

یہ سُن کر پریم چند جی کو افسوس ہوا۔ اس جواب میں انھیں دوسروں کے تجربوں کی توہین معلوم ہوئی۔ پریم چند جی کے دل میں بنیادی عنصر یعنی خدا کے بارے میں اگرچہ لایقینی تھی لیکن انسان کی تخلیق کردہ سائنس اور اس کے نتائج پر ان کا یقین مستحکم تھا۔ توہین چاہے وہ کسی قسم کی ہو اس سے انھیں نفرت تھی وہ کچھ بھی تھے لیکن کٹر ہرگز نہیں تھے۔ مذہب کی مخالفت لیکن جیوتش بدیا میں اُن کا اس قسم کا یقین ۔۔۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ دیکھ کر کبھی کبھی مجھے تجسس بھی ہوا مگر میں نے اُن کی زندگی میں ہمیشہ اِن دونوں متضاد قسم کے نظریات کو نبھتے دیکھا ہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہ جوں کا توں مان لیتے تھے اور کئی بڑی بڑی باتوں میں وہ بڑے بیباک اور نڈر مصلح تھے۔

رات کو جب چلنے کی بات آئی تب بولے "تو آج ہی تم چل دو گے۔ میں سمجھتا تھا کہ کچھ روز رہو گے "۔

اِن کے الفاظ میں کچھ زیادہ اصرار نہیں تھا۔ اُن کے مزاج میں اصرار تھا ہی نہیں۔ کسی کے آنے جانے کی آسانی کے درمیان وہ کبھی اپنی خواہش کو حائل نہیں کرتے تھے۔ کسی کے کام میں دخل انداز ہونے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں سے ملتے ہوئے بھی انھیں تذبذب ہوتا تھا کہ کہیں وہ اِن کا وقت تو نہیں ضائع کر رہے۔ آج کے مشینی دور میں اُن کے مزاج کی یہ خصوصیت بہت ہی بیش بہا تھی۔ ادب دوستوں کو بھلے ہی یہ پسند نہ آئے۔

پھر سنہ ۱۹۳۰ء کی قومی تحریک آ گئی جس میں بہت سے لوگ جیل چلے گئے۔ اس دوران میں پریم چند جی نے "ہنس" نکالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خوش قسمتی ہی ہوئی کہ وہ جیل نہیں گئے۔ اِنکا جیل سے باہر رہنا زیادہ سخت عبادت تھی۔ جیل میں مجھے جو اُنکے خطوط ملے اِن سے مجھے معلوم ہوا کہ پریم چند جی کی بدلت مجھے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ شروع میں ہی پریم چند جی نے اطلاع دی ۔۔۔ "میری بیوی صاحبہ پکٹنگ کے جرم میں دو مہینے کی سزا پا گئی ہیں۔ کل فیصلہ ہوا ہے۔ اِدھر پندرہ دن تک اسی میں پریشان رہا۔ میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ انھوں نے خود جا کر میرا راستہ بند کر دیا "۔

اِن کے خطوط میں ہندی ادب پر بھی بہت بحث ہوتی تھی۔ اور کچھ اپنے دل کی۔ اپنے حالات کی اور سکھ دُکھ کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

83885
Date 7-11-85

ایک خط میں انھوں نے لکھا۔

"...... ' غبن ' ابھی تیار نہیں ہوا۔ ابھی سو صفحات اور ہوں گے یہ ایک سماجی واقعہ ہے میں پُرانا ہو گیا ہوں اور پُرانے طرزِ تحریر کو نبھائے جا رہا ہوں۔ کہانی کو درمیان سے شروع کرنا یا اس طرح شروع کرنا کہ جس سے ڈرامہ کا سا انداز پیدا ہو جائے میرے لیے مشکل ہے"

انکی اقتصادی حالت کا اندازہ اس خط سے کیجئے۔

" پیارے جے نیندر تمھارا خط کئی دن کے بعد ملا۔ مجھے امید تھی کہ دہلی (گھر) سے آ رہا ہوگا لیکن آیا لاہور (جیل) سے۔ خیر لاہور (جیل) ملتان (جیل) سے کچھ کم دُور ہے۔ اس سے کئی دن پہلے میں نے ملتان بھی ایک خط بھیجا تھا شاید وہ لوٹ کر آگیا ہو۔ تمھیں مل گیا ہو۔ اچھا میری کہانی سنو "ہنس" کی ضمانت مانگی گئی۔ میں سمجھا تھا آرڈی نینس کے ساتھ ضمانت بھی ختم ہو جائیگی لیکن نیا آرڈی نینس آگیا اور اس کے ساتھ ضمانت بھی بدستور قائم رہی جون اور جولائی کا شمارہ ہم نے چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن جب منیجر صاحب نیا ڈکلیریشن دینے گئے۔ تو مجسٹریٹ نے رسالہ جاری کرنے کی اجازت نہ دی۔ اگر ضمانت اُٹھ گئی تو رسالہ فوراً نکل آئے گا چھپ۔ کٹ۔ سل کر تیار ہے۔ اگر اجازت نہ ملی تو معاملہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ میرے پاس نہ روپے ہیں نہ پرامیسری نوٹ نہ سیکیوریٹی۔ کسی سے قرض لینا نہیں چاہتا۔ یہ سال کا آغاز ہے۔ چار پانچ سو وی۔ پی جاتے تو کچھ روپے ہاتھ آتے۔ لیکن اب شاید ایسا نہیں ہو سکے گا۔

اس دوران میں میں نے "جاگرن" (ایک رسالہ) لے لیا ہے۔ "جاگرن" کے بارہ شمارے نکلے لیکن خریداروں کی تعداد دو سو سے آگے نہ بڑھی۔ اشتہار تو ویاس جی نے بہت کیا لیکن کسی وجہ سے رسالہ نہ چلا۔ انھیں اس پر لگ بھگ پندرہ سو کا گھاٹا رہا وہ رسالے کو بند کرنے جا رہے تھے۔ مجھ سے بولے اگر آپ اسے نکالنا چاہیں تو لے لیں میں نے اسے لے لیا۔ ہفتہ وار اخبار کی صورت میں نکالنے کا ارادہ ہے۔ پہلا شمارہ اس جنم اشٹمی سے شائع ہوگا۔ تمھارا ارادہ بھی ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا تھا یہ سب سامان تمھارے ہی لئے ہے۔ میں جب تک اسے چلاتا ہوں اس کے بعد یہ تمھاری ہی چیز ہوگی۔ سرمائے کا فقدان ہے "ہنس" میں کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں لیکن ہفتہ وار اخبار نکالنے کے لالچ کو روک نہ سکا۔ کوششیں کر رہا ہوں کہ اخبار عوام الناس کے رجحانات کا آئینہ دار ہو۔ اس کام میں بھی ہزاروں کا گھاٹا ہوگا لیکن کیا کروں یہاں تو زندگی ہی ایک مسلسل گھاٹا ہے "

ایک گلے کا خط دیکھئے

"پیارے جے نیندر۔ آداب عرض۔

بھئی واہ جانتا ہوں۔ جون گیا۔ جولائی گیا اور اگست کا بھی میٹر جانے والا ہے۔ لیکن حضور کو یاد ہو نہیں کیوں یاد آئے بڑا آدمی ہونے میں یہی تو عیب ہے۔ روپے تو ابھی کہیں سے ملے نہیں لیکن شہرت تو مل ہی گئی ہے اور شہرت یافتہ شخص سرمایہ دار شخص سے کم جھلکڑ اور مغرور نہیں ہوتے۔

اچھا دل لگی چھوڑو۔ یہ بات کیا ہے تم کیوں مجھ سے تنے بیٹھے ہو نہ کہانی بھیجتے ہو نہ خط کہانی نہ بھیجو خط تو بھیجتے رہو میں تو ادھر بہت پریشان رہا۔ یاد نہیں آ رہا کہ پہلے بھی یہ داستان لکھ چکا ہوں یا نہیں بیٹی کے یہاں بچہ پیدا ہوا اور زچگی میں ہی اُسے بخار نے جکڑ لیا۔ مرتے مرتے بچی۔ ابھی تک نیم جان ہے۔ بچہ بھی کسی طرح بچ گیا ہے۔ آج بیس روز ہوئے یہاں آگئی ہے۔ اس کی ماں بھی دو مہینے اس کے ساتھ رہی۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ بیمار پڑا۔ دانتوں میں تکلیف ہوئی۔ مہینوں اس میں لگے۔ دست آئے اور ابھی تک کچھ نہ کچھ شکایت باقی ہے دانتوں کے درد سے بھی پنڈ نہیں چھوٹا۔ بڑھاپا بذاتِ خود ایک مرض ہے اور اب اس نے قبول کر دایا ہے کہ میں ۔۔۔ آ چکا ہوں۔

کام کی کچھ نہ پوچھو بے ہودہ کام کر رہا ہوں۔ کہانیاں صرف دو لکھی ہیں۔ اردو اور ہندی میں ہاں کچھ ترجمے کا کام کیا ہے۔

"سرسوتی" (ایک رسالہ) میں تم نے وہ نوٹ دیکھا؟ آج معلوم ہوا کہ یہ فلاں صاحب کی نوازش ہے۔ میں تو خیر بوڑھا ہو گیا ہوں جو کچھ لکھ سکتا تھا لکھ چکا اور دوستوں نے مجھے آسمان پر چڑھا دیا۔ لیکن تمھارے ساتھ یہ کیا سلوک؟ اور چترسین (ہندی کے ایک مانے ہوئے ادیب) کو کیا ہو گیا ہے کہ "اسلام کا وش ورکش" (اسلام کا زہریلا درخت) لکھ ڈالا اس پر ایک تنقید تم لکھو اور کتاب میرے پاس بھیجو۔ اس فرقہ دارانہ پروپگنڈے کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا......"

حالات نے ان پر کبھی رحم نہیں کیا۔ پریم چند جی نے بھی ان سے کبھی رحم نہیں مانگا۔ وہ مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔ پوری عمر اسی میں گزاری۔ پھر بھی نئے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے انھیں خوف نہ آتا تھا۔ وہ بچتے نہ تھے۔ قرض سے کتراتے نہ تھے۔ پیسے کا انھیں لالچ نہیں تھا۔ ہاں گھاٹے کا ڈر ضرور تھا۔ آمدنی چاہے کوڑی کی نہ ہو۔ لیکن اوپر سے گھاٹے کا بھوت تو منھ پھاڑے کھانے کو نہ دوڑے۔ اتنا ہی چاہیئے۔ لیکن اتنا بھی نہ ہوا۔ اس گھاٹے نے ان کی کمر توڑ دی۔ "ہنس" چلایا، "جاگرن" چلا۔ دونوں ان کا تن من تو لیتے ہی تھے۔ اوپر سے پیسہ بھی مانگتے تھے۔ پیسہ ان کے پاس دینے اور مسلسل دیتے چلے جانے کے لئے کہاں تھا۔ آخر فلمی دنیا کی طرف سے آئے ہوئے ایک دعوت نامہ پر انھیں غور کرنا پڑا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۴ء کو انھوں نے ایک خط میں لکھا۔

"...... تمھارا خط عین انتظار کی حالت میں ملا۔ تم سے مشورہ کرنے کی خاص ضرورت آپڑی ہے۔ بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کنٹریکٹ کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ۔ میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں فروخت کروں۔ میں اس سلسلہ میں تمھاری رائے ضروری سمجھتا ہوں۔ کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے میں جو چاہوں لکھوں۔ جہاں چاہے لکھوں۔ ان کے لئے چار پانچ سینریو تیار کر دوں۔ سوچتا ہوں کہ ایک سال کے لئے چلا جاؤں سال بھر وہاں رہنے کے بعد کچھ ایسا کنٹریکٹ کر لوں کہ یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں۔ اور چار پانچ ہزار روپئے مل جایا کریں۔ اس لئے "جاگرن" اور "ہنس" دونوں مزے سے چلیں گے اور پیسے کی دقت جاتی رہےگی۔"

میرے اور دوسرے دوستوں کے مشورہ نہ دینے پر وہ بمبئی گئے۔ اقتصادی حالت نے مجبور کر دیا لیکن تجربے نے بتایا کہ وہ وہاں کے قابل نہیں تھے۔ فلم اور پریم چند دونوں متضاد چیزیں تھیں وہاں سے انھوں نے لکھا۔

"میں جن ارادوں سے آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس انداز کی کہانیاں بناتے آئے ہیں۔ اس لکیر سے جو برابر بھی نہیں ہٹ سکتے۔ Entertainment کو یہ لوگ vulgarity value کہتے ہیں۔ عجیب و غریب ان کا ایمان ہے۔ راجہ۔ رانی ان کے وزیروں کی سازشیں نقلی لڑائی۔ بوسے بازی یہی ان کے مخصوص موضوعات ہیں۔ میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں۔ جسے پڑھے لکھے لوگ بھی دیکھنا چاہیں لیکن ان کو فلماتے ہوئے انھیں شبہ ہو رہا ہے کہ چلیں نہ چلیں۔ یہ سال تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرضدار ہو گیا تھا۔ قرض اتار دونگا لیکن اور کچھ حاصل نہیں۔ ناول "گودان" کے چند آخری صفحات لکھنے باقی ہیں۔ ادھر۔۔۔ ہنس جاتی جی چاہتا ہے یہاں چھٹی پا کر اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں۔

وہاں پیسہ نہیں ہے۔ مگر اطمینان ضرور ہے۔ یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں"۔ ان کا ایک فلم بنا تھا "مزدور"۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:

"مزدور تمھیں پسند نہ آیا۔ یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے اپنا کہہ بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی کہہ سکتا ہوں۔ اس کے بعد ہی ایک اس کے بھی ایک رومانس آ رہا ہے۔ وہ بھی میرا نہیں ہے میں اس میں بہت تھوڑا سا ہوں۔ فلم میں ڈائرکٹر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ادیب قلم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ڈائرکٹر ملکی علمداری ہے اور اس کے راج میں ادیب کی حکومت نہیں چل سکتی۔ وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ "میں عوام کے رجحانات کو جانتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے"۔ اس کے برعکس ڈائرکٹر بڑے زور سے کہتا ہے "میں جانتا ہوں عوام کیا چاہتے ہیں اور ہم یہاں عوام کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے کاروبار کھولا ہے۔ دولت کمانا ہماری غرض ہے۔ جو چیز عوام مانگیں گے وہی ہم دیں گے"۔ اس کا جواب یہی ہے "اچھا صاحب ہمارا اسلام قبول کیجیے ہم گھر جاتے ہیں"۔ وہی میں کر رہا ہوں۔ مئی کے آخر میں بندہ بنارس میں بیٹھا ناول لکھ رہا ہوگا۔ اسکے علاوہ مجھ میں کسی نئے فن کو نہ سیکھنے کی بھی "صفت" رہی ہے۔ فلم لائن میں میرے دل کو اطمینان نہیں مل سکا۔ اطمینان ڈائرکٹروں کو بھی نہیں مل ملتا لیکن وہ کچھ اور نہیں کر سکتے جھک مار کر پڑے رہتے ہیں۔ میں کچھ اور کر سکتا ہوں چاہے وہ بیگار ہی کیوں نہ ہو اسلئے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں جو پلاٹ سوچتا ہوں اس میں آدرش واد گھس آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں Entertainment value نہیں ہے اسے میں تسلیم کرتا ہوں مجھے لوگ بھی ایسے ملے جو نہ ہندی جانیں نہ اُردو۔ انگریزی میں ترجمہ کر کے انھیں کہانی کا مفہوم سمجھنا پڑتا ہے ورنہ کام کچھ نہیں بنتا۔ میرے لئے وہی پرانی لائن مزے کی ہے جو چاہا لکھا۔"

اس طرح فلم لائن بھی کنارہ کر کے انھیں واپس آنا پڑا۔ اسکے بعد وہ کچھ زیادہ دنوں تک نہیں زندہ رہے۔

مرنے سے ایک سوا مہینے پہلے کی بات ہے۔ پریم چند جی چارپائی پر پڑے تھے۔ مرض بڑھ گیا تھا چل پھر نہیں سکتے تھے لیکن چہرے پر مکمل سکون تھا۔

ایسی حالت میں ایک دن انھوں نے کہا "جے نیندر لوگ ایسے وقت میں خدا کو یاد کیا کرتے ہیں مجھے بھی خدا یاد دلایا جاتا ہے لیکن ابھی تک مجھے خدا کو تکلیف دینے کی ضرورت معلوم نہیں ہوئی"۔ الفاظ آہستہ آہستہ بڑی دل جمعی سے کہے گئے تھے اور میں اس انتہائی مطمئن دہریے درویش کی طاقت پر حیران تھا۔

مو۔۔سے ایک رات قبل بھی میں اُن کی کھاٹ کے برابر بیٹھا تھا۔ صبح سات بجے انھیں اس دنیا سے اُٹھ جانا تھا۔ بہت سویرے مجھ سے باتیں ہوئیں۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ سب سو گئے پڑے تھے۔ الفاظ اُن کے منہ سے پھسپھسا کر نکل جاتے تھے کانوں سے زیادہ انھیں دل سے سُننا پڑتا تھا۔ رات کے بارہ بجے "ہنس" کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اپنی امیدوں و تمناؤں کو وہ کچھ الفاظ کے ذریعہ اور کچھ آنکھوں کے ذریعہ مجھ پر ظاہر کر چکے تھے۔ "ہنس" اور ادب کی فکر انھیں اس وقت کھائے جا رہی تھی۔ اپنے بچوں کا مستقبل بھی اُنکے ذہن پر بار بنا ہوا تھا۔ مجھ نے انھیں کچھ ڈھارس دی تھی۔ اب تین بجے رات کے وقت میں اُن کے پھولے ہوئے ہاتھ کو جیسے انھوں نے دابنے کو کہا تھا اپنے ہاتھ میں لیکر سوچ رہا تھا کہ کیا مجھ سے جو انکی ڈھارس ہے وہ صحیح ہے؟ رات کے بارہ بجے میں نے ان سے کچھ بحث کرنے کی زیادتی بھی کی تھی۔ وہ کانٹا میرے دل میں کھٹک رہا تھا ــــ کیا کہوں؟ کیا کروں؟

اتنے میں پریم چند جی بولے ــــ "جے نیندر" اور یہ کہہ کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اُنکی

ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے دبا دیا۔ اُنکی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کچھ فکر نہ کیجیئے بابوجی۔ آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ پھر کام کرنے کے لئے ہم سب لوگ موجود ہی ہیں"

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد یکایک وہ بولے۔

"بس آدرش سے کام نہیں چلے گا" میں نے کہنا چاہا ـــ "آدرش"۔

"بحث نہ کرو" اور یہ کہہ کر انھوں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔

اس وقت میرے دل پر لاچاری کا ایک ناقابل برداشت بار آ پڑا. . . . .

. . . . اس وقت پریم چند کو طرح طرح کی پریشانیاں گھیرے ہوئے تھیں، میں یا کوئی اور ان پریشانیوں کو کسی طرح نہ بٹا سکتا تھا۔ پریشانیوں کا مرکز یہی تھا کہ "ہنس" کیسے چلے گا، نہیں چلے تو کیا ہوگا؟ "ہنس" کے لئے جینز کی اسوقت بھی انھیں حسرت تھی۔ اور "ہنس" نہ جئے گا یہ تصور اُن کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ "ہنس" کیلئے اسوقت نہ جانے وہ کس درجہ جھکنے کرنے کو تیار تھے۔

میری خواہش تھی کہ ان سے کہوں ـــ "ہنس" نہیں مریگا۔ وہ جھکے بنا جئے گا۔ وہ آپکا رسالہ ہے پھر وہ کس طرح جھک سکتا ہے" لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا اور کوئی تسلی اس شہنشاہ ادب کو نہ پہونچا سکی۔

تھوڑی دیر بعد بولے ـــ "گرمی بہت ہے پنکھا کرو"۔ میں پنکھا کرنے لگا انھیں نیند نہ آتی تھی۔ تکلیف بے حد تھی لیکن کراہتے نہیں تھے۔ چپ چاپ آنکھیں کھولے پڑے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد بولے "جاؤ جے نیندر سوؤ"۔

معلوم کیا تھا کہ اب چند گھڑیاں باقی ہیں میں جاکر سو رہا۔

صبح ہوتے ہوتے انھیں ایسا غش آیا کہ پھر دوبارہ حواس نہ لوٹے۔

پریم چند کو گئے اب اٹھارہ برس ہوتے ہیں۔ لیکن دل کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ وہ اب جنت کے ہیں۔ ہمارے سماج اور زمانے کے نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اٹھا کر موت نے غلطی ہی کی ہے۔ نہ اُن کی عمر اس قابل تھی نہ کسی طرح وہ وقت سے پیچھے تھے۔ تھے تو ایک قدم آگے تھے اور موجودہ حالات میں شاید وہ پہلے سے بھی زیادہ صحیح اور ضروری ثابت ہوتے۔

"نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء"

بسلسلہ مضمون صفحہ ۳۶ (کتابوں کی باتیں)

بسلسلہ مضمون صفحہ ۳۶

چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کے نظریات افکار اور حسن کلام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

میں سانس لیتا نہیں اجنبی فضاؤں میں
مجھے تلاش کرو تم میری نواؤں میں

اپنی ذات ہی گویا ایک انجمن ٹھہری
ہم سجائے بیٹھے ہیں بزم آگہی تنہا

شعور دیدہ وری کچھ مذاق عام نہیں
سمیٹ لایا ہوں جلوے حسین خوابوں سے

لہجے میں ہے کچھ درد کچھ الفاظ میں رس ہے
لفظوں کی حلاوت بھی ایک آزار نفس ہے

عصر حاضر کے تقاضوں کو نہ ٹالا جائے
زندگی کو نئے ماحول میں ڈھالا جائے۔

خوبصورت کتابت و طباعت کا مرقع یقیناً مقبول ہوگا۔ اور ساغر دل سے اُٹھنے والی موج کم و کیف" اور مستیٔ جذبات اثر وہاں تک پہونچے گی۔ جس کی تمنا اثر انصاری نے کی ہے۔

نمائندہ شعر و ادب :

اَدبی تقریبات

جنوری، فروری اور مارچ ۱۹۸۱ء کے درمیان لکھنؤ کے شعری و ادبی ماحول میں جو زندگی اور رہا ہمی نظر آئی اُس نے کسی حد تک، گذشتہ کئی برسوں کی کمی کو پورا کر دیا۔

شعری نشستوں، ہنگامی مشاعروں، سرکاری و نیم سرکاری نمائشوں اور ادبی سیمینار نے نہ صرف یہ کہ اردو دوستوں اور ادب نوازوں کے لئے دلبستگی کا سامان فراہم کیا۔ بلکہ شہر کی فضا میں ایک ادبی ہلچل کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اردو اور قومی یکجہتی کے نام پر ہونے والی متعدد تقاریب نے دلدادگانِ شعر و ادب کو خوش فکر اور خوش گو شعراء کے کلام سے زیادہ نوازا مگر اُردو زبان کے مستقبل کے بارے میں کوئی جامع پروگرام نہیں پیش کیا۔

۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ کے موقع پر ضلع انتظامیہ [illegible] سے ایک بزمِ مشاعرہ مقامی ڈسٹرکٹ بورڈ ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت مسٹر جسٹس مرتضیٰ حسین نے فرمائی۔ [illegible] مقامی [illegible] شعراء نے شرکت فرمائی۔

[illegible] جنوری کو [illegible] انڈیا جوہر اکیڈمی لکھنؤ کی جانب [illegible] آزادی مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ گنگا پرشاد ورما ہال لکھنؤ میں ہونے والی اس تقریب کی صدارت [illegible] سید علی الرضوی صاحب ایم۔ ایل۔ سی۔ اور افتتاح مسٹر ظفر علی نقوی نائب وزیر نے فرماتے ہوئے بے باک مقرر، ممتاز صحافی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سابق صدر مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر مسٹر سبط رضی ممبر راجیہ سبھا اور جلسہ کے منتظم مسٹر اطہر نبی نے بھی مولانا کی حیات، شاعری اور حصول آزادی کے لئے اُن کی جد و جہد پر روشنی ڈالی۔ ممتاز شاعر عمر انصاری اور شاداں بارہ بنکوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تقاریر کے بعد ایک کامیاب مشاعرہ ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر بشیر بدر نے کی۔ مختصر شعری نشست میں بیکل اُتساہی، ڈاکٹر ساغر اعظمی، بشیر بدر، عرفان لکھنوی، ساجد صدیقی، والی آسی، رئیس انصاری وغیرہ نے اپنا کلام سنایا۔

۱۵ فروری کو دن میں بزم شعراء لکھنؤ کی جانب سے ایک کامیاب شعری نشست ڈاکٹر ایس۔ آر۔ رضوی کی رہائش گاہ واقع ڈالی گنج پر ہوئی جسکی صدارت سید اطہر حسین آئی۔ اے۔ ایس نے فرمائی اور افتتاح مسٹر جسٹس مرتضےٰ حسین صاحب نے اپنی تقریر میں شعراء کو موجودہ حالات کی جانب متوجہ کیا اور انھیں اپنی شیریں زبان کے ذریعہ ملک میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور نفرت و تنگ نظری کے خلاف آواز اٹھانے کی تلقین کی۔

نشست میں تقریباً تیس شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ جن میں عمر انصاری، سید نواب افسر، ڈاکٹر ولی الحق انصاری، تین سلونوی، نہال رضوی، شارب لکھنوی، عرفان لکھنوی، انجم ملیح آبادی، عرفان صدیقی، رباب رشیدی، شمس فرخ آبادی، شاہجہاں بانو یاد اور آثر عباسی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں نشست کے درمیان ڈاکٹر رضوی نے ایک عصرانہ بھی دیا جس نے نشست کو کافی تقویت پہونچائی۔

۱۷ فروری کی شب میں ڈاکٹر ولی الحق انصاری صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے مجموعۂ کلام "غزالانِ خیال" کی رسم اجراء کی تقریب اُردو سماج لکھنؤ کے زیر اہتمام رونمدار الیہ لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر کے این، کول نے مجموعہ کی رسم اجراء انجام دی اور مسٹر جسٹس مرتضےٰ حسین نے ڈاکٹر ولی الحق کے مجموعہ کو ایک بصیرت افروز مقالہ سے نوازا حیات اللہ انصاری نے ڈاکٹر ولی الحق کی ابتدائی زندگی اور جد و جہد پر روشنی ڈالی۔ اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی و سید اطہر حسین نے عقیدت کے پھول نچھاور کئے۔ اس موقع پر عرفان عباسی نے ایک پر لطف خاکہ پڑھا اُردو سبھا کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سلمان عباسی نے ادارے کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ تقریب کے درمیان شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر رضوان علوی نے بزمِ شعراء کی جانب سے عمر انصاری، انجمن فردوس ادب کی جانب سے عرفان لکھنوی، گہوارہ اکیڈمی کی جانب سے انجم ملیح آبادی اور ادب گھر کی جانب سے شمس فرخ آبادی نے ڈاکٹر انصاری کی گلپوشی کی رسم اجراء کی تقریب کا اختتام ایک شعری نشست پر ہوا جس میں منتخب مقامی [illegible] عرفان صدیقی تاباں جھانسوی، آیا زجھانسوی اور مخمور سعیدی نے بھی اپنا کلام سنایا۔

۲۰ فروری کو اُردو ہندی ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے سبکا رتا بھون لکھنؤ میں ایک کامیاب تقریب ہوئی جس میں ممتاز شاعر غلام ربانی تاباں کو ایوارڈ اور سند سے نوازا گیا اور عرفان عباسی کی کتاب "تذکرہ شعراء اودھ" کی رونمائی ہوئی۔ اتر پردیش کے گورنر شری سی۔ پی۔ این سنگھ کی شرکت نے اس تقریب کی اہمیت میں ایک خاص اضافہ کیا۔ اس موقع پر ایک کامیاب مشاعرہ بھی ہوا جس میں ہندوستان کے مشاہیر شعراء نے باذوق سامعین کی کثیر تعداد کو اپنے شیریں کلام سے نوازا۔ غلام ربانی تاباں، کیفی اعظمی، نذیر بنارسی، نشور واحدی، نازش پرتاپگڈھی، بیکل اتساہی، ڈاکٹر بشیر بدر، وسیم بریلوی، شاذ تمکنت، حسن کمال، عالم فتحپوری اور ڈاکٹر ساغر اعظمی کی شرکت اس مشاعرے کی کامیابی کی ضامن ہے۔

۲۱ فروری کو اتر پردیش کے مختلف محکموں کے تعاون سے حضرت محل پارک میں "جشن لکھنؤ" کے نام سے ہونے والی نمائش میں بھی ایک ہنگامہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں شعراء کی کثرت نے ادبی ماحول کو انتشار و بدمزگی میں تبدیل کر دیا۔ تقریباً چار، پانچ ہزار سامعین کی موجودگی میں سرکاری منتظمین نے سفارشوں اور تعلقات سے نواز کر کچھ ایسے شعراء بھی پیش کئے جو سامعین کے ذوقِ سماعت پر بار رہے۔ اگر اس مشاعرہ میں احباب نوازی اور سفارشات کا دخل نہ ہوتا تو کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، شاذ تمکنت، نازش پرتاپگڈھی، ڈاکٹر بشیر بدر، جگناتھ آزاد، وسیم بریلوی، نذیر بنارسی، نشور واحدی، عمر انصاری، عالم فتحپوری، سید نواب افسر، [illegible] نظامی وغیرہ بھی مشاعرے کی کامیابی کے ضامن ہوتے۔

۲۴ فروری کو دن میں اُردو ہندی ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے اُردو اکادمی لکھنؤ کے ہال میں پروفیسر جگناتھ آزاد کی صدارت میں ایک سیمنار ہوا جس میں "ترقی پسندی اور احتجاج" کے موضوع پر عابد سہیل نے ایک پیپر پڑھا۔ اُور اُس پر عمیق حنفی، جگناتھ آزاد، غلام ربانی تاباں، حیات اللہ انصاری، کیفی اعظمی حسن کمال، ڈاکٹر آفتاب اختر، شاہنواز قریشی، ابراہیم علوی اور اختر الملک نے بحث کی مجموعی طور پر یہ مباحثہ بہت کامیاب رہا۔

اسی رات امین الدولہ پارک لکھنؤ میں قومی یکجہتی کے نام سے ہونے والی نمائش میں بھی ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ نمائش کے منتظمین نے لکھنؤ میں بیرونی شعراء کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کو زیادہ اہمیت دی۔ لیکن نمائش میں لگنے والے بینروں کی جانب کوئی توجہ نہ دی جنمیں اُردو کا کہیں بھی ذکر نہ تھا۔

۷ مارچ کی شب میں آل انڈیا ہندی اُردو سنگم لکھنؤ کے زیر اہتمام گنگا پرشاد میموریل ہال میں قومی ایکتا سمیلن مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اِس تقریب کی صدارت ڈاکٹر فاروق عبداللہ۔ ایم۔ پی نے کی اور افتتاح شری شیام لال یادو ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا نے کیا۔ شہر میں قومی یکجہتی کے نام پر ہونے والی حالیہ تقاریب کے مقابلہ میں یہ سمیلن اِس اعتبار سے زیادہ کامیاب رہا کہ اِس میں باہمی اتحاد کو فروغ دینے، اور ملک میں انسانیت کا پرچم بلند کرنے کی جانب خاص طور سے توجہ دی گئی۔

اِس موقع پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے زبان کے مسئلہ کو مذہب سے جوڑنے کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے کہا کہ نہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور نہ اُردو مسلمان کی۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو کشمیر میں ہندی اور پنجاب میں اُردو نہ ہوتی۔ فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ نے کہا یہ ملک کے لئے بدنما داغ ہیں۔ انھوں نے کہا جو انسان دوسرے انسان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام نہیں کر سکتا۔ وہ ملک و قوم کا وفادار نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے نہایت جرأتمندانہ انداز میں کہا کہ ہم وہ ہندوستان دیکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں مسلم مسجد میں نماز پڑھ سکیں، ہندو مندر میں جا سکیں اور سکھ اپنے گردواروں میں عبادت کر سکیں۔

راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیرمین شری شیام لال یادو نے بھی ڈاکٹر عبداللہ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے انہیں خیالات کا اظہار کیا۔ اِس موقع پر مسٹر رفیع صدیقی۔ ایم۔ ایل۔ اے الحاج شیخ نعمت اللہ اور شری منوہر سنگھ سیٹھی نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ برلن سے آئے ہوئے مسٹر عارف نقوی نے سمینار کا افتتاح کیا اور مسٹر مصطفےٰ حسین انصاری سابق وزیر اُترپردیش نے مشاعرہ کی شمع روشن کی۔ اِس موقع پر چند شعراء اور سماجی کارکنوں کو کمیٹی کی جانب سے بطور ایوارڈ سندیں بھی دی گئیں۔

۱۷ مارچ کی شب میں بمبئی کے ممتاز فلمی موسیقار رویندر جین کی لکھنؤ آمد کے موقع پر اُن کے اعزاز میں ایک "بزم نغمہ" خوش فکر شاعر کرشن بہاری نور کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ لکھنؤ کے منتخب شعراء اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے سامعین کی موجودگی میں رویندر جین نے اپنی غزلوں اور گیتوں سے حاضرینِ بزم کو محظوظ کیا۔ بزمِ موسیقی سے قبل ایک شعری نشست ہوئی جس میں کرشن بہاری نور، عرفان لکھنوی، انجم ملیح آبادی، عرفان صدیقی، شمس فرخ آبادی، گوونِد رن نگم نفیس، اور کبیرا انجم نے اپنا کلام سنایا۔

۱۸ مارچ کی شب میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کے زیر اہتمام سوچنا کیندر حضرت گنج میں اُردو بلٹز کے اڈیٹر حسن کمال کے اعزاز میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔

خبر ہے کہ محکمۂ اطلاعات کے ذمہ داروں نے حسن کمال کو یہ اعزاز ایک صحافی کی حیثیت سے دیا تھا کہ شاعر کی حیثیت سے۔ اگر صحافی کی حیثیت سے اُن کو یہ اعزاز دیا گیا تو ممکن ہے اسمیں محکمہ کے ذمہ داروں کی کچھ مصلحتیں شامل ہوں جبکہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور اگر یہ اعزاز ایک شاعر کو دیا گیا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ حال ہی میں شہر میں آنے والے دوسرے ممتاز شعراء پرو فیسر جگن ناتھ آزاد، غلام ربانی، تاباں، کیفی اعظمی شاذ تمکنت ..... بابا قسیم کے اعزاز سے کیوں نہیں نوازا گیا۔ جن کا شعری و ادبی سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہرنوع اس نشست کو صدر محفل ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے سراہا اور اسے ایک خوشگوار روایت قرار دیا۔ مسٹر ٹھاکر پرشاد سنگھ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات نے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کیا اور تقریب کا اختتام ایک مختصر شعری نشست پر ہوا جس میں چند مقامی شعراء نے اپنا کلام سُنایا۔

۲۸ مارچ کی شب میں شہر کی نوتشکیل ادبی انجمن "مجلس علم و ادب" کی افتتاحی تقریب چودھری اشرف الدین کی رہائش گاہ واقع نعمت اللہ روڈ پر منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت مسٹر جسٹس مرتضےٰ حسین نے فرمائی۔ اور افتتاح اُردو اکیڈمی کے صدر مسٹر علی جواد زیدی نے فرمایا۔ ابتداء میں مجلس کے سکریٹری جنرل مسٹر عمر انصاری نے مجلس کی تشکیل اور اُس کے تحت ہونیوالے دیگر پروگراموں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ نوتشکیل مجلس مقامی دوسری انجمنوں کی طرح صرف مشاعروں کے انعقاد ہی تک محدود نہیں رہے گی۔ بلکہ اس کے ذریعہ نثری ادب پر بھی کام کیا جائیگا۔ جو دوسری انجمنیں ابھی تک نہیں کرسکیں۔ سکریٹری جنرل نے مجلس کے زیر اہتمام بزرگ صحافی اور شاعر امین سلونوی اور ..... ناول نگار نسیم انہونوی کا عنقریب ہی جشن منائے جانے کا اعلان بھی کیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد طرحی مشاعرہ ہوا اور مصرع طرح — "لو یہ در ہم نے بیٹھے عرضِ ہنر کھولدئے" پر عمر انصاری، سید نواب افسر، چودھری پربھان سرورش اناوی، محضر لکھنوی، سید اطہر حسین، مضطرب سلطان نظامی، عرفان لکھنوی، انجم ملیح آبادی، عرفان صدیقی، تسنیم فاروقی، حیات وارثی، شایاں رامپوری، ڈاکٹر حبیب پرویز صدر بارہ بنکوی، جوہر آمیٹھوی، نذیر صفی پوری وغیرہ نے اپنا کلام سُنایا۔ مجموعی طور پر یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔

نمک انواری

برائے درد گردہ و پتھری

انوار کیمیکل انڈسٹریز کا شاہکار

اگر آپ کو دردِ گردہ کی شکایت ہے یا آپ کے پیٹ میں پتھری پڑ گئی ہے، تو بلا آپریشن کے اس نمک کو استعمال کرکے اپنے مرض کا ازالہ فرمایئے

عرصہ تئیس سال سے یہ نمک انواری تیر بہدف ثابت ہو چکا ہے

قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

تیر بہدف مجربات ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے طلب فرمایئے

جانِ غالب (از محمد حسین شمس الدین)

مرزا غالب کے ادبی خطوط کا نمائندہ انتخاب جس سے ان کے اندازِ فکر اور اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ قیمت: ۱/۵۰

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو / این پی ۹۳
لائسنس نمبر ۲۰۸۸/۱۲ ،۴ ۲۰۱۶
دفتر فون ۱ ۵ ۳ ۲ ۱ ۶ ۴
فون رہائش گاہ : ۴ ۷ ۵ ۵ ۴ ۴

ایڈیٹر: محمد حسین شمس علوی
قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند

مجلس ادارت:
عبدالقوی دریابادی (بی۔اے)
سعادت علی صدیقی (ایم لٹ)
محمد حسنین علوی (ایم۔اے)

ادارۂ فروغ ہند کا ترجمان
بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

شمارہ (۳) جولائی ۱۹۸۱ء جلد (۲۸)

ترتیب

مجلس ادارت
پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو — لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی ریڈر شعبۂ اردو — مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر انوار الحسن — "
پروفیسر حکم چند نیر — بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن — لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر فضل امام — راجستھان "

زرسالانہ اعزازی ... بیس ۲۰ روپے
عوام سے ..... پندرہ ۱۵ روپے
فی پرچہ ..... ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ: ادارہ فروغ اُردو ۴۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر فروغ اُردو ۴۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

۲ دو غزلیں

جنبش لبوں کو آپ جو فرما کے رہ گئے
وہ پھول تھے جو [illegible] کے رہ گئے

یوں عرضِ مدعا پہ وہ شرما کے رہ گئے
ارمان دل کے دل ہی میں بل کھا کے رہ گئے

جب بے نقاب بام پہ وہ جلوہ گر ہوئے
مہر و مہ و نجوم بھی شرما کے رہ گئے

رُخ سے نقاب اُن کے اُلٹنے کی دیر تھی
مثلِ کلیم سینکڑوں غش کھا کے رہ گئے

دُنیا تو آفتاب اُنھیں دیکھتی رہی
ہم نے نظر اُٹھائی تو شرما کے رہ گئے

آفتاب عالم (راجستھان)

جب سے اُن سے نظر ملائی ہے
آہ کیسی یہ چوٹ کھائی ہے

اُس نے جب [illegible]
[illegible] داستاں سنائی ہے

دل کی دل تک کہاں رسائی ہے
میری ہر آرزو پرائی ہے

میں ہوں تمہارے وفا میں مگر
[illegible] کے ساتھ اک جدائی ہے

موت آئی اور آ گئے وہ بھی
موت کو آج موت آئی ہے

[illegible] ہمیں دیے جس نے
اُس پہ الزام بے وفائی ہے

مُسکراتے ہیں سہمے جاتے ہیں
جانے کیا بات یاد آئی ہے

بات جب تک ہے دل میں اپنی ہے
لب پہ آئی تو ہر پرائی ہے

آفتاب آنسوؤں کو روک بھی لے
راز کھلنے میں جگ ہنسائی ہے

رُباعیات

میر مشتاق احمد

پوچھتے کیا ہو ستم کتنے اُٹھائے میں نے
کیا شمار ان کا کروں زخم جو کھائے میں نے
عشق اک کھیل نہیں کچھ مرے دل سے پوچھو
رات دن لوٹ کے کانٹوں پہ گنوائے میں نے

کیا کیا میں نے محبت میں مجھے یاد نہیں
اُن کو دل دے کے زباں پر کوئی فریاد نہیں
شوخ نظروں نے کیا دل مرا برباد ضرور
ہو کے برباد بھی لیکن کوئی برباد نہیں

دل محبت کے ہاتھوں مرا بڑھ گیا
ولولہ بڑھ گیا، حوصلہ بڑھ گیا
جتنی منزل کے پانے کی حسرت ہوئی
ہر قدم بڑھ کے خود راستہ بڑھ گیا

سعادت علی صدیقی

اپنی باتیں

ریاستی وزیر اعلیٰ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جنرل کونسل کے جلسہ منعقدہ ۱۹ اپریل سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ۱۹۸۱ء کے خاتمے سے پہلے ہی اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں جو وعدہ کیا گیا تھا، حکومت اس کی پابند ہے۔" مذکورہ جلسے کے علاوہ بھی متعدد جلسوں، میٹنگوں اور تقریبوں میں یہ خوش خبری سنائی گئی اور مختلف اقدامات کرنے کا اعلان کیا گیا جن میں سرکاری دفتروں میں اردو میں پیش کی جانے والی درخواستیں قبول کرنے کے فیصلہ پر عمل درآمد اور اردو اساتذہ کو مستقل کرنا شامل ہے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری بسوں میں اردو کا بھی استعمال ہو۔ نیز ایسے اضلاع میں جہاں اردو جاننے والوں کی آبادی ۱۵ فیصد یا اس سے زائد ہے، کلکٹر، ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتروں میں اردو جاننے والے ایک ملازم اور ٹائپسٹ کی تقرری جلد کی جائے گی۔ کابینہ کے جلسہ میں اس پر بھی غور کیا گیا کہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش کے صدر دفتر کی طرح ضلع اطلاعات دفتروں سے بھی اردو میں پریس نوٹ جاری کیے جائیں۔ جلسہ میں ریاستی محکمہ لسانیات کے اردو شعبے کو زیادہ مستحکم بنانے اور اردو کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنے پر بھی غور و خوض کیا گیا۔

یہ اعلانات بڑے دل خوش کن اور امید افزا ہیں اور جیسا کہ نیا دور کے اداریہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت وزیر اعلیٰ کی قیادت میں اردو کی توسیع و ترقی کے لئے مخلصانہ طور پر کوشاں ہے اور مؤثر اقدامات کر رہی ہے جس کے نتیجے میں لازمی طور پر اردو کے لئے سازگار فضا تیار ہوگی۔ لیکن گزشتہ ۳۳-۳۴ برسوں میں اردو والوں نے اتنے فریب کھائے ہیں اور انھیں خوب صورت اعلانات و دل کش بیانات سے جس طرح بہلایا جاتا رہا ہے کہ اسے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہے۔ [illegible] ایسے بیانات و اعلانات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک ان پر صحیح طور پر عمل درآمد نہیں ہوتا اور اردو کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کیا جاتا انھیں حکومت کی نیک نیتی اور مخلصانہ کاوشوں کا کسی طور پر یقین نہیں آئے گا۔ اردو والوں کا تجربہ و مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ایسی صورت حال تو کئی بار ایسے سامنے آئی جس سے انھیں احساس ہونے لگا کہ اردو کو انصاف ملنے ہی والا ہے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات برآمد ہوا۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے اعلان میں غیر معمولی تاخیر نے ان شکوک و شبہات کو اور تقویت پہنچی ہے اور یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ وزیر اعلیٰ [illegible] صاف گو، نیک نیت اور سادہ مزاج سہی، ان کا عملہ جو تیس برسوں میں اردو دشمنی کا عادی ہو چکا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ ایمرجنسی کے زمانے میں سب کے سب اردو دوست نظر آنے لگے تھے اور ایمرجنسی ہٹتے ہی سب نے اپنے چہروں سے نقاب اتار پھینکی)، اردو کے ساتھ کتنا انصاف کرے گا اور وزیر اعلیٰ کو کتنا تعاون دے گا۔ اس کا اندازہ

۱۔ سرکاری دفتروں، عدالتوں، ریلوے اور روڈویز وغیرہ میں اردو کے ستونوں کی حقیقت تمام سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں اردو کا استعمال کب شروع ہوگا اس کا اندازہ ریاستی حکومت کی جانب سے گذشتہ چند ماہ میں لگائی گئی نمائشوں میں "اردو کے استعمال" سے ہی لگایا جا سکتا ہے جہاں مطالبات اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود "اردو" کہیں نظر نہیں آئی۔

۲۔ جس "اردو سیل" کا اعلان زور و شور سے کیا جاتا رہا ہے، عدم تحریری [illegible] کہیں وجود نہیں ہے۔

۳۔ ریاستی محکمے لسانیات اور دیگر دفاتر میں اردو داں افسروں و ملازمین کے تقرر کی بات تو بہت دور کی ہے، محکمہ تعلیم و بھاگ، محکمۂ اطلاعات اور دیگر محکموں میں متعدد جگہیں ایک مدت سے خالی ہیں اور جانے کب تک خالی رہیں گی۔؟

۴۔ اردو تعلیم کی حوصلہ افزائی کتنی اور کیسی ہو رہی ہے اس کی مثالیں ان گنت ہیں۔ روہیلکھنڈ یونیورسٹی کے ان کالجوں میں جن میں چار مراد آباد کے ہیں۔ جنتا عہد حکومت میں اردو بحیثیت مضمون پڑھانے کی اجازت ملی تھی جن میں پانچ کالجوں میں چوتھا سیشن ختم ہو رہا ہے اور جملہ شرائط پوری کی جا چکی ہیں لیکن ریاستی حکومت نے مستقل الحاق کی منظوری ابھی نہیں دی ہے۔ جبکہ دیگر مضامین کو منظوری مل چکی ہے۔

یہ تو چند مثالیں ہیں تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ داستان تمام نہ ہوگی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ "جس سازگار ماحول" کا انتظار کیا جا رہا ہے اسے مہا دیوی ورما، امرت لال ناگر، اور ان کے ہم نوا ادیب اور بلراج مدھوک جیسے فسطائی عناصر "ناسازگار" بنانے کی مسلسل جد و جہد کر رہے ہیں اور کوئی ان کی زبان کو لگام دینے والا نہیں ہے۔ یہ ادیب اور شاعر جب اردو کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں تو اپنی ترقی پسندی اور وسیع النظری کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور اردو والے انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں (ہندی کے ایک مشہور افسانہ نگار و ادیب جنھوں نے حال ہی میں ایک ہندی تقریب میں اردو کے خلاف جی کھول کر زہر اگلا ہے، اردو اکادمی کے ممبر ہیں اور اردو کے ترقی پسند ادیب انھیں "ترقی پسند [illegible]" جتاتے ہیں) اور جب اپنی محفلوں [illegible] بولتے ہیں تو اس انداز سے کہ اگر ان کا بس چلے تو ان کا گلا گھونٹ دیں جس کی تازہ مثال حال میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی ایک تقریب ہے جس میں نام نہاد ادیبوں و شاعروں کو اگر واقعی ادیب و شاعر ہوتے تو تعصب و تنگ نظری، فرقہ پرستی و لسانی عصبیت کا مظاہرہ نہ کرتے) نے اس ذہنیت کا مظاہرہ کیا جو آر ایس ایس، جن سنگھ اور بلراج مدھوک سے عبارت ہے، جب تک ملک میں بد [illegible] کے ان کے رہنما زہر اگلتے رہیں گے، حکومت ان کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلو تہی کرتی رہے گی، اس وقت تک قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، علاقائی سالمیت اور سیکولرزم کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ انتظامیہ اور حکومت میں لگے ہوئے فسطائی عناصر بھی اس سے مبرا نہیں ہیں، انھیں سزا دینا بھی نہایت ضروری ہے ورنہ بصورت دیگر اردو کے بارے میں اعلانات و احکامات پر عملدرآمد تو کیا کوئی بھی ترقی پسند اقدام عمل جامہ نہیں پہن سکے گا۔

اگست اور ستمبر کا شمارہ
ایک ساتھ ستمبر میں شائع ہوگا
قارئین نوٹ فرمالیں۔

منظر عاشق ہرگانوی
صدر شعبہ اردو، مارکھم کالج
ہزاری باغ - (بہار)

قمری کفِ خاکستر

* فروغ اردو کے فروری ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں شیخ حبیب اللہ صاحب نے غالب کے درج ذیل شعر پر سے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

تشریح اقبال پیش کی ہے لیکن پوری تشریح پڑھ جانے پر بھی قمری کا مفہوم واضح نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ تشریح سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ لفظ "قمری" کے معنی الگ الگ لغات میں مختلف ہیں۔ کئی ناقدوں نے اس لفظ کی تحقیق کے بعد اپنے آراء پیش کئے ہیں۔ مگر میں کی روح تک علامہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ شاید ہی کوئی پہونچا ہو۔

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا بھی جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے۔ زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جز ہے اس لئے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس طرف ابھی تک ہماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے۔

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں اور ان کے دور کو کتنا ہی الٹ پلٹ ڈالیں، مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ایک سچے دیانتدار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسلسل بنائے رکھتا ہے، جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں
اب اس لفظ قمری کو لیجئے۔

ہماری زبان میں ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ہے نام عربی اور فارسی سے آیا ہے مگر اس کی اصلیت کے پتا نے۔ یہ دونوں زبانیں قاصر ہیں۔ فارسی کے خالص لغتوں میں یہ لفظ نہیں۔ مؤید الفضلاء میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغ یہ لفظ ملتا ہے۔ اور تاج نام کسی لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوکتے ہیں۔ پھر اس نے اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چڑیا ہے۔ او قمری اور فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور اس کی آواز کی یا کوکو کی ہوتی ہے۔ گلے میں طوق ہوتا ہے اور قمری کی دو قسمیں ہوتی ایک سفید کا قمری اور دوسری صندلی اور اس کی آواز سے یا عفو صدا نکلتی ہے۔

[illegible]

ڈاکٹر سید محمد عقیل
صدر شعبہ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی

پریم چند کے ناولوں کے سلسلے میں چند غلطیوں کا ازالہ

ادھر جب سے پریم چند صدی کے جشن منائے جانے لگے ہیں۔ پریم
چند کے سلسلے میں ایک طرف بہت سی نئی باتیں سامنے آرہی ہیں اور بہت
کچھ رطب و یابس تحقیق کے نام پر چھپ کر، پریم چند تحقیق میں غلط
سلط شامل ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہی باتیں
سند کے طور پر پیش کی جائیں۔ اور اس طرح تحقیق میں مزید اغلاط
کا طومار شامل ہو جائے۔ پریم چند پر اردو میں چونکہ بہت کم تحقیقی کام ہوا ہے
اس لئے ہر محقق، اپنی کاوشوں کو حرف آخر کا رنگ دینے کی کوشش
کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پریم چند کے سلسلے میں مزید تحقیق کرنے
اور اُن کی تخلیقات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔
مجھے پریم چند کے سلسلے میں ادھر جو کچھ مطالعے کا موقع ملا ہے
اس سے میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ بہت سے اردو کے ماہرین
پریم چند، جو تفصیلات کی تلاش تو درکنار، شاید پریم چند کے اصل
ناولوں اور کتابوں تک بھی نہیں پہونچے ہیں۔ ادھر اُدھر کے
اقتباسات کو بنیاد بنا کر بہت سے حتمی فیصلے کر دیئے ہیں۔
جن سے پریم چند کا مطالعہ کرنے والا طالب علم خاصہ بھٹک
سکتا ہے۔ میں نے جو پریم چند کی تخلیقات خصوصاً ناولوں کا جو
مطالعہ کیا ہے اُسے سلسلے وار بیان کر رہا ہوں۔

ہم خرما و ہم ثواب

یہ ناول پہلی مرتبہ اردو میں باہتمام بابو منوہر لال
بھارگو سپرنٹنڈنٹ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ، چھپا [illegible] پہلے ایڈیشن
کے کور پر ناول کا نام اور تمام عبارت یوں شائع ہوئی ہے۔

ہم خرما و ہم ثواب

ایک دلچسپ ناول

مصنفہ

جناب منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ۔

باہتمام بابو منوہر لال بھارگو سپرنٹنڈنٹ مطبع منشی نولکشور واقع لکھنؤ میں چھپا۔

معہ جلد　　بار اوّل　　قیمت ۳ر۔"

یہ ناول ایک سو چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول میں کُل تیرہ ابواب ہیں۔ کہیں سنِ طباعت درج نہیں ہے۔ یہ پہلا ایڈیشن خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن الٰہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں ملا۔ اس پر یہ عبارت درج ہے۔

"ہم خرما و ہم ثواب
ایک دلچسپ ناول

مصنفہ

جناب منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ
حسبِ فرمائش بابو ہر چرن داس بھارگو منیجر بھارگو اسکول بکڈپو
نمبر ۱۵۔ امین آباد پارک لکھنؤ
بار دوم
جابر پریس لاٹوش روڈ میں باہتمام منشی دیبی پرشاد طبع ہوا
جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

... ۲ جلد　　.... جز ۱۲ صفحہ　　قیمت فی جلد ۳ر"

اس کتاب میں متن کے کُل ایک سو چار صفحات ہیں۔ اس کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہے۔ ایک اور ایڈیشن اسی سائز کا جناب امرت رائے کے پاس ملا۔ اس پر بھی بار دوم درج ہے۔ لیکن پریس کا نام نولکشور پریس درج ہے۔ کسی میں سنِ اشاعت درج نہیں۔ اسی طرح میری نظر میں یہ تین ایڈیشن ہیں جو اُردو میں شائع ہوئے۔ ہندی میں "ہم خرما و ہم ثواب" کا کوئی نقل لفظ یعنی روپانتر نہیں ملتا۔ لیکن ایک ناول پریما کے نام سے ملتا ہے۔ کچھ لوگ پریما کو "ہم خرما و ہم ثواب" کا کوئی نقل لفظ یعنی روپانتر نہیں ملتا۔

لیکن ایک ناول پریما کے نام سے ملتا ہے۔ کچھ لوگ پریما کو "ہم خرما و ہم ثواب" کا ہندی ترجمہ کہتے ہیں جسے کسی مترجم نے اُردو سے ہندی میں منتقل کر دیا ہے۔ پریما کو یہ لوگ ہندی کا اصل ناول نہیں مانتے۔ خود امرت رائے کا بھی یہی خیال ہے اُن کی عبارت یوں ہے۔

"جس آدمی کو ۱۹۱۳ء میں ایک مختصر سا مضمون لکھنے میں بھی ہندی نہیں آتی، اُس نے ۱۹۰۶ء میں پورا ایک ناول ہندی میں کیسے لکھا؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ منشی جی نے اپنے اُردو قصے ہم خرما و ہم ثواب کا ہندی انوواد اپنے کسی دوست سے کرا لیا ہوگا اور شاید خود بھی ایک نظر ڈال لی ہو۔" (منگلاچرن کا دیباچہ ص ۲۰۰) ۱۷ جولائی ۱۹۱۳ء کو ایک خط پریم چند نے دیا نرائن نگم کے نام لکھا۔ جو مدن گوپال کی کتاب 'پریم چند کے خطوط' میں ص ۱۷۵ پر یوں درج ہے۔

"۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی۔ رسالہ 'زمانہ' میں لکھتا رہا۔ کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس (الٰہ آباد) سے شائع کرایا۔"

اب اُس پریما کا ٹائیٹل نیچے ملاحظہ ہو جو ۱۹۰۷ء میں انڈین پریس سے چھپا۔ پریم چند کا عبارت صاف ہے کہ پریما ۱۹۰۴ء (انیس سو چار عیسوی) میں لکھا گیا جو بعد کو انڈین پریس سے چھپا۔ پریما کا ٹائیٹل نیچے یوں ہے۔

"پریما
ارتھات
دو سکھیوں کا وِواہ
اُودیک، شکشا پرد اور لوتن اپنیاس
لیکھک
بابو نواب رائے بنارسی

پرکاشک
انڈین پریس الہ آباد

پرتھم بار...(کاپی) سن ۱۹۰۷ عیسوی) مولیہ ۱۱ (دس آنے)

ہم خرما و ہم ثواب اور پرتیما کا مطالعہ دلچسپ مسالہ فراہم کرتا ہے۔ کہیں پرتیما میں واقعات کی تفصیلات بڑھا دی گئی ہیں اور کہیں عنوان سے وہ اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں جو ہندی والوں کے لئے شاید اجنبی ہوتے۔ اب ذرا امرت رائے کے مفروضے پر بھی غور کر لیا جائے کہ "منشی جی نے کسی دوست سے 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ترجمہ ہندی میں پرتیما کے نام سے کرا لیا ہوگا۔" اگر یہ بات درست ہے تو مترجم کو کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ ترجمہ کرتے وقت پرتیما میں اپنی طرف سے ردّ و بدل کر دے۔ کہیں عبارتیں بڑھا دے کہیں کردار ادھر اُدھر کر دے کہیں قصے کو طول دیدے۔ پھر اگر ایسا ہوا تو وہ حصے جو پرتیما میں مترجم نے بڑھائے وہ پریم چند کے لکھے ہوئے کیونکر ہوئے۔ اس کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ ترجمہ خود پریم چند نے کیا۔ اور حسب منشاء عبارتیں، گھٹاتے بڑھاتے گئے کرداروں کو ہم خرما و ہم ثواب کی مختلف سچویشن سے ہٹا کر پرتیما میں دوسری جگہ فٹ کر دیا (مثال کے طور پر رام کلی اور لکشمی کے کردار) اُردو کے مصرعے اور اشعار حذف کر دیئے۔ عاشقانہ خطوط کو طول دے دیا قصے کو گھٹا بڑھا دیا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ پریم چند نے پرتیما اُردو میں پہلے لکھا اور ہندی میں اپنے کسی دوست سے ترجمہ کرا لیا۔ ایسی صورت میں اُردو پرتیما کہاں گئی۔ یا تو اُس کا مسودہ ملنا چاہیئے۔ یا پھر پرتیما، اُردو میں چھپا ہوا ملے۔ لیکن دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں۔ اس لئے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ پرتیما ہندی میں پریم چند ہی نے لکھا ہے جیسا کہ انھوں نے دیا نرائن نگم کو اپنے خط میں لکھا۔ رہ گیا پریم چند کا

ملا ادھر ڈاکٹر جعفر رضا کی کتاب پریم چند۔ فن اور تعمیر فن کا نیا اڈیشن آیا ہے۔ اس میں جعفر رضا صاحب نے ہم خرما و ہم ثواب کے متون کا مقابلہ کیا ہے۔ اور ہندی پرتیما اور اُردو کے 'ہم خرما و ہم ثواب' کے اختلاف کی نشاندہی کی ہے۔ یہ اختلافات حسب ذیل ہیں۔ جعفر رضا صاحب کی عبارت یوں ہے۔

" اُردو اشاعت میں ایک جگہ لالہ جی کے انکار کرنے کا بیان ہے (شادی سے انکار) اور ہندی میں پرتیما کی ماں، امرت رائے پر فدا نظر آتی ہے۔ قصے کا انجام دونوں صورتوں میں یکساں ہوتا ہے۔ لیکن واقعات کی ترتیب میں فرق ہو گیا ہے اسی طرح ایک دوسری جگہ اُردو میں پورنا کا ذکر ہے۔ اور ہندی میں اس کے ساتھ رام کلی اور لکشمی بھی شامل کر لی گئی ہیں۔" (پریم چند۔ فن اور تعمیر فن ص ۱۴۳)

ہمارے خیال میں یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔ جعفر رضا صاحب نے ہم خرما و ہم ثواب کا مطالعہ ٹھیک طور سے نہیں کیا۔ ہم خرما و ہم ثواب میں دونوں باتیں موجود ہیں۔ پرتیما کی ماں امرت رائے پر فدا بھی ہے اور رام کلی اور لکشمی کے کردار بھی ہم خرما و ہم ثواب میں موجود ہیں۔ ہم خرما و ہم ثواب کی عبارتیں ملاحظہ ہوں۔ پرتیما کی ماں " ہم خرما و ہم ثواب میں امرت رائے پر کس طرح فدا ہے۔

" لالہ بدری پرشاد کی بیوی بیچاری عرصے سے بیمار تھیں اور انھیں بڑا اصرار تھا کہ بیٹی کی شادی جہاں تک جلد ہو جائے اچھا ہے..... مگر جب انھوں نے امرت رائے کو ایک بار صحن میں دیکھ لیا تھا اُسی وقت سے اُن کو یہ دھن سوار تھی کہ میری بیٹی کی شادی ہو تو انھیں سے ہو..... وہ بیچاری امرت رائے کو اپنا داماد سمجھنے لگی تھیں" (ہم خرما و ہم ثواب ص ۱۱ دوسرا ایڈیشن)۔ اب رام کلی اور لکشمی کے کردار ہم خرما و ہم ثواب میں دیکھیئے۔

جب بابو امرت رائے کچہری چلے جاتے ہیں تو اکیلے اُس کا جی بہت گھبراتا ہے۔ بس اُس نے ایک روز اُن سے کہا کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو رام کلی اور لچھمی کو اس جگہ بلا لیجئے تاکہ اُن کی صحبت میں وقت کٹ جایا کرے۔ رام کلی کو ناظرین جانتے ہیں لچھمی بھی ایک کائستھ کی لڑکی تھی اور گونے کے دن بیوہ ہو گئی تھی۔" (ہم خرما و ہم ثواب ص ۹۴ دوسرا ایڈیشن)

وہ خط جو انھوں نے سنہ ۱۹۱۳ء میں منشی دیانرائن نگم کو لکھا جس میں پرتاپ کے وجے دسمی نمبر میں کہانی بھیجنے کے سلسلے میں لکھا کہ "ہندی لکھنی تو آتی نہیں مگر کچھ قلم توڑ مروڑ دیا ہے" تو اسے اُردو کے مصنف کا انکسار سمجھنا چاہیئے۔ اس سے یہ مطلب نکالنا مناسب نہیں کہ منشی جی سنہ ۱۹۱۴ء تک ہندی نہیں لکھ سکتے تھے۔ اگر امرت رائے کی یہ دریافت صحیح ہے کہ پریم چند نے ورناکیولر فائنل امتحان اُردو اور ہندی میں پاس کیا تھا تب انھیں اتنی ہندی ضرور آنی چاہیئے کہ وہ بخوبی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ خصوصاً ناول یا قصے کی زبان لکھنا ایسے آدمی کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اگر امرت رائے کی یہ بات صحیح مان لی جائے کہ سنہ ۱۹۱۴ء تک پریم چند، ہندی بالکل نہیں لکھ سکتے تھے۔ تو ایسا آدمی سنہ ۱۹۱۳ء میں دیانرائن نگم کے اخبار کے ہندی سکیشن کا اڈیٹر کیسے بننے کو تیار ہے؟ پھر نام کا اڈیٹر نہیں بلکہ "مناسب اور دلچسپ ترجمے" کرتا ہے" نوٹ اور تنقید" ہندی میں لکھنے کو تیار ہے۔ پریم چند کے اس خط کی عبارت ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے سنہ ۱۹۱۳ء میں منشی دیانرائن نگم کو یہ پیشکش کی تھی۔

"اب رہ گئے ہندی رسالے۔ آپ مجھے اپنے ہندی ڈپارٹمنٹ کا اڈیٹر سمجھئے۔ میں اخبارات اور رسالوں سے مناسب اور دلچسپ ترجمے کر دیا کروں گا۔ کہیں کہیں اُن پر نوٹ اور تنقید بھی کروں گا۔ ہندی شعرا کی دلچسپ اور مختصر سوانح عمریوں کا سلسلہ بھی دوں گا" (چٹھی پتری جلد اول صـ۱۷۔ یہ خط ۷ فروری سنہ ۱۹۱۳ء کا ہے)

۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۵ء (انیس سو پانچ) کو پریم چند نے ایک خاص ہندی میں دیانرائن نگم کو لکھا ہے جس میں ایک ناول کے مسودے کا ذکر ہے۔ غالباً یہ ہندی ناول پریما کے مسودے کا تذکرہ ہے۔ جو دو سال بعد انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس میں صاف درج ہے کہ یہ کسی ناول کا "پانڈولیپی" ہے۔ "پانڈولیپی" کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ مسودہ ہندی میں ہے اس خط میں ہندی کے ثقیل الفاظ کا خاصہ استعمال کیا گیا ہے۔ خط یوں ہے۔

"دو مہینے سے زیادہ ہوا کہ مجھے اپنے اپنیاس کی پانڈولیپی آپ کے پاس اولوک نارتھ بھیجنے کا سوبھاگیہ ہوا تھا۔ اس آشا میں کہ آپ میرے لئے ایک پرکاشک جٹانے کی کرپا کریں گے مجھے یاد ہے کہ وہ دسمبر کی ۸ تاریخ تھی جب میں نے کتاب آپ کے پاس بھیجی تھی"

(چٹھی پتری جلد اول صـ۱۔ یہ خط ۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۵ء کا ہے)

اسی کے ساتھ پریم چند کا ایک اور خط دیکھئے جو انھوں نے دیانرائن نگم کو سرسوتی پریس بنارس سے ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء کو اپنی سوانح عمری کے سلسلے میں لکھا تھا۔

"سنہ ۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی۔ رسالہ زمانہ میں لکھتا رہا۔ کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا" (پریم چند کے خطوط صـ۱۵ مرتبہ مدن گوپال)

اس خط سے ۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۵ء کے خط کی مکمل مطابقت ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء کے خط سے یہ بات بھی صاف ہے کہ ہندی ناول پریما سنہ ۱۹۰۴ء میں لکھا گیا تھا۔

میں ہے جو بعد کو سنہ ۱۹۰۷ء میں مل گیا۔ یعنی انڈین پریس جس نے پریما شائع کر دیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک اور خط دیانرائن

اُردو لکھئے، پڑھئے اور بولیئے

★ ★ ★

نگم کو پریم چند نے لکھا جو مدن گوپال کے مرتبہ خطوط میں صفحہ ۴۸-۴۹ پر موجود ہے اس میں ایک جگہ یہ عبارت ملتی ہے۔

"اگر آپ اس میں کوئی امر خلاف شان نہ سمجھیں تو میں کبھی کبھی ایک آدھ مضمون اُردو اور ہندی میں لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں اور آپ اسے اپنی جانب سے انسپکٹر صاحب نارمل اسکولز کے پاس بھیج دیں۔ یہی اس گزٹ کے ایڈیٹر ہیں۔"

۲۵ جولائی ۱۹۰۱ء کو دیانرائن نگم کو ایک خط لکھتے ہیں۔

"آج ایک کام سے فرصت ملی۔ شیخ سعدی کے حالات، ایک صاحب کی فرمائش سے ہندی میں لکھے۔ اب زمانہ کے لئے لکھنے کی فکر میں ہوں" (مدن گوپال ص۴۲)

پھر ۱۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کو ایک اور خط نگم کو لکھتے ہیں: "لالہ کاشی ناتھ کی ہندی ہندی کتاب تعطیل سے یونہی پڑی ہوئی تھی اس پر میں نے ریویو کر دیا۔ کتاب اچھی ہے۔ رفع شکایت ہو گئی۔"

(مدن گوپال ص۷۵)

۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۷ء تک، پریم چند کے ہندی میں لکھنے کے دعوؤں کا ایک سلسلہ ہے۔ کیا بغیر اچھی ہندی جانے ہوئے کوئی ہندی میں مضامین، ریویو، تنقید یہ سب کچھ لکھ سکتا ہے؟ یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔ ہمارے آپ کے لئے بھی اور امرت رائے صاحب کے لئے بھی اور اُن لوگوں کے لئے بھی جن کا دعویٰ ہے کہ پریم چند، ہندی میں کچھ لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

اب پریم چند کے ہندی سے اُردو میں ترجمے کی صلاحیت پر بھی دو ایک باتیں دیکھ لی جائیں۔ اس پوری بحث میں تاریخ اور سِن کو خاص طور پر نظر میں رکھنا چاہیئے۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:-

(۱) "بھرت پر ایک ہندی مضمون کا ترجمہ کیا تھا۔ وہ الناظر میں تھا۔" (چٹھی پتری جلد اوّل ص۳)

(۲) "ایک اور قصہ بھیجتا ہوں۔ یہ کچھ عرصہ ہوا بنگلہ سے ترجمہ ہو کر مریادا میں نکلا تھا۔ قصہ نہایت دلچسپ ہے ورنہ میں کیوں ترجمہ کرتا۔" (چٹھی پتری جلد اول ص۳۱

۲۲ فروری ۱۹۱۴ء کا خط مہویا سے لکھا گیا)

(۳) "آپ سُن کر خوش ہوں گے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے یہ بازارِ حُسن کا ترجمہ ہے۔ بازار حسن اب صاف کر رہا ہوں۔"

خط مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۱۹ء۔ مدن گوپال ص۷۹)

ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ پریم چند نے ہی کیا تھا اور اس لئے بجا طور پر انھوں نے سیوا سدن کو "میرے ہندی ناول" لکھا ہے اور نقادوں نے بجا طور پر "اسے ہندی زبان کا بہترین ناول" بھی کہا۔ اِدھر اُردو میں پریم چند کے ایک محقق ڈاکٹر جعفر رضا صاحب نے اپنی کتاب "پریم چند۔ فن اور تعمیر فن کے ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں پریم چند کی ہندی دانی پر شبہ ظاہر کیا ہے اس نئے اڈیشن کے ص۹ صفحہ پر وہ تحریر کرتے ہیں

"اب...... پریم چند کا اپنا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں ایک ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا جس سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو خیال ہوا کہ پریم چند نے ابتدا سے ہندی اُردو دونوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ اُن کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ پریما ہندی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے اُردو ناول ہم خرما و ہم ثواب کا ترجمہ ہے۔ پریم چند کے مکتوب مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ "پرتاپ" کو کہانی

تھے۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۷ء کے قبل اُن کی کسی ہندی تخلیق کی تلاش تحصیل حاصل ہے۔"

ایک دوسری جگہ جعفر رضا صاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کی تحقیق کے مطابق پریم چند نے اپنے تمام ناول ہندی کے قبل اُردو میں لکھے۔ اور جن کے ترجمے ہندی میں شائع ہوئے۔" (پریم چند اُردو ہندی ادیب۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میگزین پریم چند نمبر ۱۹۸۰ء)

اسی طرح جلوۂ ایثار اور وردان کی زبان پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر رضا صاحب نے پھر یہی نتیجہ نکالا کہ ۱۹۱۵ء تک پریم چند ہندی سے واقف نہ تھے۔ اُن کی عبارت یوں ہے۔

"اب یہ بات تحقیقی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پریم چند نے ۱۹۱۵ء تک صرف اُردو میں لکھا۔ اُس دور کے پریم چند کو ہندی سے نہ صرف تخلیق عمل کی بنیادوں پر کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ انھوں نے ہندی ترجموں پر نظر ثانی نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ترجموں کی زبان میں بعد کے دور کے ناشرین نے مزید ترمیم اور اضافے کئے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ مزید اہمیت حاصل کر لیتا ہے کہ پریم چند کے ہندی ترجموں کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے۔" (پریم چند۔ فن اور تعمیرِ فن ص ۱۷۵۔ نیا اڈیشن)

ان دونوں اقتباسات میں ایک جگہ "ناگری رسم خط سے برائے نام واقفیت" کی بات کہی گئی ہے۔ اور دوسری جگہ "ہندی ترجموں ترجموں کی ذمہ داری پریم چند کی نہیں بلکہ ناشرین کی ہے جنھوں نے "مزید ترمیم و اضافے کئے ہیں" کی بات ہے ناگری رسم خط سے ۱۹۱۴ء تک برائے نام واقفیت کے متعلق اوپر بحث کی جا چکی ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک برابر شواہد موجود ہیں کہ پریم چند ہندی میں خطوط، تخلیقات اور ترجمے سب کچھ کرتے رہے۔ رہ گئی ترمیم و اضافے کی بات تو یہ ناشرین نے نہیں خود پریم چند نے کئے ہیں جس کا ذکر انھوں نے بازارِ حسن کے سلسلے میں بھی کیا ہے اور چوگانِ ہستی کے سلسلے میں بھی جس کا ذکر آگے کروں گا۔ پھر پریما بازارِ حسن اور وردان، سب کے مذہبی تراجم، پریم چند کے سامنے آ گئے تھے۔ انھیں اس کی نشاندہی کر دینی چاہیے تھی کہ ان کے ان ناولوں میں دوسروں نے ترمیم و اضافے کئے ہیں۔ اُن کا اس ترمیموں سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جعفر صاحب کا محض مفروضہ ہے۔

یہیں سے ایک دوسرا افسانہ بھی شروع ہوتا ہے کہ پریم چند کے کن ناولوں کو اُردو کا ناول مانا جائے اور کن ناولوں کو اردو کا ہندی ترجمہ یا ہندی سے اُردو میں ترجمہ۔ اور پھر یہ تراجم کس کے ہیں۔ پریم چند کے اپنے کئے ہوئے یا دوسروں نے اُن کے لئے کئے تھے۔ پریم چند کا سب سے پہلا ناول اسرارِ معابد اُردو میں لکھا گیا اور شائع بھی ہوا میں نے وہ ٹائپ کاپی دیکھی ہے۔ جو پریم چند کے بیٹے امرت نے آوازۂ خلق سے نقل کرا کے احتشام حسین صاحب کو دی تھی۔ پھر اس کا ترجمہ خود امرت رائے نے کیا۔ اگرچہ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ پریم چند نے اپنے خطوں میں کہیں بھی اس ناول کا تذکرہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ دوسرا ناول، ہم خرما و ہم ثواب اور پریما خاصے بحث طلب ہیں۔ ہم خرما و ہم ثواب، پر نہ کوئی سنِ اشاعت ہے اور نہ اس کا کوئی مسودہ ہے اور نہ پریم چند کے کسی خط میں یہ ملا کہ ہم خرما و ثواب، پریما سے پہلے لکھا گیا لیکن چونکہ پریما میں قصے کو طول دیا گیا ہے اور بہت کچھ کاٹ چھانٹ وصلاح ہے اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم خرما و ہم ثواب، پہلے

لکھا گیا اور تقریباً ساتھ ہی شائع ہوا۔ معلوم نہیں کشنا اُردو میں تھا یا ہندی میں۔ ہم خرما و ہم ثواب کے ٹائیٹل پیج پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"مصنفہ منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ"۔

اور پریما کے ٹائیٹل پیج پر کشنا کا نام نہیں ہے۔ اس کے دو معنی ہوئے، یا تو کشنا اُردو میں لکھا گیا۔ اس لئے ہندی کتاب پر جو ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی۔ اس پر یہ نام نہیں لکھا گیا۔ یا پھر کشنا [illegible] کے سن تخلیق ۱۹۰۴ء کے بعد لکھی گئی اس لئے پریما کے ٹائیٹل پیج پر اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ ہم خرما و ہم ثواب بھی پریما سے پہلے نہیں چھپا، ورنہ اس کا نام پریما کے ٹائیٹل پیج ہونا چاہئے تھا۔ اور پھر کشنا کا بھی نام ہوتا۔ [illegible] ناولوں کے بعد کچھ لوگوں نے روٹھی رانی کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ناولٹ راجستھانی قصوں سے ماخوذ ہے۔ اور کچھ لوگوں نے اسے گجراتی قصوں سے ماخوذ بتایا ہے۔ مگر مجھے یہ تحقیق نہیں، اس لئے اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ روٹھی رانی، زمانہ پریس کانپور سے اُردو میں شائع ہوا۔ مگر اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن نواب رائے کا نام لکھا ہے۔ جلوۂ ایثار ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ جس کا ہندی ترجمہ لگ بھگ ۱۹۱۲ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کس نے کیا یقین کے ساتھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن ہندی اور اُردو ناولوں میں اتنی تبدیلیاں ہیں کہ ان ترمیم و اضافوں کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ترجمہ پریم چند ہی کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ترمیم و اضافے کا حق مصنف کی زندگی میں دوسروں کو نہیں پہونچتا۔ اگر ترمیم و اضافے دوسروں کے لئے ہیں تو وردان بھی دوسرے مصنف کی تصنیف ہوتی۔ صرف پریم چند اس کے مصنف کیسے ہو سکتے ہیں مترجم کا بھی اس میں نام ہونا چاہئے۔ چونکہ بازارِ حسن کا ترجمہ

خود پریم چند کر چکے تھے، اور اس میں [illegible] اضافے [illegible] اور خاصے اضافے کئے تھے۔ بہت سے الفاظ بازارِ حسن کے ہندی میں ترجمہ کرتے۔ وقت نکال دیئے تھے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ یہ پریم چند ہی نے وردان بھی اردو کے جلوۂ ایثار سے ہندی میں منتقل کیا۔ اور جہاں چاہا کچھ حصے نکال دیئے اور جہاں چاہا کچھ حصے نکال دیئے۔ اور جہاں چاہا کچھ جوڑ دیا۔ اس خیال کو پریم چند کے ایک خط سے بھی تقویت ملتی ہے۔ [illegible] جنوری ۱۹۲۱ء کو دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"زندہ ہوں۔ ناول کی ہندی کر رہا ہوں اور پریم بتیسی کی فکر کھائے جاتی ہے" اور وردان کا یہی سن اشاعت ہے۔ کوئی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ یہ غلط گوشۂ عافیت کے لئے بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ جعفر رضا صاحب کی کتاب پریم چند۔ فن اور تعمیرِ فن کے دوسرے ایڈیشن کے ۱۹۸۲ء پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"حسن اتفاق سے [illegible] کا اصل مسودہ دست بردِ ایام [illegible] گوشۂ عافیت [illegible] جعفر رضا صاحب کی کتاب پریم چند فن اور تعمیرِ فن کے دوسرے ایڈیشن کے ص ۱۹۸۲ء پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"حسن اتفاق سے گوشۂ عافیت کا اصل مسودہ دست بردِ ایام سے محفوظ رہ گیا جس پر ۲ مئی ۱۹۰۸ء کو گوشۂ عافیت کی تصنیف ابتدا کرنے اور [illegible] ۱۹۲۰ء [illegible] خود پریم چند کے قلم سے درج ہے"

معلوم نہیں کہ جعفر رضا صاحب کو گوشۂ عافیت کا یہ مسودہ کہاں ملا۔ اس کا کوئی حوالہ ضرور نہیں دیا۔ [illegible] مدن گوپال کے مرتبہ خطوط میں ۱۱ ستمبر ۱۹۲۱ء کے خط کے نیچے انگریزی عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے

"حضرت سحر کو میں نے [illegible] دینا طے کر لیا ہے [illegible]

ہیں .... اگر وہ ہوں تو گوشۂ عافیت بھی ان سے
پورا کرنا ہوں گا اور کچھ نئی کتابوں کا ترجمہ بھی۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی خط امرت رائے کی مرتبہ چٹھی پتری
کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۰۱ پر ۵ اگست ۱۹۲۰ء میں ملتا ہے۔ اگر جعفر رضا
صاحب کے بیان کے مطابق گوشۂ عافیت کو پریم چند ۲۵
فروری ۱۹۲۰ء کو تمام کر چکے تھے۔ تو پھر تحریر ۵ اگست ۱۹۲۰ء
۱۹۲۰ء میں کس گوشۂ عافیت کو پورا کر رہے تھے۔ ہندی میں
ترجمہ کرنے کی یہ بات ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ اول تو پریم چند نے
گوشۂ عافیت لکھا ہے، پریم آشرم نہیں۔ پھر یہ کہ پریم آشرم تو
۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں ہندی میں چھپ چکا تھا۔ اس طرح اوپر
جہاں سے بات چلی تھی کہ "ناول کی ہندی کر رہا ہوں" وہ دلائل
کے لئے ہی ہے۔

امرت رائے نے بھی منگلا چرن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ
"گوشۂ عافیت کا پہلا مسودہ اردو میں ہے" ممکن ہے کہ مسودہ
انہیں کے پاس ہو۔ "پہلا مسودہ" سے یہ شبہہ بھی ہوتا ہے کہ کئی
مسودے بنائے گئے۔ جسے ہم انگریزی میں FIRST DRAFT
کہہ سکتے ہیں ورنہ اقبال ورما سحر کے ترجمہ کرانے کی بات بے معنی
ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات اور ہے۔ پریم چند
اپنے خطوں میں بار بار ایک اور ناول کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور اسکا
نام "ناکام" بتاتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا حوالہ دیا نرائن
نگم کے نام لکھے ہوئے خط مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۲۰ء میں یوں ملتا ہے۔

"میرا دوسرا ناول "ناکام" عنقریب اختتام پر ہے۔
وہ پورا ہو جائے۔ تو نوبت رائے کی طرف متوجہ ہوں......
...... یہ ناول بھی ہندی میں چھپے گا۔" (مدن گوپال صـ ۹۸)

پھر آگے چل کر دوسرا حوالہ یوں ہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۲۰ء کو
پھر دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"آج کل بازارِ حسن کی ترتیب میں مصروف ہوں۔ ابھی تک
نام مقرر نہ تھا۔ بازارِ حسن اب پریس جا رہا ہے اس کے
بعد "ناکام" میں ہاتھ لگے گا۔ پہلے ہندی ایڈیشن نکلے گا۔"

(مدن گوپال صـ ۹۹)

پھر ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے خط میں امتیاز علی تاج کو لکھتے ہیں۔

"اگر ایشور نے چاہا تو چند ماہ میں میرا اپنا ناول "ناکام"
تیار ہو جائے گا۔" (مدن گوپال صـ ۱۲۹)

پھر ۱۷ فروری ۱۹۲۲ء کو امتیاز علی تاج کو ایک خط میں
اطلاع دیتے ہیں۔

"میرا ہندی ناول ختم ہو گیا۔ اب اردو کا کام جلد ہوگا۔
جب تک بازارِ حسن پریس سے نکلے گا۔
شاید نئے ناول کا حصہ اول آپ کی خدمت میں
حاضر ہو جائے۔" (مدن گوپال صـ ۱۱۷)

لیکن پھر یہ "ناکام" ناول کہاں گیا جو ہندی ناول تھا
قیاس ہے کہ یہی "ناکام" "پریم آشرم" بن گیا "ناکام"
شاید کہ اس تشکر کے انجام کو ذہن میں رکھ کر اس کا نام مقرر کیا
گیا تھا۔ بہرحال اگر گوشۂ عافیت کا اردو مسودہ کہیں مل جائے
اور اس پر خاتمے کی تاریخ بھی ۲۵ فروری ۱۹۲۰ء لکھی ہے۔
جیسا کہ جعفر رضا صاحب نے تحریر کیا ہے۔ تو پھر اس پر
بجائے گوشۂ عافیت کے "ناکام" لکھا ہونا چاہئے۔ ایک
بات اور کہ اگر "ناکام" ہی گوشۂ عافیت ہے تو یہ ناول
پہلے ہندی ہی میں لکھا گیا جیسا کہ اردو کے خط میں درج ہے۔
"میرا ہندی ناول ختم ہو گیا اب اردو کا کام جلد ہوگا" اور شائع
بھی پہلے ہندی ہی میں ہوا۔ اس طرح جعفر رضا صاحب کی یہ بات
درست نہیں کہ

(۹) "ہندی کا پریم آشرم، اردو گوشۂ عافیت کا ترجمہ ہے"

بعض مقامات پر اختلاف ... [illegible] کی بدولت طبع کا
نتیجہ ہے۔ ہمارے خیال میں پریم آشرم کو ہندی کا تخلیقی ناول
نہیں قرار دیا جا سکتا"
(پریم چند۔ فن اور تعمیر فن ص ۱۹۰ ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

(۲) "اس وقت تک ہندی کے پریمیوں کو لیجیے معلوم ہوتا کہ
جس ناول پر انھیں فخر و مباہات ہے (یعنی پریم آشرم) وہ ایک
اردو ناول کا ترجمہ ہے" (فن اور تعمیر فن ص ۱۹۴ ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

"پریم آشرم" کے بعد رنگ بھوم کا مسئلہ اٹھتا ہے
مدن گوپال نے پریم چند کے خطوط کے مقدمہ میں عجیب بات
لکھ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اپنی کہانیوں کا ایک مجموعہ پریم پچیسی ... میں
شائع کر ... اس کے بعد ہی ایک اور عظیم ناول جو کہ ...
شروع کیا گیا ... اس سے پہلے دو اہم ناولوں کی طرح یہ بھی
اردو میں لکھا گیا مگر اس کی اشاعت پہلے ہندی میں ہوئی۔
رنگ بھومی کے نام سے چھپا۔ پریم چند کا یہ آخری ناول ہے
جو پہلے اردو میں لکھا گیا" (پریم چند کے خطوط ... مدن گوپال)

میرا خیال ہے کہ مدن گوپال صاحب نے بغیر تحقیق کے یہ بات
سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے لکھ دی کیونکہ انکے مرتبہ خطوط
کے اسی مجموعے میں ص ۱۷۱ پر دیا نرائن نگم کے نام ۱۹۲۴ء میں گنگا
پستک مالا کاریالیہ سے پریم چند کا لکھا ہوا ایک خط درج
ہے جس کی عبارت یوں ہے۔

"حضرت سحر نے رنگ بھومی کا اردو ترجمہ کر دیا مگر معاوضہ
ہندی صفحات پر ۸ فی صفحہ مانگتے ہیں یعنی کل [illegible]
روپے۔ مجھے کل کتاب کے چھ سو مل جائیں تو ...
بھومی کا میں نے ... اردو بازار قلم کی
حالت دیکھ ... اردو ... معاوضہ نہیں ہے اور ...
خوشی سے دینے کو تیار ہوں۔ ان کے زیادہ سے زیادہ تین مہینے
صرف ہوئے ہوں گے۔ ... گھنٹے روزانہ کام کر کے ۱۵۰ ملتے
ہیں تو کیا کم ہیں۔ مگر وہ نہ جانے کس خیال میں ہیں"

اس خط کی عبارت میں کسی طرح کا الجھاؤ نہیں ہے مثلاً کوئی
یہ نہیں کہہ سکتا کہ ممکن ہے رنگ بھومی کے کچھ صفحات کا ترجمہ سحر
نے کر دیا ہو۔ ایسا نہیں ہے پوری کتاب کے ترجمے ہی کی بات
ہے۔ رقم کی تعداد بھی ۸ فی صفحہ کے لحاظ سے ۱۴۵۰ روپے
کے دونے صفحات ہوئے یعنی کل نو سو تیس صفحات ہندی ناول
کے ہوئے۔ اس طرح وقت کا تعین بھی پریم چند نے تین مہینے
کیا ہے۔ اس طرح یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ رنگ بھومی کے کچھ
... کے ترجمے کی بات ہو رہی ہے یہ تو پورے ناول کے ترجمے
کی بات ہے۔ پھر دوسرا خط ۱۷ جولائی ۱۹۲۴ء کو سرسوتی پریس
بنارس سے لکھا گیا ہے۔ یہ خط بھی دیا نرائن نگم کے نام ہے۔ لکھی
... ناول ہے۔

"... ۱۹۲۲ء میں جلوہ ایثار اور ۱۹۱۸ء میں بازار حسن
ہندی میں سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم کایا کلپ
چاروں ناول، دو دو سال کے وقفے کے بعد نکلے۔ انکے
اردو ترجمے عنقریب شائع ہوں گے" (مدن گوپال ص ۱۷۵)

اس خط کا آخری جملہ ہمارے کام کا ہے۔ اس میں صرف بازار
حسن کا پہلا حصہ تو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا جسے دارالاشاعت
پنجاب نے شائع کیا۔ دوسرے حصے کا صحیح سن اشاعت مجھے نہیں
ملا۔ ۲۴ جون ۱۹۲۱ء کو ایک خط میں منیجر دارالاشاعت کو لکھتے ہیں

"مجھے مطلق خبر نہیں کہ بازار حسن کی اشاعت کا کیا انتظام
ہوا ہے۔ اس میں ابھی کتنی دیر ہے؟" (مدن گوپال ص ...)

ڈاکٹر جعفر رضا نے فن اور تعمیر فن کے ۱۹۸۰ء کے ایڈیشن کے ص ۱۸۰ پر لکھتے ہیں:
"۲۰ فروری ۱۹۲۴ء کے مکتوب میں حصہ دوم کی اشاعت کا ذکر ہے..."

لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ۱۸ فروری ۱۹۲۴ء کے خطوط کی عبارت یوں ہے۔

"... کا حصہ اول آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔" (مدن گوپال ص ۱۲۵)

اس میں حصہ دوم کا لفظ نہیں ہے۔ چٹھی پتری جلد دوم کے ص ۱۱ پر بھی حصہ دوم کا ذکر نہیں ہے۔ ۱۱

اب یہاں سے میری دوسری مشکل شروع ہوتی ہے۔ پریم چند کی ہندی لیاقت کی بحث ہم اوپر کر چکے ہیں کہ ان میں ہندی کی تخلیقی صلاحیت شروع ہی سے تھی لیکن جعفر رضا صاحب نے فن اور تعمیر فن کے ص ۱۹۲ تا ۱۹۵ پر رنگ بھومی پر بحث کرتے ہوئے اس میں تحریف و اضافے کا سہرا کسی شیو پوجن سہائے کے سر باندھا ہے۔ گویا موجودہ رنگ بھومی پورا پریم چند کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں شیو پوجن سہائے شریک ہو گئے ہیں۔ رنگ بھومی میں کتنا شیو پوجن سہائے کا لکھا ہوا ہے اور کتنا پریم چند کا، اسے بھی کسی محقق کو تلاش کرنا چاہئے۔ مگر پھر رنگ بھومی کے مسودے پر جہاں جعفر رضا صاحب نے بحث کی ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ

"اس مخطوطے پر منشی جی کی اپنی تحریر درج ہے۔

"Hindi Finished dated August-12, 1924"

پھر وہ امرت رائے کا ایک بیان یوں لکھتے ہیں۔

"رنگ بھومی کی چھپائی شروع ہو گئی۔ لکھی پہلے اردو میں گئی، چھپی پہلے ہندی میں۔" (فن اور تعمیر فن ص ۱۹۳ سنہ ۸۰ء ایڈیشن)

لیکن امرت رائے کا بیان، رنگ بھومی کے متعلق منگلا چرن کے دیباچہ کے صفحہ آٹھ پر یوں ہے۔

"رنگ بھومی (۱۹۲۴ء) منشی جی کے اپنیاسوں میں پہلا ہے جس کا پہلا مسودہ ہندی میں لکھا گیا۔" (منگلا چرن ص ۸) اب سمجھ میں نہیں آتا کہ امرت رائے کا کونسا بیان صحیح ہے۔ منگلا چرن والا یا وہ جو جعفر رضا صاحب نے پیش کیا ہے۔ پھر یہ کہ چوگان ہستی کی اشاعت ۱۹۲۷ء تک پریم چند ہندی میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے یہ بات بھی جعفر رضا صاحب نے اپنی کتاب میں بڑے وثوق کے ساتھ لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی عبارت:

"پریم چند اپنا مسودہ اردو میں تیار کرتے تھے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ چوگان ہستی کی اشاعت تک پریم چند ہندی میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت نہیں پیدا کر سکے تھے۔"

فن اور تعمیر فن ص ۱۹۶ سنہ ۸۰ء ایڈیشن

اب ذرا پریم چند کے اس خط کی عبارت کو اپنے ذہن میں دہرائیے جس میں انھوں نے ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی بات حضرت اقبال ورما سحر سے طے کی تھی جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ان واقعات سے قطعی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رنگ بھومی جو موجود ہے، پہلے ہندی میں لکھی گئی۔ چوگان ہستی جو بعد کو اردو میں چھپی، اصل ہندی کی رنگ بھومی کا ترجمہ ہے جو اقبال ورما نے کیا ہے۔ جو لوگ چوگان ہستی کے ۱۹۲۷ء والے دارالاشاعت لاہور سے چھپے ہوئے پریم چند کے مقدمے کا حوالہ دیتے ہیں،

۱۱۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک دلچسپ بات بازار حسن کے سلسلے میں اپنی کتاب فن اور تعمیر فن کے صفحہ ۱۰۳-۱۰۴ پر لکھی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"اس کے پہلے ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کی تحقیق ہے کہ یہ سیوا سدن کا اردو روپ بازار حسن لاہور سے ۱۹۱۹ء کے وسط میں شائع ہوا۔ کتنی بے بنیاد اور گمراہ کن بات ہے۔"

اگر کمل کشور گوئنکا اتنے ہی غیر محتاط محقق ہیں تو انھیں پریم چند پر کام کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ یہ کام چھوڑ کر کچھ اور کرنا چاہئے۔ چھپائی کی غلطی سے ۱۹۲۱ء کے بجائے سنہ ۱۹۱۱ء ہو گئی ہے۔ ایسی غلطی تو پریم چند کا معمولی طالب علم بھی نہیں کر سکتا۔ — سید محمد شفیع

اس کی کہیں آلو چنا کر رہا ہے" (مدن گوپال صفحہ ۱۴۸)

ڈاکٹر قمر رئیس، جو اردو میں پریم چند کے اچھے ناقد سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" میں یہی لکھا ہے کہ یہ ناول ۱۹۳۱ء کے درمیان لکھا گیا۔ اور ۱۹۳۲ء میں سرسوتی پریس سے شائع ہوا۔ انھوں نے یہ بحث نہیں اٹھائی کہ یہ ناول پہلے اردو میں لکھا گیا یا ہندی میں۔ لیکن جعفر رضا صاحب نے لکھا کہ کرم بھومی پہلے اردو میں میدانِ عمل کے نام سے لکھی گئی اور ہندی میں بعد کو اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اُن کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

"ہمارے نزدیک میدانِ عمل بھی پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح اردو تخلیق ہے اور اس کا اسی حیثیت سے تجزیہ کیا جانا چاہیے۔" (فن اور تعبیرِ فن صفحہ ۲۲۲، ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

امرت رائے نے قلم کا سپاہی میں ۱۹۳۲ء کے واقعات لکھتے ہوئے پریم چند کی تحریر کا اقتباس یوں پیش کیا ہے۔

"راشٹر کا انت ہو گیا۔ راجاؤں کی برتی ندھی، راج ستا کو اپنا سا کر لیں گے۔ مسلمان جس طرف اپنا فائدہ دیکھیں گے اُدھر جائیں گے۔ سبھی دل اپنی اپنی رکشا کریں گے۔ راشٹر کی رکشا کون کرے گا؟ پورا چکر دیدہ ہے۔"

اور اس جملے کے بعد امرت رائے لکھتے ہیں۔

"کرم بھومی انھیں دنوں میں آکر پوری ہوئی۔"

(قلم کا سپاہی صفحہ ۵۶۵-۵۶۶ دسمبر ۱۹۷۶ء ایڈیشن)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ کرم بھومی ۱۹۳۲ء میں تمام ہوئی جو ہندی میں تھی۔ اب پریم چند کا خط جینندر کمار کے نام ملاحظہ ہو۔ یہ خط ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا ہے۔

"کرم بھومی کا اردو انواد جامعہ ملیہ سے شاید نکل جائے۔ اور کیا لکھوں آشا ہے تم پرسن ہو گے۔" (مدن گوپال صفحہ ۲۹۵)

پھر ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو بمبئی سے ایک خط حسام الدین غوری کو پریم چند نے لکھا جس کی عبارت یوں ہے۔

"میری دو کتابیں جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں۔ ایک کا نام "میدانِ عمل" دوسری کا نام "واردات" میری زیرِ تصنیف ہے۔" (مدن گوپال صفحہ ۲۲۴)

یہاں پہلی مرتبہ پریم چند نے میدانِ عمل کا نام لکھا ہے۔ اور جینندر کمار کے خط میں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ یہ کرم بھومی کا "انواد" ہے۔ میرے پاس میدانِ عمل کا پہلا ایڈیشن ہے جو مکتبہ جامعہ دہلی سے چھپا تھا موجود ہے اس کے اختتام پر کاتب نے اپنا نام اور ختم کتابت کی تاریخ بھی لکھ دی ہے جو اس طرح ہے۔

"کتبہ محمد نصیر بگرامی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء"

۲۴ دسمبر ۱۹۳۵ء کو پریم چند ایک خط جینندر کمار کو لکھتے ہیں جس میں کرم بھومی کے اردو ایڈیشن کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"میرے کرم بھومی اردو ایڈیشن جامعہ ملیہ نے نکالا ہے ہو سکے تو کاشی نمبر پریس کے لیے کچھ لکھنا۔" (مدن گوپال صفحہ ۲۴۴)

اب کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ میدانِ عمل کرم بھومی کا اردو ترجمہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء کے اختتام تک جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے میدانِ عمل کی جو تاریخ اشاعت ۱۹۳۲ء بتائی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ تاریخ محض قیاس کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ اُن کی عبارت اس طرح ہے۔

"اردو میں میدانِ عمل ۱۹۳۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دلی سے شائع ہوا۔" (فن اور تعبیرِ فن صفحہ ۲۲۲، ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

ہم ایک اہم مسئلہ ابھی باقی رہتا ہے کہ میدانِ عمل کا اردو ترجمہ کس نے کیا؟ خود پریم چند نے یا کسی اور نے۔ پریم چند نے اس کی کہیں وضاحت نہیں کی۔ نہ اپنے کسی خط میں اس کا اشارہ کیا ہے۔

نظر آیا تھا۔ (۳) اسکا محقق اور مجاہد علم کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا پورا اندازہ لگانا میرے لئے ناممکن نہ تھا۔ اور ایک وفد کے ممبر کی حیثیت سے میرے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ میں کتب خانۂ رامپور کے علمی خزانے کی تلاش و تجسس کرتا یا اُس چُپ چاپ بیٹھے اپنے کام میں غرق عالم اور محقق سے بات چیت کرتا لیکن اس محقق کی نابغیت کا عکس کبھی میرے ذہن سے زائل نہ ہوا۔ برسوں پہلے کی کم علمی اور کم خبری تو ہنوز میرے ساتھ ہے مگر اس طویل زمانے کے رنگا رنگ تجربوں سے اتنا ضرور حاصل کر سکا ہوں کہ اچھے اور بُرے کے مابین کسی حد تک امتیاز کر سکوں۔ میری دلی تمنا ہوتی ہے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے علمی اور ثقافتی میدان میں کوئی مناسب کام انجام دوں۔

پشتون زبان، تاریخ اور ادب سے متعلق تحقیق کے دوران ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے بعض مشہور کتب خانوں میں ہمارے اس علاقے کی زبان اور تاریخ سے متعلق مفید کتابیں اور دستاویزات موجود ہیں۔ علی گڑھ، بانکی پور، حیدر آباد، ٹونک، بھوپال، دہلی اور کلکتہ وغیرہ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں کافی مواد دستیاب ہونے کی اُمید تھی ہمیں یہ بھی توقع تھی کہ روہیل کھنڈ کے علاقے یعنی رام پور وغیرہ کے گھرانوں میں مفید اور نادر مخطوطات ہوں گے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کتب خانۂ رامپور کے اس محقق عالم نے ضرور اس میدان میں کچھ کام کیا ہوگا۔

اوائل اپریل ۱۹۷۷ء میں پشاور یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی جب جامعۂ اُردو علی گڑھ میں جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کرنے کے بعد واپس آئے تو انھوں نے مولانا عرشی کی اس کتاب اُردو اور افغان (یا اُردو میں پشتو کا حصہ) کا تفصیل سے ذکر کیا اور بتایا کہ وہ مولانا عرشی سے یہ وعدہ بھی لے آئے ہیں کہ اگر پشتو اکیڈیمی اس کتاب کو شائع کرے گی تو علامۂ موصوف اس بارے میں اور کسی سے معاملہ نہیں کریں گے۔

علامۂ عرشی ایک جید عالم اور محقق ہیں اور اُن میں پشتو نولی کی رگ زندہ ہے۔ مختصر خط و کتابت میں انھوں نے مجھے لکھا کہ:

"مسودہ بھیجتا ہوں کام آئے تو آپ کی چیز ہے میں تاجر اور سوداگر نہیں طالب العلم ہوں۔ یہ میری برسوں کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے اور علاقۂ کردہ میں قائم علمی ادارہ پشتو اکیڈیمی اس کا مستحق ہے کہ یہ کتاب اُسی کے سپرد کی جائے۔"

بعد ازاں میں نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے اجازت طلب کی۔ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کرنل منور خان آفریدی نے اس اقدام کی جس گرم جوشی سے تائید کی اسے الفاظ میں ظاہر کرنا ممکن نہیں۔ کرنل صاحب نے کہا کہ ثقافت کے سلسلے میں یہ اک عظیم کارنامہ ہوگا۔ اس کتاب سے اُردو زبان کی ساخت بنیاد اور ذخیرۂ الفاظ پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہند و پاک کی ثقافت میں اُردو زبان کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔

اُردو ہند و پاک کی وہ مشترک میراث ہے جس میں ہم سب برابر کے حصے دار ہیں۔ اور کوئی بھی اس کا منفرد دعوے دار نہیں بن سکتا۔ اگر مختلف علاقوں والے اُردو کے آغاز اور ابتدا میں اپنا دعویٰ اور حق تسلیم کرانا چاہیں تو علمی لحاظ سے اس بارے میں پشتونوں کا دعویٰ فائق نظر آئے گا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ کتاب اُردو افغان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یک جہتی اور اتحاد کے بلند نصب العین کے پیش نظر ارباب علم اس کتاب کا بغور مطالعہ کریں گے۔ اور ثقافت

کے تحفظ و بقا کی خاطر اس کی قدر کریں گے۔

علامہ عرشی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں اُن تمام اسباب و علل سے مدلل بحث کی ہے جن کی بنا پر پشتو پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اُردو کی ساخت و پرداخت میں اُن کا بڑا اہم حصہ ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے میں مولانا عرشی کی اس دلچسپ تحریر کو یہاں نقل نہیں کرتا اور نہ اس میں کسی اضافے کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ بہرحال ہمیں یہ احساس پیدا کرنا چاہیئے کہ برصغیر کی زبانیں رسم و رواج اور دستور آپس میں متضاد یا متناقض نہیں ہیں بلکہ ان سب کے ادغام و امتزاج سے وہ صحیح ثقافت متشکل ہوگی جس کی تعمیر و تشکیل ہم سب کے پیش نظر ہے اور جو مستقبل میں عالمی ثقافت میں ایک اہم کردار ادا کرے گی۔

اس مشکل کام میں مولانا عرشی کی محنت و عرق ریزی لائق تحسین و قابلِ ستائش ہے۔ ایسے ہی برصغیر ہند و پاک کے اُن بہت سے علاقوں روہیل کھنڈ، حیدرآباد، بھوپال، ٹونک، جاورہ، دہلی، قصور، ملتان اور سندھ وغیرہ کے افغان باشندوں میں محقق اصحاب رائے اور ارباب ذوق بھی اپنے اپنے علاقوں کی مروجہ زبانوں میں پشتو الفاظ کی تلاش و تحقیق کریں جہاں جہاں پختون جا جا کر بسے اور ان کے اس مستقل رہنے سہنے کے باعث بہت سے پشتو الفاظ اب مقامی زبانوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ علامہ عرشی کی رہنمائی میں میری توقعات اور بھی قوی ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ بلکہ کامیاب و بارآور ثابت ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ بعض عجلت پسند حضرات یہ پوچھیں گے کہ آخر اس تمام تگ و دو کا فائدہ کیا ہے؟ تو میں اُن کی خدمت میں عرض کروں گا کہ انسان کے عام علمی اور عملی نظام معاشرت و ثقافت کا تقاضا یقین، اُس کی تفاہیمت اور اس کا ماحصل آپس میں مفاہمت و معاونت ہے اور زبان اس نظام کے قیام میں اہم اور بنیادی ہے۔ جو انسانی رابطہ و تعلق کا اہم ترین فطری نفسیاتی اور تربیتی آلہ ہے۔

میرا ذاتی مشاہدہ تو یہ ہے کہ میں نے اپنی مادری زبان کی لغوی تحقیق کے میدان میں اگر بعض یورپی زبانوں کے الفاظ میں یگانگت اور ہم آہنگی پائی ہے اور مجھے یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک کے علماء سے اس سلسلے میں مذاکرات اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا ہے تو با وصف اس کے کہ ہم میں اور اُن میں بڑی حد تک مختلف النوع اختلافات پائے جاتے ہیں محض لغات کے توافق اور تشابہ سے آپس میں ایک عجیب نفسیاتی مگر خوش آیند مفاہمت اور موافقت محسوس ہونے لگی ہے۔ اگر اسی نظریئے کو عملاً توسیع دی جائے تو انجام کار یقیناً وہ مختلف انسانی طبقوں کے مابین اختلاف کو رفع کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔ علاوہ بحقیقت علم، فن، ہنر و حکمت بلا امتیاز زمان و مکان اور بلا اختلاف رنگ و نسل اولادِ آدم کی مشترک میراث ہے۔ اور اس میراث سے استفادے کا سب سے مستحسن، لطیف، پُر امن و پُر کشش طریقہ بھی ایک دوسرے کی زبانوں اور اُن سے پیدا شدہ افکار و جذبات کا فہم و افہام اور اُن کی قدر و منزلت ہے۔

دوسری بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کا مطالعہ جب اس زاویۂ نگاہ سے کیا جائے گا جو مولانا عرشی نے پشتو اور اُردو کے باہمی تعلق کے اثبات کیلئے اپنی گراں قدر تصنیف "اردو اور افغان" کی وساطت سے پیش کیا ہے۔ اور ہر علاقے کے لوگ اپنی زبان کا برصغیر کی دیگر علاقائی زبانوں سے قائم کرلیں تو بہت ممکن ہے کہ ثقافتی ہم آہنگی جو انسانی ترقی و بہبود کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ ان مطالعوں کی برکت سے آسان ہو جائے گی۔ اور اگر اس روشنی میں ایسے

(باقی صفحہ ۳۲)

چودھری غیاث الدین شرف

ضلع بارہ بنکی
ماضی اور حال کے آئینہ میں

(دوسری اور آخری قسط)

نہیں۔ ہر ایک انھیں یوں ہی جانتا ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہ ایک ایسے سخت وقت میں خوراک کا مسئلہ انھوں نے بڑی آسانی سے حل کر دیا تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت اور مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی سادگی و شرافت اور نیکی و انسانیت کے قصے آج تک لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ موضع مسولی کے رہنے والے تھے جہاں کے تین آدمی سفیر مقرر ہوئے۔ انور جمال قدوائی Secretary Union Ministry for Information and Broadcasting کشمیر Public کشمیر کے Public Service Commission کے چیرمین رہے اور اب شیخ الجامعہ ہیں۔ بیگم انیس قدوائی سابق ممبر پارلیمنٹ مشاہیر میں شامل اسی چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی ہیں۔

قدوائیوں کا ایک مسولی سے ملا ہوا ضلع بڑا گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ شفیق الرحمان قدوائی ڈاکٹر ذاکر حسین کے خاص ساتھی ہندوستان میں Basic education کے بانی اور دہلی گورنمنٹ میں وزیر تھے۔ ان کے ایک بیٹے ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نہرو یونیورسٹی میں اُردو کے استاد ہیں۔

بیگم محسنہ قدوائی M.P. سابق وزیر حکومت اتر پردیش اور اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر بہار اسی موضع کے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر جلیل الرحمٰن قدوائی بھی اسی گاؤں کے ہیں۔ رضوان الرحمٰن قدوائی I.F.S. اور ان کے والد بزرگوار نصیر الرحمٰن قدوائی آپ اپنی مثال ہیں۔ اکرام الرحمٰن قدوائی جن کا انتقال پر ملال ایک حادثہ میں ۲۰ فروری گزشتہ کو ہو گیا ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خبر ملتے ہی ہزاروں آدمیوں کا بڑے گاؤں میں ایک میلہ سا لگ گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ان کے یہاں انعام الرحمٰن قدوائی مدینہ منورہ جاتے ہوئے موٹر کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ وہ ہندوستانی سفارت خانہ میں فرسٹ سکریٹری تھے۔

ضلع بارہ بنکی کے شرفا کی آبادی زیادہ تر [illegible] صفات ہیں جو اپنی پرانی روایات [illegible] رکھنے کی کوشش اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جس گاؤں میں چلے جایئے کوئی نہ کوئی پرانا خاندان ضرور ملے گا اور کوئی نہ کوئی فرد کسی بڑے عہدہ پر فائز یا کسی نہ کسی خصوصیت کا حامل۔ بارہ بنکی کے لوگ عرسوں، میلوں اور شادی بیاہ میں شرکت بہت ضروری اور اہم سمجھتے ہیں۔ ہر دور میں یہاں نامی شعرا موجود رہے ہیں۔ بارہ بنکی کے قصبات اور شہر میں برابر مشاعرہ منعقد ہوتے رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح یہاں اب بھی اچھے شعراء موجود ہیں۔ عزیز صاحب بارہ بنکی کے استاد سمجھے جاتے ہیں

ہیں۔ یہاں کے ایک باغ و بہار تعلقدار چودھری محمد علی صاحب
(۱۸۸۲-۱۹۵۹ء) تھے جو بڑے پڑھے لکھے کئی کتابوں کے مصنف اور ایسے
دلچسپ اور خوش مذاق بزرگ تھے کہ ان کی دلچسپ ترین گفتگو
اور لطیفوں سے پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی دلچسپی تھی۔ میں نے دیکھا
کہ ان کے محل میں ہر گلاب کے درخت میں ایک ٹین کا ٹکڑا لگا ہوا ہے
اور اس پر ان کے کسی دوست کا نام لکھا ہوا ہے۔ سفید تار کا بنا ہوا
خوبصورت حقہ ایک طشت میں رکھا ہے جو پھولوں سے آراستہ
کیا گیا ہے۔ چلم پر چاندی کا جھمل رکھا ہے جس میں چاندی کی
زنجیریں لگی ہوئی لٹک رہی ہیں۔ نفیس خوشبودار تمباکو فضا کو معطر
کئے ہوئے ہے۔ ردولی کے شرفا میں ایک خاص نفاست ہے۔ حقہ کا
جس قدر اچھا نیچہ یہاں بنتا ہے لکھنؤ میں کبھی نہیں بنتا۔ بوٹ کے
جیسے نفیس لڈو اور نقل ردولی میں بنتے ہیں کہیں اور نہیں بنتے۔
ردولی کے مشہور شعرا مجاز مرحوم اور مسعود اختر جمال مرحوم کو
جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے کون نہیں جانتا۔

ایک انصاری بزرگ ہرات سے ۔۔۔

[illegible] ہندوستان [illegible] جو [illegible] سہالی میں قیام [illegible]
[illegible] تین چار [illegible] پر آباد [illegible] ملا قطب الدین [illegible]
[illegible] مشہور عالم دین بزرگ [illegible] شریف [illegible] ملا عبد السلام
[illegible] کی فوج [illegible]
[illegible] حضرت شاہ [illegible] کی [illegible] یاد تھی۔ جو سید [illegible]
[illegible] مولانا ضیاء الدین صاحب دہلوی آئے
[illegible] شاہ شجاع کرمان کی اولاد تھے۔ ملا عبد السلام صاحب کی ولادت
تین چار پشت کے بعد ہوئی۔ ملا صاحب کے بیٹے دہلی میں قاضی القضات
ہوئے۔ ملا قطب الدین کے صاحبزادہ ملا نظام الدین صاحب کے
متعلق علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ان سے بڑا عالم دین
پیدا نہیں ہوا۔ ملا صاحب کو استاد الہند کا لقب ملا۔ انھوں نے درس
نظامیہ مرتب فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ آج بھی اس کو اس کی کتابیں
پڑھے بغیر اپنی عالم نہیں ہو سکتا۔ مولانا شبلی نے تحریر فرمایا کہ روئے زمین
پر علما کا کوئی اتنا عظیم الشان خاندان پیدا نہیں ہوا جس میں نسل
بعد نسل ہر زمانہ میں مستند علماء موجود رہے جو اپنے عہد کے نہایت
مستند اور بڑے علم بزرگ تسلیم کیے گئے۔ اقطاع فرنگی محل اور دوسرے
گاؤں کی جاگیر شہنشاہ اورنگ زیب نے ملا نظام الدین صاحب کو
پیش کی تھی۔ اس وقت سے یہ خاندان لکھنؤ میں آباد ہو گیا۔ جب زمینداری
ختم نہیں ہوئی تھی تو میں نے ایک خوش مذاق بڑے زمیندار کے یہاں
دیکھا کہ پہلوان ملازم ہے جو گاؤں والوں کو کشتی لڑانا سکھاتا ہے۔
چنانچہ صبح ہوتے ہی اکھاڑہ پر لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ رات کو بٹیروں
کا شکار کیا جاتا۔ جو لڑنے کے قابل ہوتیں وہ لڑائی کے لئے تیار
کی جاتیں باقی کھانے کے کام آتیں۔ پانی میں لڑائی کا تماشا دیکھنے
کے لائق ہوتا ——

بارہ بنکی کا ذکر اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک بھٹی
تعلقدار چودھری مہدی حسن خاں کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ زندگی بھر
گھوڑ گاڑی پر بیٹھ کر نکلتے تھے۔ چالان ہوتے رہے تو گھوڑوں کے تاجر
بن گئے [illegible] میں دس دس بارہ بارہ گھوڑے لگا کر نکلتے جو گویا
Demonstration کہلاتا۔ چودھری صاحب کی بڑی شہرت ہو چکی
تھی ان کے ایک دوست لکھنؤ میں ایک نواب صاحب سے ملنے گئے جو
آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ انکی میز پر ایک پنجرا رکھا تھا جس میں
ایک تیتر بند تھا نواب صاحب نے کچھ دیر بعد کہا کہ وہ لڑکا مہدی
حسین بہت چل نکلا ہے۔ تم ان سے کہو کہ وہ مجھ سے تیتر لڑائے
انھوں نے نواب صاحب کا پیغام اس لئے نہیں کہا کہ فساد پیدا
ہو جائیگا۔ اتفاقیہ ایک شام کو نواب صاحب امین آباد میں مل
گئے جبکہ ان صاحب کے ساتھ چودھری صاحب کے رشتہ دار
بھی تھے۔ نواب صاحب نے پوچھا کہ میاں تم نے کیا میرا پیغام مہدی

حسن تک نہیں پہونچایا۔ یہ سنکر چودھری حسن صاحب کے رشتہ دار فوراً بول اٹھے کہ آپ فرمائیں ہم آپ کا پیغام انہیں اور ان کا جواب آپکو پھر پہونچا دیں گے۔ نواب صاحب بولے کہ میں تیتر لڑانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے یہ پیغام پہونچا دیا۔ اور جواب نواب صاحب کو کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک تیتر کا مقابلہ میں سو روپیہ ہر تیتر لڑا سکتا ہوں۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو صرف تیتر لڑانا چاہتا ہوں۔ چودھری صاحب نے دو ہیلکھنڈ کے بہت مشہور چھالیوں کو بلا کر کئی سو تیتر تیار کرائے۔ اور نواب صاحب سے کہلایا کہ جب آپ یاد فرمائیں میں عزت افزائی کے لئے دولت پر حاضر ہونگا یا اگر آپ غریب خانہ پر تشریف لائیں تو میری عزت افزائی ہوگی لیکن میری رائے یہ ہے کہ یہ جنگ جنبش کے میدان میں لڑی جائے۔ دو سبب یہ کہ تیتر آدمی کی بغل سے نکل کر جب میدان میں جاتے ہیں تو قدم پیچھے نہ جائے۔ چنانچہ اگر تیتر بھاگا اور کسی نے تالی بجائی یا آوازیں کسے۔ تو پھر ہار ہو جائے گی۔ یہ سنکر نواب صاحب حیران ہوئے اور بولے کہ میں نے سنا ہے کہ فوراً مار سپاہی کرنے لگتے ہیں۔ میں ایک سپاہی آدمی ہوں میں ان سے تیتر نہیں لڑاؤنگا۔ یہ بات جب مہدی حسن خاں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے مسٹر Dawlings کا دس ہزار روپیہ طلب کیا۔ ظاہر ہے کہ نواب صاحب نے انکار کر دیا۔ پھر دیوانی میں مقدمہ لڑا جس میں ہزارہا روپیہ صرف ہوا اور آخر کار سات سو روپیہ پر صلح ہوئی۔

چودھری صاحب کا ایک لاجواب قصہ یہ ہے کہ ایک بار پردان کے مشہور میلہ میں گئے ایک ہاتھی پسند کیا۔ قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ کوئی دائی ملک ہاتھی کو خرید چکے۔ اور قیمت بھی دیدی۔ انکے آدمی ہاتھی لینے آرہے ہونگے۔ انھوں نے قیمت فروخت معلوم کی اور ہاتھی کے مالک کو زبردستی یہ کہہ کر دی کہ ہاتھی اس کا ہوگا جو اسے کھول لیجائے گا جیسے ہاتھی نہ ملے اسے قیمت لوٹا دینا۔ ان کے ساتھ ہر قسم کے آدمی رہا کرتے تھے وہ ہاتھی کھول کر بارہ بنکی لے آئے۔

مجھگواں شریف کا موضع۔ موضع سہالی سے بہت قریب ہے۔ یہاں ایک بہت بڑے بزرگ کا مزار ہے جنکا نام مخدوم شیخ سارنگ تھا۔ یہ لکھنؤ کے حضرت مخدوم مینا کے مرشد تھے۔ مخدوم صاحب سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد ۱۳۵۱ء میں مجھگواں شریف میں جو جنگل تھا یاد الٰہی میں سارا وقت گزار دیتے تھے۔ اسوقت وہاں کے سجادہ نشین عارف میاں صاحب ایک جماعت کثیر کے حلقہ ارادت میں داخل ہے۔

نیند ہونگ زیب حضرت سید شاہ عبدالرزاق سلسلہ قادریہ کے ایک بڑے کامل بزرگ بانسہ شریف میں تشریف فرما تھے۔ ملا نظام الدین صاحب کو آپ سے کمال ارادت تھی۔ ان علماء فرنگی محلی نے اپنے نام کے ساتھ سگ بانسہ لکھا ہے۔ حضرت سید صاحب کی ولادت سنہ ۱۶۳۶ء کے قریب ہوئی اور قریب ۹۹ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

بیس سال کی عمر تھی کہ سنہ ۱۷۴۲ء میں بابا جگجیون داس نے موضع کلٹروا میں جو دریاباد سے قریب چار میل ہے اقامت اختیار کی آپ کی ولادت موضع سرد ہا میں ہوئی تھی۔ خاندان کی رشتہ داریاں تعلقداروں سے ہوتی رہیں۔ باباجی نے ستنامی فرقہ قائم کیا لاکھوں آدمی اس فرقہ میں داخل ہوئے۔ باباجی کی وفات سنہ ۱۷۶۱ء میں ہوئی۔ باباجی نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ مہاراجہ ٹکیت رائے کے بھتیجے نے سمادھ کی عمارت بعہد نواب آصف الدولہ تعمیر کرائی۔ باباجی کی تعلیم یہ تھی کہ ایک خدائے واحد کو مانو۔ تمام اوتاروں کی بھی عزت کرو۔ باباجی کے حلقہ بگوشوں میں ہر طبقے کے لوگ تھے انہیں سے ایک چیلے نے اودھ میں اور دوسرے نے امرتسر میں مٹھ تعمیر کئے۔ باباجی نے خدمت انسانیت اور نیکی کی تعلیم دی باباجی کو سید صاحب بانسہ ...

(باقی مضمون صفحہ ...

نمایندہ شعر و ادب :-

ادبی خبریں

جون کے مہینے میں مجلس علم و ادب لکھنؤ کی جانب سے
اندرا لیہ لکھنؤ کے خوبصورت ہال میں منعقد ہونے والی تہنیتی
تقریب لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔
بزرگ صحافی، ادیب اور شاعر امین سلونوی اور
مشہور ناول نگار اور ناشر تسلیم نہوی کی ادبی، سیاسی اور سماجی
خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے والی یہ تقریب ۸ جون کو
اُردو اکیڈمی کے چیرمین علی جواد زیدی کی صدارت میں
منعقد ہوئی۔ مسٹر جسٹس مرتضیٰ حسین نے اپنے افتتاحی خطبہ میں
امین سلونوی کو فرض شناس ادیب اور ایک اعلیٰ انسان
قرار دیا اور تسلیم نہونوی کی ناول نگاری کو مشرقی کلچر
کا ترجمان بتاتے ہوئے اُن کی جد و جہد اور کسی اعانت کے
بغیر ناشروں میں ایک خاص مقام حاصل کرنے کو اُن کا
کارنامہ بتایا۔

شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور اردو دوستوں کے
اس اجتماع میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، جمیل مہدی
ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ، حکیم ابن صاحب فیض آبادی نے
امین سلونوی کی محبت، شفقت اور جنگ آزادی میں اُن کے
عمل کردار کو خراج تحسین پیش کیا اور ڈاکٹر اسلام سندیلوی،
حفیظ نعمانی، محترمہ عفت موہانی نے تسلیم نہونوی کی جد و جہد
اُنکی اصلاحی تاریخی اور جاسوسی ناولوں پر روشنی ڈالی۔

ابتدا میں مجلس کے سکریٹری جنرل عمر انصاری نے مجلس
کی سرگرمیوں پر رپورٹ پیش کی اور الحاج شیخ نعمت اللہ
نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ تقریب کے درمیان عمر انصاری
الحاج نعمت اللہ، صباح الدین عمر، عرفان لکھنوی، شاہجہاں
بانو یاد، انجم ملیح آبادی، چودھری شرف الدین نے مہمانان
خصوصی کی گلپوشی کی۔ تقریب کی نظامت اُردو اکیڈمی کے [illegible]
کے سابق سکریٹری صباح الدین عمر نے کی۔

اپریل کے مہینہ میں منعقد ہونے والی غیر مسلم اُردو مصنفین
کی سہ روزہ کانفرنس سے بھی اُردو حلقوں میں بیداری پیدا ہو گئی۔
اور اُردو کے مستقبل کے بارے میں امید افزا نتائج دیئے۔ زبان
کے مسئلہ پر عوامی جد و جہد [illegible] کیا گیا۔ کانفرنس کے سلسلے
میں معروف افسانہ نگار رام لعل کی کوششوں کو ادبی حلقوں
میں کافی سراہا گیا۔

اسی ماہ میں اکیڈمی کی جانب سے [illegible]
اعزازی تقریب بھی شہر کے ادبی حلقوں کے لئے موضوع بحث
رہی۔ سنجیدہ حلقوں نے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو

کسی ادارے کی جانب سے سند اعزاز دیئے جانے کی تقریبات کو بہترین سمجھا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ عرصہ سے اداروں یا انجمنوں کی جانب سے شاعروں اور ادیبوں کو سند اعزاز سے نوازنے کی وبا عام ہو گئی ہے۔ اور اہل قلم نے آج تک اس جانب توجہ دینے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی سندوں سے ممتاز اہل قلم [illegible] کوئی اضافہ تو نہیں ہوتا بلکہ وہ خود سندوں کو شرف قبولیت بخش کر ان اداروں کو ضرور مستند کر دیتے ہیں جنھوں نے انھیں ایوارڈ دیا [illegible]۔

میں اکرم [illegible] صاحب سے اقبال منزل لکھنؤ کے کشادہ سبزہ زار پر منعقد ہونے والی اس تقریب میں مسٹر جگناتھ مسرا وزیر اعلیٰ بہار نے ممتاز فنکاروں کو ان کی شان میں، امتیازی اور اعزازی سندوں سے نوازا۔ ان سندوں کے ساتھ ہر فنکار کو نقد انعامات بھی دیئے گئے جو یقیناً معاشی الجھنوں کے اس دور میں دل خوش کن اور منفعت بخش ثابت ہوئے ہوں گے۔

اس تقریب میں مسٹر [illegible] پرتاپ سنگھ وزیر اعلیٰ [illegible] کی شرکت اور اردو کے مسئلہ میں انکی یقین دہانیاں ضرور اہمیت رکھتی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے دل خوش کن وعدوں کے بجائے اردو والوں کو یقین دلایا کہ انکی حکومت ۱۹۸۰ء کے آخر تک اردو کو [illegible] تسلیم کر لیگی۔ مسٹر سنگھ نے [illegible] اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے صاف اور کھلے ذہن کے ساتھ کہا کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ دینے والی اس زبان کو اب ختم نہیں کیا جائیگا۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم آندھیوں اور طوفانوں سے محفوظ رکھ کر اس کو منزل تک پہنچائیں۔

بسلسلہ مضمون صفحہ [illegible] کا

قائم کئے جائیں جن میں مختلف علاقوں کی زبانوں کے چیدہ چیدہ اور منتخب ماہرین و علما کی جماعت کے سپرد اس قسم کی لسانی تحقیق کا کام کیا جائے تو میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ انھیں بظاہر بالکل مختلف علاقائی زبانوں کے مابین اتنی وحدت، یگانگت، ہم آہنگی اور مشابہت دیکھنے میں آنے لگے گی کہ یہ حضرات خود حیران و ششدر رہ جائیں گے بلکہ اس قسم کی کاوشوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ ایک زبان والے دوسری زبان کو بھی کسی حد تک اپنی ذاتی زبان سمجھنے لگیں گے اور مختلف علاقوں کے لوگ بخوشی اور بہ سہولیت ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے۔ اے کاش یہ انداز فکر عام ہو اور حکومتوں اور عوام کا ہر طبقہ اس پر ہمدردانہ توجہ سے غور کرے۔

(نوٹ یہ مضمون مولانا [illegible] مرحوم کی حیات میں لکھا گیا تھا)

بسلسلہ مضمون صفحہ [illegible] (بارہ بنکی ماضی اور حال کے)

ایک طرف اور ملامت [illegible] سے دوسری طرف محبت و عقیدت تھی۔ یہ قومی یکجہتی کی قدیم مثال ہے جسے دیوی شریف کے حاجی صاحب نے چار چاند لگا دیئے۔ ملا نظام الدین صاحب نے سید صاحب کے مبارک حالات زندگی پر ایک کتاب فارسی میں لکھی۔ یہ بھی لکھا کہ آپ اُن سے ملنے تشریف لائے۔ ان بزرگوں کی تعلیمات کا اس ضلع کے لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ ہر فرقہ کے لوگوں میں میل ملاپ یا دوستی ہی نہیں بلکہ ایسے تعلقات ہیں جو رشتہ داروں میں بھی نہیں ہوتے۔ حاجی صاحب کی Univer sal Love a Broker hood کی تعلیمات کا اثر یہاں کے باشندوں میں موجود ہے۔

مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

بہ ترتیب حروف تہجی ... دسمبر ۱۹۷۱ء

(ا)

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱	امیر خسرو نمبر	فروغ اردو	15/-
۲	ادبی جائزے	سعادت علی صدیقی	8/-
۳	ایکتا کا چمن تہواروں کے پھول	قمر بسوانی	3/-
۴	احتشام حسین نمبر فروغ اردو	سید انصار حسین ہاشمی	30/-
۵	اردو کا ماضی حال اور مستقبل	احمد ابراہیم علوی	4/-
۶	آئینہ نظم اردو	قمر بسوانی	5/-
۷	انتخاب کلام چکبست لکھنوی	روپ نرائن شیو پوری شاکر	1/-
۸	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن رضوی	18/-
۹	اردو وہم نمبر فروغ اردو	اقبال صدیقی	3/50
۱۰	انوار اللغات اردو المعروف شمس اللغات (پاکٹ سائز)	پروفیسر احتشام حسین	4/-
۱۱	ادبی تاثرات	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	6/-
۱۲	آئینہ عقل	پروفیسر نگہت شاہجہانپوری	4/50
۱۳	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر حسن فاروقی	8/
۱۴	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	6/-
۱۵	انارکلی امتیاز علی تاج (جدید ایڈیشن)		4/-
۱۶	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	5/50
۱۷	اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ	پروفیسر کلیم الدین احمد	15/-
۱۸	اردو میں تنقید	ڈاکٹر حسن فاروقی	7/
۱۹	انتخاب قصائد اردو	مغیث الدین فریدی	1/50
۲۰	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	10/-
۲۱	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم	عبدالشکور	9/-
۲۲	نقوش	شاہ معین الدین ندوی	9/-
۲۳	اکبر نامہ اکبر میری نظر میں	عبدالماجد دریابادی	10/-
۲۴	انتخاب جدید نثر اردو	سید احتشام حسین	5/-
۲۵	اقبال مرتبہ فروغ اردو		1/50
۲۶	البرامکہ اور ان کا عروج و زوال	ڈاکٹر حبیب حسین ایم۔	[illegible]
۲۷	ادبی تنقید	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
۲۸	انتخاب کلام غالب	بشیر احمد [illegible]	[illegible]
۲۹	انتخاب قصائد غزلیات فروغ اردو جدید ایڈیشن		8/-
۳۰	ادب کیا ہے	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	5/-
۳۱	[illegible] خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	3/-
۳۲	آئینہ نثر اردو	سعادت علی صدیقی	6/-
۳۳	ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	4/50
۳۴	الوالمجر	مجنوں گورکھپوری	1/50
۳۵	اردو کی کہانی	سید احتشام حسین	2/50
۳۶	ادب پارے حصہ نظم و نثر	"	6/-
۳۷	ابوالکلام آزاد (نظم)	جگن ناتھ آزاد	35
۳۸	ارمغان نثر و نظم	عبدالواحد خلیل	1/25
۳۹	افسانہ نمبر (مرتبہ فروغ اردو)		2/50
۴۰	اچھی نظمیں	جگر مشتاق	-/40
۴۱	اردو ادب میں طنز و مزاح کا ملا جلا جدید ایڈیشن	غلام احمد فرقت	25/-
۴۲	اردو شاعر	امیر احمد علوی	2/50
۴۳	غزلیات حافظ صاحب غالب	غالب فارسی	3/50
۴۴	آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ		2/-
۴۵	نئی پہچان یعنی زندگی کا حال مع ہمہ [illegible] کتاب	اعجاز احمد فاروقی	1/25
۴۶	اختر کے پیارے	امیر حسن نورانی	-/50
۴۷	اسپین کی شہزادی	صادق سردھنوی	4/50
۴۸	ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو		2/50
۴۹	اپنی موج میں	ادارہ	3/50
۵۰	انوار جدید خط و کتابت	خلیق احمد علوی	-/60

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۵	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	۹/-
۱۶	ترانہ ہائے خیام	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۱۷	تعلیمات اسلامی مکمل ۵ پارٹس	محمد حسین	۳/-
۱۸	تصویر درد مع ترجمہ	علامہ اقبال	۱/۲۵

(ٹ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ٹیگور	نادم سیتاپوری	۳/-
۲	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۳/-

(ث)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ثنائے حبیب نعتیہ کلام	بہزاد لکھنوی	۲/۷۵

(ج)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	جان غالب	محمد حسین شمس علوی	۲/-
۲	جائزے	انور سیوانی	۳/-
۳	جوابات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۴	جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء)	فروغ اردو	۴/-
۵	" " نمبر ۲	" "	۴/-
۶	جوئے رواں مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	۲/۵۰
۷	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	۲/۵۰
۸	جنگ ہنسائی مجموعہ افسانہ	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹	جلوے	معین الدین دردائی	۲/-
۱۰	جمیلہ بوائری (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۱۱	جگر نمبر حصہ اول	سید احتشام حسین	۸/-

(چ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	۲/-

(ح)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	حیات فضل الحق	خیرآبادی	۱/۵۰
۲	حالی بحیثیت شاعر جدید اڈیشن مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۳	حسرت موہانی	عبدالشکور	۱/-
۴	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۱/۵۰
۵	حلیم نباتات	وزیر خاں لنکرانی	[illegible]
۶	حبیبہ غالب	سعادت علی صدیقی	۲/۵۰

(خ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	خطوط مجنوں	سید اثر حسین	[illegible]
۲	خضر راہ مع ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-
۳	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبدالماجد دریابادی	۲/-
۴	خضر راہ مع ترجمہ	[illegible]	۱/-
۵	خلاصہ شریعت زادہ	[illegible]	۱
۶	خلاصہ روح تنقید		۲/-
۷	خلاصہ جواہر العروض		۲/-
۸	خطبات مزاحیہ محمد علی ردولوی مع مقدمہ	شوکت تھانوی	۲/۵۰
۹	خوشی کی تلاش	احسن الطوفی ایم-اے	۴/-
۱۰	خلاصہ شعر الہند حصہ دوم		۱/-
۱۱	خلاصہ المیزان		/۷۵

(د)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	دیوان آبرو		۸/-
۲	دلچسپ کہانیاں		۴/-
۳	دیوان فغانی		۲/۵۰
۴	داستان سہراب و رستم مع مقدمہ فارسی	عبدالواحد خاں خلیل	۲/۵۰

۵- دنیا کا یادگار مشاعرہ — 1/50

۶- دستۂ گل — -/40

۷- دوشیزہ قاف (ناول) — خان محبوب طرزی — 5/-

۸- دلربا — " " — 3/50

۹- دلی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید اڈیشن) — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — 12/-

۱۰- دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — 3/50

(ڈ)

۱- ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — -/50

(ذ)

۱- ذوق جستجو — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — 2/-

۲- ذوق ادب و شعور — سید احتشام حسین — 8/-

۳- ذوق جنوں مجموعۂ کلام — آل احمد سرور — 11/-

(ر)

۱- روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — 9/-

۲- رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ — سید امیر حسن نورانی — 2/50

۳- رہبر مضمون نویسی — شفاعت علی صدیقی — 3/-

۴- راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — 1/50

۵- رخسار سحر — انور کریم صدیقی — 1/50

۶- رفتار — وحشی محمود آبادی — 3/50

۷- رموز حکمت معہ مقدمہ اردو — محمد شریف — 4/-

۸- ریاض فارسی — منتخب کلام فارسی — 3/-

۹- ریختہ ولی جدید اڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — 3/-

(ز)

۱- زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ — مولانا تھانوی — -/50

۲- زنبیلوں کا بادشاہ حکیم بانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی — 2/-

۳- زینب ساحرہ — وحشی محمود آبادی — 3/-

(س)

۱- سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — 4/-

۲- سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — 5/-

۳- سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیر — 9/-

۴- سرد لو (مجموعۂ کلام) — پروفیسر اختر قادری — 4/50

۵- سلک گہر — سید احتشام حسین — 5/-

۶- سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — 1/50

۷- سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — 9/-

۸- سوز (ناول) — مائل ملیح آبادی — 4/-

۹- سیاحت زمین " — محمود اعظم فہمی — 1/50

۱۰- ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — 3/50

۱۱- سنہرا حلقہ — -/75

۱۲- سر سید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — -/50

۱۳- سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — 1/25

(ش)

۱- شعر نو تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن — 8/-

۲- شرح دیوان غالب مزاحیہ — غلام احمد فرقت — 20/-

۳- شرح سلک گہر — عبدالقوی دریابادی — 6/-

۴- شاہ غمگین حضرت جی — پروفیسر عبدالشکور — 3/-

۵- شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — 5/-

۶- شرح ادب پارے نظم — ڈاکٹر محمود الحسن — 5/-

۷- شرح منتخبات فارسی — عبدالقوی دریابادی — 5/-

۸- شبلی نعمانی — انوار الحسن نورانی — 1/50

۹- شرح دیوان غالب جدید اڈیشن — نظم طباطبائی — 9/-

۱۰- شہر اور سماجی زندگی — عبدالعلی قدوائی — 1/-

" " دوم — 1/25

۱۲ مشہری اور سماجی زندگی دوم — عبدالعلی قدوائی — 1/-

۱۳ " اور " سوم " " " — 1/50

۱۴ نشاناتِ تارہ گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — 2/50

۱۵ شعر العجم حصہ اول، دوم سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — 4/-

۱۶ شرح نثر امروزہ ایران — احسن الظفر بی اے — 2/-

۱۷ شرح شعر امروز ایران " مجلد — 4/-

۱۸ شمع و شاعر — علامہ اقبال — 5/-

۱۹ شرح حکیم نباتات و زیرجان — نیر مسعود — 1/75

۲۰ شرح انتخاب قصائد و غزلیات درسی مطابق نصاب بی اے — 8/-

۲۱ شرح شعر پاستان حصہ اول — ڈاکٹر انوار الحسن — 2/-

۲۲ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبدالقوی — 2/-

۲۳ شرح مفتاح العربیہ — عبدالقوی دریابادی — 2/-

۲۴ شرح نصاب فارسی

۲۵ شرح شعر پاستان حصہ دوم — احسن الظفر — 2/-

۲۶ شرح گلہائے ادب — 3/-

۲۷ شرح آئینہ نظم اردو — 3/-

۲۸ شرح نثر فارسی (امروزہ) — 2/-

۲۹ شرح آئینہ نثر اردو (خلیل قدوائی) — 2/-

۳۰ شرح غنچۂ گل — 4/-

۳۱ شرح شعر فارسی کلاسیک — احسن الظفر — 2/-

۳۲ شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶، ۷، ۸ — خلیل قدوائی — 3/-

(ض)

۱ ضمیر و پیر (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — 9/-

۲ صحیفۂ محبت مہدی افادی کے خطوط — ڈاکٹر محمود الٰہی — 6/50

(ط)

۱ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو — 2/-

۲ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ — غلام الثقلین — -/75

۳ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — 1/50

(ع)

۱ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — 6/-

۲ عکس اور آئینے تنقیدی مضامین کا مجموعہ — سید احتشام حسین — 9/-

۳ عبدالماجد دریابادی نمبر — 12/-

(غ)

۱ غالب کا تنقیدی شعور — اخلاق حسین عارف — 2/-

۲ غالب نام آورم — نادم سیتاپوری — 6/-

۳ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر — سید احتشام امیر حسن نورانی — 6/-

۴ غالب کی تخلیقی تخیل — شہید صفی پوری — 8/-

۵ غنچہ و گل — سید محمود الحسن رضوی — 5/50

۶ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر — نادم سیتاپوری — 4/50

۷ غزنی دروازہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — 4/50

۸ غزلیات — نظیری — 1/50

۹ غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید اڈیشن) — ذکی کاکوروی — 25/-

(ف)

۱ فرقت کاکوروی نمبر — 6/-

۲ فن خطابت یعنی استاد تقریر — کلب مصطفیٰ ایڈووکیٹ — 2/-

۳ فریدہ " — خان محبوب طرزی — 2/50

۵. فورٹ ولیم کالج اور اکرام غنی — نادم سیتاپوری — ۹/-
۶. فلسفۂ اقبال — عبدالقوی دریابادی — ۶/-
۷. فلسفۂ ابن رشد — مائل ملیح آبادی — ۲/۵۰
۸. فروغ جام مجموعۂ کلام — فشور واحدی — ۵/-
۹. فغان محسن — محسن کاکوروی — ۱/۵۰
۱۰. فارسی آموز — مشیر احمد علوی — ۱/-
۱۱. فن داستان گوئی جدید ایڈیشن — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۹/-
۱۲. فریاد اُمت — علامہ اقبال — ۱/۲۵

(ق)

۱. قدیم و جدید ہیئت پر مزاحیہ نظمیں — غلام فرقت — ۶/-
۲. قصائد ظہیر فاریابی — ۳/-
۳. قصائد مومن مع شرح — ظہیر احمد صدیقی — ۷/۵۰
۴. قطرے سے گہر ہونے تک — صالحہ عابد حسین — ۲/-
۵. قصص و مسائل — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۶. قصائد قاآنی (فارسی) — ۱/-
۷. قومی ادب نثر و نظم — حامد اللہ افسر — ۳/-
۸. قیامت صغریٰ — سائنسی ناول خان محبوب طرزی — ۱۲/-

(ک)

۱. کلیات اقبال — علامہ اقبال — ۱۵/-
۲. کیسر اور کاہی — بدرالدین طیب جی — ۳/-
۳. کف گلفروش — مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت — ۴/۵۰

(گ)

۱. گاندھی نمبر — ۶/-
۲. گلدستۂ فارسی اول و دوم — محمود بیگ شفیعی — ۲/۴۵
گلزار فارسی یعنی نامہ جدید — ۱/۲۵

۴. گلہائے ادب — ۴/-
۵. گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۱. لوائح جامی — مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۷۵
۲. لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۳. لب بام — عادل رشید — ۴/-
۴. لسانیات اور اردو — نصیر محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰

(م)

۱. مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲. مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو — ۲۰/-
۳. محسن کاکوروی نمبر — ۲/۵۰
۴. مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۲/۵۰
۵. مرثیہ نگاری اور میرانیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/-
۶. مضامین فرحت حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۴/-
۷. " " حصہ دوم " — ۴/-
۸. ماضی کی کہانیاں — آفتاب اختر تلہری — ۴/-
۹. میرے اسٹیج ڈرامے — ڈاکٹر محمد حسن — ۸/-
۱۰. موسم گل (ناول) — عادل رشید — ۷/-
۱۱. مجبور — خان محبوب طرزی — ۴/-
۱۲. مضامین جدید — محمد حادی — ۲/۵۰
۱۳. مثنوی سحر حلال فارسی مع مقدمہ
۱۴. قدرت اللہ بیگ — ۲/۵۰
۱۵. مطالعہ — ذکی کاکوروی — ۵/-
۱۶. مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰
۱۷. معرکۂ رزم دیوان — صادق سردھنوی — ۶/-
۱۸. مثنویات حالی مع اضافہ — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰

۱۹ مراۃ الحالی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۹/-

۲۰ مفتاح العربیہ — محمد حسین شمس علوی — ۵۰.

۲۱ میٹھے بول — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۲/-

۲۲ مصنوعی چاند — خان محبوب طرزی — ۴/-

۲۳ مقدمہ شعر و شاعری — ” مطابق نصاب بی۔اے حالی — ۲/۵۰

۲۴ مرثیہ غالب — حالی — ۱۲/-

۲۵ محبوبہ کربلا — جرجی زیدان — ۳/۵۰

۲۶ معمار — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰

۲۷ مولانا حالی — انوار الحسن صدیقی — -/۵۰

۲۸ انتخاب فسانۂ آزاد یعنی مہاراج بلی رتن ناتھ سرشار لکھنوی

۲۹ ڈاکٹر محمد حسن فاروقی — ۲/۵۰

۳۰ مرزا ملّا نوک جھونک — خواجہ عزیز حسن مجذوب — -/۷۵

۳۱ مجذوب اور ان کا کلام — مولانا رضا انصاری — ۱/۵۰

۳۲ مصباح بلاغت مع مقدمہ — محمد شریف — ۴/-

۳۳ مطالعہ سودا — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/۵۰

۳۴ مقدمات و مقالات — عبد الاحد خاں — ۵/۵۰

۳۵ منتخب سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۵/-

۳۶ مفتاح العربیہ شرح — محمد حسین شمس علوی — ۳/-

(ن)

۱ - ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم

کے نام عبد الماجد دریابادی — -/۸۰

۲ - نثر امروز ایران — ڈاکٹر رغیب حسین — ۴/-

۳ - نشاط تماشا — وجاہت علی سندیلوی — ۴/-

۴ - نقد و انتقاد — اعجاز احمد معجز — ۳/-

۵ - نقش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین — ۱۴/-

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی دوم — ۲۰/-

۶ - شجاعت علی سندیلوی — ۲/۴

۷ - نغمہ کوہسار — خان محبوب طرزی — ۴/-

۸ - نفحات الہند مع مقدمۂ اردو — محمد شریف — ۳/-

۹ - نظم سائیکلوپیڈیا — ذکی کاکوروی — ۱۲/-

۱۰ - نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی — کبیر احمد جائسی — ۳/-

۱۱ نسرین نسترن — ڈاکٹر ہ نور ادتیا — ۱۴/-

۱۲ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ — حامد اللہ — ۶/-

۱۳ نیرنگ خیال حصہ اول — محمد حسین آزاد — ۱/۲۵

۱۴ ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام

کے نام عبد الماجد دریابادی — -/۸۰

۱۵ نوائے سرور جہان آبادی دیوان — ڈاکٹر حکم چند نیر — ۸/۵۰

۱۶ - نیا راستہ (ناول) — خان محبوب طرزی — ۲/۵۰

۱۷ - نوروز ” — مائل ملیح آبادی — ۱/۵۰

۱۸ - نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ — آل احمد سرور — ۱۲/-

۱۹ نیلم — انتصار حسین — ۲/۵۰

۲۰ نذیر احمد کی کہانی — فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰

۲۱ نقوش و افکار — مجنوں گورکھپوری — ۸/-

۲۲ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی عبد الاحد خاں

۲۳ منشی نولکشور نمبر

(و)

۱ - وعدۂ فردا — اثر رحیم آبادی — ۱۵/-

(ہ)

۱ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے — علی عباس حسینی — ۲/-

۲ - ہندی کی کہ مسلمان شعرا

۳۔	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/۰	۹۔	ہمارا سماج ۱۲	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی فریاؔ	۱/۴۰
۴۔	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	مظفر سلیم	۱/۵۰		(مئی)		
۵۔	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	"	۱/۵۰	۱۔	یادگار غالب	مولانا حالی	۸/-
۶۔	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی فریاؔ	۱/۰	۲	یا قوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۷۔	" " ۲	" "	۱/۳	۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰
۸۔	" " ۳	" "	۱/۴				

ملنے کا پتہ :۔ ادارہ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کا ترجمان
بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ڈبلیو / این پی ۔
لائسنس نمبر ۲۰۸۸۴ / ۲۰ / ۱۷ / ۶۴ء
دفتر فون ۲۶۱۳۵
فون رہائش گاہ ۲۶۶۵۶

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

ایڈیٹر :۔
محمد حسین شمس علوی
قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند

شمارہ ۷-۸ اگست و ستمبر ۱۹۸۱ء جلد (۲۸)

مجلس ادارت :۔
عبدالقوی دریابادی (بی۔ اے)
سعادت علی صدیقی (ایم۔ لٹ)
محمد حسنین علوی (ایم۔ اے)

ترتیب

مجلس ادارت

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو ۔	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی ۔ ریڈر شعبۂ اردو	مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر انوار الحسن	
پروفیسر حکم چند نیر	بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر فضل امام	راجستھان یونیورسٹی

زر سالانہ اعزازی بیس روپے
عوام سے : پندرہ روپے
فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ
ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

دو غزلیں

شفیع اللہ خاں رازؔ اناوی

صحنِ چمن میں چاکِ گریباں بہت سے تھے
نیرنگیٔ بہار کے عنواں بہت سے تھے

ان کو غمِ جہاں نے تھپک کر سُلا دیا
آنکھوں میں جنکی خواب پریشاں بہت سے تھے

دنیا فقط مجھی پہ نگاہیں جمائے تھی
ورنہ شکارِ گردشِ دوراں بہت سے تھے

جن کا تمام حسن بلائے غم نے ڈس لیا
ایسے بھی رشکِ ماہِ درخشاں بہت سے تھے

اچھا ہوا بکھر کے سمندر میں گھُل گئی
ناچیز مشتِ خاک میں طوفاں بہت سے تھے

مٹی میں ہے بہار کی خوشبو بسی ہوئی
شاید یہیں پہ رشکِ گلستاں بہت سے تھے

جن کی رگوں میں بادۂ عرفاں تھی موجزن
ان کے قریب صاحبِ ایماں بہت سے تھے

جسموں کو اپنے ڈھانپنے نکلے تھے گھر سے لوگ
پھر بھی نئے لباس میں عریاں بہت سے تھے

ہر انجمن میں اُس کو نئی زندگی ملی
سُنتے ہیں جس کی موت کے ساماں بہت سے تھے

ہم کو یہ رازؔ شامِ گلستاں بتا گئی
محرومِ دیدِ صبحِ بہاراں بہت سے تھے

کرامت علی کرامتؔ

دامن دریدہ اور جگر چاک چاک ہے
قصہ ہمارے عہد کا کیا دردناک ہے

ہم بھی جو مضطرب ہیں تو وہ بھی ہیں بیقرار
یعنی شعورِ غم میں عجب اشتراک ہے

یاروں نے جب سے بدلا ہے اُردو کا رسم خط
پہلے جو تھا فراق وہی اب بھراک ہے

میرے لہو کی شاخ ہے کتنی جھکی ہوئی
دستِ صبا میں تیغ بھی کیا پُرتپاک ہے

یوں ذہن پر ہے عکس فگن درد کا شہاب
ہر ذرۂ حیات بشرتابناک ہے

پہنے ہوئے ہیں وقت کا خلعت کچھ ایسے لوگ
جن کی نظر کے سامنے اپنی ہی ناک ہے

لمحوں کے ٹوٹنے کی صدا سُن رہا ہوں میں
منظر شکست و ریخت کا کیا خوفناک ہے

انساں کے حوصلوں کی بلندی کا ہے ثمر
عرشِ بریں پہ جلوہ فگن مشتِ خاک ہے

اپنے وطن کی خاک کرامتؔ ہے یوں عزیز
جس کا ہر ایک ذرہ مقدس ہے، پاک ہے

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

ہندوستان میں اتر پردیش کو ہی اُردو کی قتل گاہ ہونے کا فخر و شرف حاصل ہے اس نے آزادی کے پہلے دن سے ہی، اُردو زبان اور اس کے رسم خط کو ختم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اتر پردیش کی راجدھانی، اور اُردو زبان کے مرکزی شہر لکھنؤ اور جدوجہدِ آزادی کی تاریخی جگہ امین الدولہ پارک میں قومی پرچم لہرانے سے پہلے اُردو کی وہ عبارت مٹا دی گئی جو جھنڈے کے نیچے لکھی ہوئی تھی۔ یہ پہلا قدم تھا اُردو کشی کی طرف، اور اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ آزادی کے بعد اُردو کو اس ریاست میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا۔ حکومت نے دوسرا مؤثر راستہ محکمہ تعلیم کے ذریعہ سے اُردو کو ختم کرنے کا اختیار کیا، اور ایسے سرکلر، ایسے اشارات اور ایسے ہدایات محکمہ تعلیم کی طرف سے جاری ہونے لگے جن سے عملی طور پر اُردو تعلیم ختم ہو گئی۔ غیروں کی حکومت میں جس زبان کی تعلیم ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ درجات تک بلا کسی روک ٹوک کے بغیر کسی شرط کے ہر اسکول میں رائج تھی، اسی زبان کو اپنوں کی حکومت میں ختم کرنے کا باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا۔ اور پہلا دیش بھگتی کا کام یہی سمجھا گیا کہ اُردو زبان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ کم از کم اتر پردیش میں اُردو زبان اور اس کا ایک بھی نام لیوا باقی نہ رکھا جائے۔ محکمہ تعلیم نے پہلا کام یہ کیا کہ بیسک اسکولوں کی اُردو کتابیں چھپوانا بند کر دیں، جب کتابیں ہی نہ ہوں گی تو پڑھنے والے خود بخود ختم ہو جائیں گے ۱۹۵۲ء تک کتابیں نہیں چھاپی گئیں۔ بڑی کوششوں کے بعد ۱۹۵۴-۵۵ء کے تعلیمی سال سے اُردو میں کتابیں اس طرح شائع کی گئیں کہ ان میں ہندی کتابوں اور ایک ہی فرقہ کی دیومالا کے بیشتر اسباق تھے، صرف رسم خط اُردو تھا۔ اس کے خلاف انجمن ترقی اُردو، ادارۂ فروغ اُردو اور دوسرے اداروں نے باقاعدہ مہم شروع کی، حکومت کی بارگاہ میں متعدد بار وفد کی شکل میں حاضری دی گئی، لیکن "کون سنتا ہے فغانِ درویش"! لسانی سامراجیت، اکثریت کا زعم، اور حکومت کا نشہ، ان وفود کی کیا حقیقت سمجھتا؟ کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بدقت تمام نظرثانی کی منظوری اس شرط کے ساتھ دی گئی کہ صرف زبان درست کر دی جائے، اسباق وہی رہیں گے۔

۱۹۷۲ء تک پورے بیس سال یہ کتابیں نصاب میں داخل رہیں۔ اور مدعیانِ جمہوریت و انسانیت، ہمدردی و رواداری کے اصلی مقاصد کا پردہ فاش کرتی رہیں۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے تعلیمی سال میں پہلے درجے سے آٹھویں درجہ تک اُردو کی کتابیں اتر پردیش اُردو اکادمی کی معرفت تیار کرائی گئیں۔ اور پورے ستائیس سال کے بعد خدا خدا کر کے، منافرت اور تعصب کا مواد ا کتابوں سے دور ہوا۔ مگر ہندی کی کتابوں اور دوسرے مضامین تاریخ وغیرہ کی کتابوں میں زہریلا مواد بدستور موجود رہا۔ اگرچہ مرکزی سطح پر متعدد کمیٹیوں نے نصاب تعلیم کو جمہوری بنانے اور زہریلے اسباق دُور کرنے کا مشورہ دیا، لیکن ان پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف متعصب اور فرقہ وارانہ جماعتوں کو پوری آزادی دی گئی کہ وہ اپنے اسکولوں میں "منافرت" کی تعلیم دیں۔ آج بھی "اتہاس گا رہا ہے" جیسی نفرت آمیز کتابیں پڑھائی جا رہی

ہیں اور حکومت کی قومی یک جہتی کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ فروغ اردو، قومی آواز، عزائم، سیاست جدید وغیرہ نے حکومت کو توجہ دلائی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے وہی تین پات۔

اس سال وزیر اعلیٰ نے جلسے ہی یہ اعلان کیا اور یقین دلایا کہ ۱۹۸۱ء ختم ہونے سے پہلے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے گا، اردو دشمن حلقوں میں مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسی ترکیبیں اور سازشیں کی جانے لگیں کہ رہی سہی اردو بھی ختم ہو جائے۔ محکمہ تعلیم نے یہ شرف حاصل کرنے میں سبقت حاصل کی، اس نے بیسک اور جونیر اسکولوں کے نصاب سے اردو کی تعلیم قریب قریب ختم کر دی، یوں بھی اس کی نگرانی میں اردو نصاب کی کتابیں تعلیمی سال شروع ہونے کے دو تین ماہ بعد آتی ہیں اور کبھی کبھی تو پورا سال گزر جاتا ہے اور کتابیں چھپ کر تیار نہیں ہوتیں۔ ۸۱-۱۹۸۰ء کے تعلیمی سال میں مندرجہ ذیل کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔ یا اگر شائع ہوئیں تو بازار میں نہیں آئیں۔

بیسک اردو ریڈر حصہ دوم ، حصہ سوم
بیسک حساب حصہ دوم ، حصہ پنجم
وگیان سائنس حصہ دوم
ہماری دنیا ہمارا سماج حصہ سوم

ان کتابوں کے علاوہ اس وقت بیسک اردو ریڈر حصہ اول۔ ہماری زبان حصہ دوم، اور جونیر ہائی اسکول کے دوسرے مضامین کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ یہ حالت اس وزیر اعلیٰ کے دور حکومت میں ہے جس پر بظاہر مکر و فریب کی سیاست کا سایہ ابھی نہیں پڑا ہے اور جو کھلی ہوا اور صاف ذہن رکھتا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے بہت پہلے کئی ماہ ہوئے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ بسوں وغیرہ پر اردو میں بھی لکھ دیا جائے گا، لیکن اتنا معمولی کام بھی آج تک نہیں ہو سکا۔ گویا ان کے اعلان کی اہمیت ذمہ دار کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہے۔

باشعور رواداراور انصاف پسند جمہوریت ہوتی تو اس کو یہ احساس ضرور ہوتا کہ جب ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بنگال، بہار، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، آندھرا وغیرہ میں ایسے تعلیمی ادارے موجود ہیں، جہاں تمام مضامین اردو کے ذریعہ سے پڑھائے جاتے ہیں وہاں بیسک اسکولوں میں تو اردو ذریعہ تعلیم ہے ہی، جونیر ہائی اسکولوں، انٹرمیڈیٹ کالجوں، میں بھی اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ اتر پردیش ہی میں اردو ذریعہ تعلیم کیوں نہیں ہو سکتی۔ جہاں سب سے زیادہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ثانوی اسکولوں میں تو بڑی بات ہے۔ ابتدائی اسکولوں میں بھی ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہے۔ اردو کتابیں وقت پر کیوں نہیں شائع ہوئیں۔ جن پبلشرس کو کتابیں چھاپنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ اور وہ سال سال بھر کتابیں نہیں شائع کرتے، ان کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی جاتی، ہر سال اردو کے ساتھ ہی یہ کرم کیوں کیا جاتا ہے۔ اس نااہلی اور نااہلی پر حکومت یا محکمہ تعلیم کی طرف سے کیا کارروائی کی جاتی ہے؟ جس زبان کے خوش نما اور شاندار محل کو لسانی آمریت کا بلڈوزر کھنڈر بنا رہا ہو، اور اس کی بنیاد کو ختم کر دینے پر مسلسل عمل کر رہا ہو۔ اس کھنڈر کو نہ بڑے بڑے سمینار، مشاعرے اور اجلاس بچا سکتے ہیں نہ عالمی اردو کانفرنس بچا سکتی ہے۔ اگر اس زبان کو زندہ رکھنا ہے تو ان نمائشی کاموں کے بجائے، عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلا کام ہر اسکول میں اردو کی تعلیم کو رائج کرانا، اور اس کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے، جس کے لئے دربارداری کے بجائے آبلہ پائی کی ضرورت ہے۔

———※———

ڈاکٹر سید محمد عقیل
صدر شعبۂ اُردو - الہ آباد یونیورسٹی

پریم چند کے ناولوں کے سلسلے میں چند غلطیوں کا ازالہ

ادھر جب سے پریم چند صدی کے جشن منائے جانے لگے
ہیں۔ پریم چند کے سلسلے میں ایک طرف بہت سی نئی باتیں سامنے آرہی
ہیں اور بہت کچھ رطب و یابس، تحقیق کے نام پر چھپ کر ......
...... پریم چند تحقیق میں غلط سلط شامل ہو رہا ہے۔
ہوسکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہی باتیں سند کے طور پر پیش کی جائیں
اور اس طرح تحقیق میں مزید اغلاط کا طومار شامل ہو جائے۔ پریم چند
پر اُردو میں چونکہ بہت کم (تحقیقی) کام ہوا ہے اس لئے ہر محقق اپنی کاوشوں
کو حرف آخر کا رنگ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پریم چند
کے سلسلے میں مزید تحقیق کرنے اور اُن کی تخلیقات کو صحیح تناظر میں
پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے پریم چند کے سلسلے میں ادھر جو کچھ مطالعہ
کا موقع ملا ہے اُس ... اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ بہت سے اُردو
کے ماہرین پریم چند جو تفصیلات کی تلاش در کنار، شاید پریم چند
کے اصل ناولوں یا کتابوں تک بھی نہیں پہونچے ہیں۔ ادھر اُدھر کے
اقتباسات کو بنیاد بنا کر بہت سے حتمی فیصلے کر دیئے ہیں جن سے
پریم چند کا مطالعہ کرنے والا طالب علم خاصہ بھٹک سکتا ہے۔ میں نے
جو پریم چند کی تخلیقات خصوصاً ناولوں کا جو مطالعہ کیا ہے۔ اُسے سلسلے
وار بیان کر رہا ہوں۔

ہم خرما و ہم ثواب

یہ ناول پہلی مرتبہ اُردو میں
باہتمام بابو منوہر لال بھارگو سپرنٹنڈنٹ مطبع نول کشور لکھنؤ میں
چھپا۔ پہلے اڈیشن کے کور پر ناول کا نام اور تمام عبارت یوں لکھی ہے:

ہم خرما و ہم ثواب
ایک دلچسپ ناول
مصنفہ
جناب منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ۔
باہتمام بابو منوہر لال بھارگو سپرنٹنڈنٹ مطبع منشی نول کشور
واقع لکھنؤ میں چھپا۔

معہ جلد ۔ بار اوّل ۔ قیمت ۱۴ ار"

ناول ایک سو چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول میں کُل تیرہ ابواب ہیں کہیں سن طباعت درج نہیں۔ یہ پہلا اڈیشن خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری میں موجود ہے اس ناول کا دوسرا اڈیشن الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں ملا اس پر یہ عبارت درج ہے۔

"ہم خرما ہم ثواب
ایک دلچسپ ناول
مصنفہ
جناب منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ حسب فرمائش بابو ہرچرن داس بھارگو منیجر بھارگو اسکول بکڈپو بزما، امین آباد پارک لکھنؤ

بار دوم

مہتاب پریس لاٹوش روڈ میں باہتمام منشی دیبی پرشاد طبع ہوا۔ جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

۲۰۰ جلد　　جز ۲　　فی جلد ۱۲/

اس ناول میں متن کے کل ۱۰۴ صفحات ہیں۔ اس کا سائز $\frac{18\times22}{8}$ ہے۔ ایک اور اڈیشن اسی سائز کا جناب امرت رائے کے پاس ملا۔ اس پر بھی بار دوم درج ہے لیکن پریس کا نام نول کشور پریس درج ہے۔ کسی میں سن اشاعت درج نہیں۔ اس طرح میری نظر میں یہ تین اڈیشن ہیں جو اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ہندی میں ہم خرما و ہم ثواب کا کوئی نقل، لفظ یعنی روپانتر نہیں ملتا۔ لیکن ایسے ناول پرتیما کے نام سے ملتا ہے۔ کچھ لوگ پرتیما کو 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ہندی ترجمہ سمجھتے ہیں۔ جیسے کسی مترجم نے اُردو سے ہندی میں منتقل کر دیا ہے۔ پرتیما کو یہ لوگ ہندی کا اصل ناول نہیں مانتے ......

خود امرت رائے کا بھی یہی خیال ہے۔ اُن کی عبارت یوں ہے۔

"جس آدمی کو ۱۹۱۲ء میں ایک مختصر سا قصہ لکھنے بھر کی ہندی نہیں آتی، اس نے ۱۹۰۶ء میں پورا ایک ناول ہندی میں کیسے لکھا؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ منشی جی نے اپنے اُردو قصے ہم خرما و ہم ثواب کا ہندی الٹوا دا اپنے کسی دوست سے کرا لیا ہوگا اور شاید بہت دیکھی ایک نظر ڈال لی ہو۔" (منگلا چرن کا دیباچہ صفحہ ۷) ۱۷ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ایک خط پریم چند نے دیا نرائن نگم کے نام لکھا جو مدن گوپال کی کتاب پریم چند کے خطوط میں صفحہ ۱۷۵ پر یوں درج ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی۔ رسالہ زمانہ میں لکھتا رہا۔ کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پرتیما کو انڈین پریس (الہ آباد) سے شائع کرایا۔" اب اس پرتیما کا ٹائٹل نیچے ملاحظہ ہو جو ۱۹۰۶ء میں انڈین پریس سے چھپا۔ پریم چند کی عبارت صاف ہے کہ پرتیما سنہ ۱۹۰۴ء (انیس سو چار عیسوی) میں لکھا گیا جو بعد کو انڈین پریس سے چھپا۔ پرتیما کا ٹائٹل نیچے یوں ہے۔

" پرتیما
ارتھات
دو سکھیوں کا وواہ
وچکر۔ شکھا پرد اور نوتن اپنیاس
لیکھک :
بابو نواب رائے بنارسی
پرکاشک :
انڈین پریس الہ آباد

پرتھم بار ... (کانپور) سن ۱۹۰۷ عیسوی) مولیہ دس آنے
ہم خرما و ہم ثواب اور پرتگیا کا مطالعہ دلچسپ مسالہ فراہم
کرتا ہے۔ کہیں پرتگیا میں واقعات کی تفصیلات بڑھا دی گئی ہیں۔[۱] اور
کہیں عنوان سے وہ اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں جو ہندی والوں
کے لئے شاید اجنبی ہوتے۔ اب ذرا امرت رائے کے مفروضے
پر بھی غور کر لیا جائے کہ منشی جی نے کسی دوست سے 'ہم خرما و ہم ثواب'
کا ترجمہ ہندی میں پرتگیا کے نام سے کرا لیا ہوگا۔" اگر یہ بات
درست ہے تو مترجم کو کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ ترجمہ کرتے
وقت پرتگیا میں اپنی طرف سے رد و بدل کر دے کہیں عبارتیں
بڑھا دے۔ کہیں کردار ادھر۔ ادھر کر دے کہیں قصے کو طول
دیدے پھر اگر ایسا ہوا تو وہ حصے جو پرتگیا میں مترجم نے بڑھائے
وہ پریم چند کے لکھے ہوئے کیونکر ہوئے۔ اس کی دو ہی شکلیں ہو سکتی
ہیں یا تو یہ ترجمہ خود پریم چند نے کیا۔ اور حسب منشا عبارتیں
گھٹاتے بڑھاتے گئے۔ کرداروں کو ہم خرما و ہم ثواب کی مختلف
سچویشن سے ہٹا کر پرتگیا میں دوسری جگہ فٹ کر دیا۔ (مثال کے
طور پر رام کلی اور لکشمی کے کردار) اردو کے معرکۃ الآرا اشعار
حذف کر دیئے۔ عاشقانہ خطوط کو طول دے دیا قصے کو گھٹایا
بڑھا دیا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ پریم چند نے پرتگیا اردو میں
پہلے لکھا۔ اور ہندی میں اپنے کسی دوست سے ترجمہ کرا لیا۔ اس
صورت میں اردو پرتگیا کہاں گئی۔ یا تو اس کا مسودہ ملنا چاہیئے۔
یا پھر پرتگیا، اردو میں چھپا ہوا ملے لیکن دونوں میں سے ایک
بات بھی نہیں۔ اس لئے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ پرتگیا ہندی میں پریم
چند جی نے لکھا۔ جیسا کہ انھوں نے دیانرائن نگم کو اپنے
خط میں لکھا۔ رہ گیا پریم چند کا وہ خط جو انھوں نے ۱۹۱۴ء میں
منشی دیا نرائن نگم کو لکھا جس میں پرتاپ کے دوسرے نمبر میں
کہانی بھیجنے کے سلسلے میں لکھا: ہندی لکھنی تو آتی نہیں مگر کچھ قلم

۱۔ ادھر ڈاکٹر جعفر رضا کی کتاب پریم چند۔ فن اور تعمیر فن کا نیا اڈیشن آیا ہے۔ اس میں جعفر رضا صاحب نے ہم خرما و ہم ثواب کے متون کا مقابلہ کیا ہے
اور ہندی پرتگیا اور اردو کے ہم خرما و ہم ثواب کے اختلاف کی نشاندہی کی ہے۔ یہ اختلافات حسب ذیل ہیں جعفر رضا صاحب کی عبارت یوں ہے
"اردو اشاعت میں ایک جگہ لالہ جی کے انکار (شادی سے انکار) کا بیان ہے اور ہندی میں پرتگیا کی ماں امرت رائے پر فدا نظر
آتی ہے قصے کا انجام دونوں صورتوں میں یکساں ہو جاتا ہے لیکن واقعات کی ترتیب میں فرق ہو گیا ہے اسی طرح ایک دوسری جگہ اردو میں پورنا کا ذکر
ہے اور ہندی میں اس کے ساتھ رام کلی اور لکشمی بھی شامل کر لی گئی ہیں۔" (پریم چند۔ فن اور تعمیر فن ص ۱۴۳)
ہمارے خیال میں یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔ جعفر رضا صاحب نے ہم خرما و ہم ثواب کا مطالعہ ٹھیک طور سے نہیں کیا۔ ہم خرما و ہم ثواب
میں دونوں باتیں موجود ہیں۔ پرتگیا کی ماں امرت رائے پر فدا بھی ہے۔ اور رام کلی اور لکشمی کے کردار بھی ہم خرما و ہم ثواب میں موجود ہیں۔ ہم خرما
و ہم ثواب کی عبارتیں ملاحظہ ہوں۔ پرتگیا کی ماں "ہم خرما و ہم ثواب" میں امرت رائے پر کس طرح فدا ہے۔
"لالہ بدری پرشاد کی بیوی۔ بیچاری [illegible] بیمار تھیں اور انھیں کا اصرار تھا کہ بیٹی کی شادی جہاں تک جلد ہو جائے اچھا ہے....
[illegible] انھوں نے امرت رائے کو ایکبار [illegible] دیکھ لیا تھا۔ اسی وقت سے ان کو یہ دھن سوار تھی کہ میری بیٹی کی شادی ہو تو انھیں سے ہو....
وہ بیچاری امرت رائے کو اپنا داماد سمجھنے لگی ہیں" (ہم خرما و ہم ثواب ص ۱۰۰ دوسرا ایڈیشن) اب رام کلی اور لکشمی کے کردار
ہم خرما و ہم ثواب میں دیکھئے۔
"جب بابو امرت رائے کچہری چلے جاتے ہیں تو اکیلے اُس کا جی بہت گھبراتا ہے۔ بس اُس نے ایک روز اُن سے کہا اگر
کچھ حرج نہ ہو تو رام کلی اور لچھمی کو اس جگہ بلا لیجئے۔ [illegible] ان کی صحبت میں وقت کٹ جایا کرے۔ رام کلی کو ناظرین جانتے ہیں۔ لچھمی بھی ایک کائستھ کی
لڑکی تھی اور گونے ہی کے دن بیوہ ہو گئی تھی۔" (ہم خرما و ہم ثواب ص ۹ دوسرا ایڈیشن)

توڑ مروڑ دیا ہے تو اسے اُردو کے مصنف کا انکسار سمجھنا چاہیئے۔

اس سے یہ مطلب نکالنا مناسب نہیں کہ منشی جی ۱۹۱۳ء تک ہندی نہیں لکھ سکتے تھے۔ اگر امرت رائے کی یہ دریافت صحیح ہے کہ پریم چند نے ورناکیولر فائنل امتحان اُردو اور ہندی میں پاس کیا تھا تب انھیں اتنی ہندی تو ضرور آنی چاہیئے کہ وہ تھوڑی بہت پڑھ سکتے تھے۔ خصوصاً ناول کی زبان لکھنا ایسے آدمی کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اگر امرت رائے کی یہ بات صحیح مان لی جائے کہ ۱۹۱۳ء تک پریم چند ہندی بالکل نہیں لکھ سکتے تھے۔ تو ایسا آدمی ۱۹۱۳ء میں دیا نرائن نگم کے اخبار کے ہندی سیکشن کے اڈیٹر کیسے بننے کو تیار ہے؟ پھر نام کا اڈیٹر نہیں بلکہ "مناسب اور دلچسپ ترجمے کرتا ہے "نوٹ اور تنقید" ہندی میں لکھنے کو تیار ہے۔ پریم چند کے اس خط کی عبارت ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے ۱۹۱۳ء میں منشی دیا نرائن نگم کو یہ پیشکش کی تھی۔

اب رہ گئے ہندی رسالے۔ آپ مجھے اپنی ہندی ڈپارٹمنٹ کا اڈیٹر سمجھئے۔ میں اخبارات اور رسالوں سے مناسب اور دلچسپ ترجمے کر دیا کروں گا کہیں کہیں اُن پر نوٹ اور تنقید لکھوں گا۔ ہندی شعرا کی دلچسپ اور مختصر سوانح عمریوں کا سلسلہ بھی دوں گا۔" (چٹھی پتری جلد اول ص۱۷ یہ خط ۱۴ فروری ۱۹۱۳ء کا ہے)

۲۰ فروری ۱۹۰۵ء (انیس سو پانچ) کو پریم چند نے ایک خط خالص شدہ ہندی میں دیا نرائن نگم کو لکھا ہے۔ جس میں ایک ناول کے مسودے کا ذکر ہے غالباً یہ ہندی ناول پریما کے مسودے کا تذکرہ ہے۔ جو دو سال بعد انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس میں صاف درج ہے کہ یہ کسی ناول کا "پانڈو لیپی" ہے۔ "پانڈو لیپی" کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ مسودہ ہندی میں ہے اس

خط میں ہندی کے ثقیل الفاظ کا خاصہ استعمال کیا گیا ہے خط یوں ہے۔

"دو مہینے سے زیادہ ہوا کہ مجھے اپنے اپنیاس کی پانڈولیپی آپ کے پاس اولوکن نارتھ بھیجنے کا سوبھاگیہ ہوا تھا۔ اس آشا میں کہ آپ میرے لئے ایک پرکاشک جٹانے کی کرپا کریں گے مجھے یاد ہے کہ وہ دسمبر کی آٹھ تاریخ تھی جب میں نے کتاب آپ کے پاس بھیجی تھی۔"

(چٹھی پتری جلد اول ص۱ یہ خط ۲۰ فروری ۱۹۰۵ء کا ہے)

اسی کے ساتھ پریم چند کا ایک اور خط دیکھئے۔ جو انھوں نے دیا نرائن نگم کو سرسوتی پریس بنارس سے ۱۷ جولائی ۱۹۲۶ء کو اپنی سوانح عمری کے سلسلے میں لکھا تھا۔

"۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی۔ رسالہ زمانہ میں لکھتا رہا کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔ ۱۹۰۲ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا۔" (پریم چند کے خطوط ص۱۷۵ مرتبہ مدن گوپال)

اس خط سے ۲۰ فروری ۱۹۰۵ء کے خط کی مکمل مطابقت ہے۔ ۱۹۲۶ء کے خط سے یہ بات بھی صاف ہے کہ ہندی ناول پریما ۱۹۰۴ء میں لکھا گیا تھا۔ جو بعد کو ۱۹۰۷ء میں مل گیا۔ یعنی انڈین پریس جس نے پریما شائع کر دیا۔ ستمبر ۱۹۱۰ء میں ایک اور خط دیا نرائن نگم کو پریم چند نے لکھا جو مدن گوپال کے مرتبہ خطوط میں صفحہ ۴۸-۴۹ پر موجود ہے اس میں ایک جگہ یہ عبارت ملتی ہے۔

"اگر آپ اس میں کوئی امر خلاف شان نہ سمجھیں تو میں کبھی کبھی ایک آدھ مضمون اُردو یا ہندی میں لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں اور آپ اسے اپنی جانب سے انسپکٹر صاحب

نارمل اسکولز کے پاس بھیج دیں۔ یہی اس گزٹ کے ایڈیٹر ہیں ۱۵ جولائی ۱۹۰۸ء کو دیا نرائن نگم کو ایک خط لکھتے ہیں۔

"آج ایک کام سے فرصت ملی۔ شیخ سعدی کے حالات ایک صاحب کی فرمائش سے ہندی میں لکھے۔ اب زمانہ کے لیے لکھنؤ کی فکر میں ہوں۔" (مدن گوپال ص ۴۳)

پھر ۲۱ ستمبر ۱۹۱۷ء کو ایک اور خط نگم کو لکھتے ہیں: "لالہ کاشی ناتھ کی ہندی کتاب تعطیل... یونہی پڑی ہوئی تھی اس پر میں نے ریویو کر دیا۔ کتاب لکھی ہے۔ رفع شکایت ہو گئی۔"

(مدن گوپال ص ۶۵)

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۷ء تک، پریم چند کے ہندی میں لکھنے کے دعوؤں کا ایک سلسلہ ہے۔ کیا بغیر ہندی جانے ہوئے کوئی ہندی میں مضامین، ریویو، تنقیدیں سب کچھ لکھ سکتا ہے؟ یہ بھی سوچنے کی بات ہے ہمارے آپ کے لئے بھی اور امرت رائے صاحب کیلئے بھی اور اُن لوگوں کے لئے بھی جن کا دعویٰ ہے کہ پریم چند ہندی میں کچھ لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

اب پریم چند کے ہندی سے اُردو میں ترجمے کی صلاحیت پر بھی دو ایک باتیں دیکھ لی جائیں۔ اس پوری بحث میں تاریخ اور سنین کو خاص طور پر نظر میں رکھنا چاہئیے۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: -

(۱) بھرت پر ایک ہندی مضمون کا ترجمہ کیا تھا۔ وہ الناظر میں پہلے ہی بھیج دیا تھا حالانکہ وہ زمانہ میں زیادہ موزوں ہوتا۔

(چھٹی پتری جلد اوّل ص ۳۲)

(۲) "ایک اور قصہ بھیجتا ہوں۔ یہ کچھ عرصہ ہوا بنگلہ سے ترجمہ ہو کر مریادا میں نکلا تھا۔ یہ قصہ نہایت دلچسپ ہے ورنہ میں کیوں ترجمہ کرتا۔" (چھٹی پتری جلد اول ص ۳۳)

۲۲ فروری ۱۹۱۲ء کا خط [illegible] لکھا گیا۔

(۳) آپ سُن کر خوش ہوں گے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے یہ بازارِ حُسن کا ترجمہ ہے بازارِ حُسن اب صاف کر رہا ہوں۔"

خط مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۱۹ء۔ مدن گوپال ص ۹۷)

ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ پریم چند نے ہی لیا تھا اور اسی لئے بجا طور پر انھوں نے سیوا سدن کو "میرے ہندی ناول" لکھا ہے اور نقادوں نے بجا طور پر "اسے ہندی زبان کا بہترین ناول" بھی کہا۔ ادھر اُردو میں پریم چند کے ایک محقق ڈاکٹر جعفر رضا صاحب نے اپنی کتاب "پریم چند — فن اور تعمیر فن کے ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں پریم چند کی ہندی دانی پر شبہہ ظاہر کیا ہے۔ اس نئے اڈیشن کے ص ۹ صفحہ پر وہ تحریر کرتے ہیں۔

اب ...... پریم چند کا اپنا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: ۱۹۰۲ء میں ایک ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا جس سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو خیال ہوا کہ پریم چند نے ابتدا سے ہندی اُردو دونوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ اُن کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ پریما ہندی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اُردو ناول ہم خرما و ہم ثواب کا ترجمہ ہے۔ پریم چند کے مکتوب مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ پرتاپ کو کہانی ارسال کرنے تک پریم چند ناگری رسم الخط سے ناواقف تھے۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۷ء کے قبل اُن کی کسی ہندی تخلیق کی تلاش تحصیل حاصل ہے۔"

ایک دوسری جگہ [illegible] لکھتے ہیں۔

" ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کی تحقیق کے مطابق پریم چند نے اپنے تمام ناول ہندی کے قبل اُردو میں لکھے۔ اور جن کے ترجمے ہندی میں شائع ہوئے " (پریم چند اُردو ہندی ادیب۔ الہ آباد یونیورسٹی میگزین پریم چند نمبر ۱۹۸۰ء)

اسی طرح جلوۂ ایثار اور وردان کی زبان پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر رضا صاحب نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ ۱۹۱۵ء تک پریم چند ہندی سے واقف نہ تھے۔ اُن کی عبارت یوں ہے۔

" اب یہ بات تحقیقی طور پر پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ پریم چند نے ۱۹۱۵ء تک صرف اُردو میں لکھا۔ اس دَور کے پریم چند کو ہندی سے نہ صرف تخلیقی عمل کی بنیادوں پر کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے ہندی ترجموں پر نظر ثانی نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ترجموں کی زبان میں بعد کے دَور کے ناشرین نے مزید ترمیم اور اضافے کئے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ مزید اہمیت حاصل کر لیتا ہے کہ پریم چند کے ہندی ترجموں کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے۔ (پریم چند فن اور تعمیر فن صفحہ ۵۸-۱۵۷ نیا اڈیشن)

اِن دونوں اقتباسات میں ایک جگہ " ناگری رسم خط سے برائے نام واقفیت " کی بات کہی گئی ہے۔ اور دوسری جگہ " ہندی ترجموں کی ذمہ داری پریم چند کی نہیں۔ بلکہ ناشرین کی ہے جنھوں نے " مزید ترمیم و اضافے کئے ہیں " کی بات ہے ناگری رسم خط سے ۱۹۱۲ء تک برائے نام واقفیت کے متعلق اوپر بحث کی جا چکی ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک برابر شواہد موجود ہیں کہ پریم چند ہندی میں خطوط، تخلیقات اور ترجمے سب کچھ کرتے رہے۔ رہ گئی ترمیم و اضافے کی بات تو یہ ناشرین نے نہیں خود پریم چند نے کئے ہیں جس کا ذکر انھوں نے بازارِ حُسن کے سلسلے میں بھی کیا ہے اور چوگانِ ہستی کے سلسلے میں بھی جس کا ذکر آئے گا پھر پریما بازارِ حُسن اور وردان سب کے ہندی تراجم میں پریم چند کے سامنے آ گئے تھے۔ انھیں اس کی نشاندہی کر دینی چاہیئے تھی کہ ان کے اِن ناولوں میں دوسروں نے ترمیم و اضافے کئے ہیں۔ اُن کا اِن ترمیموں سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جعفر رضا کا محض مفروضہ ہے۔

یہیں سے ایک دوسرا افسانہ بھی شروع ہوتا ہے کہ پریم چند کے کن ناولوں کو اُردو کا ناول مانا جائے۔ اور کن ناولوں کو اُردو کا ہندی ترجمہ یا ہندی سے اُردو میں ترجمہ۔ اور پھر یہ تراجم کس کے ہیں۔ پریم چند کے اپنے کئے ہوئے یا دوسروں نے اُن کے لئے کئے تھے۔ پریم چند کا سب سے پہلا ناول اسرارِ معابد اُردو میں لکھا گیا اور شائع بھی ہوا میں نے وہ ٹائیپ کاپی دیکھی ہے۔ جو پریم چند کے بیٹے امرت رائے نے ادارۂ خلق سے نقل کرا کے احتشام حسین صاحب کو دی تھی۔ پھر اس کا ترجمہ خود امرت رائے نے کیا۔ اگرچہ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ پریم چند نے اپنے خطوں میں کہیں بھی اس ناول کا تذکرہ نہیں کیا۔ آخر کیوں ؟ دوسرا ناول ہم خرما و ہم ثواب اور پریما خاصے بحث طلب ہیں۔ ہم خرما و ہم ثواب، پر نہ کوئی سن اشاعت ہے اور نہ اس کا مسودہ ہے اور نہ پریم چند کے کسی خط میں یہ ملا کہ ہم خرما و ہم ثواب، پریما سے پہلے لکھا گیا لیکن چونکہ پریما میں قصے کو طول دیا گیا ہے اور بہت کچھ حک و اصلاح ہے اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم خرما و ہم ثواب، پہلے لکھا گیا اور تقریباً ساتھ ہی شائع ہوا۔ معلوم نہیں کس زبان اُردو میں تھا یا ہندی میں۔ ہم خرما و ہم ثواب کے ٹائیٹل پیج پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"مصنفہ منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ"
اور پریما کے ٹائیٹل پیج پر کشنا کا نام نہیں ہے۔ اس کے دو معنی ہوئے، یا تو کشنا اُس کے بعد میں لکھا گیا۔ اس لئے ہندی کتاب پر جو ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی۔ اس پر یہ نام نہیں لکھا گیا۔ یا پھر کشنا پریما کے سن تخلیق ۱۹۰۷ء کے بعد لکھی گئی۔ اس لئے پریما کے ٹائیٹل پیج پر اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ ہم خرما و ہم ثواب بھی پریما سے پہلے نہیں چھپا۔ ورنہ اس کا نام پریما کے ٹائیٹل پیج پر ہونا چاہیئے تھا۔ اور پھر کشنا کا بھی نام ہوتا۔ ان ناولوں کے بعد کچھ لوگوں نے روٹھی رانی کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ناولٹ راجستھانی قصوں سے ماخوذ ہے (کچھ لوگوں نے اسے گجراتی قصوں سے ماخوذ بتایا ہے مگر مجھے یہ محقق نہیں) اس لئے اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ روٹھی رانی، زمانہ پریس کانپور سے اُردو میں شائع ہوا۔ مگر اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن نواب رائے کا نام لکھا ہے۔
جلوۂ ایثار ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا جس کا ہندی ترجمہ بعد کو ۱۹۲۱ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کس نے کیا یقین کے ساتھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن ہندی اور اُردو ناولوں میں اتنی تبدیلیاں ہیں کہ ان ترمیم و اضافوں کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ترجمہ پریم چند ہی کا ہو سکتا ہے کیونکہ ترمیم و اضافے کا حق مصنف کی زندگی میں دوسروں کو نہیں پہونچتا۔ اگر ترمیم و اضافے دوسروں کے لئے ہیں تو وردان پھر دو مصنفوں کی تصنیف ہوئی۔ صرف پریم چند اُس کے مصنف کیسے ہو سکتے ہیں۔ مترجم کا بھی اس میں نام ہونا چاہیئے۔ چونکہ بازارِ حسن کا ترجمہ خود پریم چند کر چکے تھے۔ اور اس میں ترمیم و اضافے بھی کئے تھے اور خاصے اضافے کئے تھے۔ بہت سے اُردو کے بازارِ حسن کے حصے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت نکال دیئے تھے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند ہی نے وردان بھی اُردو کے جلوہ ایثار سے ہندی میں **منتقل کیا**۔ اور جہاں چاہا کچھ حصے نکال دیئے اور جہاں چاہا کچھ جوڑ دیا۔ اس خیال کو پریم چند کے ایک خط سے بھی تقویت ملتی ہے۔ ۳ر جنوری ۱۹۲۱ء کو دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"زندہ ہوں۔ ناول کی ہندی کر رہا ہوں اور پریم بتیسی کی ذکر کھائے جاتی ہے۔" اور وردان کا بھی سن اشاعت ہے۔ کوئی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ یہ خط گوشۂ عافیت کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جعفر رضا صاحب کی کتاب پریم چند۔ فن اور تعمیر فن کے دوسرے ایڈیشن کے صفحہ ۱۸۲ پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"حسن اتفاق سے گوشۂ عافیت کا اصل مسودہ دست بردِ ایام سے محفوظ رہ گیا جس پر ۲ مئی ۱۹۱۸ء کو گوشۂ عافیت کی تصنیف کا ابتدا کرنے ۲۵ فروری ۱۹۲۰ء کو تمام کرنے کی اطلاع خود پریم چند کے قلم سے درج ہے۔"

معلوم نہیں کہ جعفر رضا صاحب کو گوشۂ عافیت کا یہ مسودہ کہاں ملا۔ اس کا کوئی حوالہ انھوں نے نہیں دیا ... مدن گوپال کے مرتبہ خطوط میں ... خط کے نیچے الگ یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے

"حضرت سحر کو میں نے ۲۰۰ دینا طے کر لیا ہے وہ راضی بھی ہو گئے .... گر وہ راضی ہوں تو گوشۂ عافیت بھی اُن سے پورا کروا لوں گا اور کچھ نئی کہانیوں کا ترجمہ بھی۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی خط امرت رائے کی مرتبہ چٹھی پتری کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۵۶ پر اگست ۱۹۲۵ء میں ملتا

ہے اگر جعفر رضا صاحب کے بیان سے: بہ "گوشۂ عافیت"
کو پریم چند ۲۵، فروری ۱۹۲۰ء کو تمام کر چکے تھے۔ تو پھر سحر
صاحب ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۱ء میں کیسے گوشۂ عافیت کو پورا کروا رہا ہے
تھے۔ ہندی میں ترجمہ کرنے کی یہ بات ہو نہیں سکتی کیونکہ اوّل تو پریم چند
نے گوشۂ عافیت لکھا ہے۔ پریم آشرم نہیں۔ پھر یہ
کہ پریم آشرم تو ۱۹۲۱ء ۱۹۲۲ء میں ہندی میں چھپ چکا تھا۔
اس طرح دو پرچہاں سے بات چلی تھی کہ "ناول کی ہندی کرا رہا
ہوں" وہ ورداں کے لئے ہی ہے۔

امرت رائے نے بھی منگلا چرن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ
گوشۂ عافیت کا پہلا مسودہ اُردو میں ہے۔ ممکن ہے کہ مسودہ
انھیں کے پاس ہو "پہلا مسودہ" سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ کئی
مسودے بنائے گئے جسے ہم انگریزی میں FIRST DRAFT
کہہ سکتے ہیں ورنہ اقبال درما سحر سے ترجمہ کرانے کی بات بے معنی
ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات اور ہے پریم چند
اپنے خطوں میں بار بار ایک اور ناول کا حوالہ دیتے ہیں اور
اس کا نام "ناکام" بتاتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا حوالہ دیا نرائن
نگم کے نام لکھے ہوئے خط مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۲۰ء میں یوں ملتا ہے۔

"میرا دوسرا ناول "ناکام" عنقریب اختتام ہے وہ
پورا ہو جائے۔ تو نوبت رائے کی طرف متوجہ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ
ناول بھی ہندی میں چھپے گا۔" (مدن گوپال ص ۹۸)
پھر آگے چل کر دوسرا حوالہ یوں ہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۲۰ء
کو پھر دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔
"آج کل بازارِ حسن کی ترتیب میں مصروف ہوں ابھی
تک ناکام میں مصروف تھا۔ بازارِ حسن اب پریس جا رہا ہے
اس کے بعد "ناکام" میں ہاتھ لگے گا۔ پہلے ہندی اڈیشن
نکلے گا۔" (مدن گوپال ص ۹۹)
پھر ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں امتیاز علی تاج کو لکھتے ہیں۔
"ایشور نے چاہا تو چند ماہ میں میرا اپنا ناول 'ناکام'
تیار ہو جائے گا۔" (مدن گوپال ص ۱۲۹)
پھر ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کو امتیاز علی تاج کو ایک خط
میں اطلاع دیتے ہیں۔
"میرا ہندی ناول ختم ہو گیا اب اردو کا کام جلد ہوگا
جب تک بازارِ حسن پریس سے نکلے گا۔
شاید نئے ناول کا حصہ اوّل آپ کی خدمت میں حاضر
ہو جائے۔" (مدن گوپال ص ۱۴۶)
لیکن پھر یہ "ناکام" ناول کہاں گیا؟ جو ہندی ناول تھا
قیاس ہے کہ یہی "ناکام" بعد کو "پریم آشرم" بن گیا "ناکام"
شاید گیان شنکر کے انجام کو نظر میں رکھ کر اس کا نام مقرر کیا
گیا تھا۔ بہر حال اگر گوشۂ عافیت کا اُردو مسودہ کسی کو ملا ہے
اور اس پر خاتمے کی تاریخ بھی ۲۵، فروری ۱۹۲۰ء لکھی ہے۔
جیسا کہ جعفر رضا صاحب نے تحریر کیا ہے تو پھر اس مسودہ پر
بجائے گوشۂ عافیت کے "ناکام" لکھا ہونا چاہیئے۔ ایک
بات اور کہ اگر "ناکام" ہی گوشۂ عافیت ہے تو یہ ناول پہلے
ہندی ہی میں لکھا گیا۔ جیسا کہ اُوپر کے خط میں درج ہے "میرا
ہندی ناول ختم ہو گیا اب اُردو کا کام جلد ہوگا۔" اور شائع
بھی پہلے ہندی ہی میں ہوا۔ اس طرح جعفر رضا صاحب کی یہ بات
درست نہیں کہ

(۱) "ہندی" پریم آشرم، اُردو گوشۂ عافیت کا ترجمہ
ہے۔ بعض مقامات پر اختلاف ہے جو مترجم کی جودتِ طبع کا
نتیجہ ہے ہمارے خیال میں پریم آشرم کو ہندی کا تخلیقی ناول

نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

(پریم چند - فن اور تعمیر فن ص ۱۹۰ سنہ ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

(۲) "اِس وقت ہندی کے پریمیوں کو کیسے معلوم ہو تا کہ جس ناول پر انھیں فخر و مباہات ہے (یعنی پریم آشرم) وہ ایک اُردو ناول کا ترجمہ ہے۔" (فن اور تعمیر فن ص ۱۸۶ ، ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

گوشۂ عافیت جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ بعد کو سحر نے ترجمہ کیا، اصل ناول ہندی میں پہلے لکھا گیا۔ اگر پریم چند نے پریم آشرم کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا تو بہت تھوڑا سا۔ باقی تمام ترجمہ اقبال ورما سحر نے پورا کیا۔ اِس طرح گوشۂ عافیت ہندی ناول 'پریم آشرم' کا ترجمہ ہے نہ کہ 'پریم آشرم' اُردو کے 'گوشۂ عافیت' کا ترجمہ۔

"پریم آشرم" کے بعد رنگ بھوم کا مسئلہ اٹھتا ہے مدن گوپال نے پریم چند کے خطوط کے مقدمے میں عجیب بات لکھ دی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"اپنی کہانیوں کا ایک مجموعہ 'پریم پچیسی' ہندی میں شائع کرایا۔ اِس کے بعد ہی ایک اور عظیم ناول چوگانِ ہستی شروع کیا گیا اِس سے پہلے دو اہم ناولوں کی طرح یہ بھی اُردو میں لکھا گیا مگر اِس کی اشاعت پہلے ہندی میں ہوئی 'رنگ بھومی' کے نام سے چھپا۔ پریم چند کا یہ آخری ناول ہے جو پہلے اُردو میں لکھا گیا۔" (پریم چند کے خطوط ص ۱۲ مدن گوپال)

میرا خیال ہے کہ مدن گوپال صاحب نے بغیر تحقیق کے یہ بات محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے لکھ دی ہے، کیونکہ اُن کے مرتبہ خطوط کے اسی مجموعے میں ص ۱۷۵ پر دیا نرائن نگم کے نام سنہ ۱۹۲۳ء میں گنگا پستک مالا کاریالیہ سے پریم چند کا لکھا ہوا ایک خط درج ہے جس کی عبارت یوں ہے۔

"حضرت سحر رنگ بھومی کا اُردو ترجمہ کر دیا۔ مگر معاوضہ ہندی صفحات پر ۸ آنہ فی صفحہ مانگتے ہیں۔ یعنی کل ۴۵۰ روپئے مجھے کل کتاب کے چھ سو مل جائیں تو میں سمجھوں گا میں نے تیر مارا..... اُردو بازار قلم کی حالت دیکھ کر ۱۵۰ روپئے بُرا معاوضہ نہیں ہے اور یہ میں خوشی سے دینے کو تیار ہوں۔ اُن کے زیادہ سے زیادہ تین مہینے صرف ہوئے ہوں گے۔ ۳-۴ گھنٹے روزانہ کام کر کے ۱۵۰ ملتے ہیں تو کیا کم ہیں۔ مگر وہ نہ جانے کس خیال میں ہیں۔"

اِس خط کی عبارت میں کسی طرح کا اُلجھاو نہیں ہے مثلاً کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ممکن ہے رنگ بھومی کے کچھ صفحات کا ترجمہ سحر نے کر دیا ہو۔ ایسا نہیں ہے پوری کتاب کے ترجمے کی بات ہے۔ رقم کی تعداد سے بھی ۸ آنہ فی صفحہ کے لحاظ سے ۴۵۰ روپئے کے دو نے صفحات ہوئے یعنی کل نو سو تیس صفحات ہندی ناول کے ہوئے۔ اسی طرح وقت کا تعین بھی پریم چند نے تین مہینے کا کیا ہے۔ اِس طرح یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ رنگ بھومی کے کچھ حصوں کے ترجمے کی بات ہو رہی ہے یہ تو پورے ناول کے ترجمے کی بات ہے۔ پھر دوسرا خط ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء کو سرسوتی پریس بنارس سے لکھا گیا ہے۔ یہ خط بھی دیا نرائن نگم کے نام ہے اِس کی عبارت یوں ہے۔

"سنہ ۱۹۱۶ء میں جلوہ ایثار اور سنہ ۱۹۱۸ء میں بازار حسن لکھا۔ ہندی میں سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم کایا کلپ چاروں ناول، دو دو سال کے وقفے کے بعد نکلے اُن کے اُردو ترجمے عنقریب شائع ہوں گے۔"

(مدن گوپال ص ۱۷۵)

اس خط کا آخری جملہ ہمارے کام کا ہے۔ اس میں صرف بازارِ حُسن کا پہلا حصّہ تو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا جسے دارالاشاعت پنجاب نے شائع کیا۔ دوسرے حصّے کا صحیح سنِ اشاعت مجھے نہیں ملا۔

۲۴ جون ۱۹۲۱ء کو ایک خط میں منیجر دارالاشاعت کو لکھتے ہیں۔

"مجھے مطلق خبر نہیں کہ بازارِ حُسن کی اشاعت کا کیا انتظام ہوا ہے اس میں ابھی کتنی دیر ہے؟" (مدن گوپال ص۱۲۱)

ڈاکٹر جعفر رضا "فن اور تعمیرِ فن" کے ۱۹۸۰ء کے اڈیشن کے ص۱۸۰ پر لکھتے ہیں،

"۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں حصّہ دوم کی اشاعت کا ذکر ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کے خطوط کی عبارت یوں ہے۔

اول آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔" (مدن گوپال ص۱۴۸)

اس میں حصّہ دوم کا لفظ نہیں ہے۔ چِٹھّی پتری کی جلد دوم کے صفحہ ۱۳۵ پر بھی حصّہ دوم کا ذکر نہیں ہے[۱]

اب یہاں سے میری دوسری مشکل شروع ہوتی ہے۔

پریم چند کی ہندی لیاقت کی بحث ہم اُوپر کر چکے ہیں کہ اُن میں ہندی کی تخلیقی صلاحیت شروع ہی سے تھی لیکن جعفر رضا صاحب نے فن اور تعمیرِ فن کے ۱۹۸۰ء، ص۱۹۵ پر رنگ بھومی پر بحث کرتے ہوئے اس میں تحریف و اضافے کا سہرا کسی شیو پوجن سہائے کے سر باندھا ہے گویا موجودہ رنگ بھومی بھی پورا پریم چند کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں شیو پوجن سہائے شریک ہو گئے۔ یہ رنگ بھومی میں کتنا شیو پوجن سہائے کا لکھا ہوا ہے اور کتنا پریم چند کا، اسے بھی کسی محقق کو تلاش کرنا چاہیے۔ مگر پھر رنگ بھومی کے مسودے پر جہاں جعفر رضا صاحب نے بحث کی ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ

"اس مخطوطہ پر منشی جی کی اپنی تحریر درج ہے۔

'Hindi Finished dated August 12, 1924

پھر وہ امرت رائے کا ایک بیان یوں لکھتے ہیں۔

رنگ بھومی کی چھپائی شروع ہو گئی۔ لکھی پہلے اُردو میں گئی، چھپی پہلے ہندی میں۔" (فن اور تعمیرِ فن ص۱۹۶ ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

لیکن امرت رائے کا بیان 'رنگ بھومی' کے متعلق منگلا چرن کے متعلق منگلا چرن کے دیباچہ کے صفحہ آٹھ پر یوں ہے۔۔

"رنگ بھومی (۱۹۲۵ء) منشی جی کے اُپنیاسوں میں پہلا ہے جس کا پہلا مسودہ ہندی میں لکھا گیا۔" (منگلا چرن ص۸)

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ امرت رائے کا کونسا بیان صحیح ہے۔ منگلا چرن والا یا وہ جسے جعفر رضا صاحب نے پیش کیا ہے۔ پھر یہ کہ چوگانِ ہستی کی اشاعت یعنی ۱۹۲۷ء تک پریم چند ہندی میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے یہ بات بھی جعفر رضا صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو اُن کی عبارت :

---

[۱] ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک دلچسپ بات بازارِ حُسن کے سلسلے میں اپنی کتاب فن اور تعمیرِ فن کے ص۱۷۹-۱۸۰ پر لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔
"اس کے پہلے اڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر کمال کشور گوینکا کی تحقیق جدید ہے کہ سید امتیاز علی کا اُردو روپ بازارِ حُسن لاہور سے ۱۹۱۱ء کے وسط میں شائع ہوا۔ کتنی بے بنیاد اور گمراہ کن بات ہے

اگر کمل کشور گوئنکا اتنے ہی غیر محتاط محقق ہیں تو انھیں پریم چند پر کام کرنے کا دعویٰ نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ کام چھوڑ کر کچھ اور کرنا چاہیے۔ یہ چھپائی کی غلطی ہے۔ جو ۱۹۲۱ء کے بجائے ۱۹۱۱ء ہو گئی ہے ایسی غلطی تو پریم چند کا معمولی طالبعلم بھی نہیں کر سکتا۔ سید محمد عقیل

"پریم چند اپنا مسودہ اُردو میں تیار کرتے تھے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ چوگانِ ہستی کی اشاعت تک پریم چند ہندی میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت نہیں پیدا کر سکے تھے۔" فن اور تعمیرِ فن ص۱۹۵، ۱۹۸۰ء ایڈیشن)

اب ذرا پریم چند کے اُس خط کی عبارت کو اپنے ذہن میں دہرائیے جس میں انھوں نے ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی بات حضرت اقبال ورما سحر سے طے کی تھی جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ان مباحث میں قطعی اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ رنگ بھومی، جیسی کہ موجود ہے۔ پہلے ہندی میں لکھی گئی۔ چوگانِ ہستی جو بعد کو اُردو میں چھپی، اسی ہندی کی رنگ بھومی کا ترجمہ ہے۔ جو اقبال ورما سحر کا کیا ہوا ہے جو لوگ چوگانِ ہستی کے ۱۹۲۷ء والے دارالاشاعت لاہور سے چھپے ہوئے پریم چند کے مقدمے کا حوالہ دیتے ہیں، انھیں پریم چند کی لکھی ہوئی عبارت کو پھر غور سے پڑھنا چاہیئے اور اس مقدمے کی یہ عبارت خاص طور پر "ہندی اڈیشن، تیار کرتے وقت اُردو مسودے میں اتنی ترمیم ہو گئی کہ وہ اس حالت میں پریس کے قابل نہ تھا۔

اس کے علاوہ کئی ابواب ہندی میں اور بڑھا دیئے گئے انھیں دوبارہ مسودے میں شامل کرنا ضروری تھا۔ اس لئے سارا اُردو مسودہ، ہندی مسودے کے مطابق دوبارہ لکھنا پڑا۔ میں اپنے کرم فرما منشی اقبال ورما سحر ہتھگامی کا بیحد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس بار کو اپنے ذمہ لیا۔"

(بحوالہ چوگانِ ہستی حصّہ دوم)

جعفر رضا صاحب نے بھی اپنی کتاب میں یہ اقتباس پیش کیا ہے۔ مگر اس میں، آخری جملہ کاٹ دیا ہے جس میں اقبال ورما سحر کا ذکر آیا ہے۔ علاوہ پہلے ڈرافٹ والی بات بھی ہے جسے ہم اُوپر پیش کر چکے ہیں۔ جیسے امرت رائے نے لکھا ہے۔ امرت رائے کی کتاب قلم کا سپاہی کے نئے اڈیشن میں ص۳۵۹ پر بھی اقبال ورما سحر والا جملہ پورا اُسی طرح موجود ہے جس طرح پریم چند نے لکھا تھا۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ پریم چند نے کربلا نام کا ڈرامہ جو ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، یہ ڈرامہ بھی پہلے ہندی ہی میں لکھا گیا تھا جس کے کچھ حصوں کا ترجمہ اُردو میں بعد کو منشی منیر حیدر اور پریم چند نے کیا۔ پریم چند کے ایک خط سے اس کی تصدیق ہوتی ہے یہ خط ۲ اگست ۱۹۲۴ء کو منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھا گیا ہے اسکی عبارت یوں ہے۔

"مرزا جعفر علی خاں صاحب نے اگر کچھ ترمیمات کی ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندی سے خود ترجمہ نہیں کیا۔ میرے ایک نارمل اسکول کے دوست منشی منیر حیدر صاحب قریشی ہیں۔ انھیں سے کرالیا ہے اب بقیہ حصوں کا ترجمہ میں خود کر دوں گا جو خامیاں ہوں گی وہ ضرور نکال دوں گا...... میرے احباب نے ہندی میں یہ ڈرامہ پڑھا ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔" (مدن گوپال ص۱۶۸)

اب سوچنے کی بات ہے کہ اگر پریم چند چوگانِ ہستی کی اشاعت یعنی ۱۹۲۷ء تک ہندی میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے تو ۱۹۲۴ء میں ہندی میں کربلا ڈرامہ کیونکر لکھا۔

بس اب دو اہم ناولوں پر بحث کر کے یہ مقالہ ختم کیا جاتا ہے۔ ان میں پہلا کرم بھومی ہے جو اُردو میں میدانِ عمل کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔ اور دوسرا گئودان۔ کرم بھومی سے متعلق پریم چند کا پہلا خط، نگم کے نام ۲۸، فروری ۱۹۲۹ء کا ملتا ہے جس میں گالزوردی کے ڈرامے جسٹس کے ترجمے کا اشارہ

ہے خط کی عبارت یوں ہے۔

"میرے پاس ایک نشست سے زیادہ وقت نہیں ہے اگر اسے کرتا ہوں تو میرا پردۂ مجاز رہا جاتا ہے۔ صبح کو کرتا ہوں تو کرم بھومی میں حرج ہوتا ہے دوسرا کوئی ساد وقت ہے" (مدن گوپال ص۱۸۴)

پھر دوسرا خط ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء کا جینیندر کمار کے نام ہے جس کی عبارت یوں ہے۔

"کرم بھومی کے تیس فارم چھپ چکے ہیں ابھی چھ فارم باقی ہیں۔ ہنس میں ہاتھ لگا دیا۔ پریس کو اوکاش نہ ملا اس لئے اب تک پُستک تیار نہ ہوئی اب اسے جلد سماپت کرتا ہوں" (مدن گوپال ص۲۴۱)

پھر یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو ایک خط سرسوتی پریس سے جینیندر کمار کو لکھتے ہیں:—

"کرم بھومی تمھیں بُری نہیں لگی۔ اس سے خوشی ہوئی اس کی کہیں آلوچنا کر دو" (مدن گوپال ص۲۴۹)

ڈاکٹر قمر رئیس، جو اُردو میں پریم چند کے اچھے ناقد سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' میں یہی لکھا ہے یہ ناول ۳۲-۱۹۳۰ء کے درمیان لکھا گیا۔ اور ۱۹۳۲ء میں سرسوتی پریس سے شائع ہوا۔ انھوں نے یہ بحث نہیں اٹھائی کہ یہ ناول پہلے اُردو میں لکھا گیا یا ہندی میں۔ لیکن جعفر رضا صاحب نے لکھا کہ کرم بھومی پہلے اُردو میں میدانِ عمل کے نام سے لکھی گئی اور ہندی میں بعد کو اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اُن کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

"ہمارے نزدیک ~~میدانِ~~ عمل' بھی پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح اُردو تخلیق ہے اور اس کا ابھی حیثیت سے تجزیہ کیا جانا چاہیئے۔" (فن اور تعبیر ~~[illegible]~~ ایڈیشن)

امرت رائے نے قلم کا سپاہی میں ۱۹۳۲ء کے واقعات لکھتے ہوئے پریم چند کی تحریر کا اقتباس یوں پیش کیا ہے۔

" راشٹر کا انت ہوگیا۔ راجاؤں کی پرتی ندھی، راج ستا کی اُپاسنا کریں گے۔ مسلمان جس طرف اپنا فائدہ دیکھیں گے اُدھر جائیں گے۔ سبھی دل اپنی اپنی رکشا کریں گے راشٹر کی رکشا کون کریگا؟ پورا چکر دیوہ ہے"

اور اس جملے کے بعد امرت رائے لکھتے ہیں۔

"کرم بھومی انھیں دنوں میں آکر پوری ہوئی"

(قلم کا سپاہی ص۵۵-۵۵۴ دسمبر ۱۹۷۶ء ایڈیشن)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ کرم بھومی ۱۹۳۲ء میں تمام ہوئی جو ہندی میں تھی۔ اب پریم چند کا خط جینیندر کمار کے نام ملاحظہ ہو۔ یہ خط ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء کا ہے۔

"کرم بھومی کا اُردو انوادجامعہ ملیہ سے شاید نکل جائے اور کیا لکھوں آنند ہے تم پرسن ہو" (مدن گوپال ص۲۸۵)

پھر ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو بمبئی سے ایک خط حسام الدین غوری کو پریم چند نے لکھا جس کی عبارت یوں ہے۔

"میری دو کتابیں جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں۔ ایک کا نام "میدانِ عمل" دوسری کا نام "واردات" تیسری زیر تصنیف ہے" (مدن گوپال ص۳۴۲)

یہاں پہلی مرتبہ پریم چند نے میدانِ عمل کا نام لکھا ہے۔ اور جینیندر کمار کے خط میں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ یہ کرم بھومی کا "اُردو انواد" ہے میرے پاس میدانِ عمل کا پہلا ایڈیشن ہے جو مکتبۂ جامع دہلی سے چھپا تھا موجود ہے اس کے اختتام پر کاتب نے اپنا نام اور ختم کتابت کی تاریخ بھی لکھ دی ہے جو

اس طرح ہے۔

"مکتوبہ محلہ نظیر بگرامی۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء"

۱۴ دسمبر ۱۹۳۵ء کو پریم چند ایک خط جینیندر کمار کو لکھتے ہیں جس میں کرم بھومی کے اُردو اڈیشن کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"میرے کرم بھومی اُردو اڈیشن جامعہ ملیہ نے نکالا ہے۔ ہو سکے تو کاشی نمبر میں اس کے لئے کچھ لکھنا۔" (مدن گوپال صفحہ ۱۳۰)

اب کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہی کہ میدانِ عمل کرم بھومی کا اُردو ترجمہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء کے اختتام تک جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے میدانِ عمل کی جو تاریخِ اشاعت ۱۹۳۲ء بتائی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ تاریخ محض قیاس کی بنیاد لکھی گئی ہے۔ اُن کی عبارت اس طرح ہے۔

"اُردو میں میدانِ عمل ۱۹۳۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔" (فن اور تعمیر فن صفحہ ۲۲۴ ۱۹۷۸ء ایڈیشن)

تاہم ایک اہم مسئلہ ابھی باقی رہتا ہے کہ میدانِ عمل کا اُردو ترجمہ کس نے کیا ہے؟ خود پریم چند نے یا کسی اور نے۔ پریم چند نے اس کی کہیں وضاحت نہیں کی۔ نہ اپنے کسی خط میں اس کا اشارہ کیا ہے۔ صرف قیاس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ زیادہ تر تراجم اقبال ورما سحر نے کئے ہیں۔ اس لئے یہ ترجمہ بھی انھیں کا ہو سکتا ہے۔ اقبال ورما سحر نے اپنی تحریروں میں اس کے اشارے بھی کہیں کہیں کئے ہیں۔ اور دیریندر پرشاد سکسینہ نے بھی سحر کی سوانح عمری میں یہ بات لکھی ہے۔

اب ہم پریم چند کا آخری ناول گئودان رہ جاتا ہے اس پر مسعود حسین خاں نے "گئودان تصنیف یا ترجمہ" کے نام سے ایک طویل اور فکر انگیز مقالہ لکھا ہے جس میں داخلی اور خارجی شواہد سے بحث کر کے اسے ہندی گئودان کا ترجمہ ثابت کیا ہے اور جس کے یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ زمانہ کے پریم چند نمبر کے صفحہ ۹ پر ایک عبارت دیا نرائن نگم کی یوں درج ہے۔

"۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول گئودان (گودان) سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں۔ پہلا اڈیشن قریب اختتام ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی افراد سے جلد شائع ہوگا۔"

پریم چند کے ابھی تک کے محققین نے بالاتفاق یہ تحریر کیا ہے کہ گئودان پہلی مرتبہ اُردو میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا معلوم نہیں کہ یہ روایت کہاں سے چلی ہے۔ لیکن گئودان کا پہلا اڈیشن میرے پاس موجود ہے جو پہلی مرتبہ جید برقی پریس دہلی سے ۱۹۳۹ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے چھپوا کر شائع کیا اس پہلے اڈیشن کے دوسرے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔

"طبعِ اوّل ۱۹۳۹ء ... ۲۰۰۰ (دو ہزار) مطبوعہ جید برقی پریس دہلی۔"

اور پہلے صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے

"گئودان مصنفہ منشی پریم چند مصنف میدانِ عمل بیوہ واردات وغیرہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ لاہور لکھنؤ۔ قیمت ۵؎"

داخلی اور خارجی شواہد پر پروفیسر مسعود حسین خاں کے جامع مقالہ کے بعد "مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں" لیکن قطعی آخری بات۔ یہ کہ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی کتاب "تلاش و توازن" میں صفحہ ۱۰۹ پر لکھا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ العصر میں ۱۹۱۹ء تک "پلشم" کے فرضی نام سے جو کہانیاں شائع ہوئی ہیں وہ پریم چند ہی کے ذہن کی تخلیق ہیں اگرچہ اب تک کوئی خارجی ثبوت اس سلسلے میں

جمال آرا نظامی
جاپان ہاؤس۔ میرس روڈ علی گڑھ

افسانہ حقیقت سے علامت تک

کسی نے کہا ہے کہ جو شخص ہاتھ سے کام کرتا ہے وہ مزدور ہے، جو ہاتھ اور دماغ کو ملا کر کام کرتا ہے وہ کاریگر ہے اور جو ہاتھ دماغ اور دل سے کام کرتا ہے وہ آرٹسٹ ہے۔

لکھنے والوں پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ جو حقائق کے متعلق لکھتا ہے وہ مورخ ہے جو حقائق کو انسانوں سے ملاتا ہے وہ صحافی ہے۔ اور جو حقائق، انسان اور انسانی جذبات کو ملاتا ہے وہ ادیب ہے۔

مورخ اور صحافی بلند پرواز پرندے کی طرح سیاسی زلزلوں کا مجموعی نظارہ کرتے ہیں۔ مگر ادیب گلی گھومنے والے سیاح کی طرح دروازوں پر دستک دیتا ہے اور افراد کے چہروں کو پڑھتا ہے اسی لئے کسی بھی انقلاب کی تصویر اسوقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک مورخ اور صحافی کے ساتھ ادیب کا قلم بھی حرکت میں نہ آئے۔ مورخ اور صحافی اگر تواریخ کی آنکھ ہیں تو ادیب تواریخ کی خوردبین ہے ادیب کو صوا [illegible] ـ

اس قابل بنایا ہے کہ وہ تمام تبدیلیوں کو اپنے دل کی دھڑکنوں کی کی طرح محسوس کر سکے اور اس کا قلم سرجن کے نشتر کی طرح انقلاب کی پوری جسامت کے رگ و پے میں پہونچ سکے۔

آج اردو افسانے میں اظہار کے مختلف انداز اور موضوعات کے تنوع یا وسعت کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اس اہم حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ اردو افسانے کی داغ بیل ڈپٹی نذیر احمد کے برعکس پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے ہاتھوں رکھی گئی۔ ظاہر میں تو یہ ادب کی تاریخ کا ایک اتفاقی واقعہ محسوس ہوگا کہ اردو کے پہلے ناول نویس ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ اور ناول نے ایک صدی کی جد و جہد میں کلام کے دس ناول بھی نہ پیش کئے۔ جب کہ اس سے کم عمر میں افسانے نے فرانسی اور روسی افسانوں کے فنی معیار کو چھو لیا۔

داستان اور ناول کے برعکس اردو افسانہ کا آغاز ہی حقیقت نگاری سے ہوتا ہے۔ پریم چند نے اپنے پہلے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے لے کر آخری عمر کے مشہور ترین

افسانہ "کفن" تک حقیقت نگاری کو اپنے فن کی بنیاد قرار دیا۔ پریم چند ترقی پسندوں کے لئے گارڈ ہی نہ تھے۔ بلکہ اپنے فن میں ترقی پسندی کے جملہ خواص بھی رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں وہ تمام خصوصیتیں مل جاتی ہیں جنھیں ترقی پسند افسانے کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔ موضوع کی تدبیر کاری میں انھوں نے حقیقت نگاری پر زور دیا۔ وہ آنے والوں کے لئے اچھی مثال ثابت ہوئی۔ حقیقت پسندی situation کے بیان اور کردار نگاری میں نہیں ہے۔ بلکہ اپنے عہد کے بنیادی تضادات کو سمجھنے پر مبنی ہے۔ کردار اپنے تاریخی تناظر میں خاص قسم کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پریم چند نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔ ان کے زمانے میں urban Parasite نوآبادیاتی نظام کی علامت تھا۔ مہاجن جو محنت نہیں کرتا لیکن سب کچھ ہڑپ کر جاتا ہے۔ اور مزدور جو خون پسینہ بہانے کے باوجود خالی رہتا ہے۔ ان کا تضاد اس زمانے کا بنیادی تضاد تھا۔ یہ پریم چند نے اس الگ الگ موضوع کی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی کہانیاں شائع ہوئے افسانوں کے دُکھ درد کو فنی احساس کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یہی سچی حقیقت پسندی ہے۔ لہٰذا پریم چند کی صورت میں سماجی حقیقت نگاری اور سیاسی حالات کے تجزیے سے افسانے نے اپنا سفر شروع کیا۔ یلدرم بھی اپنے رنگین انداز نگارش کے باوجود حقیقت پسند افسانہ نگار رہے۔ اور بقول سلیم اختر جبکہ "خارستان و گلستان" اور "چڑیا چڑے کی کہانی" کی صورت میں پہلی مرتبہ افسانے میں جنسی موضوعات کو چھیڑا۔ ناول کے مقابلے میں اُردو افسانے کو سیدھی راہ پر گامزن ہونے میں کسی طرح کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اور آج اُردو افسانے میں موضوعات و اسالیب کے لحاظ سے جو تجربات نظر آتے ہیں یا تکنیک کا تنوع کی جو مثالیں ملتی ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ بنیاد میں اینٹ سیدھی رکھی گئی تھی۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو افسانے کی سب سے اہم روایت حقیقت نگاری رہی ہے۔ چنانچہ پریم چند اور انکے دیگر معاصرین کے یہاں کسی نہ کسی طرح سے یہی رویہ ملتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ پریم چند کے مقابلے میں ان کے دوسرے معاصرین کا ذہن نسبتاً کم تجزیاتی تھا اور نہ ہی وہ لوگ پلاٹ اور تکنیک پر پریم چند جیسا عبور رکھتے تھے۔ اسلئے حقیقت نگاری کی روایت میں خود کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

ترقی پسند افسانے نے موضوعات کے لحاظ سے پریم چند کے موضوعات پر تو کم اضافے کئے۔ البتہ تکنیک اور تدبیر کاری میں وہ پریم چند سے بہت آگے نکل گئے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی محض چند نام ہی نہیں۔ بلکہ ترقی پسند افسانے کے مخصوص رجحانات کے لحاظ سے سنگ میل بھی ہیں۔ اُردو افسانے میں منٹو کا انداز واقعیت نگاری کی اچھی مثال ہے اس نے زندگی کے جن مریضانہ اور گندے پہلوؤں کو لیا ان کی ویسی ہی تصویریں پیش کیں۔ اس مقصد کے لئے اور اس نے زبان اور تشبیہات سے بہت کام لیا۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ منٹو کے افسانے پڑھ کر بعض اوقات منہ پر تھپڑ پڑنے کا احساس ہوتا ہے۔ تو اسکی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنی تمام خباثتوں آلائشوں اور مکاریوں کے ساتھ عریاں نظر آتا ہے۔ اور اسی سے اس نے انسانی فطرت کا حسن بے نقاب کیا۔ ادب میں ترقی پسند تحریک احتجاج کی تحریک تھی۔ اسی لئے ترقی پسند افسانے نے

احتجاج کی شدت کو محسوس کرانے کے لئے حقیقت پسندی اور
واقعیت نگاری دونوں سے کام لیا۔ اس لحاظ سے اگر
دیکھیں تو جنس کے بارے میں ان کا حقیقت پسندانہ رویہ
کھل کر ہی آجاتا ہے: "لحاف" "ہتک" "اور" "بو" ایسے افسانوں
میں تلذذ نہیں بلکہ واقعیت نگاری کے لحاظ سے وہ ایسے
ہی واضح تر بے باکی کے متقاضی تھے۔ ان کا مقصد زندگی
کے جس روپوش گوشے کو دکھانا تھا اس میں وہ صرف
"بے باکی" کی بناء پر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

یہاں ہمیں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ حقیقت نگاری اور
واقعیت نگاری میں جو نازک مگر اساسی فرق ہے۔ حقیقت
نگار زندگی کی تصویر کشی میں نہ تو ضرورت سے زیادہ شوخ
رنگ استعمال کرتا ہے اور نہ اس کو غیر حقیقی بنانے کی کوشش
کرتا ہے اس لئے وہ موضوعات اور مسائل زیست جنھیں
رومانوی مصنفین نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا یا جن کی داستانوں
میں کھپت نہ ہو سکتی تھی۔ ان کے بارے میں سوچنا اور لکھنا
آسان ہی نہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو ضروری بھی ہو گیا کہ
حقیقت نگاری ان کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی تھی یہی نہیں بلکہ
محبت، نفرت، جنس جیسے ہیجانات سے بھی سنہرے لبادے
اُتار کر اور پرانے اور مقبول انداز کے برعکس "رومانی ہالہ"
کے بغیر ان کی تصویر کشی کی گئی۔

واقعیت نگاری فطرت نگاری ہے حقیقت پسند
مصنفین نے جب اشیاء و قومات اور جذبات کو انکی بنیادی
اور سہ R صورت میں پیش کرنے کے لئے کاربن کاپی کی کوشش
کی تو واقعیت نگاری نے جنم لیا۔ ماحول کے لئے مشاہدہ اور
جزئیات نگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض تشبیہہ استعارے
سے بات نہیں بنتی لیکن ہوا یہ کہ اسی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے ایسی
تحریروں کو رومانی قرار دیا گیا لیکن یہ فراموش کر دیا گیا کہ
رومانیت شاعرانہ اسلوب کا نہیں بلکہ زندگی کے بارے
میں ایک مخصوص اور منفرد رویہ کا نام ہے وہ رویہ جو یلدرم
نیاز اور حجاب کسی کے فن میں نظر نہیں آتا۔ اسی لئے ان
رومانوی افسانہ نگاروں نے اپنے عصر اور ادب پر گہرے
اثرات نہیں چھوڑے۔ کیونکہ سیاسی خلفشار اور معاشی
بدحالی کے اس دور میں قصیدہ کی تشبیب ایسے مناظر والے
رومانوی افسانوں کی نہیں بلکہ تلخ اور کھری حقیقت نگاری اور
بے رحم واقعیت نگاری کی ضرورت تھی اور یہ کام ترقی پسند
ادب کی تحریک نے کیا۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی ہندوستان کے ساتھ
ساتھ دنیا بھر کے لئے اقتصادی بدحالی اور سیاسی بے چینی
کے نقطۂ عروج کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں دانشوروں
نے روس کی طرف دیکھا تو باقی دنیا نے ہٹلر کی طرف ہندوستان
میں [illegible] میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ اور تین
سال بعد عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ دونوں واقعات ادیبوں
کی آنکھ کھولنے کو کافی تھے۔ پریم چند ترقی پسند ادب کی تحریک
سے قبل ہی ذہنی اور عملی طور پر ترقی پسند تھے۔ اس لئے اگر
عمر کے آخری دور میں "کفن" جیسا افسانہ لکھا یا انتقال سے
چند ماہ قبل انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت
کر کے ان خیالات کا اظہار کیا تو اس پر چنداں تعجب نہ ہونا
چاہیئے۔ بلکہ پریم چند کا فن ایک دائرہ کی صورت میں تکمیل پا گیا۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا
جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو،

تحریک ردِ عمل ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم
میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کر دے، سلائے
نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

پریم چند کا خطبہ صدارت ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کے لئے ایک
طرح سے منشور کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پریم چند کے افسانوں
نے جس ذہنی رویہ کا انفرادی سطح پر اظہار کیا تھا اب وہ
تحریک کی صورت میں باقاعدہ ادبی منصوبہ بندی کے طور پر
صورت پذیر ہو رہا تھا۔ اس تحریک سے وابستہ سب ہی افسانہ
نگار حقائق پسند اور حقیقت نگار تھے۔ لیکن تمام قد آور
افسانہ نگاروں نے زندگی اور فن پر اپنی مخصوص انفرادیت
کی چھاپ بھی لگائی۔ چنانچہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی،
سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ
کے افسانوں کی صورت میں جہاں اردو افسانے میں حقیقت
نگاری کی نے اپنی جڑیں مضبوط کیں وہاں زاویہ نگاہ اور انداز
بیان نے سب ہی کو ایک دوسرے سے منفرد بھی بنائے رکھا
مثلاً کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی دونوں میں فطرت کے
مناظر کی رنگین تصویر کشی مشترک قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن
یہ رنگین مناظر محض فطرت کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے
نہیں ہیں۔ اور نہ ہی وہ ان سے زندگیوں کی تلخیوں کو بلکہ اس
رنگینی میں زندگی کی بدصورتی کا تضاد مزید نمایاں ہو جاتا ہے۔
کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں اور
احمد ندیم قاسمی کے گاؤں کی زندگی پر لکھے گئے افسانوں میں یہ
رجحان نمایاں ہے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ شہر پہنچ کر
دونوں کے یہاں "رنگین نگاری" ختم ہو جاتی ہے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ بمبئی اور لاہور جیسے شہروں کی گرد و غبار سے

ان کی دنیا میں حسن و فطرت کے رنگین پہلو کی ضرورت نہیں ہے۔
حقیقت نگاری اگر اپنی منطقی انتہا تک پہنچ جائے
تو وہ واقعیت نگاری بن جاتی ہے Nana میں "تہما" کے
چیچک کو درست طور سے بیان کرنے کے لئے ہسپتالوں میں
مریضوں کو دیکھ کر بیماری کی کیفیات کے نوٹس لئے تھے اردو
افسانے میں منٹو اور کسی حد تک عصمت چغتائی کے یہاں
واقعیت نگاری ملتی ہے۔ گو جنس نگاری کی بدنامی نے دونوں
کو متنازعہ بنائے رکھا۔ منٹو نے طوائف کے موضوع کو اس لئے
اپنایا کہ انھوں نے محسوس کیا طوائف کے کوٹھے پر ہر قسم کے
لوگ آ سکتے ہیں۔ یہاں جام جم ہے پورے عہد کی زندگی کا
مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہاں زندگی کی پرچھائیاں ننگی دیکھی
جا سکتی ہیں۔ لہذا ہولناک حقیقت نگاری کی ہولناک سماجی
حقیقت نگاری کی جھلک منٹو کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے افسانے
پڑھ کر بھیانک حقیقت نگاری کی بناء پر کراہیت ہوتی تھی۔
سیکس کی کہانی وہ ہوگی جس سے سیکس پیدا ہو۔ منٹو کی بعض
کہانیاں سیکس سے بالاتر ہیں "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "[illegible]"
ایسی کہانیاں ہیں جو سیکس پر نہیں ہیں۔ لیکن فن بائٹ پر ہے۔
بڑے آرٹسٹ کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کی مطابقت سے زبان
استعمال کرے یہ ہنر منٹو کو معلوم تھا۔ ان کی زبان بے حد
خوبصورت ہے۔ منٹو ایک ایسا فوٹوگرافر، ایک ایسا مصور
تھا جس کی حقیقت نگاری نے ایک ایسا البم تیار کیا تھا
جس کے ہر ورق میں ایک شکل تھی جو تصویر اور آرٹ کا درجہ
رکھتی تھی۔

ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ختم ہو گیا تھا۔ یعنی
آزادی مل گئی تھی۔ دوسرا نعرہ تھا اشتراکیت پسندی یا Social

جب یہ نہیں ہوا تو ہمارا خواب ٹوٹ گیا۔ تو اعتماد بھی اٹھ گیا۔ دوسرا ایمان پیدا ہوا کہ انسان بغیر کسی عقیدے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ سارے فلسفے بے کار ہیں ہم کو اپنی ذات کو موضوع بنانا چاہیے۔ یہ بات یورپ نے سوچی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں (۱۹۴۲ء) پچیس ہزار بچے جرمنی میں اور بہت سی جگہ پر یہ وہ ناجائز بچے تھے۔ جو فوج کے ذریعہ پیدا ہوئے۔ ان بچوں کے باپ دادا انہیں سوشل اسٹیٹس نہیں انھیں وہیں صرف ضروری تعلیم دی گئی۔ یہ لڑکے جب جوان ہوئے ان میں آرکسٹ بھی ہیں ان کا گھر نہیں، باپ نہیں، سوسائٹی نہیں کوئی کلچر نہیں، یہ نہیں معلوم کہ کل کیا ہوگا۔ ان کے سامنے زندگی ٹوٹ گئی۔ اور ماضی اگر ٹوٹ جائے (خاندان ٹوٹنے کا مطلب) انھوں نے سوچا کہ ماضی کچھ نہیں، مستقبل کچھ نہیں، جو کچھ موجود ہے وہی ہے۔ اسطرح علامتی اور تجریدی افسانے نے جنم لیا۔ اپنی موجودہ صورت میں علامتی اور تجریدی افسانے کو ترقی پسند افسانوں کا ردعمل بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ترقی پسند تحریک کے کمزور ہونے کی وجہ سے جو خلاء پیدا ہو گیا تھا وہ پوری کرنے والوں نے منسوب کر لیا۔ جدید ادب سے اس میں نئے تجربوں کی کوشش کی گئی اور وہ افسانہ جو انسان کی ذات کی کہانی سنا رہا ہو۔ سماج یا زمانے کے سامنے جواب دہ نہ ہو بلکہ وہ محسوس کر رہا ہو۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اپنے لئے لکھ رہا ہے۔ اس تجربے کے نام سے دو باتیں نمایاں ہوئیں یہ افسانہ [illegible] رہا بلکہ شعور کی رو ہو گیا (آپ کی گفتگو جو دوسرا نہ سن رہا ہو) اور نہ اس میں کوئی ربط رہا۔ یہ تحریک اس لئے بھی مقبول ہوئی کہ اس کا تعلق مصوری سے ہے لیکن شعور کی رو کی کامیابی مصوری میں ہو سکتی ہے وہ لٹریچر میں نہیں ہو سکتی۔ تکنیک کا تجربہ وہ آدمی کرتا ہے جس کے پاس کچھ کہنے کو نہیں ہوتا۔ تجربہ اس وقت تک ادب کا حصہ نہیں بن سکتا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے وہ زبان سے ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

ترقی پسند افسانے کی اساس خارجیت اور حقیقت نگاری پر تھی۔ اسی حقیقت نگاری نے بعض اوقات ذہن کو کیمرہ کالینز تو بنا دیا لیکن خارجیت سے رشتہ کبھی نہ ٹوٹا جبکہ علامتی اور تجریدی افسانے نے خارجیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کے اس مخصوص تصور کو بھی مسترد کر دیا۔ جسے بسا اوقات سماجی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا ترقی پسند افسانے میں خارجیت پر جو زور دیا جاتا تھا اب اس کا ردعمل باطن سے رغبت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

علامت اور تجرید کے درمیان "عبوری" دور کا افسانہ نہیں ملتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو علامتی اور تجریدی افسانہ ابھی تک نزاعی چلا آرہا ہے اس کی شاید یہ بھی وجہ ہو کہ ابھی تک ایک بھی ایسا افسانہ نگار نہیں آیا جسے علامتی یا تجریدی افسانے میں کرشن چندر، بیدی اور منٹو کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ ہم عصر افسانے پر علامتی اور تجریدی افسانوں نے اپنے نقوش نہ چھوڑے جنھیں گہرا یا ان مٹ قرار دیا جا سکے۔ اسی لئے یہ کسی تحریک کی صورت میں نہ پنپ سکا۔ اور نہ ہی افسانہ نگاروں کی نئی پود اس سے اس طرح اثرات قبول کر سکے گی جس طرح ترقی پسند افسانے نے افسانہ نگاروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ بلکہ اب تو ایسا محسوس

ہو رہا ہے کہ جیسے ان کے ردِ عمل حقیقت نگاری مزید قوت اور استحکام حاصل کر رہی ہے۔

علامتی اور تجریدی افسانہ گو آج کی پیداوار ہے لیکن اس کا آغاز اتنا اچانک نہیں جتنا بعض اوقات قارئین کے ردِ عمل سے محسوس ہوتا ہے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے بعض ایسے افسانے بھی لکھے جو آج کے مفہوم کے لحاظ سے خالص علامتی اور تجریدی تو نہ تھے لیکن ان کے روپ میں حقیقت پسند افسانہ علامت اور تجریدیت کی طرف مائل پرواز نظر آتا ہے۔ یوں وہ حقیقت اور علامت اور واقعیت اور تجریدیت کے درمیان نو مینز لینڈ (No man's land) ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کرشن چندر کا "دو فرلانگ لمبی سڑک" جو بغیر پلاٹ کا ایک کامیاب افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ علامتی افسانے کی اوّلین شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بغیر پلاٹ کے افسانے کافی تعداد میں لکھے گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے اگلا قدم تجریدیت کا ہی ہو سکتا ہے۔ اب افسانہ کا رُخ خارج سے ہٹا کر باطن کی دُنیا کی طرف موڑ دیا گیا۔ ترقی پسند افسانے نے اگر "خارجی حقیقت نگاری" پر زور دیا تو موجودہ افسانے نے "داخلی حقیقت نگاری" کو اپنا شعار بنایا۔ علامتی افسانہ اور تجریدی افسانہ بالکل جداگانہ ہیں۔ اور ہر دَور کے تکنیکی تقاضے الگ الگ ہیں۔ علامتی افسانہ کی بنیاد بالعموم کسی تلمیح، قدیم داستان یا مذہبی قصّے پر ہوتی ہے۔ کبھی اس میں Myth سے کام لیا جاتا ہے تو کبھی بچوں کی کہانیوں سے لیکن یہ سب کچھ یوں ہی یا ذکر کیا جاتا ... ماضی کے تناظر ہی حال [illegible]

[illegible]

صفت ہے۔ یعنی یہ ماضی پرستی ہی نہ پُرانی روایات کو زندہ کرنا بلکہ ماضی کی روشنی سے حال کی تاریکی اُجاگر کی جاتی ہے۔ افسانہ نگار ایک تاثر کی تشکیل کے لیے تاثر انگیزی کے تمام مروّج قواعد سے انحراف کرتا ہے۔ اب تک افسانہ میں وحدتِ تاثر پر بہت زور دیا گیا تھا۔ چنانچہ کسی زمانے میں تو پلاٹ کو نقشہ بنا کر سمجھایا جاتا تھا۔ لیکن تجریدی افسانہ نگار کو پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے ارتقاء سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ زندگی کی وہ ترجمانی کرتا ہے لیکن وہ زندگی کو جس طرح بے ہنگم اور منتشر پاتا ہے اسی روپ میں پیش کر دیتا ہے۔ پہلے افسانہ نگار زندگی کے بے ربط واقعات کو ایک مربوط سلسلہ میں پرو کر ایک خاص تاثر اُبھارتے تھے۔ مگر تجریدی افسانہ نگار ایسا کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ انتشار سے ہی اُبھارتا ہے اس طرح دیکھا جائے تو تجریدی افسانہ واقعیت پسندی کے ذیل میں آ جاتا ہے لیکن یہ واقعیت پسندی خارجی نہیں بلکہ باطنی ہے۔ تجریدی افسانہ تجریدی مصوری اور آزاد نظم سے مشابہت رکھتا ہے۔ آزاد نظم کے مانند تجریدی افسانے نے بھی فارم کی قیود سے بغاوت کی ہے۔ اس حد تک کہ تاثر بھی قربان کر دیا۔ تجریدی افسانے میں اسلوب سے شعریت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ خصوصیت ہر تجریدی افسانہ نگار کی تو نہیں ہے۔ لیکن یہاں بلراج مینرا اور پاکستان میں رشید امجد نے اس پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

جہاں تک اُردو افسانہ کا تعلق ہے بلراج مینرا، انتظار حسین، خالدہ اصغر، رشید امجد، انور سجاد اور سریندر پرکاش وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان [illegible] ہیں جنہیں خالص علامتی افسانہ نگار

قرار دیا جاسکتا ہو۔

انتظار حسین نے داستانوں اور تلمیحات پر افسانہ استوار کیا بلکہ آخری آدمی "اور کایاکلپ" ایسے افسانوں کا تو اسلوب بھی داستانی ہی ہے جبکہ "زرد کتا" ملفوظات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ البتہ سریندر پرکاش نے "دوسرے آدمی کے ڈرائنگ روم" کے بعض افسانوں میں علامت کا بہت اچھا استعمال کیا ہے۔ پاکستان میں انور سجاد کو تجریدی افسانے کے سلسلے میں اولیت دی جاسکتی ہے۔ بلراج مینرا نے "کمپوزیشن" میں تجرید کی بہت اچھی مثال پیش کی ہے۔ جوگیندر پال اور رام لعل ان دونوں میں غالباً ایک بات مشترک ہے ان پر پورے طریقے سے علامت یا تجرید کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا ان کے یہاں علامت کے ساتھ ساتھ کہانی پن بھی مل جاتا ہے اسی وجہ سے خالص تجریدی افسانہ لکھنے والوں کے مقابلے میں ان کی کہانیاں نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

حقیقت نگاری میں موضوع اور اسالیب دونوں کے تنوع اور رنگا رنگی کی بہت گنجائش ہے اس لئے کہ حقیقت خود رنگین اور متنوع ہے لیکن علامت نگاری میں فن کار کا تخلیقی عمل حاوی رہتا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے یہاں تنوع کے لئے فکر اور مشاہدے کی گہرائی اور وسعت کے علاوہ تخلیقی اُپج بھی ضروری ہے اور یہ نہ ہو تو علامتی افسانہ ایک محدود دائرے میں گھومتا رہے گا۔

حقیقت نگاری کی وکالت کرتے ہوئے ہندی کے ممتاز نقاد پروفیسر نامور سنگھ نے کہا تھا۔ اور ہمیں اس کی وکالت یوں بھی کرنا ہوگی کہ علامت نگاروں کے پاس وسیع تر میدان نہیں ہے۔ انھوں نے تجربے ضرور کئے ہیں۔ بعض تجربے بہت قیمتی بھی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ترکش میں اب زیادہ تیر باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ چنانچہ جدید علامتی افسانہ نگاروں کے بیشتر افسانے ایک جیسے محسوس ہونے لگے ہیں۔

اور انھوں نے یہ بھی صحیح کہا ہے۔

"آخر یہ پریم چند کی روایت کیا ہے جس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ پریم چند کے بعد کہانی کے فن میں بہت ترقی ہوئی ہے اور نکھار پیدا ہوا ہے اردو میں بھی اور ہندی میں بھی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے پریم چند کی بعض اچھی چیزیں چھوڑ دی ہیں۔ آج کہانی صرف لکھی جاتی ہے۔ پریم چند نے کہانیاں لکھی بھی ہیں۔ اور کہی بھی ہیں۔ قصہ گوئی ہندوستان کا ایک پرانا فن ہے۔ پریم چند کی بعض کہانیاں پڑھ کر انھیں سنانے کو جی چاہتا ہے۔ کہانی کہنے کی یہ روایت جدیدیت کے ہاتھوں مجروح ہو گئی ہے۔ اب کہانی سنانے کی چیز نہیں رہی ہے۔ بلکہ اکیلے میں سوچنے کی چیز رہ گئی ہے۔ حالانکہ اس خصوصیت کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور پریم چند نے حقیقت پسندی کی جو روایت قائم کی ہے اس کے لئے جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔

نقش حالی
از
پروفیسر
احتشام حسین
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
قیمت حصہ اوّل ۰ دوم کامل ۔/۵ م

ظفر حبیب
صدر شعبۂ اردو اے۔ پی۔ ایس۔ ایم۔ کالج برونی

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

لکھمیناں جو نہ کوئی بڑا شہر ہے اور نہ چھوٹا دیہات بلکہ اس کی حیثیت دونوں کے مابین ایک قصبہ کی ہے ہمیشہ سے نہ صرف یہ کہ شمالی مونگیر اور موجودہ ضلع بیگو سرائے کا سب سے اہم علمی اور ادبی مرکز ہے۔ بلکہ شمالی بہار میں اسکی ایک مسلم حیثیت ہے۔ آج بھی اس کے دامن میں بہت سارے گراں قدر شعرا اور ادبا گل بوٹوں کی طرح ٹنکے ہیں۔ لکھمینا کی یہ ہری بھری گود اغیار کے لئے سبب چشمک ہے تو احباب کے لئے قابلِ افتخار۔ ایک اہم خاصہ اس قصبہ کا یہ ہے کہ اس کے دانشور، صحافی، ادیب اور شعرائے کرام اپنی قوت لایموت کے حصول میں دوسرے شہروں میں پناہ گزیں ہیں لیکن یہ دھرتی انہیں فراموش نہیں کرتی۔ اس لئے وہ بھی اس کے سایۂ عاطفت میں پہونچکر لمحہ بھر کے لئے ہی سہی اطمینان کی ٹھنڈی سانس ضرور لیتے ہیں۔

جب بھی طویل چھٹیوں کی آمد آمد کا وقت ہوتا ہے۔ تو یہاں کے لوگ اپنے ان دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کی آمد اس قصبہ کے لئے آمدِ بہاراں ہوا کرتی ہے۔ مئی اور جون تعلیمی اداروں میں تعطیل کا موسم ہوتا ہے اور اس طویل تعطیل میں کم از کم وہ لوگ تو ضرور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ جن کا تعلق تعلیمی اداروں سے ہے اور جن کی تعداد معتد بہ ہے۔ چنانچہ ۲۸ مئی ۱۹۸۱ء کو جب ناچیز اپنی دھرتی کو سلام کرنے پہونچا تو ہر طرف سے یہ صدا آنے لگی کہ اس چھٹی میں لائبریری میں کوئی شاندار پروگرام کرو۔۔۔۔ شوق کو مہمیز لگی۔ اس خبر نے ہمت بندھائی کہ کلکتہ سے پروفیسر نورالہدیٰ، مونگیر سے پروفیسر شبیر حسن اور رانچی سے قمر حمید صاحبان آئے ہوئے ہیں۔

مشورہ ہ لہ شاعری بہت ہو چکی۔ اب ضرورت تربیت فکر و شعور کی ہے۔ بہار شریف کے حادثہ نے نہ صرف یہ کہ پورے ہندوستانی مسلمان کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو کہا ہے۔ بلکہ ہندوستان کی تمام تر ملتوں کے دلہائے دردمند کو پکارا ہے کہ مظلوموں کا ساتھ دو اور ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہونچاؤ۔

اور اس لئے یہ طے کیا گیا کہ ایک سیمینار منعقد کیا جائے جس میں
فساد کے مسئلہ پر کھل کر بحثیں ہوں اور ان کے سدباب کی تدبیریں
ڈھونڈھ کر نکالی جائیں لیکن یہ بھی سوچا گیا کہ اگر بات صرف
فساد تک محدود رکھی گئی تو ذہن مجروح ہو کر رہ جائے گا۔
نگاہوں کے سامنے خون چکا منظر آئے گا۔ اور قلب و نظر کو
خون آلود کر جائے گا۔ اس لئے وسیع مقاصد کے حصول کے لئے
موضوع کو پھیلایا گیا۔ اور بات یہ طے پائی کہ طلبا اور نوجوانوں
کی تربیت کے لئے کچھ دیگر موضوعات کو بھی شامل کیا جائے۔
چنانچہ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ ایک
مقالہ پڑھیں جس کا عنوان ہو" ادب کی بنیادی ذمہ داری"۔ ظفر
حبیب فساد کے موقع پر ایک مضمون پڑھے "مسلم کشی کا سلسلہ
کب تک" نورالہدیٰ اور شبیر حسن صاحبان ایک ایک افسانہ
سنائیں! اور قمر حمید صاحب اپنی شعری تخلیقات پیش کریں۔
دو جون ۱۹۸۱ء کی تاریخ طے کر دی گئی۔ اسٹوڈنٹس اردو
لائبریری کے ذمہ داروں نے اس تقریب کی تفصیلات کو
مشتہر کرنا شروع کر دیا۔ اثبات و نفی کی کشاکش شروع
ہو گئی۔ سیمینار کے انعقاد سے قبل ہی موضوعات و مسائل زیر بحث
آ گئے۔ شریعت قسری کے پیروکاروں سے لیکر رندان بلانوش
تک اس کا چرچا پہونچ گیا۔ حرم و دیر کے ان تذکروں نے اس
سیمینار کو انتہائی پس منظر عطا کر دیا۔ یہاں تک کہ دو جون
۱۹۸۱ء کا وہ وقت مقرر بھی پہونچ گیا جس وقت اسے ہونا
تھا! لیکن بجلی کی مستقل آنکھ مچولی اور طلبا کی رنگ رلی نے
وقت کو کچھ ٹل جانے کا موقع دے دیا۔ سیمینار سات بجے
شام سے شروع ہونے کے بجائے نو بجے رات سے شروع
ہوا۔ اسے دو سیشن میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلی نشست کی صدارت
ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب کے حوالہ کی گئی اور دوسری کی عبد
تپش صاحب کے پہلی نشست نثری تھی اور دوسری شعری
پہلی نشست میں سب سے پہلے ڈاکٹر مہدی حسن صاحب
نے اپنا مقالہ سنایا۔ پھر اس کے بعد شبیر حسن صاحب نے
ایک کہانی پڑھی" درد کی محفلیں"۔ کہانی کے بعد ظفر حبیب
کو بلایا گیا مضمون سنانے کو اور تب نورالہدیٰ صاحب کا نمبر
آیا۔ انھوں نے بھی ایک کہانی "سجدے کی موت" سنائی
ایک گھنٹے میں یہ چاروں تخلیقات سُن لی گئیں اور تب
بحث کا سلسلہ شروع ہوا۔ حاضرین نے بحث میں کھل کر اور
جم کر حصہ لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ عزیز طلبا اور بزرگ دانشوروں
کے درمیان ایک مقابلہ چل رہا ہے۔ دونوں طبقہ ایک سے
ایک نکتے نکالنے کی کوشش میں لگا تھا۔

ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے اپنے مقالہ میں جو اہم
بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ ادب کو انسانیت کی خدمت کا فرض
انجام دینا چاہیئے۔ سماج کو فلاحی خطوط پر قائم کرنے کے
لئے ادیب کو بھرپور کوشش کرنا چاہیئے۔ اور فلاحی سماج
وہ سماج ہے جس میں خدائی ہر مخلوق کو اس کا جائز حق ملے
کسی کی حق تلفی نہ کی جائے۔ اور چھین جھپٹ کا مزاج پنپنے
نہ پائے۔ اس کے لئے ضرورت ایسی بات کی ہے کہ خالق
کائنات کے مرتب کردہ اصول حیات کو عام کیا جائے۔

ظفر حبیب کے مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ آزادی
کے آس پاس جو فسادات ہوئے ان کے اسباب دوہی تھے
جن کا انجام تقسیم ملک تک پہونچا۔ اس وقت بھی سخت
خونریزیاں ہوئیں لیکن ان خونریزیوں کو سبب کی بنیاد
پر بھلا دیا گیا۔ اور اب جو فسادات ہو رہے ہیں ان کے

اسباب قطعیٔ وہ نہیں رہتے۔ اب ہندوستان کی مسلم اقلیت کے خلاف یہاں کی فرقہ پرست ذہن و مزاج رکھنے والے اس طبقہ کے سازشی ٹولہ کا ہاتھ ہے جو منظم طور پر ہندوستانی مسلمانوں کو جانی نقصان سے زیادہ مالی نقصان پہونچانے کی کوششوں میں لگا ہے۔ مالی نقصان پہونچانے کے پس پشت صرف یہ سبب کار فرما ہے کہ پھر اسکی پسماندگی کا فائدہ اٹھاکر اسے صحیح خطوط پر اُبھرنے سے روک دیا جائے۔ اور یہ امت جو نیابت الٰہی کے مقام پر فائز کی گئی ہے محکوم و مظلوم ہوکر رہ جائے۔ اس سلسلہ میں سیاسی جماعتوں کی تخصیص نہیں مشہور فرقہ پرست جماعتوں کے شانہ بشانہ وہ جماعتیں بھی اس سازش کو حقیقت کی شکل عطا کر رہی ہیں جن کے چہروں پر ترقی پسندی کی نقاب پڑی ہے۔

پروفیسر شبیر حسن کی کہانی ان کے ترقی پسندانہ خیالات کی ترجمان تھی۔ ایک کلرک کی زندگی کے مسائل اور اسکی معاشی مجبوریوں کا دردناک تذکرہ اس کہانی کی روح تھی جسے بڑے ہی دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

پروفیسر نورالہدیٰ کی کہانی اپنے موضوع پر منفرد حیثیت کی حامل تھی۔ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا تھا جس پر غالباً ابتک کسی نے کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان بزعم خود اسلام کی واحد پیرو کار جماعت افراد کی بھیڑ جمع کر لینے میں جسے مہارت تامہ حاصل ہے ان کی کہانی کا موضوع تھی جس میں انھوں نے انتہائی ایمائی انداز میں اسکی حقیقتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک امتیازی وصف اس کہانی کا یہ بھی تھا کہ اسکا پس منظر لکھنؤ ہی کا ماحول تھا۔

یہ ساری نثری تخلیقات سیمینار کی پہلی نشست میں پڑھی گئیں۔ بحث کے بعد دوسری نشست کا آغاز ہوا۔ جناب ترقید صاحب کو اس نشست میں چار غزلیں اور ایک نظم (آزادی یوم آزادی) سنانی تھی۔ اس نشست کی صدارت جناب عبدالصمد تپش صاحب نے فرمائی۔

نشست کا وہ حصہ بیحد دلچسپ رہا جس میں سامعین نے ان تمام تخلیقات پر کھل کر تبصرہ کیا۔ سب سے پہلے اُبھرتے ہوئے جواں سال افسانہ نگار منظور رشیدی سامنے آئے۔ شبیر حسن صاحب کے افسانہ میں کرب و ہیجان تو ملتا ہے لیکن نجات کا راستہ نہیں ملتا۔ کردار ردِ عمل ضرور ہے لیکن یہ کردار عمل کا جذبہ نہیں جگاتا ہے۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اس کہانی میں منفیانہ انداز پایا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر مہدی حسن نے شبیر حسن کے افسانہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "انسان کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ صرف پیٹ یا اس سے آگے بھی کچھ؟ اگر وہ پیٹ تو بھی اس کا حل کیا ہے؟ معاش ایک اہم مسئلہ ہے لیکن اسکا متوازن حل ڈھونڈھنا ضروری ہے اور یہ اس وقت ممکن ہوگا جب انسان کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو اور احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے بالاتر ہستی پر ایمان لانا لازمی ہے۔ ایک ادیب کو اس توازن کی تبلیغ کرنی چاہیئے نہ کہ صرف آہ و بکا پر بات ختم کر دی جائے"۔ —— ظفر حبیب کا مضمون کامیاب اچھوتا اور قابلِ پسند ہے۔ اس باب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی حیثیت نہیں پہچانی ہے۔ اس کی مزید تفصیل مضمون میں پیش کی جانی چاہیئے"۔ سجدے کی موت جب میں سن رہا تھا تو ایسا لگا جیسے ایک حسین خواب

دیکھ رہا ہوں جسکی تفسیر ابھی سمجھ میں نہیں آئی"۔
مہدی حسن صاحب کے لیے عبدالصمد تپش صاحب تشریف فرما ہوئے۔" مہدی صاحب کا مقالہ قابلِ تعریف ضرور ہے لیکن یکطرفہ ہوگیا ہے۔ ادب کی ذمہ داری صرف اخلاقیات کے سلسلے میں بیان کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا جانا چاہیئے۔۔۔ اشتراکی خدا بیزار اور ملحد ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن شبیر حسن کے افسانہ میں خدا بیزاری جیسی کوئی بات نہیں۔ جس رُخ کو انھوں نے پیش کیا ہے اسکی تفصیل پیش کردی ہے۔۔۔ ظفر حبیب کا مضمون بھرپور ہے بات جتنے کھلے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ وقت اسی کا تقاضہ کرتا ہے"۔

قمر حمید صاحب نے فرمایا۔۔۔" مہدی صاحب کی زبان مقالہ کی کم اور خطابت کی زیادہ ہے۔ تنقید نگار کو کسی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے وقت موضوع کی ہمہ گیریت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ شبیر حسن کا افسانہ پلاٹ کی حیثیت سے تو ٹھیک ہے۔ لیکن زبان و بیان میں شستگی کی کمی ہے۔ افسانہ نگار نے ادب کے خارجی حسن کی طرف توجہ کم دی ہے۔۔۔ ظفر حبیب کی ایک بات جو سب سے زیادہ اچھی لگی وہ ان کی صاف گوئی ہے انھوں نے انتہائی دلیرانہ انداز اختیار کیا ہے۔ خدا کرے یہ انداز اور نکھرے۔ نور صاحب بنیادی طور پر ایک افسانہ نویس ہیں۔ ان کے متعلق بس اتنا ہی کہوں گا۔۔۔"

بزرگوں کے ان تبصروں کے بعد نوجوانوں میں جوش و ولولہ پیدا ہوا۔۔۔ مسلم یونیورسٹی کے طلبا ناصر اختر اور شہباز الرحمٰن نے کہا" مہدی صاحب نے مکمل انسان بنانے پر توجہ دینے کی بات کہی ہے۔ انسان تو اس دنیا میں بھرا پڑا ہے یہ سارے مسائل کو حل کرسکے"۔ شہباز نے کہا" ظفر حبیب صاحب نے مسلمانوں کو اخلاق پر توجہ دینے پر پورا زور نہیں دیا ہے"۔

محمد جان ہائی اسکول کلکتہ کے طالبعلم علامہ شبلی عزت عرشی نے کہا" ایک افسانہ نگار موضوع کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکتا ہے۔ اس کا اندازہ نور الہدیٰ صاحب کا افسانہ سُن کر ہوا۔ پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ سجدہ کی موت میری سمجھ میں نہیں آیا"۔

گنیش دت کالج بیگو سرائے کے طالبعلم سرور حسن نے کہا۔۔۔" ظفر حبیب صاحب نے کہا ہے کہ مسلم کشی کا سلسلہ بند نہیں ہوسکتا ہے لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ہم صحیح معنوں میں مسلمان ہوجائیں تو یہ سلسلہ بند ہوجائے گا۔ نور صاحب کا افسانہ سمجھ میں نہیں آیا"۔

عزیزوں کے بعد مائیک ایکبار پھر بزرگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ شبیر حسن صاحب سامنے آئے۔۔۔" میرے افسانہ میں منفیت نہیں ہے۔ اسمیں نچلے متوسط طبقہ کی زندگی کی تفسیر ہے۔ میں کردار کو سامنے لاتا ہوں اس کے ہاتھ میں جھنڈا نہیں پکڑاتا۔ فاضل مضمون نگار (مہدی حسن) نے ادب کا بہت تنگ تصور لیا ہے۔ زندگی کو ہر معنی میں دیکھا جانا ضروری ہے اخلاقیات کا وہ تصور ان کے یہاں ہے جو دوسرے مسائل سے آنکھ موند کر گزر جاتا ہے زندگی کے مسائل میں روٹی بھی ہے اور مذہب بھی۔۔۔ ظفر حبیب نے فرقہ وارانہ فساد کو بڑے کینوس پر نہیں دیکھا ہے صرف ایک طبقہ کے مسائل ان کے پیش نظر ہیں۔ فساد سیاسی تحریکات کو دبانے کے لئے کرائے جاتے ہیں۔ سیکولرزم پر

انستہ کیا گیا ہے۔ اکثریت میں بھی ایسی قوتیں ہیں جو فساد کو
پسند نہیں کرتیں۔ ترقی پسندوں نے فساد کے خلاف لکھا ہے
ثریت میں بھی ایسی قوتیں ہیں جو فساد کو پسند نہیں کرتیں۔ مضمون
دھورا ہے۔ اسباب کا تفصیلی جائزہ ہونا چاہیئے۔ سماجی
ور اقتصادی معاملات پر بحث کی گنجائش باقی ہے"۔
شبیر حسن کے بعد ظفر حبیب سامنے آئے ـــــ "مجھے
پنے مضمون کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے۔ جب یہ باضابطہ
شائع ہوگا تو اس پر زیادہ جم کر بحث کی جا سکتی ہے۔ چونکہ
اسے پڑھ کر سنانا تھا اس لئے بہت سے حصے تشنہ رہ گئے اسکا
مجھے بھی احساس ہے۔ لیکن مضمون نامکمل نہیں ویسے کسی بھی
موضوع پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ترقی
پسندوں کے سلسلہ میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زبانی ہمدردی
کے معاملہ میں ہندوستان کی کونسی سیاسی جماعت کسی سے
پیچھے ہے؟ ہمیں تو عمل چاہیئے۔ وہ اشتراکی حضرات جو بات
بات پر گالیاں چلا سکتے ہیں اور گولیاں کھا سکتے ہیں۔ ان
میں سے آج تک ایک بھی اشتراکی ایسا نہ ملا جو فرقہ وارانہ
فساد کے موقع پر حملہ آوروں کی گولیاں کھانے کو آگے بڑھ
گیا ہو۔ اگر ایسی کوئی ایک بھی مثال ہو تو میرے سامنے پیش
کی جائے۔؟ میں اکثریت کی اکثریت کو امن پسند سمجھتا ہوں۔
لیکن یہ امن پسندی کیسی کہ غنڈے سماج پر حکومت کریں؟
ـــــ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب اب سے پہلے تک صرف
خطیب تھے۔ اس لئے ان کی تحریر میں خطابت کا رنگ جھلکنا
لازمی ہے۔ شبیر حسن نے خوبصورت زبان بھی استعمال کی ہے
اور موضوع کی پیش کش میں ایماندار بھی رہے ہیں۔ لیکن میں
ان سے یہ عرض کروں گا کہ وہ اگر خود کو ابدی بنانا چاہتے

ہیں تو ابدی نظریات سے اپنا رشتہ جوڑیں۔ انسانی نظریات
تو جنم لیتے رہے ہیں اور مرتے رہے ہیں ـــــ نور الہدیٰ صاحب
کی ایمائیت سمبالزم (SYMBOLISM) پر عام طور
پر عدم پسندیدگی کا اظہار صرف اس وجہ سے کیا گیا کہ سامعین
جدید کہانی کے تیور سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ کہانی انتہائی
خوبصورت ہے لیکن بات کہیں کہیں کھل گئی ہے۔ یعنی کچھ اور
زیادہ سمبالزم کا سہارا لیا جانا چاہیئے۔ البتہ زبان کی
دلنشینی سے انکار کی گنجائش نہیں"۔
صدر نے نور صاحب کے متعلق کہا کہ "ان کی کہانی میں
SUGGESTi VENES بہت زیادہ ہے اور
یہ عام ذہن کے قابل ہے ـــــ افسانہ میں BRAMETIC
JUSTICE کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ شبیر صاحب کے
افسانہ میں اسکی کمی ہے۔ ظفر حبیب کا مضمون بہت بہت
اچھا ہے اور بس"۔
صدر کی اس گفتگو کے بعد دوسری نشست کے صدر
تشریف فرما ہوئے۔ قمر صاحب کی تخلیقات سنی گئیں اور ان
پر بھی تبصرے ہوئے۔ کسی نے قمر صاحب کے لحن کی تعریف کی۔
کسی نے لفظوں کی پیکریت کی۔ کسی نے لفظوں کی آنچ پر
قمر کے پگھلتے وجود کو دیکھا اور کسی نے کرب کی لذتیت کا
لطف اُٹھایا ـــــ
منظور رشیدی نے کہا "قمر صاحب کی شاعری میں
زندگی سے بیزاری اور اُمید کی شکست کا احساس ہوتا ہے
زبان بہت پیاری ہے"۔ نور الہدیٰ صاحب نے کہا "قمر
حمید کی شاعری نے ارتقاء مدارج کو طے کیا ہے۔ اقبال
کے سوا تمام لوگوں کی شاعری نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد

زوال آمادہ ہوگئی ہے۔ قمر کی شاعری غالباً نقطۂ عروج کی پہلی منزل میں ہے۔ میانہ روی کا انداز ہے اس لئے زوال کا اندیشہ نہیں۔ انداز جدید ہے مجھے کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس میں مستفیت پائی جائے۔" شبیر حسن نے کہا "میں شاعری کم سمجھتا ہوں پھر بھی نظم بہت پسند آئی۔ اس نظم میں فیض کا انداز ہے۔ فیض کی طرح کا۔ یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کا شکوہ تو ہے لیکن ؏

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی آئی نہیں ہے

کی بات نہیں کہی گئی ہے۔ ظفر حبیب نے کہا "قمر حمید کی شاعری بہت سارے ڈھنڈورچی جدید شاعروں کے مقابلے میں بہت اچھی اور اعلیٰ مرتبت ہے۔ لفظوں کے استعمال کا جو سلیقہ قمر صاحب کے پاس ہے کم شاعروں کو یہ فن نصیب ہوسکا ہے

آلام روزگار کو آساں بنا لیا

جو غم ملا اسے غم جاناں بنا لیا

کی مکمل تقلید قمر حمید کے یہاں پائی جاتی ہے۔ چند اشعار قارئین کی نظر کرتا ہوں اس اصلاح کے ساتھ کہ یہ سیمنار رات کے نو بجے شروع ہوکر تقریباً ایک بجے اختتام پذیر ہوا۔

سورج نے ساری بات بتائی تھی راز کی
سایے کے پیچھے پیچھے تھا سایہ لگا ہوا

سرابوں کے میں پیچھے دوڑتا ہوں
کرو مجھ کو سمندر کے حوالے

اپنی دوشیزہ تمناؤں کی تشہیر کے لئے
جذبہ گمنام گناہوں کا ابھرتا کوئی

تیرے احساس کو بھی روگ لگا کر اک دن
پر سکوں جھیل میں آنکھوں کی اترتا کوئی
دکھتا پلکوں سے ڈھلکتے ہوئے موتی کا حساب
بخیہ زخمیوں کا مرے بیٹھ کے کرتا کوئی

بسلسلہ مضمون صفحہ ۱۷ (ڈاکٹر محمد عقیل)

دستیاب نہیں ہوسکا۔

قمر رئیس صاحب کی اس تحقیق کے بعد جعفر رضا صاحب نے اپنی کتاب پریم چند۔ فن اور تعمیر فن کے ۱۹۸۲ء کے اڈیشن کے صفحہ ۱ پر لکھا ہے کہ —

پریم چند کی کہانیوں کے تعین میں ایک دوسرے فرضی نام "لبشلم" کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے جو ۱۹۱۴-۱۷ء کے مختلف رسائل میں نظر آتا ہے۔"

پھر انھوں نے "لبشلم" اسی کتاب میں اسی صفحہ پر تین جگہ تحریر کیا ہے۔ اسی کتاب سے پہلے اپنی کتاب "پریم چند کہانی کا رہنما" میں بھی انھوں نے "لبشلم" نام کی نشاندہی کی ہے لیکن "العصر" رسالے میں جو پیارے لال شاکر میرٹھی نکالتے تھے اس میں یہ نام "لبشلم" نہیں بلکہ "پلشم" درج ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ "پلشم" کے فرضی نام سے جو مضامین اور افسانے ملتے ہیں، وہ پیارے لال شاکر میرٹھی ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ پریم چند کا ان افسانوں اور مضامین سے کوئی واسطہ نہیں۔ "پلشم" ایک مرکب نام ہے جو پیارے لال میرٹھی کے نام کے پہلے حروف کا مرکب ہے۔ پ۔ ل۔ ش۔ م اور افسانوں میں جو پریم چند کا رنگ ملتا ہے۔ تو اسے محض پریم چند کی تقلید سمجھنا چاہیئے۔

علیم جہانگیر
۲۰ آسرا، ۲-۱-۸۸ - قاضی واڑہ، اورنگ آباد
(مہاراشٹر)

(طنز و مزاح)

تاریخ کیا ہے؟

کسی نے ٹھیک ہی کہا "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ ہم سالِ رواں کا "ماتم" اور نئے سال کا "جشن" منانے سے قبل ہی نہ صرف ہمارے ڈرائنگ روم کی "درو دیوار" بلکہ ہر کتب فروش کی دکانیں "نت نئے ڈیزائن، دلفریب ودلکش مناظر اور حُسن و رعنائی کے کلینڈرز سے آراستہ و پیراستہ ہوجاتی ہیں۔

یوں بھی بعض مقولوں اور مشوروں کا صحیح اندازہ انسان کو اسی وقت ہوتا ہے جب وہ ان پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیتا ہے۔ اب ہماری مثال لیجئے۔ ہم "رمضان المبارک" کی عید کا چاند دوستوں رشتہ داروں کے ساتھ "چاند رات" سے ایک دن قبل آسمان پہ دیکھنے کی "بے سود" توکبھی "باسود" جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ انواع و اقسام کی جنتریوں کے مطابق فراہم کردہ "تین تفرقہ" تاریخیں ہمیں شک و شبہہ میں ڈال دیتی ہیں۔ یہ اور بات کہ کہیں سے چاند نظر آنے کی اطلاع پر ہمارے "ملّا لوگ" بڑے قیمتی اور مخلصانہ مشورے دیتے ہیں۔

ازل سے "انسان اور تاریخ" کا ساتھ چولی دامن کا ساہے دورِ حاضر کے بہت سے مسائل کا بوجھ صرف "تاریخیں" اٹھاتی ہوئی ہیں۔ روز مرّہ تاریخ کا بار ہم لئے پھرتے ہیں۔ اگر آپ فرصت کے لمحات میں غور کریں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہوجائیگی کہ آپ کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں ہوں آپ سے "بجا" یا "بے جا" یہ ضرور دریافت کیا جائے گا "آج تاریخ کیا ہے" "ڈیٹ پلیز" "آج تاریخ ہے کتنی" خواہ آپ کو تاریخ یاد ہوگیا نہ ہو۔ ہم عینی شاہد ہیں جو تاریخ بتانے پر بڑے تلخ تجربوں سے گزرے ہیں۔

ہمیں وہ دن یاد ہے جب ہم ریل میں سفر کر رہے تھے کسی سُریلی آواز کی سرگوشی میں ہم نے پہلی بار "تاریخ بتاتے ہوئے معصومیت سے کہہ دیا "محترمہ خدا کے لئے اب مہینہ مت پوچھیے۔" دوسرے ہی لمحہ ہم جیسے اعلیٰ فرد کی نہ صرف "خاندانی تاریخ" بلکہ لحیم شحیم باڈی کا "جغرافیہ" تک بچانا مشکل تھا۔

بلا ناغہ علی الصبح "تاریخ دیکھ کر گھر سے نکلنا ہمارا معمول ہے۔ لیکن روز بروز تاریخ دریافت کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے بوکھلاجانا ہماری عین شرافت ہے۔ بارہا

ایسا بھی ہوا کہ نہ چاہتے ہوئے ہمیں تاریخ کہنے میں ہی خیر و عافیت نظر آئی ۔

پچھلے دنوں ہم شاپنگ میں مصروف تھے کہ کسی نے پوچھا "آج کیا تاریخ ہے"۔ ہم نے جھنجھلا کر کہا "گزرے ہوئے کل کی تاریخ معلوم ہے"

وہ ۔ جی نہیں۔

ہم ۔ آنے والے کل کی تاریخ بتا سکتے ہو۔

وہ ۔ جی وہ بھی نہیں ۔

ہم ۔ پھر حال کی تاریخ جاننا بہت مشکل ہے"۔

اس مشینی دور میں انسان تاریخ سے باخبر رہنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرلیتا ہے ۔ ہمارے ایک دوست ہیں وہ ہر وقت "تازہ اخبار" کی ایک کاپی اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں۔ لوگ انھیں بہت بڑا سیاست داں سمجھتے ہیں آفس میں کبھی اخبار ان کے "ہاتھ" میں ہوتا ہے تو کبھی "ٹیبل" پر پڑا رہتا ہے۔ دراصل وہ مسودوں پر اخبار دیکھ کر تاریخ درج کرتے ہیں۔ بلکہ حاجت مندوں کی حاجت بھی رفع کرتے ہیں ایک دفعہ انھوں نے ڈھیر سارے مسودے "باس" کے "ملاحظہ" کو بھجوائے ۔ باس نے بلوا کر ان کی خوب خبر لی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ گھر سے نکلتے وقت عجلت میں "پرانے اخبار" کی کاپی ساتھ لیتے آئے۔ جسکی تاریخ تمام تر مسودوں پر درج تھی۔

جب اسے مبالغہ نہ سمجھیں۔ ہمارے ایک اور دوست ہیں۔ جن کے گھر خدا کے فضل سے ہر سال ایک کلینڈر تیار ہو جاتا ہے نتیجے میں اب ان کے پاس "قسم ہا قسم کے اسقدر کلینڈر جمع ہو چکے ہیں کہ انھیں خود کی تاریخ یاد نہیں۔ ہر کسی سے تاریخ پوچھنا انکی "ہابی" ہے۔ ہم نے انھیں اس خطرناک بیماری سے بچانے کی خاطر سنجیدگی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ ماضی یا مستقبل دونوں میں سے کسی ایک تاریخ کو اچھی طرح یاد رکھیئے"۔ وہ فرمانے لگے "اس سے فائدہ" ہم نے سمجھاتے ہوئے مزید بتایا "مستقبل کی تاریخ میں سے ایک کا عدد منفی کرنے یا ماضی کی تاریخ میں ایک کا عدد جمع کرنے پر خود بخود حال کی تاریخ حاصل ہو جایا کرے گی"۔ اس پر انھوں نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے غمگین آواز میں کہا۔ "اگر ماضی یا مستقبل پر میری نظر ہوتی تو آج میں حال میں بے حال نہ ہوتا"۔

ہم کلینڈرز کی مدد سے انسان کے معیار اور مزاق کا بآسانی اندازہ لگا لیتے ہیں ۔ ہمارے ایک باذوق پڑوسی ہیں جنھوں نے اپنے گھر کو نہ صرف اچھا خاصہ "تاریخ گھر" بنا رکھا ہے۔ بلکہ "قومی یکجہتی" کی عمدہ مثال بھی قائم کر رکھی ہے ہماری رائے میں انھیں کم از کم "نوبل پرائز" ضرور ملنا چاہیئے۔ ان کے پاس ہر ٹائپ کے کلینڈر موجود ہیں ۔ ہر کلینڈر کے لئے جگہ بھی "مخصوص" ہے۔ فلمی ستارے، سیاسی رہنما اُس طرف تو مختلف مذہبی، تعلیمی اور ادبی کلینڈرز اس طرف انجینئرنگ کے اعلیٰ نمونے، ڈاکٹری آلات، گھریلو آرائش و آسائش کے کلینڈرز ادھر تو مختلف کمپنیوں، اداروں کے اشتہاری ماڈلز اُدھر۔ صبح بنارس، شام اودھ اس جگہ تو چرند پرند اس جگہ۔ قدرتی مناظر یہاں تو ماڈرن آرٹ وہاں۔ بچوں کے کلینڈرز ایک طرف تو کھلونے کے دوسری طرف

پتہ نہیں آپ کے گھر میں کوئی کلینڈر ہے یا نہیں لیکن ان کے گھر کلینڈرز کی "بھرمار" دیکھ کر ہم نہ صرف "طبقاتی کشمکش" کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے حسن سلیقہ کے قائل بھی ہو کر آتے ہیں ۔ ایک دن وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ انکے نوکر نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھاتا ہوا یہ کہکر چلا گیا "صاحب

تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ تب تک آپ انتظار کیجئے۔" ہم حسبِ عادت مختلف کلینڈرز کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے صوفے پر نظر پڑی۔ ہم چونک سے گئے۔ ایک پیارا اور خوبصورت سا بچہ منہ میں انگلی دبائے ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہم اس ننھے منے اور معصوم بچے کو از راہ ہمدردی اٹھانے کو جھکے ہی تھے اسی اثنا میں ہمارے پڑوسی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بارعب انداز میں کہنے لگے "کیا کر رہے ہو"؟ ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا "آپ کے بچے کو گود میں لے رہے ہیں"۔ اس پر انھوں نے غضبناک آواز میں چنگھاڑتے ہوئے کہا "کیا بکتے ہو؟ ہم نے ابتک شادی ہی نہیں کی" پہلے تو ہم دہلتے ہوئے سمجھے وہ مذاق کر رہے ہیں مگر ان کے سمجھانے پر "تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے گھر میں بچوں کے کلینڈرز تو ہیں مگر بچہ ہرگز نہیں" ہم نے ہڑبڑا کر جو غور سے دیکھا تو ہمارا سر ندامت کے مارے جھکا کا جھکا ہی رہ گیا۔ درحقیقت وہ "مرفی" ریڈیو کا کلینڈر تھا۔ جو ہماری آمد پر ان کے ملازم نے دیوار سے "لٹکانے" کے بجائے صوفے پر "چھوڑ" دیا گیا تھا۔

ہماری بات چھوڑیئے۔ اب وہ باپ بن چکے ہیں۔ ان کے کمسن بچے بھی ان کلینڈرز سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ایک دن ہم ان کے کمسن بچے کو "سنیما" دکھانے لے گئے جو مختلف اداکاروں کو مختلف اوقات میں پردے میں چلتا پھرتا دیکھ کر کہتا رہا "انکل انکل یہ کلینڈرز تو ہمارے بھی گھر میں ہیں" ہم نے اسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ گھر پہونچکر بھی اور راستے بھر یہی کہتا رہا۔ وہ "سنیما گھر" سے صرف کلینڈرز دیکھ کر آرہا ہے۔

کبھی کبھی انسان کی معمولی سی غلطی تاریخ میں حماقت بن جاتی ہے۔ محمد تغلق مورخین کی نظر میں محض اسی لئے "پاگل" تھے کہ اس نے دلی سے "دیوگری" "تک" "رن" اور جوابی "لانگ رن" لگائی تھی۔ ہمارے ایک دور کے رشتہ دار نے اپنے والد کی معمولی سی غلطی کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمیں بتایا۔ انکی نسبت کسی دور دراز شہر میں طے کر کے جب ان کے والد خوشی خوشی گھر لوٹے "تو" مارے خوشی" کے انھیں صرف تاریخ یاد تھی۔ مہینہ "قمری" تھا یا "انگریزی" وہ بھول گئے نتیجہ میں نوشامیاں مع براتیوں کے شادی سے ایک مہینہ قبل دلہن والوں کے گھر کا "گھیراؤ" کر دیا۔ بیچارے کو آج تک باپ کی اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

پچھلے مہینے ہمیں شادی کا ایک رقعہ ملا۔ جس پر ازروئے کلینڈر مہینہ اور تاریخ درست تھی لیکن سال ہجری کے لحاظ سے ایک "صدی" آگے یعنی ۱۵۰۱ھ درج تھی۔ وہ تو غنیمت ہوا کسی وقت کار "منچلے نوجوان" نے "سرخئ خون" سے "فردی" تصیح کر دی۔ ورنہ ہمیں شادی میں شرکت کے لئے اس "رقعہ" کے ساتھ "توسیعئ عمر" کی درخواست "نیلی چھتری" والے کو بھیجنی پڑتی۔

ہم کلینڈرز کے ذریعہ ملک کی معاشی "صورت حال" کا بخوبی اور عمدہ طریقہ سے جائزہ لے لیتے ہیں۔ مثلاً "خلیل خان" کے گھر "امپورٹیڈ" کلینڈرز سے یا عظیم کے گھر "عظیم الشان" اور دیدہ زیب، رنگی برنگی جنتریوں سے انکی حیثیت کا رعب ہم پر چھانے لگتا ہے۔ آپ ہم ملک کو خود کفیل "سمجھ لیتے ہیں" جب ان "نفیس" اور "نازک" "کلینڈرز" یا جنتریوں کے بیچ "ہنگامی" حالات میں "شب ہائے متبرکات" یا مذہبی رسومات" کے مواقعہ پر "قمر در عقرب" یا "سعد و نحس" دنوں کی تاریخ دیکھنے اچانک لطیف کی جیب سے "پاکٹ سائز" جنتری [illegible]

تو ہم یوں محسوس کرتے ہیں۔ اس ملک سے غربت اتنی آسانی سے نہیں ہٹے گی جس آسانی سے ہم پچھلے ماہ کا صفحہ کلینڈر سے ہٹا دیتے ہیں۔

نہ صرف اتنا بلکہ کچھ دن پہلے ہم ایک جلسہ میں شریک تھے کسی مقرر نے دوران تقریر مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "میں نے آپ لوگوں کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ افسوس کہ میرے پاس گھڑی نہیں ہے"۔ مجمع میں سے کسی نے چلاتے ہوئے کہا "آپ کے پیچھے کلینڈر تو ہے"۔

خیر کچھ بھی ہو کلینڈر ہے بڑی دلچسپ چیز۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا کے کاروبار ٹھپ ہو جائیں۔ اکثر اوقات ہم کثرت کار کی وجہ سے کلینڈر کا صفحہ اس وقت بدلتے ہیں۔ جب ریڈیو سری لنکا سے براڈکاسٹ کیے جانے والے ریکارڈ کے اس بول سے ہمارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

"خوش ہے زمانہ آج پہلی تاریخ ہے"

لیکن جوں جوں کلینڈر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ عمر بڑھتی جاتی ہے۔ توں توں زندگی کے ساتھ ساتھ ہماری جیب کا وزن بھی گھٹتا چلا جاتا ہے۔ جس کا ہمیں بے حد ملال ہے ہم سوچتے ہیں کاش ہر تاریخ "پہلی تاریخ" ہوتی پر اس خیال سے دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔

ہر روز عید نیست کہ

جان غالب

(از محمد حسین شمس الدین)

مرزا غالب کے ادبی خطوط کا نمائندہ انتخاب جس سے ان کے انداز تحریر اور اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔

قیمت ۳/=

ہماری جدید شائع کردہ کتابیں

جلد خریدیں

	قیمت
۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی قیمت	9/-
۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	7/-
۳۔ باغ و بہار میر امن دہلوی — مع مقدمہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	6/=
۴۔ یادگار غالب، حالی مع مقدمہ (جدید اڈیشن)	6/=
۵۔ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور	12/=
۶۔ دیوان غالب اردو (فروغ اردو طاہر ایڈیشن) زیر طبع	6/=
۷۔ انارکلی — امتیاز علی تاج	5/=
۸۔ سلور کنگ۔ آغا حشر کاشمیری — معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالمغنی	6/=
۹۔ اردو کے قومی شاعر۔ ڈاکٹر افتخار احسن	5/=
۱۰۔ مقدمہ شعر و شاعری حالی (زیر طبع)	5/=
۱۱۔ حسرت موہانی۔ جدید اڈیشن عبدالشکور	9/-
۱۲۔ امراؤ جان ادا — مرزا رسوا	5/50

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو، ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

پروفیسر مسعود حسین

گودان تا گئودان

گئودان اُردو میں تصنیف ہے یا ترجمہ اس سوال کو میں نے ٹھیک دس برس پہلے انجمن ترقی اُردو کے ہفتہ وار ہماری زبان کے صفحات میں تین مختصر مضامین کے ذریعہ اٹھایا تھا یہ مضامین اس ہفتہ وار میں "میرا صفحہ" کے عنوان کے تحت ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء، ۱۵ جون ۱۹۷۱ء شائع ہوتے رہے[۱]

میرا ذہن اس مسئلے کی جانب دو وجوہ سے منعطف ہوا سب سے پہلے وہ اندرونی لسانی شہادتیں جو اس کے اُردو اور ہندی اڈیشنوں کو ملا کر پڑھتے وقت سامنے آئیں جن کا ذکر مثالوں کے ساتھ میں نے ہماری زبان کے ۱۵ جون ۱۹۷۱ء کے شمارے میں کیا ہے۔ دوسرے پریم چند کے وہ خطوط جن میں پریم چند اور ان کے دوست اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی کے درمیان ترجمے کے کاروبار کا ذکر ملتا ہے[۲]۔ یہ کاروبار ان دونوں کے درمیان عرصے سے ہوتا چلا آیا تھا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں پریم چند دیا نرائن نگم کو رقم طراز ہیں :۔

"حضرت سحر کو میں نے ۲۰۰ دینا طے کیا ہے۔ وہ راضی بھی ہو گئے ...... راضی ہوں تو گوشہ عافیت

[illegible]

لیکن ان داخلی اور خارجی شہادتوں کے باوجود اب وقت تک میرا خیال تھا کہ غالباً پریم چند نے بسترِ مرگ سے گودان کے اُردو ترجمے کو دیکھا ہے۔ اور ممکن ہے جہاں تہاں سحر کے ترجمے میں اصلاح بھی کی ہو۔

پریم چند کا انتقال ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ دیا نرائن نگم نے ان کے انتقال کے بعد پریم چند نمبر (۱۹۳۷) میں گئودان کے بارے میں یہ اطلاع دی:

"۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول گئودان (ہندی) سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں اور پہلا اڈیشن قریب اختتام ہے اس کا اُردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہوگا۔"

دیا نرائن نگم نے یہاں اپنی اُردو نویسی کی بنا پر ہندی "گودان" کو "گئودان" لکھا ہے ظاہر ہے سرسوتی پریس سے گودان شائع ہو سکتا ہے، گئودان نہیں۔ جس کا پہلا اڈیشن مکتبہ جامعہ سے بہت بعد کو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

میرے اِن مختصر مضامین کا سب سے مثبت ردِ عمل دیریندر پرشاد سکسینہ صاحب کے ذیل کے مراسلے کی شکل میں ہوا ہے۔ چونکہ سکسینہ صاحب کی دسترس سحر ہنگامی کے خود نوشت حالات کے مسودے تک تھی۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مراسلے میں ہنگامی کا حسب ذیل اقتباس نقل کیا۔

"منشی پریم چند آنجہانی کے متعدد قصے اور کئی ناول مثلاً "رنگ بھوم" ــ "کرم بھوم" ــ "پریم آشرم" "نرملا" وغیرہ ہندی سے اُردو میں لکھے جو چھپ چکے ہیں۔ ابھی ان کا آخری ناول "گئو دان" بھی مکتبہ جامعہ سے شائع ہو چکا ہے جس کا اُردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے"۔

ہماری زبان کے مذکورہ بالا تین مضامین کو یکجا کر کے ترمیم و اضافے کے بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تحقیقی مجلہ فکر و نظر میں ان کو "گئودان۔ تصنیف یا ترجمہ" کے عنوان سے شائع کیا اور اُردو ہندی متون کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے سحر ہنگامی کے اس دعوے کی تصدیق کی کہ گئودان انہیں کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔ اس وقت تک بھی گئودان کے پہلے ایڈیشن کی صحیح تاریخ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے میرا خیال یہی رہا کہ پریم چند نے ممکن ہے بستر مرگ پر اس ترجمے کو سُن کر کچھ اصلاحیں دی ہوں۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر جعفر رضا کا مقالہ "پریم چند۔ فن اور تعمیرِ فن" کے نام سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے میرے علاوہ دیا نرائن نگم، دیریندر پرشاد سکسینہ اور سحر ہنگامی سب کے بیانات سے اختلاف کیا۔ مثلاً نگم کے اس جملے کو کہ "اسکا (گئودان) اُردو ترجمہ سحر صاحب کی امداد سے شائع ہوگا" (۲۶۱) پر یہ تنقید کی کہ "یہاں نگم نے سحر سے ترجمہ کرانے کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ صرف ان کی امداد کا حوالہ ہے۔ لیکن اس سے یہ سوالیہ نشان لگ جاتا ہے کہ سحر نے گئودان کی اشاعت میں کس طرح کی مدد کی"۔

اسی طرح ڈاکٹر جعفر رضا نے دیریندر پرساد سکسینہ صاحب کے مراسلے میں سحر ہنگامی کے اقتباس کے بارے میں اپنے شبہہ کا اظہار کیا۔ اور اختر حسین رائے پوری کے نام ایک مکتوب سے (جو پریم چند نے ۲۷ فروری ۱۹۳۶ء کو لکھا تھا) اور جس میں گودان اور گئودان دونوں ناموں سے اس ناول کو یاد کیا گیا ہے، یہ نتیجہ نکالا کہ پریم چند کا ہندی ناول ان کی زندگی میں ہی چھپ گیا تھا۔ اور گئودان کا مسودہ بھی انھوں نے اپنی زندگی ہی میں تیار کر لیا تھا۔

پریم چند صدی کے بھوپال سمینار میں جو نومبر ۱۹۷۹ء میں مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس موقع پر ڈاکٹر جعفر رضا اور میں دونوں موجود تھے اور پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے بھی جنھوں نے ایک جلسہ کی صدارت کی تھی۔ انھوں نے گودان اور گئودان کی بحث کو بہت دلچسپی سے سُنا۔ ہم دونوں مقالہ نگار اپنی اپنی سابقہ تحقیق پر اضافہ کئے بغیر دیر تک اس بحث میں اُلجھے رہے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر جعفر رضا محض وکالت سے کام لے رہے تھے ان کا خیال تھا کہ محض داخلی اور لسانی شہادتوں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پریم چند کے خطوط کی خارجی شہادتوں کی انھوں نے تاویلات کر لی تھیں۔ وہ کسی طرح گئودان کو ترجمہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے، اس لئے کہ اس طرح متفقہ طور پر تسلیم شدہ اُردو کا بہترین ناول اُردو والوں کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور اس کے ساتھ ان ناقدین کرام کا بھرم بھی جو اس کا گیت گاتے رہے ہیں دیکھے

مطالبہ تھا کہ جب تک مزید خارجی شواہد نہ جمع کر دوں،
مقدمہ کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

پریم چند کے بھوپال سیمینار کا ایک مثبت فائدہ یہ بھی
ہوا کہ وہاں کے محققین میں بحث چل نکلی بحث اگر تحقیقی انداز
کی ہو تو دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ ہفتہ عشرہ کے اندر
مجھے ڈاکٹر سید حامد حسن نے لکھا کہ عبدالقوی دسنوی صاحب کے
ذخیرے میں جب زمانہ کے پرانے نمبروں پر نظر ڈالی۔ تو حسب
ذیل اطلاع ملی جس سے آپ کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے
جنوری ۱۹۳۷ء کے شمارہ میں صفحہ ۳ پر "علمی خبریں" اور
نوٹس کے ذیل میں یہ درج ملا:

"منشی صاحب کے قریب قریب تمام قصے اور
ناول اُردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ البتہ انکا
آخری ناول گئودان (گؤدان) جو ان کی وفات سے چند ہی
ہفتے پہلے شائع ہوا ہے۔ ابھی تک اردو میں منتقل
نہیں ہوا ہے۔ مسز پریم چند صاحبہ اور اُنکے
صاحبزادے اس کو اُردو میں شائع کرنے کا ارادہ
رکھتے ہیں اور اس کے لئے ایڈیٹر "زمانہ" کی
معرفت لائق مترجم کی تلاش میں ہیں۔ جو صاحب
اس خدمت کو اپنے ذمہ لینا پسند کریں، وہ ایڈیٹر
"زمانہ" کانپور کو اپنی شرائط سے مطلع کریں۔"

وہ رہی وفاداری ... استواری مقدمہ اس شہادت
پر ختم نہیں، اپریل ۱۹۸۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ
اُردو نے پریم چند پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ مجھے اس کے ایک جلسہ
کی صدارت سونپی گئی۔ وہاں پریم چند کے پریمیوں میں ڈاکٹر جعفر
رضا اور ڈاکٹر قمر رئیس بھی موجود تھے میں نے اپنی صدارتی تقریر
میں اس نئی شہادت کا تذکرہ کرتے ہوئے پھر اس بات کو دہرایا کہ اس کی
موجودگی میں اب کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ گئودان اُردو میں
پریم چند کی تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے جسے سحر ہنگامی نے معاوضہ
لیکر ان کے انتقال کے بعد کیا ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا سحر ہنگامی کی
کردار کشی کرتے ہوئے انہیں ناقابلِ اعتماد بلکہ جوکر تک بنا دیا۔ انھوں
نے اہلِ بھوپال کی فراہم کردہ تازہ معلومات کا حوالہ دیئے بغیر اپنی
تصنیف "پریم چند ـــ فن اور تعمیر فن" کے نئے ایڈیشن (۱۹۸۰ء)
میں اس کا اندراج کر دیا۔ اور اپنی بحث کی ڈگر قائم رکھی۔ (ص ۲۴۴)

"پریم چند ادبیات کے بعض دیگر مباحث کی طرح
گئودان کے متعلق غلط فہمیوں کی ابتدا منشی دیا نرائن
نگم کے بیانات سے ہوتی ہے۔"

ان کے خیال میں "زمانہ" کی یہ خبر بھی اسی قسم کا بیان
ہے۔ حالانکہ وہ اُردو گئودان کے پریم چند کے انتقال سے پہلے
موجود ہونے کی شہادت بھی انہیں کے بیانات سے فراہم کرتے ہیں!
اور "مترجم کی تلاش" اور "سحر صاحب کی امداد" سے اُردو ترجمہ
شائع ہونے والے بیانات میں تضاد دیکھتے ہیں!

علی گڑھ سیمینار کے اختتام پر ڈاکٹر قمر رئیس نے نہایت
جذباتی انداز میں اپیل کی کہ میں پریم چند کو دس برس سے ادبی
عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کئے ہوئے ہوں، اور اب جبکہ پریم چند
صدی تقریبات منائی جا رہی ہیں۔ یہ میرے لئے کہاں تک مناسب
ہے۔ میرے لئے ان کے اس نقطۂ نظر پر تعجب کرنے کے سوا اور
کوئی چارہ نہیں تھا۔

میرا ذاتی خیال تھا کہ زمانہ "جنوری ۱۹۳۷ء میں مترجم
کی تلاش کے اعلان کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی تھی
کہ گئودان کا اُردو ترجمہ خود پریم چند کا کیا ہوا نہیں ہے۔ تاہم ڈاکٹر

جعفر رضا کا اصرار ختم نہیں ہوا۔ اس لئے بحث جاری رہی اور مقدمہ چلتا رہا۔

اب مجھے دو چیزوں کی تلاش ہوئی۔ ایک گئودان کے پہلے اڈیشن کی اور دوسرے "زمانہ" کے ۱۹۳۷ء کے بعد کے شماروں کی۔ اتفاق سے دونوں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخائر میں مل گئے۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے اپنی تصنیف کے ص ۱۰۳ پر گئودان کے بارے میں لکھا ہے:-

"اردو میں پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا"

یہ بیان گمراہ کن ہے اور پہلے اڈیشن کو دیکھے بغیر غالباً اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے لئے لکھا گیا ہے۔ گئودان کے پہلے اڈیشن کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری کے حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے اس پر تاریخ اشاعت ۱۹۳۹ء (مطابق ۱۳۱۴ء) درج ہے ناول کے نام کے نیچے "مصنفہ منشی پریم چند مرحوم" لکھا ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی زمانہ فروری ۱۹۳۸ء کے شمارے میں "علمی، ادبی اور نوٹ" کے صفحے پر اتمام حجت کے لئے اڈیٹر زمانہ کی دی ہوئی یہ خبر ملی:

ہمارے دوست حضرت سحر ہنگامی نے منشی پریم چند آنجہانی کے آخری ناول "گئودان" کے اردو ترجمے کی خدمت اپنے ذمہ لی تھی۔ لہٰذا آپ نے اسکا مکمل ترجمہ کرکے پبلشر کے سپرد کردیا اور اب گئودان کا اردو اڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوگا۔"

مقدمہ اب گئودان پر ختم نہیں ہوجاتا سحر ہنگامی کے اس دعوے کو کہ گئودان کے علاوہ چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، گوشۂ عافیت، نرملا وغیرہ کو اردو کا قالب انھوں نے ہی عطا کیا ہے" از سرِ نو جانچنے کی ضرورت ہے۔ بادی النظر میں داخلی اور لسانی شواہد ان کے دعوے کی صداقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اور خارجی شواہد کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔ جہاں تک گوشۂ عافیت کا تعلق ہے۔ پریم چند کے ذیل کے خط کو کسی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ جو انھوں نے دیا نرائن نگم کو ۱۹۳۱ء میں لکھا ہے:-

"حضرت سحر کو میں نے ۱۰۰ دینا طے کیا ہے، وہ راضی بھی ہوگئے...... راضی ہوں تو گوشۂ عافیت بھی ان سے پورا کروالوں۔"

حواشی

۱؎ ہماری زبان: میرا صفحہ ۱۵، دسمبر ۱۹۷۰ء، ۸ مئی ۱۹۷۱ء اور ۱۵ جون ۱۹۷۱ء۔

۲؎ مدن گوپال: پریم چند کے خطوط، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۸ء

۳؎ دیا نرائن نگم اور دوسرے اردو کے ادیبوں کو برابر ہوتا رہا ہے کہ وہ ہندی "گودان" کو بھی گئودان کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔

۴؎ دیکھئے: ہماری زبان: شمارہ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء

۵؎ علی الترتیب چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، گوشۂ عافیت، اور نرملا۔

۶؎ ہندی گودان: ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ پریم چند کی جان لیوا بیماری کا سلسلہ جون ۱۹۳۶ء سے شروع ہوگیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

۷؎ دیکھئے یہاں بھی نگم گودان کو گئودان لکھ رہے ہیں۔

۸؎ دیا نرائن نگم ہندی گودان کو مسلسل گئودان لکھتے ہیں۔ یہ غلطی خود پریم چند کے خطوط میں پائی جاتی ہے۔

وشوناتھ طاؤس

اُردو کا مسئلہ حل کرنے کیلئے سیاستدانوں کے آگے گڑگڑانے کی ضرورت نہیں

اُردو کا مسئلہ کلیتاً ایک لسانی مسئلہ ہے لیکن اسے سُلجھانے کے لئے سیاست دانوں کے آگے ایڑیاں رگڑی جاری ہیں ۔ اُردو کے حامی ارباب حکومت کے آستانوں پر سجدے کر رہے ہیں کہ ان کی نظرِ عنایت ہو اور زبان کو تحفظ ملے ۔ لسانیات کے سیاسیات کے ساتھ بیر رابطہ فہم و فراست سے بالاتر ہیں کیونکہ دُنیا میں کہیں بھی ثقافت کو سیاست کے خار دار دامن میں پناہ نہیں لینی پڑی سب ایک ہماری ہی زمین ہے جہاں

اربابِ اختیار تمدن کو بھی تابع کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ اپنے مخصوص مفادات کے لئے ناجائز طور پر وہ زبان کے مسئلہ کو سیاست کے تانے بانے میں اُلجھانے اور اسے پیچیدہ بنانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں تاکہ ملک کے دانشور اور قلمکاران کے رحم و کرم کے محتاج رہیں ۔

اپنی نمائندہ منتخب حکومت سے لسانی بنیادوں پر اُردو زبان کی حیات و بقا اور اس کی ترقی و اشاعت کے لئے راستہ ہموار کرنے کا ہمارا مطالبہ برحق ہے لیکن سیاسی طور طریقوں سے اس کے تحفظ کی مانگ کرنا دانشمندی سے بعید ہے ۔ کسی سیاسی

تنظیم کی حمایت اس لئے کرنا کہ اس نے اپنے انتخابی منشور میں اُردو کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا یا کسی سیاسی رہنما کی تعریف و توصیف میں الفاظ کے دریا محض اس لئے بہا دینا کہ اس نے انتخابی مہم کے دوران چند خوبصورت الفاظ میں اُردو کی مدح سرائی کی تھی ، اپنے آپ کو فریب دینا ہے کیونکہ الیکشن کے وعدے کبھی پورے کرنے کے لئے نہیں کئے جاتے ۔

ہم ہمیشہ ارباب حکومت اور اہل سیاست کے آگے اُردو کے لئے دامن پھیلاتے رہے ۔ ملک کے ناخداؤں نے ہمیں کئی سبز باغ دکھائے لیکن ہم نے ان کی سیاسی شعبدہ گری

کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہم حصول انصاف کی خاطر حکمرانوں تک رسائی کے لئے جد و جہد کرتے رہے لیکن ہم نے اپنے موقف کی وضاحت کے لئے عوام کے دربار میں جانے کی سعی نہیں کی۔ اُردو کے لئے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے کبھی عوامی جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کبھی عوام کو اعتماد میں نہیں لیا۔ لوگوں کو یہ علم نہیں ہے کہ یہ جد و جہد ہم کیوں اور کس لئے کر رہے ہیں۔

پنجابی، سندھی اور کشمیری زبان اُردو سے بہت قریب ہیں۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے اپنے کاز کے لئے ان زبانوں کے ادیبوں کو ساتھ لینے کی کوشش کی ہو۔ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں، کئی بار پنجابی ادیبوں سے ملا اور ان سے کہا کہ پنجابی صوبے کی جنگ اردو اخبارات کے کندھوں پر چڑھ کر لڑی گئی اور اپنا مقصد حاصل کر لیا لیکن ہم مصیبت میں ہیں تو آپ ہمارا ساتھ نہیں دے رہے ہیں جواب میں انھوں نے مجھے ہمیشہ یہی کہا کہ آپ نے ہمیں کبھی اعتماد میں نہیں لیا کبھی اپنا مقدمہ ہمارے روبرو نہیں رکھا۔ پھر ہم خواہ مخواہ آپ کے وکیل کیسے بن جائیں؟ اگر ہم نے کبھی اپنی درد بھری داستان پنجابی زبان کے دانشوروں سے بیان کی ہوتی تو وہ ضرور ہمارا ساتھ دیتے۔

اُردو والوں نے دیگر زبانوں کے اہلِ قلم کے ساتھ تال میل نہیں رکھا اور ان کی حمایت حاصل نہیں کر پائے۔ ہم با اثر انگریزی پریس کو اپنا ہمدرد نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ ہم نے کبھی اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں کیا۔ ہم نے تعلیمی اور ثقافتی اداروں اور فلمی دنیا میں اپنی لابی قائم نہیں کی۔ ہم نے طلبا کی تنظیموں اور اساتذہ کی انجمنوں میں کبھی اپنے موقف کی وضاحت نہیں کی جو ہمارا ساتھ دیتے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام کمزوریوں کی اصلاح اور اپنی تمام کوتاہیوں کا ازالہ کریں۔ سیاست کے ناخداؤں کے آگے جھولی پھیلانے کے بجائے ہمیں ملک بھر کے دانشوروں اور اہلِ قلم کو ساتھ لینا چاہیئے۔ اور عوام کے دربار میں انصاف مانگنا چاہیئے۔ کیونکہ آوازِ خلق ہی نقارۂ خدا ہے۔

ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب خریدئے

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ ادب اردو مکمل د جلد	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	70/-
اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	15/-
تنقیدی نظریات۔ حصہ اول	سید احتشام حسین	15/-
〃 〃 دوم	〃	15/-
تنقید علی تنقید		9/-
ذوق ادب و شعور		8/-
روایت و بغاوت		9/-
تنقیدی جائزے		4/-
عکس اور آئینے		9/-
سید احتشام حسین نمبر		39/-
انتخاب جدید نثر اردو		-/ز
شکست گہر		6/-
نقش حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر ۲		20/-
〃 حصہ اول 〃 نمبر ۱		15/-
اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	8/9
سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	6/-
فروغ اُردو جگر نمبر		10/-
فروغ اُردو پریم چند نمبر		15/-
حکمت نمبر		12/-
امیر خسرو نمبر		15/-
عبد الماجد دریا بادی نمبر		[illegible]/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۵-	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	۹/-
۱۶-	ثرانہائے نیام	ڈاکٹر غیب حسین	۲/-
۱۷-	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	۲/-
۱۸-	تصویر درد معہ ترجمہ	علامہ اقبال	۱/۲۵

(ٹ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ٹیگور	ناظم سیتاپوری	۲/-
۲-	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۳/-

(ث)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ثنائے حبیب نعتیہ کلام	بہزاد لکھنوی	[illegible]

(ج)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	جہان غالب	محمد حسین شمس	۲/-
۲-	جانثر	انور سیوانی	۳/-
۳-	جواہرات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۴-	جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اردو		۴/-
۵-	" " نمبر ۲ " "		۴/-
۶-	جوئے رواں مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	۲/۵۰
۷-	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	۲/۵۰
۸-	جنگ ہنسائی مجموعہ افسانہ	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹-	جلوے	معین الدین دردائی	۲/-
۱۰-	جمیلہ بوائزی (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۱۱-	جگر نمبر حصہ اول	سید احتشام حسین	۸/-

(چ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	۲/-

(ح)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	حیات فضل الحق	خیرآبادی	۱/۵۰
۲-	حالی بحیثیت شاعر جدید اڈیشن معہ اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۳-	حسرت موہانی	عبدالشکور	۱/-
۴-	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۱/۵۰
۵-	حکیم ناصر	وزیر خاں لنگراں	۱/-
۶-	حبیبہ غالب	سعادت علی صدیقی	۲/۵۰

(خ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	خطوط بیخود	سید ذاکر حسین	[illegible]
۲-	خضر راہ معہ ترجمہ	علامہ اقبال	[illegible]
۳-	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبدالماجد	[illegible]
۴-	خضر راہ معہ ترجمہ	[illegible]	۱/-
۵-	خلاصہ شریعت زادہ	[illegible]	۱/-
۶-	خلاصہ روح تنقید		۲/-
۷-	خلاصہ جواہر العروض		۲/-
۸-	خیل مزاحیہ محمد علی واحدی معہ مقدمہ	شوکت تھانوی	۲/۵۰
۹	خوشی کی تلاش	احسن النظوبی اے	۴/-
۱۰-	خلاصہ شعر الہند حصہ دوم		۱/-
۱۱-	خلاصہ المیزان		[illegible]

(د)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱-	دیوان آبرو		[illegible]
۲-	دلچسپ کہانیاں		[illegible]
۳-	دیوان فغانی		۲/۵۰
۴-	داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ فارسی	عبدالواحد خان خلیل	[illegible]

۵. دہلی کا یادگار مشاعرہ ۱/۵۰

۶. دستۂ گل ۶/۰

۷. دوشیزہ قاف (ناول) خان محبوب طرزی ۵/-

۸. دلربا " " ۳/۵۰

۹. دکنی کا دبستان شاعری

(مع اضافہ جدید ایڈیشن) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲۲/-

۱۰. دھرم کنیر ذکی کاکوری ۲/۵۰

(ڈ)

۱. ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۶/۵۰

(ذ)

۱. ذوقِ جستجو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۲/-

۲. ذوقِ ادب و شعور سید احتشام حسین ۸/-

۳. ذوقِ جنوں مجموعۂ کلام آل احمد سرور ۱۱/-

(ر)

۱. روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۹/-

۲. رباعیاتِ غالب فارسی معہ اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی ۲/۵۰

۳. رہبرِ مضمون نویسی شفاعت علی صدیقی ۳/-

۴. راکھی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۶/۵۰

۵. رخسارِ سحر انصر کریم صدیقی ۱/۵۰

۶. رفتار وحشی محمود آبادی " " ۳/۵۰

۷. رموزِ حکمت معہ مقدمہ اردو محمد شریف ۲/-

۸. ریاضِ فارسی منتخب کلام فارسی ۳/-

۹. ریختہ دلی جدید ایڈیشن ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۳/-

(ز)

۱. زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ مولانا تھانوی ۰/۰۶

۱۲. زنبیلوں کا بادشاہ حکیم بانا مزاحیہ ناول سید علی عباس حسینی ۱/۲۵

۱۳. زینب ساحرہ وحشی محمود آبادی ۳/-

(س)

۱. سلور کنگ آغا حشر کاشمیری ۴/-

۲. سوانح اور خاکے نجم الدین نقوی ۵/-

۳. سرور جہاں آبادی ڈاکٹر حکیم چند نیر ۹/-

۴. سرودِ نو (مجموعۂ کلام) پروفیسر اختر قادری ۴/۵۰

۵. سلکِ گہر سید احتشام حسین ۵/-

۶. سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۷. سرمایۂ زبانِ اردو جلال لکھنوی ۹/-

۸. سفر (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/-

۹. سیاحتِ زمین " محمود اعظم فہمی ۱/۵۰

۱۰. ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۱. سنہرا حلقہ ۰/۲۵

۱۲. سر سید احمد خاں انوار الحسن صدیقی ۶/۵۰

۱۳. سوشل اسٹڈیز احمد محسن کاکوروی ۱/۰۵

(ش)

۱. شعرِ نو تنقیدی مجموعہ ڈاکٹر محمد حسن ۸/-

۲. شرحِ دیوانِ غالب مزاحیہ غلام احمد فرقت ۲۰/-

۳. شرحِ مسلکِ گہر عبد القوی دریابادی ۶/-

۴. شاہ غلام حسن [illegible] پروفیسر عبد الشکور ۱۰/-

۵. شرحِ ادب پارے نثر سعادت علی صدیقی [illegible]

۶. شرحِ ادب پارے نظم ڈاکٹر محمود الحسن ۵/-

۷. شرحِ منتخبات فارسی عبد القوی دریابادی ۵/-

۸. شبلی نعمانی انوار الحسن نورانی ۶/۵۰

شرحِ دیوانِ غالب جدید ایڈیشن نظم طباطبائی ۱۰/-

۱۰. شیخ ... ادھ سماجی زندگی عبد العلی قدوائی ۱/-

" " حصہ دوم " " ۱/۲۵

۱۹۔ مطالعۂ حالی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — 9/-
۲۰۔ مفتاح العربیہ — محمد حسین محسن علوی — 1/50
۲۱۔ میٹھے بول — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — 2/-
۲۲۔ معنوی پیاعہ — خان محبوب طرزی — 4/-
۲۳۔ مقدمہ شعر و شاعری — مطابق نصاب بی۔اے حالی — 2/50
۲۴۔ مرثیہ غالب — حالی — 2/25
۲۵۔ محبوبۂ کربلا — جرجی زیدان — 3/50
۲۶۔ معمار — مائل ملیح آبادی — 4/50
۲۷۔ مولانا حالی — انوار الحسن صدیقی — -/50
۲۸۔ انتخاب فسانۂ آزاد یعنی مہاراج علی پنڈت سرشار لکھنوی کا
۲۹۔ ڈاکٹر حسن فاروقی — 2/50
۳۰۔ ملا نوک جھونک — خواجہ عزیز حسن مجذوب — -/75
۳۱۔ مجذوب اور ان کا کلام — مولانا رضا انصاری — 1/50
۳۲۔ مصباح بلاغت مع مقدمہ — محمد شریف — 3/-
۳۳۔ مطالعۂ سودا — ڈاکٹر محمد حسن — 5/-
۳۴۔ مقدمات و مقالات — عبد الاحد خاں — 5/50
۳۵۔ منتخب سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — 5/-
۳۶۔ مفتاح العربیہ شرح — محمد حسین محسن علوی — 2/-

(ن)

۱۔ ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم
کے نام عبد الماجد دریابادی — -/80
۲۔ نثر امروز ایران — ڈاکٹر رغب حسین
۳۔ نشاط غالب — وجاہت علی سندیلوی
۴۔ نقد و انتقاد — اعجاز احمد معجز — 2/-
۵۔ نقوش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر مدیر مقتشم حسین — 16/-
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی دوم — 16/-
۶۔ شجاعت علی سندیلوی — 28/-
۷۔ نغمۂ کوہسار — خان محبوب طرزی — 4/-
۸۔ لغات الہند مع مقدمۂ اردو — محمد شریف — 3/-
۹۔ نظم سائیکلوپیڈیا — ذکی کاکوروی — 12/-
۱۰۔ نقوش خیال یعنی انتخاب کلام فانی — کبیر احمد جائسی — 3/-
۱۱۔ نسرین نسترن — ذکی کاکوروی — 14/-
۱۲۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ — حامد اللہ افسر — 6/-
۱۳۔ نیرنگ خیال حصہ اول — محمد حسین آزاد — 1/25
۱۴۔ ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام
کے نام عبد الماجد دریابادی — -/80
۱۵۔ لبِ مرور جہاں آبادی دیوان — ڈاکٹر حکم چند نیر — 4/50
۱۶۔ نیا راستہ (ناول) — خان محبوب طرزی — 2/50
۱۷۔ نوروز — " — مائل ملیح آبادی — 1/50
۱۸۔ نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ — آل احمد سرور — 12/-
۱۹۔ نیلم — انتصار حسین — 2/50
۲۰۔ نذیر احمد کی کہانی — فرحت اللہ بیگ — 1/50
۲۱۔ نقوش و افکار — مجنوں گورکھپوری — 8/-
۲۲۔ نصاب فارسی — مع مقدمہ فارسی عبد الاحد خاں — 1/-
۲۳۔ منشی نولکشور نمبر — 1/-

(و)

۱۔ وعدۂ فردا — اختر مشتاق
رحیم آبادی — 15/-

(ہ)

۱۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے — علی عباس حسینی — 2/-
۲۔ ہندوستان کے مسلمان شعرا — امیر حسن

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۳	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
۴	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۵	ہندوستان کا تعمیری منصوبہ	"	۱/۵۰
۶	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفی احسن علوی	۱/۹
۷	" " حصہ ۲	" "	۱/۴۰
۸	" " حصہ ۳	" "	۱/۴۰
۹	ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفی احسن علوی	۱/۴

(ی)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	یادگار غالب	مولانا حالی	۸/-
۲	یاقوتی ناوں	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر آپ کا ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو جائے بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۳۔	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
۴	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۵۔	ہندوستان کا تعمیری منصوبہ	"	۱/۵۰
۶۔	ہمارا سماج ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ احسن علوی فریابی	۹/-
۷۔	" " ۲	" "	۱/۳۵
۸۔	" " ۳	" "	۱/۴۰
۹۔	ہمارا سماج ۴	ڈاکٹر مصطفیٰ احسن علوی فریابی	۱/۴۰

(مئی)

۱۔	یادگار غالب	مولانا حالی	۸/-
۲	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۳۔	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ فروغ اردو نمبر ۲۶ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ [illegible] سالانہ چندہ ختم ہو [illegible] بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے۔

(۵) [illegible] مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان

یادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ: (۹) اکتوبر ۱۹۸۱ء جلد (۲۸)

رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو / این، پی - ۹۳

لائسنس نمبر ۳۰۸۸ / ۲۰ / ۱۷ / ۶۴ / ۲۰

دفتر فون: ۴۶۱۳۵

فون رہائش گاہ ۴۶۶۵۶

ایڈیٹر: محمد حسین شمس علوی

قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند

مجلس ادارت:

عبدالقوی دریابادی (بی اے)

سعادت علی صدیقی (ایم اے)

محمد حسنین علوی (ایم۔ اے)

مجلس مشاورت

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی ریڈر شعبۂ اردو	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر ظفر احسن	
پروفیسر حکم چند نیر	بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر فضل امام	راجستھان ”

ترتیب

زر سالانہ اعزازی — بیس روپے

عوام سے: — پندرہ روپے

فی پرچہ: — ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ: ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

غزلیں

کاظم الرضا راہی

شوخ نغمے جو زمانے کو سُنا دیتا ہوں
تجھ کو رسوائیٔ عالم سے بچا لیتا ہوں

جب سُناتا ہوں میں بربادیٔ دل کا قصّہ
اس فسانے سے ترا نام مِٹا دیتا ہوں

جانے کیا سوچ کے بیٹھا ہیں زمیں پہ تنہا
نام لکھ لکھ کے ترا خود ہی مِٹا دیتا ہوں

اَب خیالوں سے ترے بزم کو روشن کرکے
میں چراغوں کو سرِ شام بجھا دیتا ہوں

میرا کردار عجوبہ ہے جہاں میں راہی
مِٹ کے خودداروں کی تصویر بنا دیتا ہوں

مظہر علی شاہ شاد دارہی

کوئی بُرا نہیں ہے ہماری نگاہ میں
زاہد پھنسا ہوا ہے ثواب و گناہ میں

مجھ کو نہیں سکوں تو انھیں بھی نہیں سکوں
اللہ رکھے اتنا اثر تو ہے آہ میں

دامن جھٹک کے جب سے گئے وہ خدا گواہ
تاریک ہو کے رہ گئی دُنیا نگاہ میں

تاریکیوں میں تھا تو مجھے شوق بندگی
سجدوں کا ہوش بھی نہ رہا جلوہ گاہ میں

دیکھا ہمارا ذوق طلب شوقِ جستجو
ہم باریاب ہو کے رہے بارگاہ میں

اَب اپنی شاد کوئی تمنّا نہیں رہی
اپنی نظر میں وہ ہیں ہم ان کی نگاہ میں

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

[illegible library stamp] NEW DELHI

اگست و ستمبر کے فروغ اُردو میں، اُردو کے متعلق یہ عرض کیا گیا تھا کہ [illegible] یو پی میں اُردو کے ساتھ کیا کیا ستم ڈھائے گئے۔ اور اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کردینے کی سرکاری و نیم سرکاری محکموں نے کتنی موثر اور منظم مہم چلائی، یہ صرف اس لئے کہ اسی ریاست میں سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی اور ہے جن کی مادری زبان اُردو رہی ہے، اسی ریاست میں اُردو کا چلن سرکاری اور عوامی سطح پر سب سے زیادہ تھا، اسی ریاست میں سب سے زیادہ اُردو کے مرکز تھے، اسی ریاست کی راجدھانی شہر لکھنؤ کی اُردو زبان ٹکسالی مستند سمجھی جاتی تھی اور کم و بیش اب بھی اس کو یہ درجہ حاصل ہے۔ برسر اقتدار جماعت کے لسانی اُمریت کا ذہن رکھنے والے حضرات نے سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ بنایا کہ اگر اُردو کو اس ریاست ختم کردیا جائے تو اس کے اثرات دوسری ریاستوں پر بھی پڑیں گے اور نسبتاً وہاں اُردو کو آسانی سے ختم کیا جاسکے گا۔ ان کا یہ منصوبہ یو۔پی میں تو صد فی صد کامیاب ہوگیا، اور دوسری ریاستیں بھی اس سے متاثر ہوئیں مگر ان ریاستوں میں نہ تو کوئی راج رشی تھا، نہ سمپورنانند جیسا وزیر تعلیم و وزیر اعلیٰ۔ اور مدھیہ پردیش کے سیٹھ گوبند داس جیسا اُردو دشمن اور نہ لسانی تنگ نظری اور تعصب کی یو۔پی جیسی شدت اس لئے وہاں اُردو کی تعلیم کسی نہ کسی طرح جاری رہی اُردو ذریعہ تعلیم بھی رہی۔ پرائمری اسکولوں، جونیر ہائی اسکولوں، اور ہائی اسکولوں تک میں اُردو نہ صرف زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی — بلکہ ذریعہ تعلیم بھی رہی۔ مغربی بنگال، بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک وغیرہ سب کہیں آج بھی پرائمری سطح سے لے کر ہائی اسکول تک ایسے اسکول ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ ابھی حال ہی میں مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کے سکریٹری اور ممبر سے ٹیلی ویژن پر ایک انٹرویو میں یہ انکشاف ہوا کہ مہاراشٹر میں کم سے کم تین سو ہائی اسکول اُردو میڈیم کے ہیں اور ریاست بھر میں اُردو میڈیم پرائمری اسکولوں کی تعداد بکثرت ہے۔ اکاڈمی نے یہ منصوبہ بھی بنایا ہے کہ تعلیم بالغان کے زیادہ سے زیادہ مرکز قائم کئے جائیں۔ اس نے ایسا نصاب مرتب کیا ہے جو کچھ ہفتوں میں اُردو پڑھنا لکھنا سکھا دیتا ہے۔

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی، ہندوستان میں سب سے پہلے قائم ہوئی تھی، اس نے تعلیم کے سلسلے میں صرف اتنا کیا ہے کہ پرائمری اور جونیر ہائی اسکول کے نصاب پہ نظر ثانی کرکے قابل اعتراض اور نفرت انگیز اسباق کو خارج کردیا ہے۔ کوئی شک نہیں یہ بھی بہت بڑا کام تھا، پورے ستائیس۲۷ سال تک قابل اعتراض اور نفرت انگیز کتابیں کورس میں داخل رہیں۔

یو۔ پی کی حکومت کی نظر میں یہی نصاب جمہوری نقطۂ نظر سے صحیح تھا —— سیکڑوں بار توجہ دلانے کے باوجود اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ مگر جب اس نفرت انگیز تعلیم کے نتائج برآمد ہونے لگے، تو برسر اقتدار حضرات کو احساس ہوا۔ اور انھیں اپنی لسانی و تعلیمی پالیسی پہ نظر ثانی کرنا پڑی۔

اکاڈمی نے اُردو تعلیم کے جائزہ کیلئے افسر دورابطہ مقرر کئے، جو وقتاً فوقتاً دورہ کرکے اُردو تعلیم کے سلسلے میں جو خامیاں شکایتیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ ان کی رپورٹ پیش کردیتے ہیں۔ لیکن ان شکایتوں کو دُور کرنے کا اکاڈمی کو کوئی اختیار نہیں ہے اس لئے ان پر عملدرآمد نہیں ہوپاتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اتنی تاخیر سے کہ مسئلہ اور زیادہ اُلجھ جاتا ہے۔

اُترپردیش اُردو اکاڈمی کو بھی سب سے زیادہ توجہ اُردو کی تعلیم اور بذریعہ تعلیم پر دینا چاہیئے۔ اگر دوسری ریاستوں میں اُردو ہائی اسکول تک ذریعہ تعلیم ہوسکتی ہے اور وہاں کے طلبا کا معیار غیر اُردو طلباء کے مقابلے میں کم نہیں ہوتا ہے۔ تو یوپی میں کیوں نہیں ہوسکتا ہے۔ جو اُردو کی اب بھی سب سے بڑی ریاست ہے۔ یہاں ایسا نصاب تعلیم کیوں نہیں مرتب کیا جاتا اور ایسے قاعدے کیوں نہیں بنائے جاتے جن سے پرائمری سطح سے لے کر انٹر درجات تک اُردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جاسکے۔ اور طلباء کا معیار ہندی طلباء سے کم نہ رہے۔ اگرچہ یہ وہم ہے، لیکن اس وہم کو دُور کرنے کی کوئی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی۔ بلکہ وہ طریقے اختیار کئے گئے۔ جن سے وہم میں برابر اضافہ ہوتا گیا—— اکاڈمی کو اسے دُور کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ماہرین تعلیم، ہمدردانِ اُردو اور اُردو کی تمام انجمنوں کو بھی اولیت اسی کو دینا ہے کہ اترپردیش میں بھی ہر سطح پر ذریعہ تعلیم اُردو ہوجائے۔

اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

فاضل انصاری سنسارپوری
۴۶- پوروانچل ہاسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی ۶۷

گئودان

تصنیف یا ترجمہ:- قاری کی عدالت میں

گئودان پریم چند کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جو اردو ہندی کے قالب میں ڈھلنے کے بعد دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو چکی ہے۔ پریم چند اردو اور ہندی ادبیات پر دسترس رکھتے تھے۔ اردو و ہندی کی تصنیفات انھیں کی رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ ہندی گئودان کی اشاعت پریم چند کی زندگی میں ہو چکی تھی۔ البتہ "گئودان" (اردو) ان کی وفات کے بعد چھپا۔ اردو کے کچھ ناقدین "گئودان" کی شہرت کو برداشت نہ کر سکے اور اس کی تاریخی حیثیت کو مجروح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ بنیادی ماخذ سے چشم پوشی کرتے ہوئے ثانوی ماخذ کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو گئودان اقبال ورما سحر ہتگامی کی رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ یعنی ہندی گئودان کا اردو ترجمہ ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے "ہماری زبان" کے توسط سے کئی مضامین لکھے۔ ان کی اولین کاوش ہماری زبان ۱۵ دسمبر ۱۹۷۹ء کے "میرا صفحہ" پر نمودار ہوئی جس میں انھوں نے پریم چند کے آخری ایام میں صحت کی خرابی کو خاص اہمیت دی اور یہ ثابت کیا کہ مسلسل بیماری کی وجہ سے وہ "گئودان" از خود منتقل نہ کر سکتے تھے۔ موصوف نے یہاں پر اس حقیقت سے چشم پوشی کی کہ "منگل سوتر" "گئودان" کے بعد ہی انھیں ایام علالت میں لکھا جا رہا تھا۔ اختر حسین رائے پوری کے نام پریم چند کا مکتوب[1] (۲۷ فروری ۱۹۳۶ء) ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے نہ اس سے اختلاف ظاہر کیا اور نہ اس سے کوئی نتیجہ ہی اخذ کیا۔ خاموشی حجۂ معنی دارد ہے

"میرا اپنا ناول گودان حال ہی میں نکلا ہے۔ اسکی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔ اردو میں ریویو کرنا میدان عمل کا نسخہ تو تم لے یہاں پہونچا ہی ہوگا اس پر بھی لکھنا گودان (چھٹا پتری میں گودان) ہم کے لئے ایک پبلشر کی تلاش کر رہا ہوں مگر اردو میں تو حالت جیسی ہے تم جانتے ہی ہو بہت ہوا تو ایک روپیہ صفحہ کوئی دیدیگا"

پریم چند کا ایک مکتوب بنام جنیندر کمار مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء ملاحظہ فرمایئے[1] (پریم چند کے خطوط مرتب مدن گوپال گوپال ص ۲۶۷) لکھتے ہیں "گودان نکل گیا۔ کل تمہارے پاس جائے گا۔ خوب موٹا ہو گیا ہے... سے بڑھ گیا اپنا وچار لکھنا" ساتھ ہی زمانہ کے پریم چند نمبر (جنوری ۱۹۳۷ء) کی اطلاع ملاحظہ ہو "۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں اور پہلا اڈیشن قریب اختتام ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہوگا۔

(ہماری زبان یکم و ۸ مئی ۱۹۸۱ء)

"قابل غور امر یہ ہے کہ گودان کی اشاعت کے بارے میں پریم چند کے مکتوب کا سن اشاعت درست ٹھہرتا ہے۔ یا [2] صاحب کی اطلاع جو کہ اول بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا ثانوی ماخذ ہے۔ یہاں پر راز ستنو کہ سری کے شبہ کو تقویت ملتی ہے جس میں انھوں نے سرسوتی پریس سے اردو گئودان کی اشاعت کا قیاس لگایا ہے۔ (ہماری زبان ۱۵، ۲۲ جون ۱۹۸۱ء ص ۶)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گودان سے گئودان کے ترجمہ کرائے جانے کے سلسلے میں نہ تو پریم چند کا کوئی خط یا بیان ملتا ہے۔ اور نہ مسز پریم چند صاحبہ یا ان کے صاحبزادگان کے بیان یا خطوط سے اس کی توثیق ہوتی ہے جو پال سیمینار کے موقع پر امرت رائے نے کیا اظہار خیال کیا یہ ابھی تک صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے۔

اب آیئے ثانوی ماخذات کی طرف جن پر بھروسہ کر کے گئودان کی ادبی حیثیت مجروح کی جا رہی ہے اس کے دو حصے ہیں۔

اول: زمانہ کانپور کے اشتہارات اور دوئم خود اقبال ورما سحر کے بیانات۔

"گودان تا گئودان" میں پروفیسر مسعود حسین صاحب نے زمانہ کے دو اشتہارات کے حوالے دیئے ہیں اول حوالہ زمانہ کے پریم چند نمبر جنوری ۱۹۳۷ء کا ہے اور دوئم زمانہ فروری ۱۹۳۸ء سے ماخوذ ہے۔ اول الذکر اشتہار کو میں نے شری امرت رائے کو لفظ بہ لفظ لکھ کر تصدیق کے لئے بھیجا۔ جس کے جواب میں انھوں نے اس اشتہار سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا: —

"زمانہ میں پرکاشت جس وگیاپن کا الیکھ آپ نے کیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا"... (مکتوب امرت رائے ۱۶ اپریل ۱۹۸۱ء)

اب زمانہ کا دوسرا اشتہار ملاحظہ فرمایئے:

"ہمارے دوست حضرت … سحر ہنگامی نے منشی پریم چند آنجہانی کے آخری ناول گئودان کے اردو ترجمے کی خدمات اپنے ذمہ لی تھی۔ لہذا آپ نے اس کا مکمل ترجمہ کر کے پبلشر کے سپرد کر دیا اور اب گئودان کا اردو اڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوگا۔"

حضرت سحر نے اس سے بہت پہلے دو سو روپے کے عوض رنگ بھوم کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ ان کے منشی پریم چند اور منشی دیانرائن نگم سے دوستانہ تعلقات بھی تھے مذکورہ بالا حق الخدمت کے جھگڑے میں پریم چند نے نگم ہی کو ثالث بننے کی دعوت دی تھی بقول خود سحر نے انکے متعدد ناول اور افسانے اردو میں

نوٹ ۔ ۱ پریم چند کے خطوط میں اس خط کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۸۴) ام ش

نوٹ ۔ ۲ چٹھی پتری حصہ دوئم میں اس خط کی تاریخ ۱۰ جون ۱۹۳۶ء ہے (صفحہ ۱۴۴ خط ۵۳) — ام ش۔

منتقل کیے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ زمانہ میں اس اشتہار کی اشاعت کا راز کیا تھا۔ لائق مترجم جو عرصہ سے اس کام کو کر رہا تھا۔ اس سے گئودان منتقل کرانے میں کیا دشواری پیش آ رہی تھی؟ یہ اشتہار مسز پریم چند صاحبہ اور ان کے صاحبزادے نے دیا تھا تو اُردو مسودہ سحر نے جامعہ ملیہ کے حوالے کیوں کیا؟ ان کو ترجمہ کے لئے کتنی اُجرت دی گئی؟ یہ اُجرت زمانہ کانپور نے ادا کی یا مسز موصوفہ نے؟ یہ چند ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات حاصل کئے بغیر ان مشتبہ اشتہارات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

ویریندر پرساد سکسینہ نے سحر کی ڈائری سے جو حوالہ پیش کیا ہے اور گئودان کے مسودے کو ان کے خاندان والوں سے حاصل کر کے محفوظ رکھنے جو مشورہ دیا ہے[1] وہ نہایت گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ یہ دعویٰ سحر نے پریم چند کی وفات کے بعد کیا گیا۔ ہر ناول یا افسانہ کا ترجمہ اگر ان کی ڈائری میں تاریخ وار درج ہوتا۔ تو ایک بات بھی ہوتی۔ یکبارگی دعویٰ شبہ سے خالی نہیں جو مسودے پبلشرز کو اشاعت کی غرض سے بھیجے گئے تھے، وہ اقبال ورما سحر کے پاس کیسے آگئے؟ اوّل تو پبلشرز مسودے واپس ہی نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی تو پریم چند کو کرتے مترجم کا تو نام بھی اشاعت میں درج نہیں پھر ترجمہ کئے جانے کا دعویٰ کس بنیاد پر صحیح مان لیا جائے۔ پریم چند کی زندگی میں اگر سحر نے مترجم ہونے کا دعویٰ کیا ہوتا تو اس کی تردید کا خدشہ تھا۔ اب اگر سحر کے خاندان والوں سے منشی جی کی تخلیقات کے مسودے مل بھی جائیں تو بھی انکی تاریخی حیثیت، قابلِ اعتماد نہیں۔

اقبال ورما سحر کی نیت پریم چند کی شہرت میں ساجھی دار بننے کی تھی۔ چونکہ یہ کام تنہا ان کے دعویٰ باطل سے ممکن نہ تھا۔

اس لئے انھوں نے اپنے اور پریم چند کے مشترکہ دوست نگم کا سہارا لیا۔ "زمانہ" کانپور کے اشتہارات نے سحر کو پریم چند کی شہرت میں ساجھی دار بنانے کا رول ادا کیا اور اس طرح مسز پریم چند صاحبہ یا ان کے صاحبزادگان کے علم میں لائے بغیر فرضی اشتہارات شائع کیے۔ میرے اس شبہ کو تقویت امرت رائے کے متذکرہ بالا خط کی روشنی ہی میں ملی۔ اقبال ورما سحر کے ان کے گھر (بعد وفات پریم چند) آنے جانے کے بارے میں دریافت کرنے پر انھوں نے لکھا "اقبال ورما سحر کو دیکھنے کی مجھے یاد نہیں ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ منشی جی کے دیہانت کے بعد وہ ہمارے یہاں آتے جاتے تھے یا نہیں؟ پریم چند کی وفات کے بعد اور ان کی حیات میں بھی سحر ان کے یہاں آئے گئے۔ یہ بات امرت رائے کو یاد نہیں۔ ظاہر ہے کہ عرصہ دراز سے سحر کا پریم چند کے گھر آنا جانا بند تھا۔

بھوپال اکیڈمی سیمنار کے موقع پر امرت رائے نے مسعود حسین صاحب سے کیا کہا؟ وہ خود تو اسے صیغۂ راز میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ان کے مکتوب کے حوالے سے پیشِ خدمت ہے "مسعود حسین خاں کی بات کے جواب کے سلسلے میں میں نے کہا تھا کہ مجھے ایک اُردو پانڈولپی کے سر ورق پر لال روشنائی سے گئودان، منشی جی کے اچھروں میں لکھا دیکھنے کی یاد ہے"

یہ سارے بیانات و شواہد سحر کی کذب بیانی اور "زمانہ" کانپور کی فرضی اشتہار بازی کی داستان بیان کرتے ہیں۔ تحقیق کا تقاضہ یہ ہے کہ بنیادی ماخذ پر بھروسہ کیا جائے یا قوی دلائل سے ان کی تردید کی جائے۔

———— ⁂ ————

[1] ہماری زبان ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء

مضمون سپلیش زیدی
ترجمہ و نوٹ : ابو محمد شبلی

ہندی میں پریم چند کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط

۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کے خط میں پریم چند نے سجاد ظہیر کو لکھا تھا۔ "یہاں تو بروقت اور خطوط نویسی سے ہی فرصت نہیں ملتی" اس سے ظاہر ہے کہ ہزار دو ہزار خطوط لکھ ڈالنا پریم چند کے لئے معمولی سی بات رہی ہوگی۔ لیکن آج ان کی چٹھیوں کے نام پر "چٹھی پتری" کے دو حصوں میں کل پانچ سو انیس (۵۱۹) خطوط اکٹھا کئے گئے ہیں۔ (میں نے ۱۵ خطوط گنے ہیں۔ مترجم) یہ خطوط ان چھیٹوں کو کم کرنے کے بعد سامنے آتے ہیں جو پریم چند کے نام دوسروں نے لکھی ہیں۔ ویسے بھی خطوط کا جمع کرنا اور اڈٹ کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

ادیبوں کے خطوط انکی زندگی اور ادب کے مطالعہ میں کسی حد تک معاون ہوئے ہیں۔ یہ بات کسی سے چھپی نہیں ہے۔ خود امرت رائے نے "چٹھی پتری" کے دیباچے میں تسلیم کیا ہے۔ سوانح لکھنے میں ان خطوط سے بیں نے کتنی مدد لی ہے۔ یہ میرے کہنے کی چیز نہیں ہے۔ پڑھنے والے خود دیکھیں گے۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس خزانہ کے بغیر اب میں (منشی پریم چند کی) سوانح لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شاید وہ تب بھی لکھی جاتی لیکن لنگڑی اور بے جان ہوتی۔ (چٹھی پتری جلد ۱ ص ۲۰)

امرت رائے کی لکھی پریم چند کی سوانح کو "بے جان" کہا تو صریحاً آنکھوں میں دھول جھونکنا ہوگا۔ چٹپٹی۔ دلچسپ اور کہانی قصوں کے ڈھنگ پر لکھی گئی چیز بے جان کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن ٹیڑھی بنیادوں پر اگر کوئی خوبصورت سی عمارت کھڑی کی جائے تو اس کی خوبصورتی اس کے ٹیڑھے پن پر تھوڑی دیر کے لئے بھلے ہی پردہ ڈال دے لیکن اس کے عیب کو بہت دنوں تک چھپائے نہیں رہ سکتی۔ یہی حال امرت رائے کی (ہندی تصنیف) "قلم کا سپاہی" کا ہے۔ خوبصورت ہوتے ہوئے بھی سوانح لنگڑی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ موٹے موٹے چشموں سے

پڑھنے کے باوجود "چٹھی پتری" میں جمع کی ہوئی زیادہ تر چٹھیاں مسخ شدہ اور ناقص ہیں۔ (مزید واقفیت کے لئے دیکھئے ڈاکٹر سلیش زیدی کی کتاب "پریم چند" کی اپنیاس یاترا (موہن نکن)۔ علی گڑھ ۱۹۷۰ء ص ۲۴۷ تا ۲۵۱)

امرت رائے نے اگر ان خطوط کو مرتب کرکے پیش کرنے کی کوشش کی ہوتی اور خطوط میں آئے ہوئے حوالوں کو محنت سے تلاش و جستجو کرکے فوٹ نوٹس بھی دیدیئے تو شاید انھیں سیدھا راستہ مل جاتا اور ان بنیادوں پر لکھی گئی سوانح بھی بے عیب ہوتی۔

پریم چند نے لیلیٰ کے خطوط جیسی کوئی چیز کبھی نہیں لکھی ایسا نہیں ہے کہ وہ لیلیٰ سے واقف نہ تھے۔ واقفیت تو اس حد تک تھی کہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۹ء کو انھوں نے دیا نرائن نگم کو لکھا تھا "اگر آپ لیلےٰ اور مجنوں کی مثنوی مجھے دیدیں تو لیلیٰ پر ایک مضمون لکھوں"۔ (چٹھی پتری جلد ۱ ص ۶) مضمون پریم چند نے لیلے ہی نہ لکھا ہو لیکن جنوری ۱۹۳۴ء کی "سرسوتی" میں لیلیٰ کی خوبصورتی اور آواز کے حسن کو شفق کی شگفتگی اور سرخی کا رنگ اور بلبلوں کی مدھر غنایت سے تشبیہہ دیکر اس کی مستی کے [illegible] ساتھ مست ضرور ہو رہے تھے۔ لیلیٰ کے نام میں کچھ کشش ہی ایسی ہے کہ جسے پسند آجائے اس کے لئے "سگ لیلیٰ" بھی تسلی کی کیفیت کے اظہار کا موضوع بن جاتا ہے۔ پریم چند بھلا کس طرح پیچھے رہتے۔ اردو ماہنامہ ادیب کے اپریل ۱۹۱۲ء کے شمارے میں "مگ لیلیٰ" نام کی ایک کہانی آخرکار چھپ ہی گئی۔ ویسے یہ کہانی ان کے تصورات کی اپج نہ تھی۔ بلکہ انگریزی کی کسی کہانی کی بنیاد پر لکھی گئی تھی۔ لیکن پریم چند کے پسندیدہ اسٹائل نے اسے جاندار بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی (منشی جی) قاضی عبدالغفار کی طرح "لیلیٰ کے خطوط" لکھ کر امر نہیں بنے۔ شاید انھیں اس لافانی شہرت [illegible] اردو کے [illegible] شاعر غالب [illegible] پریم چند [illegible] تھی۔ امتیاز علی تاج کو [illegible] ستمبر ۱۹۳۲ء [illegible] میں [illegible] لکھا بھی تھا "غالب کے [illegible] کا میں [illegible] عاشق ہوں" (پریم چند کے خطوط ص ۱۰۶)۔ لیکن ان کی چٹھیاں غالب کے خطوط کی طرح بھی رنگین، دلچسپ اور ادبی نہ بن سکیں۔ ویسے تو سب کچھ سادہ اور سپاٹ تھا جیسے وہ خود تھے۔ [illegible] کوری سادگی نہ تھی۔ اس میں ایک تیکھا پن تھا، [illegible] تھی۔ سپاٹ لفظوں میں بات سے بات پیدا کرنے کا فن تھا۔ [illegible] نفسیاتی پہلوؤں کو پکڑ کر انھیں استعمال کرنے کی صلاحیت تھی۔ اردو کے رسائل و اخبارات نے پریم چند کے نام کے ساتھ ایک [illegible] "فطرت نگار" جوڑ رکھا تھا۔ اور یہ سچ ہے کہ انسانی سرشت میں ان کی بڑی گہری نگاہ تھی۔ مکتوب الیہ کے نبض کی تیزی اور سستی کو وہ خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کے خطوط میں کھٹی میٹھی باتوں کے ساتھ ساتھ توازن باقی رکھنے کی پرزور خواہش بھی جھلکتی تھی۔

علامہ اقبال بھی پریم چند کو کچھ کم پسند نہ تھے۔ ۱۹۱۷ء میں پریم چند نے کہا بھی تھا "ہمیں ایسے شاعر چاہئیں جو حضرت اقبال کی طرح ہماری مری ہوئی ہڈیوں میں جان ڈال دیں"۔ مردہ ہڈیوں میں جان ڈالنا ایک سپاہی کی خصوصیت ہے۔ اقبال اور پریم چند دونوں ہی اپنے وقت کے سپاہی تھے۔ لیکن اقبال نے عطیہ سے محبت کرکے اسکی بے جان اور گمنام زندگی کو جس طرح زندگی دیدی پریم چند کسی کو نہ دے سکے۔ اقبال اور عطیہ کے عشقیہ خطوط اردو میں کافی چرچے کا موضوع بنے۔ لیکن پریم چند کی ایسی کوئی چٹھی ساہتیہ کاروں کی پکڑ میں نہ آسکی۔ [illegible]

مدن نے جب اس موضوع پر کچھ چھیڑ چھاڑ کی تو وہ صرف اتنا کہہ کر کہ ـــــ "کچھ بہت چھوٹے چھوٹے معاملے تھے جیسے کہ سب کے ہوتے ہیں لیکن میں انھیں پریم نہیں کہہ سکتا" صاف نکل گئے۔ نتیجہ میں اقبال کی طرح اُنکی پگڑی نہ اُچھالی جا سکی۔

پریم چند کی پہلی ملنے والی چٹھی ۱۹۰۵ء کی ہے یعنی اسوقت کی جب چھپن سالہ زندگی کا ۲۵ واں سال پختگی کی راہوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلی شادی کے بعد نو سال بیت چکے تھے۔ ادھر کچی عمر کی فصل پک کر پوری تیار ہو چکی تھی ابلی زندگی میں میاں بیوی کے تعلقات بھلے ہی تلخ رہے ہوں لیکن یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ دورِ شباب کا یہ زمانہ ماضی کے خطوط کی تہوں میں گم ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے رموا پور بستی میں یہ کہانی ابھی بھی کہیں دبی پڑی ہو۔

پریم چند کے خطوط کی ایک بڑی تعداد آج بھی ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہے۔ کچھ اخبار و رسائل میں کچھ یہاں وہاں لوگوں کے نجی کتب خانوں میں ضرورت ہے انھیں یکجا کرنے کی محنت اور لگن کے ساتھ چھان بین کرنے کی۔ مرتب اور ایڈٹ کرکے روشنی میں لانے کی جے ڈبلو کراس جیب اپنی بیوی جانح ایلیٹ کے خطوط کی بنیاد پر اس کی سوانح لکھی تو اپنی خواہش کے مطابق بنیادی چیزوں کو کاٹ چھانٹ کر ضروری اور پسندیدہ ترمیم کرکے کراؤن سائز کی تین جلدیں چھاپ دیں لیکن ہیٹ (Goz a/on S.) Haight نے رائل سائز سے بڑے سائز کی موٹی موٹی آٹھ جلدوں میں جب ایلیٹ کی چٹھیوں کو ایڈٹ کیا تو ڈبلو کراس کی ساری قلعی کھل گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امرت رائے نے بھی پریم چند کے سلسلہ میں اسکی تقلید کی ہے۔ ہاں اس بات کا شبہ ضرور ہوتا ہے کہ امرت رائے نے پریم چند کے کچھ خطوط دبا دیئے ہیں۔ ویسے تو "چٹھی پتری" کے پہلے حصہ میں صرف دیا نرائن نگم کے نام ہی پریم چند کی ۲۹۱ چٹھیاں جمع ہیں۔ لیکن اول تو انکی تعداد بہت ہی کم ہے دوسرے یہ کہ معاملہ یکطرفہ ہو کر رہ گیا ہے۔ نگم سے پریم چند کی آخیر وقت تک دوستی تھی۔ خط کتابت تھی ہر دو بار سے متعلق کڑوی میٹھی بحثیں تھیں۔ بگڑنے روٹھنے اور من جانے کے انداز تھے۔ فطری نرم و نازک اور درشت سبھی پہلو تھے۔ دستیاب خطوط میں کہیں کہیں اُنکی جھلک بھی نظر آجاتی ہے لیکن ان چٹھیوں کی عبارت کے بیچ بیچ سے جو اینٹیں نکل گئی ہیں انھیں فرضی مسالوں سے بھر کر چلتا ابھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ (چٹھی پتری جلد ۲ میں خط ۲۴ چھپتے چھپتے نکل گیا۔ مترجم) پھر نگم کی چھٹیوں کا پریم چند کے گھر میں ضائع ہو جانا انتہائی حیرت انگیز ہے۔ بنارسی داس چترویدی۔ امرناتھ جھا۔ جلیل احمد قدوائی۔ خواجہ غلام السیدین اور اشفاق حسین وغیرہ کے خطوط اگر محفوظ رہ سکتے ہیں تو نگم کے خطوط میں ہی ایسی کیا بات تھی کہ انھیں پھاڑ کر پھینک دیا گیا ؟ اور ایک بات تو طے ہے کہ اگر یہ چٹھیاں

۱۔ کہانی کے شروع میں چھپا ہوا اڈیٹوریل نوٹ قابل دید ہے ـــــ "یہ لیلی ولایتی مس لیلی تھی جسکی سادہ لوحی کو دیکھ کر اردو ہر برطرفی اپنی بناوٹی محبت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ خیریت یہ ہوئی کہ ان جیسا کتا موجود تھا جسکی بدولت کھری کھوٹی محبت کی جانچ ہو گئی۔ اور اُن کے رقیب مسٹر جان برٹن سے جو تم بیزار کی نوبت نہ آئی۔ اس دلچسپ قصہ کو منشی نواب رائے صاحب نے خاص ادیب کے لئے انگریزی سے لیا ہے۔" (دستاویز صـ۲۳۳)

جاتیں۔ آج پریم چند کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کھل کر سامنے آسکتی تھیں۔

خطوط کسی بھی انسان کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یعنی لکھنے والے کی زندگی انہیں پوری طرح جھلکتی ہے۔ اس کا اخلاق اس کی فطرت اس کے سوچنے کا انداز، اس کا ماحول اس کا زمانہ سبھی کچھ اسکے انداز سے نظر آجاتا ہے لیکن زندگی میں جتنا آدمی اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اُتنا ہی چھپاتا بھی ہے۔ اور چونکہ خطوط اسکی زندگی سے بہت ہی قریب ہوتے ہیں اس لئے اِن میں خود کو چھپانے کا رجحان بھی کم کم ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ بات چیت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں کچھ ظاہر کرنے سے پہلے کچھ سوچنے اور غور کرنے کا وقت بھی ہوتا ہے۔ منہ سے کہی ہوئی بات پرائی ہو جاتی ہے لیکن چٹھیاں ڈاک کے سپرد کرنے سے پہلے بار بار پھاڑی اور لکھی جا سکتی ہیں اس لئے ان میں تجربہ، غور و فکر، اخلاقی تصورات اور مطالعہ کی گہرائی کی کافی گنجائش ہوتی ہے ایک ہی وقت میں مختلف لوگوں کو لکھے گئے خطوط کو اگر یکجا کر کے دیکھا جائے تو ان میں کیا چھپایا جائے اور کیا ظاہر کیا جائے کا تضاد بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ پریم چند کے خطوط میں یہ گونج صاف سنائی دیتی ہے۔

پریم چند کے خطوط کو تین دوروں میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے پہلا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء تک دوسرا ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۵ء تک اور تیسرا ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک پہلے دور میں نگم اور سرور کے سوا کسی اور شخص کے نام پریم چند کا کوئی خط نہیں ملتا۔ جبکہ ایک بات صاف ہے کہ نوبت رائے نظر، پیارے لال شاکر، سرور جہان آبادی، وغیرہ تمام اردو دوستوں سے پریم چند کی خاصی گہری دوستی تھی۔ اور آپس میں خط و کتابت بھی تھی۔ ان عظیم المرتبت شخصیتوں کے علاوہ "آزاد" (لاہور) "چھتری متر" "پرتاپ"، "ہمدرد" "مخزن" وغیرہ کے ایڈیٹروں سے بھی پریم چند کے تعلقات استوار تھے۔ "آزاد" کے ستمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں "دنیا کا دربار" کے عنوان سے پریم چند کی ایک کہانی چھپی تھی "زمانہ" کے اگست ۱۹۰۹ء کے شمارے میں "ہماری قوت بیانیہ کا زوال" کے زیر عنوان پریم چند کا ایک مضمون بھی اسی وقت شائع ہوا تھا۔ اسی طرح "ہمدرد" کے ۱۷ جولائی ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں بھی "دارُوئے تلخ" کے عنوان سے ایک کہانی چھپی تھی۔ ان رسائل و اخبارات کی فائلیں اسوقت میرے سامنے نہیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان میں پریم چند کی اور کہانیاں اور مضامین بھی ملیں گے۔ ویسے یہ دونوں کہانیاں بھی جنکا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندی میں ابھی تک منتقل نہیں ہوسکی ہیں۔ اسی طرح اردو ماہنامہ "ادیب" الہ آباد میں بھی پریم چند کی ایسی مختلف کہانیاں ملتی ہیں۔ جنھیں ہندی میں شائع کرنا باقی ہے: "بڑی بہن" (جولائی ۱۹۱۱ء) "دھوکے کی ٹٹی" (نومبر ۱۹۱۲ء) اور "کیفر کردار" جولائی ۱۹۱۲ء اسی طرح کی کہانیاں ہیں۔ پریم چند کی اس دور کی چٹھیوں کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ اس سلسلے میں کچھ کامیابی بھی مل سکے گی۔ اس دور میں نگم کو لکھے گئے دو خط بھی مجھے ایسے ملے ہیں جنھیں امرت رائے کے ذریعہ اُردو میں یکجا کی گئی "چٹھی پتری" میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔ ستمبر ۱۹۱۰ء والی چٹھی مدن گوپال کے ذریعہ اُردو میں یکجا کئے گئے "پریم چند" کے خطوط سے لی گئی ہے اور جنوری ۱۹۱۵ء کا خط اردو ماہنامہ "زمانہ" سے۔

پریم چند کے دوسرے دَور کے خطوط کا کینوس خاصا پھیلا ہوا ہے۔ اس دَور میں پریم چند کی تخلیقات کا دائرہ صرف اُردو تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ ہندی میں بھی لکھ رہے

تھی۔ اور اُن کی شہرت کا اجالا پھیل کر ہمہ گیر ہوتا جا رہا تھا۔

[illegible] ہندی سے پریم چند کا تعلق بہت پُرانا تھا۔ اس کے [illegible] اُن کے دل میں گہری محبت بھی تھی۔ "ہم خرما و ہم ثواب" کی بنیاد پر لکھی گئی "پریما" اُنکی پہلی بنیادی ہندی تخلیق تھی۔ پھر ۱۹۱۷ء میں انھوں نے نگم سے ہندی پرچہ نکالنے کی بھی بات کی تھی (پریم چند کے خطوط ص ۲۴)۔ "پرتاپ" کے وجے دشمی نمبر کے لئے ۱۹۱۴ء میں ایک کہانی بھی بھیجی تھی اور ستمبر ۱۹۱۵ء تک انھیں اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ "اُردو لکھنے میں کسی ہندو کو فائدہ ہوا ہے جو مجھے ہو جائے گا" (چٹھی پتری جلد اول ص ۴۶) لیکن ان سب حقائق کے باوجود قلمکار پریم چند کا پہلا دور اُردو کے دائرے کے اندر اندر چھٹپٹاتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسرے دور میں آکر پریم چند کا تعارف ایک دوسری ہی دنیا سے ہوا جہاں مہن دویدی سے قلبی لگاؤ پیدا ہوا، پوہار سے محبت اور ہمت افزائی ملی۔ گنیش شنکر ودیارتھی سے اُمنگ اور حوصلہ ملا۔ "مریادا"۔ "ابھیودے"، "پرتاپ"، "سوادیش"، "پرتبھا"، "بھارت متر"، "سرسوتی"، "پربھا"، "سنسار"، "شکلا"، "سوارتھ"، "مادھوری"، "چاند" ایک ایک کر کے سبھی سے جان پہچان ہوئی۔ دوستی کے دائرے بھی وسیع ہوئے۔ اُردو ہندی کے میل جول سے تحریر میں کچھ اور بھی نکھار آگیا [illegible] ماہنامہ "کہکشاں" کے اڈیٹر امتیاز علی تاج تو اپنے [illegible] گہرے دوست بن گئے۔ پھر کیا تھا "حج اکبر" (نومبر [illegible])، "بینک کا دیوالہ" (فروری، مارچ ۱۹۲۰ء)، "خواب [illegible]" [illegible] (اگست ۱۹۱۹ء)، "دو [illegible]" [illegible] [illegible] (جون ۱۹۱۹ء)، "زنجیر [illegible]" [illegible] "اصلاح" [illegible] ۱۹۲۰ء)، "بانسری" [illegible] ۱۹۲۰ء)، "بوڑھی کاکی" (جولائی ۱۹۲۱ء) وغیرہ ڈھیر ساری کہانیاں "کہکشاں" میں چھپیں۔ ان میں "بانسری" ایک ایسی کہانی ہے جو ابتک ہندی میں منتقل نہیں ہو سکی ہے۔ تاج کی ہی سفارش پر ہفتہ وار "تہذیب نسواں" لاہور کے لئے بھی پریم چند نے کئی کہانیاں لکھیں جنمیں "جنجال" (۲۴ اگست ۱۹۱۸ء) اور "حالیہ تقلب" (۲۴ ستمبر ۱۹۲۰ء) دراصل ایسی کہانیاں ہیں جو ہندی میں آج تک شائع نہیں ہوئیں۔

تاج کو لکھی گئی پریم چند کی چٹھیاں "نقوش" لاہور کے مکتوبات نمبر میں چھپ گئی تھیں۔ اس لئے امرت رائے کو ان خطوط کے مرتب کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن تاج کے علاوہ پریم چند کی خط وکتابت "صبح اُمید" کے اڈیٹر پنڈت برج نرائن چکبست، "الناظر" کے اڈیٹر ظفر الملک، "العصر" کے اڈیٹر پیارے لال شاکر، "ہزار داستان" کے اڈیٹر حکیم احمد شجاع، "ہمایوں" کے اڈیٹر بشیر احمد اور "تمدن" کے اڈیٹر محمد عباس حسین سے بھی تھی لیکن اس دور کے خطوط میں نگم اور تاج کے علاوہ منیجر زمانہ پریس مہتاب رائے اور شیو پوجن سہائے کو لکھی گئی چٹھیاں ہی "چٹھی پتری" میں جگہ پا سکی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی چٹھیوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ابھی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ مجھے نگم کے نام تین خطوط ایسے ملے ہیں جو "چٹھی پتری" میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ان میں فروری ۱۹۱۶ء کا خط میں نے "زمانہ" کے فائل سے حاصل کیا ہے۔

"تمدن" کے جنوری ۱۹۲۰ء کے شمارے میں پریم چند کا ایک بہت ہی اہم خط ملنے کی اُمید ہے۔ "تمدن" کے اڈیٹر نے نومبر ۱۹۱۹ء کے شمارے میں "بانی بیوہ" کے عنوان سے ایک کہانی شائع کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مسٹر پریم چند ہمارے نسبت شاید یہ بہتر طریقے سے جانتے ہونگے کہ ناول اور افسانے کی تعریف یہ ہے کہ وہ واقعہ معلوم ہو۔ "خون حرمت" اس میزان پر پورا نہیں اترتا بلکہ وہ اس متعصبانہ سلسلے کی دوبارہ بنیاد ڈالتا ہے جو ہندو مسلمانوں میں ایک دوسری قوم کے کیرکٹروں کی روشنی میں پیش کرنے کے متعلق رائج ہے کاش منشی پریم چند "خون حرمت" نہ لکھتے۔"

پریم چند نے اسی الزام کا جواب دیا تھا۔[۵]

پہلے دہے کے پریم چند خالص آریہ سماجی انداز فکر کے حامل ادیب ہیں۔ ہندو تہذیب اور ہندو دیت کے لئے ان میں گہری عقیدت ہے لیکن انکا ہندو دیت سے پریم سناتن دھرمیوں کے انداز فکر سے میل نہیں کھاتا ہے ۱۹۱۱ء کی ایک چٹھی میں انھوں نے نگم کو ایک ہندی ہفتہ وار نکالنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ اُن کا یقین تھا کہ "ایک ہندو پرچہ جسکی پالیسی ہندو ہو اور جو اچھا کاغذ اچھی چھپائی دے سکے۔ اسکے لئے کافی گنجائش ہے۔" انھوں نے ان لفظوں میں لکھا تھا "اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا۔ اور اسکی کوشش فضول ہے" (پریم چند کے خطوط ص ۴۵) انھیں نوبت رائے نظر سے شکایت تھی کہ انھوں نے اپنے "رسالے کو بالکل اسلامی ڈھنگ پر چلانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔"

(پریم چند کے خطوط ص ۳۹)

لیکن دوسرے دہے میں آکر پریم چند کے خیالات میں کافی توازن آچکا تھا۔ وجہہ شاید یہ تھی کہ پہلے دہے کے پریم چند کے تعلقات صرف ہندو ادیبوں اور ناشروں سے تھے۔ جبکہ دوسرے دہے کے پریم چند ڈاکٹر اقبال۔ امتیاز علی تاج اور اشتیاق حسین۔ ظفر الملک۔ مولانا محمد علی وغیرہ سے پوری طرح واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ اور ان سے متاثر بھی تھے۔ "تحفۃ الزبال" کے زیر عنوان ایک مضمون [illegible] اسی دہے میں لکھا گیا۔ "حضرت علی" اور نبی کا نیتی تر داہ" نام کی کہانیاں اسی دور میں لکھی گئیں۔ "کربلا ناٹک" پریم چند کے قلم سے اسی دہے میں نکلا۔ پریم چند کے اس دور کے خطوط میں بھی میل ملاپ کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ پریم چند کی اس دہے کی کئی ایسی کہانیاں بھی ہیں جن کے حوالے "چٹھی پتری" میں ملتے ہیں لیکن یہ کہانیاں ہندی میں ابھی تک شائع نہیں ہو پائی ہیں۔ "روئے سیاہ" (صبح امید نومبر ۱۹۲۰ء) "روح حیات" (زمانہ جنوری ۱۹۲۱ء) "یاد نہیں آتا" "پیمان وفا" "رشتے آرزو" "مسرت حیات" ایسی کہانیاں ہیں جنکے بارے میں پتہ نہیں کہاں چھپیں یہ بھی طئے ہے کہ یہ کہانیاں اب تک ہندی میں نہیں چھپ سکی ہیں۔

پریم چند کی "چٹھی پتری" کا تیسرا دہا اور بھی اہم ہے اس دہے میں ہندی اُردو کے ادیبوں صحافیوں اور فلم ڈائرکٹروں سے پریم چند کے تعلقات قائم ہوئے جے نیندر۔ بنارسی داس چترویدی رام چندر ٹنڈن۔ ونود شنکر ویاس۔ ویشو سنگھ۔ اوشا دیوی مصرا۔ کنہیالال منشی۔ مہاتما گاندھی۔ کلکا۔ کانیلز کیشورام سبھروال۔ سدرگر و شرن اوستھی۔ اندرناتھ مدان بھرت آنند کوسلیا [illegible] مانک لال جوشی۔ امرناتھ جھا۔ سدرشن وغیرہ تو پریم چند کے قریب آئے ہی۔ ڈاکٹر عبدالحق۔ اختر حسین رائے پوری پروفیسر تاجور۔ رشید احمد صدیقی۔ محی الدین۔ قادری زور۔ خواجہ غلام السیدین۔ عبدالماجد دریابادی۔ سہیل عظیم آبادی۔ جلیل احمد قدوائی۔ پروفیسر محمد عاقل۔ سجاد ظہیر۔ احمد علی وغیرہ اُردو کے ممتاز ادیبوں کو قریب سے دیکھنے اور جاننے

کا بھی موقع ملا۔

پریم چند کے لئے یہ دہا ابتلا و آزمائش اور سخت ترین جد و جہد کا تھا۔ پہلے ہندی کے ولشنو شیھی (وشنو کے ماننے والے) چھٹ بھیوں نے قلم کی نوک چبھو چبھو کر پریم چند کی ساری شخصیت کو چھلنی کرنے کی کوشش کی اور ابھی اس سے پوری طرح اُبھر بھی نہیں پائے تھے کہ اُردو قلمکاروں کے اسلامی نقاب کے اندر سے نوکیلے تیر ادر بھالے نکل نکل کر پریم چند کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن دونوں حملوں میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ ایک میں پریم چند کی بڑائی اور بنیادی تخلیق کاری ہی سے بالکل انکار کیا جا رہا تھا۔ جبکہ دوسری مخالفت میں پریم چند کے ہندی سے نام نہاد طرفداری نہ ردینے پر طعن و تشنیع کیا جا رہا تھا۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پریم چند نے کسی بھی موقع پر اپنی خود اعتمادی کو نہیں کھویا۔ دھیرے۔ دھیرے یہ بادل چھٹ گئے اور آسمان ادب پر پریم چند کا نام اور بھی درخشاں ہو کر اپنی جگہ پر مستحکم ہو گیا۔ اُردو ادیبوں کی خوشی کے لئے پریم چند نے اپنے ہندی پریم کو کبھی کم کر کے دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں وہ اس غلط فہمی کو یقیناً دُور کرنا چاہتے تھے کہ اب وہ صرف ہندی کے قلم کار بن کر رہ گئے ہیں اُردو ہندی کے مسئلہ پر جتنی سنجیدگی سے پریم چند نے غور کیا اس زمانہ کے کم ہی لکھنے والے نے اسطرف اتنا دھیان دیا۔ امرت رائے نے پروفیسر محمد عاقل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اُردو ماہنامہ "ساقی" دہلی میں پریم چند پر جب یہ تنقید چھپی کہ وہ اُردو کے لئے مرحوم ہو چکے ہیں تو پریم چند نے ساقی کے ایڈیٹر کو لکھا کہ ــــ "میں اُردو کے لئے نہ صرف زندہ ہوں بلکہ زیادہ زوروں سے جی رہا ہوں"۔ (امرت رائے۔ "پریم چند قلم کا سپاہی" ص ۵۹۹)

پہلی بات تو یہ ہے کہ "ساقی" کے اڈیٹر کے نام پریم چند کا یہ خط کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا پھر "ساقی" میں ایسا اس قسم کی تنقید کبھی چھپی تھی اس پر بھی مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے وجہہ یہ ہے کہ ساقی کی پوری فائل اسوقت میرے سامنے ہے۔ اور کم سے کم ایسی کوئی تنقید میری نظر سے نہیں گزری۔

پریم چند کے اس دور کے متعدد خطوط مجھے ملے جن سے پریم چند کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ احمد علی، سجاد ظہیر حکیم محمد یوسف حسن (اڈیٹر نیرنگ خیال) ڈاکٹر عبد الحق۔ بھگوتی پرساد واجپئی پروفیسر تا جور اور مہر لال جیا کو لکھے گئے خطوط کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ احمد علی اور سجاد ظہیر کو لکھے گئے خطوط کو میں نے "نیا ادب" کے جنوری فروری مارچ ۱۹۳۹ء کے شمارے سے ہندی رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔ اڈیٹر نیرنگ خیال کو لکھا گیا خط "نیرنگ خیال" کے دسمبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ عبد الحق دلی ٹیچی "فروغ اُردو" کے اُردو مہم نمبر سے لی گئی ہے۔ بھگوتی پرساد واجپئی والا خط "پریم چند کے خطوط" سے منتقل کیا گیا ہے۔

پریم چند کے تیسرے دور کے خطوط میں زبان اور ادب سے متعلق اُنکا زاویہ نظر بہت کھل کر سامنے آیا ہے۔ خاص طور پر زندگی کے آخری سال انجمن ترقی پسند مصنفین کے پُر زور حامی دکھائی دینے لگے۔ ۱۴ فروری ۱۹۳۶ء کے خط میں انھوں نے حسرت موہانی کو لکھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اغراض و مقاصد کے مطابق ایک نیا رسالہ نکالنے کے ارادے کی اطلاع بھی دی تھی مگر شرط یہ تھی ــــــــ کہ اگر اچھا

ہوگیا" (پریم چند کے خطوط صـ۲۸۶) اور وہ اچھے نہ ہو سکے اس لئے یہ خواب ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو انہیں کے ساتھ چلا گیا ـــ (بہ شکریہ ہندی ماہنامہ " دستاویز" گورکھپور پریم چند نمبر اپریل۔ جولائی ۱۹۸۰ء ۔

نوٹ از مترجم : ـ

" چھٹی پتری " کے مرتب کرنے والے اکیلے امرت رائے ہی نہیں بلکہ مدن گوپال بھی ہیں۔ اس کے پہلے حصے میں جو صرف منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ مدن گوپال کا نام بھی چھپا ہوا ہے یا دو سطروں کا دیباچہ لکھ کر انھوں نے امرت رائے کی ہاں میں ہاں بھی ملائی ہے۔ لیکن جلد دوم سے اُنکا نام غائب ہے۔ حالانکہ اُن کے جمع کئے ہوئے خطوط اس میں بھی شامل ہیں۔ لیکن صرف بدنامی ہی ان کے حصہ میں آئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جلد دوم سے خط نمبر ۲۴ بنام جے نیندر کمار پروف پڑھتے پڑھتے کیوں غائب ہوگیا ؟ اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے ؟ اور ستمبر ۱۹۱۶ء والا منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھا ہوا خط " چھٹی پتری " جلد ۱ میں کیوں نہیں ہے۔ اس کے ذمہ دار کون ہیں امرت رائے یا مدن گوپال ؟

صـ۱ یہ صحیح نہیں ہے کہ " پریما " " ہم خرما و ہم ثواب " کی بنیاد پر لکھی گئی تھی۔ " پریما " پہلے چھپی " ہم خرما و ہم ثواب " بعد میں " پریما " کا مسودہ منشی پریم چند نے منشی دیا نرائن نگم کو ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء کو دیکھنے اور کوئی ناشر مہیا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اُردو چھپائی کا کام تو منشی دیا نرائن نگم خود کر سکتے تھے (چھٹی پتری جلد ۱ خط ۲) اس کی تصدیق نگم ہی کے نام بیس سال بعد لکھے گئے خط مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۲۶ء سے ہو جاتی ہے ؛ ۱۹۰۷ء میں ایک ہندی ناول " پریما " لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا "(پریم چند کے خطوط صـ۱۷۵) پھر ۸ جولائی ۱۹۳۰ء کو جناب دنو دشنکر ویاس کو لکھتے ہیں " پہلے ۱۹۰۱ء میں پریما لکھی " (پریم چند کے خطوط صـ۱۸۸) اس طرح یہ بات طے سمجھی جانی چاہیے کہ منشی جی نے ۱۹۰۱ء سے " پریما " لکھنے کی کوشش کی تھی۔ جو پہلے " اسرار معابد " کے نام بنارس کے ہفتہ وار " آوازہ خلق " میں ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے قسطوار شائع ہونا شروع ہوا۔ پھر اُس نے " کشنا " کا روپ دھار لیا جو نایاب ہے، اسی کا تیسرا جنم " پریما " کے نام سے ہوا اگر میری یادداشت غلطی نہیں کر رہی ہے تو " اسرار معابد " اور " پریما " کے کرداروں کے نام بھی یکساں ہیں۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ " اسرار معابد " کے بارے میں پریم چند نے کبھی کچھ نہیں لکھا " کشنا " کے بارے میں یہ طے کرنا ابھی باقی ہے کہ یہ اُردو میں چھپا تھا یا ہندی میں۔

صـ۲ منشی پریم چند اسی طرح کے چلتے اُردو والوں کو بلیک میل کرنے کے لئے لکھا کرتے تھے اُردو والے خصوصاً مسلم رسائل و اخبارات انھیں ہندو ہو کر اُردو میں لکھنے کی بڑی قیمت دیا کرتے تھے۔ امتیاز علی تاج منشی دیا نرائن نگم سے زیادہ پیسے دیتے تھے۔ انھیں کی لاگ ڈانٹ پر نگم سے سودے بازی بھی ہوتی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اُنکے گھٹیا درجے کے افسانوں کی قیمت ایک اشرفی (امرت رائے) یا تیس روپے (دیا نرائن نگم) دیتے تھے جبکہ اس وقت منشی دیا نرائن نگم صرف پانچ یا چھ روپے فی افسانہ دیا کرتے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

پریم چند محقق کی عدالت میں

ہماری زبان کے اس شمارے میں پروفیسر مسعود حسین کا ایک مقالہ گؤدان یا گئودان شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مقالے میں مسعود صاحب نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے کہ گئودان اور دوسرے ناول پریم چند نے براہ راست اُردو میں لکھے تھے یا پہلے ہندی میں لکھے اور پھر اُردو میں اِن کا ترجمہ کرایا آج سے تقریباً دس سال پہلے ہندی اور اُردو میں پہلی بار یہ مسئلہ مسعود صاحب نے ہماری زبان کے اِن ہی صفحات پر اٹھایا تھا۔ اس وقت یہ بات صرف گئودان تک محدود تھی۔ اور مسعود صاحب کا خیال تھا کہ گئودان کا ہندی سے اُردو میں ترجمہ تو کسی اور نے کیا لیکن اس ترجمہ پر نظرِ ثانی خود پریم چند نے کی ہے مسعود صاحب کی اس تحقیق کو بعض نقادوں نے پسند نہیں کیا انھوں نے اس حق میں ملنے والے شواہد کی تردید کی۔ اب مسئلہ گئودان سے بڑھ کر چوگانِ ہستی میدانِ عمل، گوشۂ عافیت اور نرملا تک پہونچ گیا ہے

مسعود صاحب نے ایک ایسی شہادت پیش کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام ناول پہلے ہندی میں لکھے گئے اور پھر اُردو میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔ یقیناً ابھی اس سلسلے میں مزید شہادتوں کی ضرورت ہے، لیکن مسعود صاحب نے ایک نیا اور اہم راستہ ضرور دکھایا ہے۔ ممکن ہے کہ پریم چند کے بعض چاہنے والوں کو یہ بحث بے معنی اور بے مقصد لگے۔ کچھ لوگ مسعود صاحب کی نیت پر بھی شبہ کر سکتے ہیں لیکن جن حضرات نے مسعود صاحب کی کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں وہ ہمارے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مسعود صاحب ایک سنجیدہ ایماندار اور غیر جانبدار نقاد اور محقق ہیں پریم چند کے سلسلے میں ان کی اس تحقیق پر سنجیدگی سے غور کرنے اور مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرض کیجئے پریم چند

نے ایک لفظ بھی اُردو میں نہیں لکھا ان کا تمام کام ہندی سے اُردو میں منتقل ہوا ہے تب بھی پریم چند کے فن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بالکل یہی ہمارا خیال ہے لیکن ہمارے دلائل مختلف ہیں۔ ہمارا کہنا ہے کہ اگر پریم چند نے اپنے بعض ناول اور افسانے پہلے ہندی میں لکھے اور پھر سحر ہنگامی یا کسی اور سے اُردو میں ترجمے کرائے تو فن تو پریم چند کا ہے لیکن زبان مترجم کی اور اس لحاظ سے ہمیں پریم چند کے پورے فن کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ تحقیق میں سب سے زیادہ مشکل کام سچ بولنا ہے۔ ہم جب ایسے لوگوں کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں جن سے ہمیں عقیدت ہو تو ان کے بارے میں کچھ ایسے حقائق بھی ملتے ہیں جن کے تحریر کرنے میں ہمارا قلم جھجکنے لگتا ہے۔ اپنے بزرگوں کے بارے میں سب سے بڑا انصاف یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے متعلق جو حقائق دستیاب ہوں انھیں ایمانداری سے نئی نسل کے سامنے پیش کر دیں۔ غالب کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سے ایسے حقائق ہیں جو بقول رشید احمد صدیقی "اگر ہمارے سامنے نہ آتے تو اچھا تھا"۔ ان حقائق کی روشنی میں انسان کی حیثیت سے جو غالب کی تصویر بنتی ہے وہ بہت اچھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود غالب کی شخصیت اور فن کی عظمت ہمارے دل و دماغ پر ثبت ہے۔ پریم چند کے بارے میں ہمارے سامنے کوئی ایسی حقیقت نہیں آئی۔ جو شرمناک ہو اگر انھوں نے اپنے کچھ ناول اُردو میں ترجمہ کرائے تو اس سے پریم چند اُردو زبان اور اُردو میں ناول کے فن پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہاں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اب نقادوں کو پریم چند کی زبان اور بیان کے بارے میں رائے بدلنی ہوگی۔ اسی طرح اگر پریم چند نے کچھ ایسے بیان دیئے ہیں جن سے فرقہ واریت کی بو آتی ہے تو ان کے ایسے بیانات اور تحریریں بھی موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی تھے اگر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف کچھ باتیں کہی ہیں تو ہندو رسم و رواج کے خلاف بھی اُن کی تحریروں میں کافی مواد موجود ہے ہمیں اس مسئلے کو بھی اس عہد کے پورے سیاسی اور سماجی تناظر اور تمام بیانات اور تحریروں کو ان کے سیاق و سباق میں دیکھنا ہوگا۔ ایسی تحقیق سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اس طرح کے کام کرنے والوں کی ہمت افزائی اور مدد کرنی چاہیئے تاکہ حقائق ہمارے سامنے آسکیں۔

ہم پروفیسر مسعود حسین کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر اپنے دریافت کئے ہوئے حقائق پیش کر دیئے ہیں اب اس سلسلے میں مزید تحقیق ہی ان کی تائید یا تردید کرے گی۔ ●●

بسلسلہ مضمون صفحہ ۱۵ (ہندی میں پریم چند کے خطوط...)

؎ ملاحظہ ہو خط بنام منشی دیا نرائن نگم مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء (پریم چند کے خطوط ص ۲۶-۲۷)

؎ منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کی نشاندہی ... ہوس" کو پڑھنے کے بعد امتیاز علی تاج نے بھی کی تھی تاج کا خط تو "مرتبین" "چھٹی پتری" کی سنسرشپ کی نذر ہو گیا مگر منشی پریم چند کی صفائی اس مجبوری میں چھپ ... ایک جواب" گلکوش کے خطوط نمبر میں شائع ہو چکا ہے

پروفیسر احتشام حسین نمبر

سید احتشام حسین کی شخصیت اور انکی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے یہ نمبر خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

قیمت : ۱۰۰ روپیے

آمنہ مشفق (کراچی یونیورسٹی)

مرحوم مولانا عرشی
شمع بکف قبیلے کی آبرو

بعد نماز عصر ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کو کتب خانہ رام پور کے احاطے میں ایک ایسے بزرگ کو سپرد خاک کیا گیا تھا جس نے اپنی ساری زندگی تاریک گوشوں میں شمعیں روشن کرنے میں گزار دی۔ تحقیق دراصل تاریکی میں شمع روشن کرنے کا نام ہے اور مولانا امتیاز علی عرشی اسی شمع بکف قبیلے کی آبرو تھے۔ انھوں نے تقریباً نصف صدی تک جس لگن اور ذوق و شوق سے علمی و تحقیقی کام کیا اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود خاں شیرانی اور قاضی عبدالودود بس یہ تین چار نام ہیں جن کے ساتھ مولانا امتیاز علی عرشی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ان سب ناموں سے بڑے بڑے کام وابستہ ہیں لیکن ان میں مولانا عرشی کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کا کام بیک وقت چار زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں ہے اور انھیں زبان، لغات، ادب، تاریخ، اور مذہبیات سے برابر کی دلچسپی تھی اور ان علوم کے متعدد ذیلی شعبوں میں انھوں نے اپنی علمی بصیرت کے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

مولانا عرشی کا خاندانی تعلق پاکستان کے علاقے سوات سے اور یہاں کے ممتاز قبیلہ حاجی خیل سے تھا۔ ان کے خاندان کے کچھ افراد اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف میں ترک وطن کر کے ہندوستان پہونچے۔ اور رام پور میں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مولانا عرشی کے دادا نے اس آبائی پیشے کو خیرباد کہہ کر علم کی طرف توجہ کی اور مولانا محمد اکبر علی خاں محدث کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر محمد مختار علی خاں تھے جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ویٹرنری کالج سے امتیاز کے ساتھ سند حاصل کی تھی۔ یہ اپنے باپ کی طرح علوم اسلامی کے عالم و فاضل تو نہ تھے لیکن علم سے شغف ضرور رکھتے تھے۔ انھیں کے ہاں ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء کو ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محمد امتیاز علی خاں رکھا گیا اور یہی آگے چل کر مولانا عرشی کے نام سے علمی دنیا میں مشہور ہوئے۔

مولانا عرشی نے مروجہ مشرقی تعلیم رام پور ہی میں حاصل

کی ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی سال لاہور چلے آئے۔ یہاں انھوں نے اورنٹیل کالج لاہور میں مولوی فاضل کی سند کے لئے داخلہ لے لیا۔ مولانا عرشی سال بھر لاہور میں رہے اور مولوی فاضل کی سند حاصل کرنے کے بعد رام پور واپس چلے گئے۔ ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی ہی سے فارسی کی اعلیٰ سند منشی فاضل بھی کرلی۔ یہاں کے نصاب کی تکمیل کے بعد انھوں نے رام پور کے شہرہ آفاق مدرسہ عالیہ (اورنٹیل کالج) کی اعلیٰ سند کے درجہ میں داخلہ لے کر ایک سال گزارا اور مدرسۂ عالیہ کی درسیات کی تکمیل کی۔ عربی و فارسی کی تعلیم کے ساتھ مولانا عرشی نے انگریزی کا مطالعہ بھی جاری رکھا اور اس میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ بعد میں انگریزی میں بھی تصنیف وتالیف کا کام کیا۔

جولائی ۱۹۳۲ء میں مولانا عرشی رام پور کے ریاستی کتب خانے کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے۔ یہ کتب خانہ برصغیر پاک و ہند کے عظیم کتب خانوں میں سے ہے۔ یہاں اردو، فارسی اور عربی کی قلمی کتابوں کا بہت بڑا اور نادر ذخیرہ ہے مطبوعہ کتابیں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ مولانا عرشی آخر وقت تک کتب خانے کے ناظم و نگراں کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ کتب خانے سے وابستگی کی نصف صدی ہی دراصل مولانا عرشی کی علمی سرگرمیوں کا دوسرا نام ہے۔ اس مدت میں انھوں نے نہ صرف کتب خانے کی کتابوں کی حفاظت کے لئے انتھک کوشش [illegible] بلکہ کتابوں سے استفادہ کرنے کے لئے اہل علم [illegible] کی سہولتیں بھی فراہم کیں۔ جس کے نتیجے میں بہت سے اعلیٰ پائے کے علمی و تحقیقی کام منظر عام پر آسکے۔

اس کتب خانے کا سب سے بڑا اثاثہ گو اس کی کتابیں ہیں لیکن مولانا عرشی کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اس کتب خانے کی تمام قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی جامع فہرستیں تیار کردیں جن میں سے اردو عربی مخطوطات کی سات جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور دنیا بھر میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں انھیں کے ذریعہ سے کتب خانہ رام پور بین الاقوامی شہرت حاصل کرسکا۔

مقالات: جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے مولانا عرشی کی تصنیفات اور مرتبات چار زبانوں میں ہیں جن کی مجموعی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب شائع ہوچکی ہیں اور باقی نصف غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سو کے قریب انھوں نے اعلیٰ پائے کے علمی، ادبی تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں ان کے مقالات کا صرف ایک مجموعہ "مقالات عرشی" کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ جس میں پندرہ مقالات ہیں۔ باقی مقالات تاحال کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔

خطوط: مولانا عرشی کے خطوط بھی علمی و ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن میں علمی، ادبی نکات کا ایک خزانہ محفوظ ہے۔ ان میں سے بہت سے خطوط مختلف رسائل میں شائع بھی ہوچکے ہیں لیکن ان کا کوئی مجموعہ تاحال شائع نہیں ہوا۔ مولانا مرحوم کے فرزند اکبر علی خاں عرشی زادہ نے جو خود ممتاز ادیب اور محقق ہیں مولانا کے خطوط بڑی تعداد میں جمع کر رکھے ہیں اور وہ انھیں کتابی صورت میں

شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے بھی مولانا عرشی کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے یوں تو اس میدان میں بہت سے اہلِ قلم نے دادِ تحقیق دی ہے لیکن مولانا عرشی کا کام کیفیت، کمیت، نوعیت، و افادیت ہر اعتبار سے منفرد ہے۔

مکاتیب غالب غالب سے ان کی دلچسپی کا آغاز کتب خانۂ رامپور سے وابستگی کے بعد ہوا۔ ریاست کے محکمۂ دارالانشا (ریکارڈ آفس) میں نوابان رام پور، یوسف علی خاں اور ان کے بیٹے کلب علی خاں کے نام غالب کے خطوط کا ذخیرہ موجود تھا۔ مولانا عرشی نے ان خطوط کو مفصل حواشی کے ساتھ مکاتیب غالب کے نام سے مرتب کیا اور ایک طویل مقدمہ لکھا جو بجائے خود غالب کی مکتوب نگاری کے بارے میں ایک اعلیٰ پائے کی کتاب کا درجہ رکھتا ہے یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی اور اس نے ایسا قبول عام پایا کہ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

انتخاب غالب ۱۹۴۳ء میں مولانا عرشی نے انتخاب غالب مرتب کیا۔ یہ غالب کے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب ہے جو خود غالب نے کیا تھا۔ اور نواب کلب علی خاں کو بھیجا تھا مولانا عرشی نے اسے کتب خانے کے ردی گھر سے ڈھونڈ نکالا اور حُسن ترتیب کے ساتھ حسن طباعت کا نمونہ بنا کر شائع کر دیا۔

فرہنگ غالب فرہنگ غالب کے نام سے مولانا عرشی نے ۱۹۴۷ء میں ایک کتاب شائع کی جو بیک وقت غالب کی تصنیف اور مولانا عرشی کی تالیف ہے۔ غالب کو فن لغت سے گہری دلچسپی تھی ان کی تحریروں میں بے شمار الفاظ کے معانی سے بحث کی گئی ہے مولانا عرشی نے اس نوعیت کی تمام معلومات کو یکجا کر دیا ہے اور اس طرح غالب کی ایک نئی تصنیف وجود میں آ گئی۔

نسخۂ عرشی مولانا عرشی کا مرتبہ غالب کا اُردو دیوان جو نسخۂ عرشی کے نام سے شہرت رکھتا ہے اس اعتبار سے بڑا اہم کارنامہ ہے کہ اس میں غالب کا سارا اُردو کلام تاریخی ترتیب سے جمع کیا گیا ہے اس میں پہلی بار متن کی صحت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو اختلافات ملتے ہیں ان کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ کلیات کے آخر میں اشاریہ بھی شامل ہے جس کی مدد سے مطلوبہ اشعار کو بآسانی پایا جا سکتا ہے۔

غالب پر مقالات مولانا عرشی نے غالب پر بیسوں مقالات بھی لکھے ہیں جنھیں چار پانچ جلدوں میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ان مقالات سے غالب کی زندگی اور فکر و فن کے بہت سے تاریک گوشے اُجاگر ہوتے ہیں۔

اس مختصر تحریر میں مولانا عرشی کی تمام تصنیفات و تالیفات اور مرتبات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم ان میں سے چند خاص خاص کا تذکرہ کیے بغیر یہ مضمون تشنہ اور نامکمل رہ جائے گا۔

نادرات شاہی یہ مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی کے فارسی ہندی اور اُردو کلام

کا مجموعہ ہے جو مولانا نے ۱۹۴۴ء میں مرتب کرکے شائع کیا۔

۲۔ **اُردو اور افغان** ــــ یہ اُردو اور پشتو کے باہمی تعلق کے بارے میں اپنے موضوع پر پہلی اور جامع کتاب ہے اسے سنہ ۱۹۶۰ء میں پشاور یونیورسٹی کے ذیلی ادارے پشتو اکیڈیمی پشاور نے شائع کیا۔

۳۔ **دستور الفصاحت** ــــ حکیم سید احمد علی یکتا لکھنوی کی تصنیف کا آخری باب جو شعرا کے حالات کے بارے میں ہے۔ اسے مولانا [illegible] نے حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کے مقدمے میں شعرائے اُردو کے اہم تذکروں پر پہلی بار جامع بحث کی گئی ہے یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

۴۔ **وقائع عالم شاہی** ــــ یہ کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ ہے جو شاہ عالم ثانی کے لشکر کا ایک بڑا عہدہ دار تھا۔ شاہ عالم نے مرہٹوں پر حملہ کیا تو فراقی لشکر میں شامل تھا۔ یہ اس زمانہ کا روزنامچہ ہے۔ مولانا عرشی نے ۱۹۴۹ء میں اسے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مرتب اور شائع کیا۔

۵۔ **تاریخ محمدی** ــــ مرزا محمد حارثی بدخشی کی تصنیف ہے جس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر مصنف کے زمانۂ حیات تک کے مشاہیر کے سنین وفات کی تحقیق کی گئی ہے۔ مولانا عرشی نے اس کے بارھویں صدی سے متعلق حصّے کو مرتب کیا ہے یہ کتاب سنہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

۶۔ **تاریخ اکبری** ــــ یہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے جو اکبر کے ایک درباری عارف قندہاری نے لکھی تھی اسی لئے یہ تاریخ قندہاری بھی کہی جاتی ہے۔ مولانا عرشی نے ۱۹۶۲ء میں اسے مرتب اور شائع کیا۔

۷۔ **فہرست مخطوطات**۔ اُردو یہ کتب خانہ رامپور کے اُردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست کی پہلی جلد ہے جس میں ۱۲۱۰ نادر قلمی کتابوں سے حاصل تعارف کرایا گیا ہے۔

فصل الخطاب ــــ مولانا عرشی کی غیر مطبوعہ کتابوں میں سب سے اہم فصل الخطاب لعمر ابن الخطاب ہے یہ کتاب عربی میں ہے اور اس میں حضرت عمر کے حالاتِ زندگی، خطبات، مکاتیب اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ ایک طرح یہ مولانا عرشی کی مسازی زندگی کا حاصل ہے۔ اپنی علمی زندگی کا آغاز انھوں نے اسی کتاب سے ۱۹۲۸ء میں کیا تھا اور آخر وقت تک وہ اس پر کام کرتے رہے۔

ہمارے محققوں میں مولانا عرشی کو کئی اعتبار سے منفرد مقام حاصل ہے اول تو یہ کہ ترتیب و تدوین کا جو اعلیٰ معیار انھوں نے قائم کیا وہ ان سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔ صحتِ متن کے ساتھ متعلقاتِ متن پر بھی ان کی گہری نظر ہوتی ہے اور وہ کثرت سے مفید حواشی لکھتے ہیں۔ پھر ان کی مرتبہ کتابوں کے مقدمے بھی اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے مولانا عرشی نے جتنی کتابیں مرتب کی ہیں اتنی ہی کتابیں تصنیف بھی کی ہیں ــــ اور یہ بات بھی کسی طرح کم اہم نہیں ہے کہ مولانا عرشی نے جتنی کتابیں مرتب کی ہیں اتنی ہمارے کسی دوسرے محقق نے مرتب نہیں کیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اہلِ تحقیق اسلوب پر توجہ نہیں دیتے وہ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ اپنی معلومات

دوسروں تک پہونچ پائیں۔ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے کہ یہ معلومات کس طرح دوسروں تک پہونچائی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض محققین کی نگارشات، انداز تحریر کی اجنبیت کی وجہ سے قارئین کے ایک محدود طبقے تک ہی رسائی حاصل کر پاتی ہیں۔ اس کے برعکس مولانا عرشی کا انداز تحریر نہایت شگفتہ اور موثر ہے وہ انشا پردازی سے تو کام نہیں لیتے لیکن ایک ایسا اسلوب ضرور اختیار کرتے ہیں جو قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتا ہے پریشانی کا باعث نہیں بنتا پھر ہر طرح کے غیر مانوس اور علمی مباحث میں ان کی یہ بنیادی خصوصیت برقرار رہتی ہے۔ نتیجۃً پڑھنے والا مسئلے کی تہہ تک پہونچنے میں بآسانی کامیاب ہو جاتا ہے۔

مولانا عرشی شاعر بھی تھے لیکن شاعری ان کے لئے وسیلۂ شہرت یا ذریعۂ عزت نہیں تھی۔ تاہم کبھی کبھار غزل کہہ لیا کرتے تھے مولانا عرشی کا کلام اتنا ہے کہ ایک اچھا خاصا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے لیکن مجموعہ کلام کی اشاعت کو انھوں نے پسند نہیں کیا اس سلسلے میں مالک رام صاحب سے ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا:

"دیوان شائع کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں اپنا کلام مجھے خود پسند نہیں، اساتذہ کا کلام پڑھ پڑھ کر ذوق شعری کچھ ایسا بلند ہو گیا ہے کہ مجھ میں ویسا کلام کہنے کی صلاحیت نہیں اور چونکہ خود اس درجے کا شعر کہہ نہیں سکتا پھر اس کلام کی اشاعت سے کیوں اپنے آپکو بدنام کروں۔"

ذیل میں مولانا عرشی مرحوم کی ایک غزل بطور نمونۂ کلام درج کی جاتی ہے۔

— خرام کہتے ہیں جسے کم نگہی ہوتی ہے
حسن کے دیس کی بولی بھی نئی ہوتی ہے

شوق نے ہم کو عطا کی ہے وہ سرمستی ناز
لن ترانی "پہ بھی پیہم" ارنی" ہوتی ہے

وہی شیشہ جو پری آنکھوں میں [illegible]
اس کے ہونٹوں سے برستی ہے ہنسی ہوتی ہے

رز و جلوہ نمائی کی [illegible] یں کے دل —
جب ابھرتی ہے تو اک کھلتی کلی ہوتی ہے

موت کو کر نہ سکی زلیخا [illegible] ہے سر دانش
اور اگر عشق کہا جائے تو ابھی ہوتی ہے

ذرے ذرے میں نظر آتی ہے رعنائی طور
چاندنی رات بھی کس درجہ بھلی ہوتی ہے

راہ دیتے ہیں ہمیں دشت کے کانٹے عرشی
عقل دے کر ہی عطا بادشہی ہوتی ہے

ذوق و جستجو

★

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔ جو انشاء عالیہ ہی کا گرانقدر نمونہ نہیں بلکہ اس کے ذریعہ اُردو ادب کی تاریخ کے بہت سے گوشے منور ہو گئے ہیں۔

قیمت: بیس روپئے

ملنے کا پتہ: فروغ اُردو امین آباد پارک لکھنؤ

نظر برنی :

مولانا محمد علی جوہر نمائش

یوں تو مولانا محمد علی جوہر صدی کی تقریبات کا آغاز ملک میں گذشتہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اسوقت ہوگیا تھا جب سابق وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے اپنی کوٹھی پر مولانا محمد علیؒ کے یادگاری ٹکٹ کی رسم اجراء ادا کی تھی تاہم جنگ آزادی کے اس عظیم رہنما کے شایان شان ہونی [illegible] جسکی قوم کی جانب سے توقعات تھیں۔ [illegible] ۱۹۷۹ء کے آغاز میں کل ہند مولانا محمد علی جوہر صدی تقریبات کمیٹی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی میں ایک انڈو پاک سیمینار ضرور منعقد ہوا تھا۔ جس میں دو عدد پاکستانی ادیب ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر عبداللیث صدیقی نے شرکت کی لیکن یہ سیمینار [illegible] معیار کا ہرگز نہیں تھا [illegible] کو یہ کہا جا سکے کہ [illegible] جشت پہلو زندگی اور کارناموں کے کسی ایک بھی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہو۔ حیدرآباد دکن اور رام پور (یو۔پی) میں بھی اس قسم کی تقریبات کا اہتمام ہوا لیکن [illegible] کشمکش، خود نمائی، اور علاقائی نمائندگی کے پہلو بے نظر آئے

افسوس تو اس بات کا ہے کہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے جس جلیل القدر رہنما نے حصول آزادی کے لئے اپنی جان تک قربان کردی۔ اسکو صحیح ڈھنگ سے نئی نسل کے افراد کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ جس لیڈر کے دور حیات میں اسکی تقاریر سننے کے لئے لاکھوں افراد کا ہجوم اکٹھا ہوجاتا تھا حصول آزادی کے بعد چند ہزار لوگ بھی مل کر نہ بیٹھ سکے اور محمد علی کو پندرہ برس کی مدت میں ہی طاق نسیاں کردیا گیا۔ اس کوتاہی میں سارا قصور حکومت یا کمیٹی کی بے سرد سامانی کا ہی نہیں ہے بلکہ کسی حد تک کمیٹی کی ناقص حکمت عملی اور تغافل بے جا کا بھی ہے۔ مرارجی ڈیسائی نے درست ہی کہا تھا کہ محمد علی کی شخصیت اور جذبات کو فراموش کرنے میں حکومت سے زیادہ انکے عقیدتمندوں کا بھی دخل ہے۔ بہر حال صدی تقریبات کی معیاد گزر چکی ہے لیکن اس دوران میں ایسے دو کام ضرور ہوئے ہیں جن سے جو ہر شناسی کا جذبہ مترشح ہوتا ہے پہلا کام تو دہلی میونسپل کارپوریشن نے

کیا جس نے اوکھلا روڈ کا نام بدل کر مولانا محمد علی جوہر
مارگ رکھ دیا جہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ واقع ہے۔ دوسرا کام
جامعہ کی مساعی کا شاخسانہ ہے جہاں شعبہ تاریخ نے
"محمد علی ہندوستانی سیاست میں" کے موضوع پر ایک کل ہند
سیمینار منعقد کرکے بحث و تمحیص کے دروازے کھول دیئے ڈاکٹر
ذاکر حسین لائبریری نے مولانا کی حیات اور کارہائے نمایاں
کو اجاگر کرنے کے لئے ایک تصویری نمائش کا ۲۶ اکتوبر تا
۲۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء اہتمام کیا ان سطور میں جوہر نمائش کا تعارف
کرانا مقصود ہے جسکو دیکھنے کے لئے دہلی اور بیرون دہلی کے
شائقین جوق در جوق آئے۔ اور مولانا کو خراج عقیدت
پیش کیا آیئے اس نمائش کے نمایاں پہلوؤں پر ہم بھی طائرانہ
نگاہ ڈالتے چلیں اس نمائش میں تین سو سے زائد تصاویر،
دستاویزات، لباس اور تصانیف شامل تھیں۔

(۱) خاندان، تعلیم اور ابتدائی دور

اس گوشہ میں علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا
شوکت علی) کی کم سنی سے لیکر تعلیم اور وفات تک [illegible]
اور کاغذات رکھے گئے تھے۔ سب سے پہلے تو مولانا محمد علی کی بتیل
کی پلیٹ پر بنی ہوئی ایک تصویر تھی جو بے حد دلآویز اور جاذب
نظر تھی۔ اسی کے ساتھ ہی لنکن کالج کے ایک پروفیسر مسٹر جیمس
ولیمز کا ایک سفارشی خط آویزاں تھا جسکا مضمون یہ تھا:
"محمد علی نے مجھ سے رومن اور انگریزی قانون پڑھا
ہے وہ تحصیل علم اور حافظہ کی بے پناہ صلاحیت
رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان میں ایک مخصوص انداز
بھی ہے جب سے انھوں نے اس کالج میں داخلہ لیا ہے
بہت محنت کرتے ہیں اور ترقی حاصل کی ہے۔ مجھے لگتا
ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے
لئے جو استعداد درکار ہے وہ سب ان میں موجود ہے"۔

مسٹر ولیمز کے سفارشی خط کے برابر ہی مسٹر محمد علی کی بی۔اے کی
ڈگری زیب دیوار تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی نے ایم
اے او کالج علی گڑھ سے ۱۸۹۸ء میں بی۔اے پاس کیا اور
اس میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔ ان کے پاس اس کورس
میں انگریزی ادبیات، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین تھے۔
علی گڑھ اسوقت الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور مسٹر بی ڈبلیو
ایس آرکین اس کے وائس چانسلر تھے۔

ڈگری کے علاوہ اسی دیوار پر ایک اور ماہر تعلیم کا سفارشی
خط بھی آویزاں تھا یہ خط لنکن کالج کے ایکٹر مسٹر ڈبلیو ڈبلیو
میری کی جانب سے لکھا ہوا تھا۔ خط پر ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ کی
تاریخ درج تھی اور نصف مضمون یہ تھا۔
"مسٹر محمد علی نے یونیورسٹی آف الہ آباد کے شاندار
کیریر کے بعد اس کالج میں داخلہ لیا۔ ان کا چال چلن
نہایت اطمینان بخش رہا ہے اور انھوں نے اپنی
حاضر دماغی، ادبی میلان طبع اور اعلیٰ خیالات
کا مظاہرہ کیا ہے۔
ان کے معلمین نے مجھے اطلاع دی ہے کہ انکی لیاقت
اور ذہانت قابل تعریف ہے اور میرا خیال ہے کہ
وہ کسی بھی تعلیمی پوسٹ پر بہتر طور پر کام کرنے کے
مستحق ہیں۔"

کالج کے ایک اور استاد مسٹر او ایم ایڈورڈس نے
اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۱ میں تحریر کیا ہے کہ "آکسفورڈ

نے اپنے [illegible] کے دوران محمد علی میری رہنمائی میں زیر مطالعہ ہے میں نے اُن کو غیر معمولی قوت اور مستحکم کامن سینس کا آدمی پایا ہے۔ وہ بڑے با اثر ہیں۔ انداز تحریر شاندار ہے اور مضمون کو دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

وہ ایک کامیاب اُستاد بن سکتے ہیں۔ ان کے شاگرد انھیں ہمدرد پائیں گے اور وہ بہت اچھے ساتھیوں کا حلقہ بنا سکتے ہیں"۔

نمائش کے پہلے پینل پر چھ تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں بالائی حصہ کے دونوں کونوں پر محمد علی عالم شباب میں نظر آرہے تھے اور درمیان علی برادران کی والدہ ضعیفی کی حالت میں دیکھی جاسکتی تھیں۔ پینل کے نشیبی حصہ میں دائیں سے بائیں تین تصاویر تھیں پہلی تصویر مولانا شوکت علی کی تھی جو اپنے بھائی محمد علی سے چھ سال بڑے تھے۔ دوسری تصویر علی برادران اور بی اماں کی تھی جو بے حد پُرکشش اور جاذب نظر تھی۔ آخر میں مولانا محمد علی کی ۱۹۰۵ کے دوران کی ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں وہ ایک شعلہ مقال مقرر کی حیثیت میں جلوہ گر تھے۔ اس تصویر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس پر مولانا کے ہاتھ سے "تمہارا محمد" تحریر تھا۔

دوسرا پینل علی برادران کے ابتدائی کوائف حالات کی غمازی کرتا تھا۔ پینل پر دائیں سے بائیں نوجوان محمد علی اپنی زندگی کے آخری ایام میں ضعیفی کی حالت سے دوچار دکھائی دیتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے سر پر وہ روایتی ٹوپی بھی موجود نہیں تھی جس کے بغیر وہ بالعموم منظر عام پر نہیں آتے تھے۔ تیسرے نمبر پر محمد علی کے عالم شباب کی تصویر کا ایک نادر پوز پیش نظر تھا۔ پینل کے نچلے حصہ میں علی برادران بیٹھے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ درمیانی تصویر میں دونوں بھائی موجود ہیں۔ محمد علی بیٹھے ہوئے اور شوکت علی کھڑے ہوئے۔ اس تصویر کے عین برابر کی تصویر میں دونوں بھائی ایک پلیٹ فارم پر ہیں غالباً کسی سیاسی دورے پر جا رہے ہوں گے۔

تیسرے پینل پر آٹھ تصاویر تھیں پہلی قطار کی دائیں سے بائیں والی پہلی تصویر نہایت دلخراش تاثر پیدا کرتی ہے کیونکہ اسمیں "غم زدہ بھائی" کے عنوان سے مولانا شوکت علی کو دکھایا گیا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصویر مولانا محمد علی کے انتقال کے وقت کی ہے اور اس میں بڑا بھائی اپنے برادر خورد کی المناک وفات پر آنسو بہا رہا ہے۔ ان کے ساتھ دو اور اشخاص کے چہرے نمایاں ہیں لیکن ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔ دوسری تصویر مولانا محمد علی کی ہے اور اس پر ۱۹۲۱ کندہ ہے اور خود مولانا نے اپنے ہاتھ سے "خادم کعبہ" لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد کی تصویر میں مولانا ایک انگریز لیڈی سے مشغول گفتگو ہیں۔ پینل کے درمیان میں صرف دو تصویریں ہیں ایک تصویر محمد علی کی اور دوسری تصویر ان کی صاحبزادی گلنار بیگم کی (شعیب قریشی کی زوجہ)

سب سے نیچے کی تین تصاویر میں تین گروپ دکھلائے گئے ہیں۔ ایک گروپ فوٹو ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علموں کا ہے جس میں اس وقت کے پرنسپل مسٹر بک کے ساتھ محمد علی اور دیگر طلبا بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ درمیانی گروپ فوٹو میں بی اماں کے ساتھ چند خواتین ہیں لیکن ان میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی شکل صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ تیسری تصویر بھی گروپ فوٹو ہے جس میں غالباً دربار رامپور کے متعلقین کے ساتھ مولانا محمد علی جلوہ گر ہیں۔

کیا جس نے ادکھلا روڈ کا نام بدل کر مولانا محمد علی جوہر مارگ رکھ دیا جہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ واقع ہے۔ دوسرا کام جامعہ کی مساعی کا شاخسانہ ہے جہاں شعبۂ تاریخ نے "محمد علی ہندوستانی سیاست میں" کے موضوع پر ایک کل ہند سیمینار منعقد کر کے بحث و تمحیص کے دروازے کھول دیئے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری نے مولانا کی حیات اور کارہائے نمایاں کو اُجاگر کرنے کے لئے ایک تصویری نمائش کا ۲۶ اکتوبر تا ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء اہتمام کیا اِن سطور میں جوہر نمائش کا تعارف کرانا مقصود ہے جسکو دیکھنے کے لئے دہلی اور بیرون دہلی کے شائقین جوق در جوق آئے۔ اور مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا آیئے اس نمائش کے نمایاں پہلوؤں پر ہم بھی طائرانہ نگاہ ڈالتے چلیں اِس نمائش میں تین سو سے زائد تصاویر، دستاویزات، لباس اور تصانیف شامل تھیں۔

(۱) خاندان، تعلیم اور ابتدائی دَور

اِس گوشہ میں علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) کی کم سنی سے لیکر تعلیم اور وفات تک [illegible] اور کاغذات رکھے گئے تھے۔ سب سے پہلے تو مولانا محمد علی کی پتیل کی پلیٹ پر بنی ہوئی ایک تصویر تھی جو بے حد دلآویز اور جاذب نظر تھی۔ اِس کے ساتھ ہی لنکن کالج کے ایک پروفیسر مسٹر جیمس ولیمز کا ایک سفارشی خط آویزاں تھا جسکا مضمون یہ تھا:

"محمد علی نے مجھ سے رومن اور انگریزی قانون پڑھا ہے وہ تحصیل علم اور حافظہ کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان میں ایک مخصوص انداز بھی ہے جب سے انھوں نے اِس کالج میں داخلہ لیا ہے

بہت محنت کرتے ہیں اور ترقی حاصل کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے لئے جو استعداد درکار ہے وہ سب ان میں موجود ہے۔"

مسٹر ولیمز کے سفارشی خط کے برابر ہی مسٹر محمد علی کی بی۔اے کی ڈگری زیب دیوار تھی۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے ۱۸۹۸ء میں بی۔اے پاس کیا اور اس میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔ ان کے پاس اِس کورس میں انگریزی ادبیات، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین تھے۔ علی گڑھ اِسوقت الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور مسٹر بی ڈبلیو ایس ارکین اِس کے وائس چانسلر تھے۔

ڈگری کے علاوہ اِسی دیوار پر ایک اور ماہر تعلیم کا سفارشی خط بھی آویزاں تھا یہ خط لنکن کالج کے ایکزٹر مسٹر ڈبلیو ڈبلیو میری کی جانب سے لکھا ہوا تھا۔ خط پر ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ کی تاریخ درج تھی اور تصیف مضمون یہ تھا۔

"مسٹر محمد علی نے یونیورسٹی آف الٰہ آباد کے شاندار کیریر کے بعد اِس کالج میں داخلہ لیا۔ ان کا چال چلن نہایت اطمینان بخش رہا ہے اور انھوں نے اپنی حاضر دماغی، ادبی میلانِ طبع اور اعلیٰ خیالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان کے معلمین نے مجھے اطلاع دی ہے کہ انکی لیاقت اور ذہانت قابلِ تعریف ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کسی بھی تعلیمی پوسٹ پر بہتر طور پر کام کرنے کے مستحق ہیں؟

کالج کے ایک اور استاد مسٹر اے ایم ایڈورڈس نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۱ میں تحریر کیا ہے کہ آکسفورڈ

نے اپنے قیام کے دوران محمد علی میری رہنمائی میں زیر مطالعہ رہے ہیں۔ میں نے اُن کو غیر معمولی قوت اور مستحکم کامن سینس کا آدمی پایا ہے۔ وہ بڑے با اثر ہیں۔ انداز تحریر شاندار ہے اور مضمون کو دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

وہ ایک کامیاب اُستاد بن سکتے ہیں۔ ان کے شاگرد انھیں ہمدرد پائیں گے اور وہ بہت اچھے ساتھیوں کا حلقہ بنا سکتے ہیں"۔

نمائش کے پہلے پینل پر چھ تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں بالائی حصہ کے دونوں کونوں پر محمد علی عالم شباب میں نظر آ رہے تھے اور درمیان علی برادران کی والدہ ضعیفی کی حالت میں دیکھی جا سکتی تھیں۔ پینل کے نشیبی حصہ میں دائیں سے بائیں تین تصاویر تھیں پہلی تصویر مولانا شوکت علی کی تھی جو اپنے بھائی محمد علی سے چھ سال بڑے تھے۔ دوسری تصویر علی برادران اور بی اماں کی تھی جو بے حد پُرکشش اور جاذب نظر تھی۔ آخر میں مولانا محمد علی کی ۱۹۰۵ء کے دوران کی ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں وہ ایک شعلہ مقال مقرر کی حیثیت میں جلوہ گر تھے۔ اس تصویر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس پر مولانا کے ہاتھ سے "تمہارا محمدؐ" تحریر تھا۔

دوسرا پینل علی برادران کے ابتدائی کوائف و حالات کی غمازی کرتا تھا۔ پینل پر دائیں سے بائیں نوجوان محمد علی اپنی زندگی کے آخری ایام میں ضعیفی کی حالت سے دوچار دکھائی دیتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے سر پر وہ رومی ٹوپی بھی موجود نہیں تھی جس کے بغیر وہ بالعموم منظر عام پر نہیں آتے تھے۔ تیسرے نمبر پر محمد علی کے عالم شباب کی تصویر کا ایک نادر پوز پیش نظر تھا۔ پینل کے نچلے حصہ میں علی برادران بیٹھے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ درمیانی تصویر میں دونوں بھائی موجود ہیں۔ محمد علی بیٹھے ہوئے اور شوکت علی کھڑے ہوئے۔ اس تصویر کے عین برابر کی تصویر میں دونوں بھائی ایک پلیٹ فارم پر تھے غالباً کسی سیاسی دورے پر جا رہے ہوں گے۔

تیسرے پینل پر آٹھ تصاویر تھیں پہلی قطار کی دائیں سے بائیں والی پہلی تصویر نہایت دلخراش تاثر پیدا کرتی ہے کیونکہ اسمیں "غم زدہ بھائی" کے عنوان سے مولانا شوکت علی کو دکھایا گیا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصویر مولانا محمد علی کے انتقال کے وقت کی ہے اور اس میں بڑا بھائی اپنے برادر خورد کی المناک وفات پر آنسو بہا رہا ہے۔ ان کے ساتھ دو لوگ اور بھی کے چہرے نمایاں ہیں لیکن ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔ دوسری تصویر مولانا محمد علی کی ہے اور اس پر ۱۹۲۱ کندہ ہے اور خود مولانا نے اپنے ہاتھ سے "خادم کعبہ" لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد کی تصویر میں مولانا ایک انگریز لیس ٹربی سے مشغول گفتگو ہیں۔ پینل کے درمیان میں صرف دو تصویریں ہیں ایک تصویر محمد علی کی اور دوسری تصویر ان کی صاحبزادی گلنار بیگم کی (شعیب قریشی کی زوجہ)

سب سے نیچے کی تین تصاویر میں تین گروپ دکھائے گئے ہیں۔ ایک گروپ فوٹو ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علموں کا ہے جس میں اسوقت کے پرنسپل مسٹر بک کے ساتھ محمد علی اور دیگر طلبا بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ درمیانی گروپ فوٹو میں بی اماں کے ساتھ چند خواتین ہیں لیکن ان میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی شکل صاف پہچانی جا سکتی ہے۔ تیسری تصویر بھی گروپ فوٹو ہے جس میں غالباً دربار رامپور کے متعلقین کے ساتھ مولانا محمد علی جلوہ گر ہیں۔

خاندان، تعلیم، ابتدائی حالات کے مخصوص گوشہ
تصاویر نہ صرف پینل پر نمایاں تھا بلکہ نمائش ہال کی سفید دیواروں کو بھی پینل کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اسکی تصاویر میں پہلی تصویر (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی نظر آئے اور دونوں ہی طبی مشن کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے۔ علی برادران کے دادا علی بخش خاں کی ایک نادر تصویر بھی آویزاں تھی جس میں اُن کے ہمراہ والی رامپور نواب یوسف علی خاں ہیں۔ تیسری تصویر میں مولانا محمد علی وہیا ست بڑودہ کے چند رفقا کے ساتھ ہیں۔ اس میں وہ مخصوص پگڑی پہنے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ والی تصویر میں مہاراجہ گائیکواڑ ہیں۔ جنکی شخصیت سے جاہ و حشمت مترشح ہو رہا ہے۔ درمیانی قطار کی تصاویر میں داہنی جانب مہاراجہ الور کی تصویر ہے جو کہ مولانا کے خاص دوستوں میں تھے۔ بیچ میں نقوش لاہور کے خطوط نمبر کا ایک تراشہ ثبت کیا گیا ہے۔ جس میں مولانا کا ایک اہم خط درج ہے۔ اس کے بعد تیسری تصویر میں والئ ریاست رامپور نواب محمد حامد علی خاں نظر آ رہے ہیں جو مولانا کے خاص دوست تھے اور جنکی دوستی کی پاداش میں مولانا کو نواب یوسف علی خاں کے غیض و غضب کا شکار ہونا پڑا۔ نچلی لائن کی پہلی تصویر میں مولانا محمد علی کا مقبرہ ہے جس کے پس منظر میں بیت المقدس صاف نظر آ رہا ہے۔ تیسری فوٹو مولانا شوکت علی اور ان کی غیر ملکی بیگم کی ہے۔ یہ بیگم مولانا کی پرائیوٹ سکریٹری تھیں جو بعد میں مولانا کی شریک حیات بن گئیں اور کچھ عرصہ بعد مولانا کو طلاق دے کر اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

ایک گروپ فوٹو ناظرین کی خاص توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ ایک فوٹو کوئی تیس پینتیس افراد کا تھا جس میں کوئی نوجوان شخص اپنے ریاستی پوشاک میں ملبوس بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا اور مولانا بھی اس میں جلوہ گر تھے۔

ہال کی دوسری دیوار بھی تصاویر کے لئے مختص تھی۔ اسکی پہلی قطار میں چار تصویریں تھیں پہلی علی برادران کی دوسری صرف مولانا محمد علی کی، تیسری مولانا شوکت علی کی اور چوتھی میں علی برادران ایک دوسرے پوز میں ہیں۔

دوسری قطار کی پہلی تصویر (دائیں سے بائیں) ایک میت کا منظر پیش کرتی ہے یہ مولانا محمد علی کا جسد خاکی ہے۔ دوسری تصویر میں مولانا لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جانے سے پہلے اپنے بھائی شوکت علی اور دوسرے احباب کے ساتھ موجود ہیں ان احباب میں عبدالرحمٰن صدیقی پہچانے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور گروپ فوٹو ہے جس میں علی برادران، بی اماں اور گھر کے دوسرے افراد بھی موجود ہیں سب سے کونے کی تصویر میں بی اماں کی ابدی آرام گاہ دکھائی گئی تھی۔ تیسری قطار میں صرف ایک تصویر ہے جس میں مولانا محمد علی کے جنازے کا جلوس نظر آ رہا تھا سب سے نیچے کی قطار میں دو تصاویر تھیں۔ دائیں سے بائیں پہلی تصویر میں مولانا شوکت علی کے صاحبزادے زاہد علی اپنے خاندان کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ ترتیب اس طرح تھی۔

دائیں سے بائیں: نواسہ / پوتا لڑکا / داماد نواسہ / پوتا
لڑکی بیگم زاہد علی زاہد علی پوتا / نواسہ

ایک تصویر مولانا محمد علی کی اہلیہ امجدی بیگم کی آخری آرام گاہ کی ہے جو کہ بمبئی کے خلافت ہاؤس میں واقع ہے۔

نمائش کا دوسرا اہم گوشہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، تاسیس ابتدائی دور" کے نام سے نمایاں کیا گیا تھا۔ پینل کی پہلی قطار

میں دائیں سے بائیں جامعہ کے پہلے سمبل (لارڈ) حسن محمد حیات
کی ہے۔ اسکے بغل میں مشہور سائنسداں پرفل چندر رے کی
تصویر ہے جنھوں نے ۱۹۱۲ میں جامعہ کے پہلے جلسے تقسیم اسناد
میں خطبہ پڑھا تھا

دوسری قطار میں دائیں سے بائیں مولانا شوکت علی
، جامعہ ملیہ کے امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ کے ساتھ ہیں۔ اسکے
بعد والی تصویر میں جو منظر دکھایا گیا ہے وہ تاریخی اعتبار
سے اہمیت کا حامل ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۲۹ اکتوبر
۱۹۲۰ کو علی گڑھ میں پڑی تھی۔ شروع کے دنوں میں یہ قومی تعلیمی
ادارہ بچولنس والی کوٹھی اور اس کے ملحقہ حصہ میں کرائے کے
کیمپوں میں چلتا رہا۔ اس تصویر میں انھیں کیمپوں کی ایک جھلک
دیکھی جاسکتی تھی۔ اس تصویر کے بعد ایک گروپ فوٹو ہے۔
جس میں ۱۹۲۵ء کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ
اور طالبعلموں کو دکھایا گیا ہے۔ نمایاں طور پر جن افراد کو
پہچانا جاسکتا ہے، ان میں محمد سرور، عبدالقادر سیالکوٹی،
یوسف حسین خاں، سعید انصاری، طاہر الیس محمدی، عبدال
عزیز انصاری، حسن محمد حیات، شفیق الرحمان قدوائی،
ای جے کیلاٹ، سعید انصاری، عبدالعلیم اسراری، معین
مہارت اور کے نائر۔ قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد ایک اور فوٹو میں ڈاکٹر انصاری
اور حکیم اجمل خاں نمایاں ہیں۔ اور غالباً یہ تصویر قیام
لندن کے دوران لیا گیا تھا۔ دوسرے لوگوں میں عبدالعلیم
اسراری، ارشاد الحق، شفیق الرحمن قدوائی، سعید انصاری،
نذیر نیازی، سید محمد ٹونکی، کنور محمد اشرف، بدرالدین جیبی
اور کئی سی ڈیکا کے چہرے پہچان لئے گئے۔

(باقی آئندہ)

ادارۂ فروغ اُردو ہند

کے ادبی شاہکار

جن کا ہر لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔

نمبر	قیمت
۱۔ فروغ اُردو پریم چند نمبر	15/-
۲۔ چکبست نمبر	12/-
۳۔ امیر خسرو نمبر	15/-
۴۔ احتشام حسین نمبر	30/-
۵۔ عبدالماجد دریابادی نمبر	12/-
۶۔ حالی نمبر حصہ دوم -/12 اول	15/-
۷۔ جنگ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء	3/50
۸۔ گاندھی نمبر	2/-
۹۔ نول کشور نمبر	3/50
۱۰۔ فرقت کاکوروی نمبر	6/-

ملنے کا پتہ:

فروغ اُردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

نوٹ

جو حضرات ماہنامہ فروغ اُردو کے خریدار ہیں ان کو ان نمبروں کی خریداری کی صورت میں پچیس پیسے فی روپیہ کی رعائت کی جائے گی۔

خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

نمائندہ شعر و ادب :

ادبی تقریبات

گزشتہ ماہ لکھنؤ میں دو اہم ادبی تقریبات منعقد ہوئیں۔ جنمیں ایک ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والی اعزازی تقریب ہے اور دوسری فخرالدین علی احمد اکاڈمی کی جانب سے فخرالدین

خطبات کا آغاز

ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والی تقریب ۱۳ اگست سنہ ۸۱ء کی شب میں راوندرالیہ لکھنؤ کے ہال میں پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں اُردو فارسی اور عربی کے ممتاز دانشور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سابق صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر رضوان علوی۔ صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر ولی الحق انصاری صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی اور محترمہ صالحہ رضوی رجسٹرار عربی و فارسی بورڈ الہ آباد کی ادبی، تحقیقی اور انتظامی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اور ان شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اُردو حلقوں میں یوں تو سند اور ایوارڈ دیئے جانے کی رسم عام ہو چکی ہے اور کچھ غیر متند اداروں کی سندیں اور ایوارڈ تقسیم کرنا ایک شعار ہو گیا ہے لیکن وہ تعلیمی ادارے جنکی توصیفی اسناد اپنی جگہ پر کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس جانب توجہ غالباً پہلی بار کی جسے ادبی حلقوں میں مستحسن اقدام قرار دیا گیا۔

ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اُردو دوستوں کے اس اجتماع میں مسٹر مصباح الدین عمر سابق سکریٹری اُردو اکیڈمی اترپردیش نے ممتاز دانشوروں کا استقبال کیا اور مسٹر عمر انصاری صدر ایوارڈ کمیٹی نے تقریب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

اس موقع پر مسٹر جسٹس مرتضےٰ حسین، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر شریف الحسن اور ڈاکٹر انوار الحسن نے اپنے مقالات کے ذریعہ ایوارڈ یافتگان کو خراج تحسین پیش کیا اور مسٹر انجم ملیح آبادی جنرل سکریٹری نے وہ پیغامات سُنائے جو انھیں مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ اُردو کے سربراہوں کی جانب سے موصول ہوئے تھے۔ اعزازی تقریب کی نظامت ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ریڈر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی نے کی۔ تقریب کا اختتام ایک آل انڈیا مشاعرہ پر ہوا جس میں پروفیسر عبدالقوی ضیا (کناڈا یونیورسٹی) مختار بارہ بنکوی، نازش پرتاپگڈھی، بیکل اُتساہی، کوثر جائسی، راز الہ آبادی، مضطر لکھنوی، نیر اندوری، ڈاکٹر ساغر اعظمی، جلال ملیح آبادی، قیوم ناشاد، حق کانپوری، کیفی وجدانی، شہناز کانپوری، کرشن بہاری نور، عرفان صدیقی، تسنیم فاروقی، والی آسی، شوکت عمر اور مشتاق پردیسی نے اپنا کلام سُنایا۔ مشاعرہ کی نظامت انور جلالپوری نے کی تقریب

کے دوران [illegible] مشاعرہ عرفان لکھنوی کا ترتیب دیا ہوا ایک ساونیئر بھی
تقسیم کیا گیا۔ تقریب کے اختتام پر خواجہ محمد یونس چیئرمین ایجوکیشنل سوسائٹی
نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور سکریٹری مسٹر شمس فرخ آبادی بھی
مبارکباد کے مستحق ہیں جنکی انتھک صلاحیتوں نے تقریب کو شاندار بنایا۔

۱۴ ستمبر ۱۹۸۱ء کو سہکارتا بھون لکھنؤ میں فخر الدین علی احمد
اکاڈمی کی جانب سے فخر الدین خطبات کا آغاز ہوا اور سابق
صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد مرحوم کو اُردو زبان کی ہمہ گیر
شخصیت اور قومی یکجہتی کی علامت سے یاد کیا گیا۔

اس تقریب کی مہمان خصوصی بیگم عابدہ احمد تھیں اور
خاص مقرر اُردو کے ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری تھے۔ اس
موقع پر وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی نمائندگی قومی یکجہتی کے ریاستی
وزیر شری جگدیش ڈکشت نے کی اور اپنی تقریر میں مرحوم
صدر کی اُن خدمات کا ذکر کیا جو انھوں نے قومی یکجہتی کو فروغ
دینے کے سلسلے میں کی تھیں۔ اکاڈمی کے چیرمین پروفیسر رضوان
علوی نے اکاڈمی کے دائرۂ کار پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے
بتایا کہ اکاڈمی کے قیام کا اصل مقصد بلند پایہ اُردو مسودات کی
طباعت اور اشاعت کے سلسلہ میں مصنفین کو مالی امداد دینا
اور یادگاری خطبات کا اہتمام کرنا ہے۔ چیرمین اکاڈمی نے اس خیال کا اظہار
بھی کیا کہ مرحوم صدر پر یادگاری خطبات کا اہتمام لکھنؤ کے علاوہ
ملک کے دوسرے حصوں میں سال میں کم از کم ۲ بار ہونا چاہیئے۔

خصوصی دعوت پر تشریف لانے والے مقرر علی سردار جعفری
نے قومی یکجہتی میں اردو شعراء کے حصہ پر ایک طویل مقالہ سنایا
اس مقالہ میں جعفری صاحب نے جاں نثار اختر مرحوم کی مرتب
کی ہوئی کتاب کا سہارا لیا۔ جلسہ گاہ میں متعدد اُردو دوستوں نے
جعفری صاحب کے مقالے کو جاں نثار اختر کی کتاب "ہمارا ہندوستان" پر
تبصرہ قرار دیا۔ ابتداء میں جعفری صاحب نے حکومت اتر پردیش
کی جانب سے منعقد ہونے والی غالب کانفرنس کے سلسلہ میں لکھنؤ کے
دوسرے دانشوروں کے تاثرات بیان کرنا چاہے تو کچھ مقامی
لوگوں نے اس سے اختلاف کیا۔

بہر نوع اس تقریب نے بے جان اکیڈمی میں کچھ زندگی کے آثار
نمایاں کئے اور مستقبل کے لئے اسے ایک اچھی علامت قرار دیا گیا
جلسہ کا آغاز علامہ اقبال کے مشہور ترانے "سارے جہاں سے
اچھا ہندوستاں ہمارا" سے ہوا جسے بچوں نے نہایت دلکش
انداز میں پیش کیا۔ یادگاری خطبات کی دوسری تقریب ۱۸ اکتوبر
۱۹۸۱ء کو لکھنؤ میں ہوگی جس میں مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست
حیدرآباد کا مقالہ ہوگا۔

۱۸ ستمبر کو پروفیسر شمس الدین صدر شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی
کے اعزاز میں ایک شعری نشست پروفیسر ولی الحق انصاری صدر
شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی رہائش گاہ پر بزم علم و ادب کے
زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں عمر انصاری، ولی الحق انصاری،
عرفان لکھنوی، انجم ملیح آبادی، عرفان صدیقی، سلمان عباسی،
شمس فرخ آبادی، اور ساجد انصاری نے اپنا کلام سنایا۔
اس موقع پر ڈاکٹر انصاری نے مہمان خصوصی سے مقامی شعراء
کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ دوسری جگہوں پر شعراء لکھنؤ کو
جس طرح قدیم روایات کا علمبردار سمجھا جاتا ہے آج کا لکھنؤ اس سے
بالکل مختلف ہے۔ مہمان خصوصی نے شعراء کے کلام کو سننے کے
بعد ڈاکٹر انصاری کے خیالات سے اتفاق کیا۔ اس شعری
نشست کی نظامت مسٹر صباح الدین عمر سابق سکریٹری
اُردو اکاڈمی لکھنؤ نے کی۔

---

۲۰ ستمبر کو ایک دوسری شعری نشست سید اطہر حسین آئی

(باقی صفحہ ۱۳۱)

مراسلات

۲۱ اگست ۱۹۸۱ء

محترم بندہ! تسلیمات

"فروغِ اُردو" کے مئی۔ جون ۱۹۸۱ء کے شمارے میں آپ نے صفحہ نمبر 34 پر میرا جو خط منشی پریم چند کی کتاب "سمر یاترا" کے ضبط ہونے کے سلسلہ میں شائع کیا تھا۔ اس میں میں نے امرت رائے صاحب کے خط کا حوالہ دیا تھا اور لکھا تھا۔ کہ امرت رائے صاحب کی اطلاع کے مطابق یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں جو تازہ ترین اطلاع حاصل ہوئی ہے اُس کے مطابق امرت رائے صاحب کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔

ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے "پریم چند وشوکوش" کے نام سے ہندی میں، دو ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں۔ انھیں مرتب کرنے کے سلسلہ میں گوئنکا صاحب نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اور ہندی جگت کے کئی عالموں کی مدد بھی حاصل کی۔ "پریم چند وشوکوش" کی جلد نمبر ۵۔ صفحہ نمبر 410 پر "سمر یاترا" کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل تحریر درج ہے۔

"سمر یاترا —— کہانیوں کا مجموعہ / بارہ سیاسی کہانیاں / ناشر: سرسوتی پریس۔ بنارس / پہلا اڈیشن ۱۹۳۰ء، 170 صفحے / قیمت ایک روپیہ / "جاگرن" ۱۳ نومبر ۱۹۳۲ء، اور "ہنس" "اکتوبر۔ نومبر ۱۹۳۲ء میں اس کے چھپنے کی اطلاع شائع ہوئی ہے —— دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۳۸ء (یعنی پریم چند کی رحلت کے ۲ سال بعد۔ مانک ٹالہ)

مندرجہ بالا اطلاع کی روشنی میں یہ بات پوری طور پر واضح ہے کہ "سمر یاترا" فی الحقیقت ضبط ہوئی تھی۔ اور کہ اس سلسلہ میں امرت رائے صاحب کی اطلاع غلط تھی۔

میں یہ خط اس لئے تاخیر سے تحریر کر رہا ہوں کہ میں دو ماہ سے زیادہ عرصہ تک ہندوستان سے باہر رہا اور واپسی پر بھی ایک ماہ تک مصروف رہا اس عرصہ میں "فروغِ اُردو" میں "سوزِ وطن" کے بارے میں میں نے جو مضمون ارسال کیا تھا وہ بھی شائع ہو گیا۔ اس مضمون میں محترمی ابو محمد شبلی کی طرف سے پیش کی گئی غلط بیانیوں کی نشاندہی کی گئی تھی اور ان کی طرف سے پریم چند کے خط میں اپنی طرف سے اضافہ فرما کر خط کے معنی ہی بدل ڈالنے کے بارے میں بھی تفصیل پیش کی گئی تھی اسی پرچے میں شبلی صاحب کا مضمون "پریم چند اور جارحانہ فرقہ پرستی" بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی۔ زیادہ تر ہوا میں لاٹھی چلائی گئی ہے۔ "سوزِ وطن" میں شبلی صاحب کی غلط بیانیوں کی نشاندہی کے بعد شبلی صاحب کی کوئی بھی بات قابلِ اعتبار نہیں رہی۔ پھر بھی قارئین کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس کا جواب لکھوں گا۔ اور اس کے بعد "پریم چند کے افسانوں میں مسلم کردار" (از ابو محمد شبلی —— مطبوعہ فروغِ اُردو۔ اپریل جولائی ۱۹۷۹ء) کے جواب میں بھی ایک طویل مضمون یا مختصر مضامین پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس دوران میں اگر ممکن ہو سکے تو "عظیم آباد اکسپریس" میں شائع شدہ میرا مضمون "پریم چند اور

جارحانہ فرقہ پرستی نمبر ۲ بھی شائع فرمادیں تو فروغ اُردو کے قارئین کے روبرو اور بہت سی نئی چیزیں بھی پیش ہو جائیں گی ۔

خلوص کار

مانک ٹالہ

(۲۸۶)

محمود منزل

دریاباد ۔ الہ آباد ۔ ۲۲ اگست ۱۹۸۱ء

محترمی تسلیم !

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے ۔ ادھر میں اپنی بیماری کی وجہ سے لکھنؤ نہیں آسکا ۔ اُمید ہے کہ "پریم چند" پر میرا مقالہ آپ دوبارہ شائع کریں گے ۔ درخواست ہے کہ پروف بہت احتیاط سے دیکھا جائے ۔ جو سطریں غائب ہو گئی تھیں اُن کو بطور خاص دیکھ لیا جائے ۔ مقالے کی کچھ سطریں چھوٹ جانے کی وجہ سے اُس پر اعتراضات آرہے ہیں ۔ اس لیئے اس مرتبہ بہت احتیاط کی ضرورت ہے ۔

ابو محمد شبلی صاحب کے تمام مقالوں کو اکٹھا کر کے "پریم چند کا مطالعہ ——— ایک بازدید" کے نام سے شائع کیجئے ۔ بہت دلچسپ اور معلوماتی کام ہوگا ۔ تجارت کے لحاظ سے بھی مفید ——— چند مقالے اور شامل کر دیجئے ۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے ۔

خیر طلب !

سید محمد عقیل

★ اُردو لکھیئے
★ اردو پڑھیئے
★ اُردو بولیئے

بسلسلہ مضمون صفحہ ۲۹ کا

لئے ۔ اس کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی ۔ اس نشست کا اہتمام بھی نجم غلام دادو بانی ... نے کیا ۔ اس نشست میں سید اطہر حسین سحر ، عرفانی لکھنوی ، انجم ملیح آبادی ، شاہجہاں بانو یاد ، شمس فرخ آبادی کے علاوہ بیرونی شاعر نعیم بجے پوری نے بھی اپنا کلام سُنایا ۔ ●●

ادارۂ فروغ اُردو کی

قابل قدر فخریہ پیش کش

دیوان غالب

فروغ اُردو ۔ طاہر ایڈیشن

جو کہ علامہ غالب نے خود اپنے کلام کو منتخب کر کے شائع کیا تھا ۔ اور اس کا نسخہ برٹش لائبریری میں محفوظ ہے ، ادارہ فروغ اُردو نے اس کو حاصل کر کے ۔ بڑے آب و تاب سے شائع کیا ہے ۔

خاصہ کی چیز ہے ۔

قیمت ، چھ روپے

ملنے ——— کا ——— پتہ

ادارۂ فروغ اُردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

فروغ اردو لکھنؤ
اکتوبر ۱۹۸۱ء

[illegible] نرائن نگم
[illegible] روڈ لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۰۱ ، ۱۰ / نومبر ۱۹۸۱ء

جشن صد سالہ یوم پیدائش منشی دیا نرائن نگم

ایڈیٹر "زمانہ" کانپور

محترم جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ فروغ اردو ۔ آداب عرض ہے میں آپکی توجہ حسب ذیل اداریہ جو [illegible] ہندوستان ہند ۔ دہلی
کے جولائی سن ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے، کی طرف مبذول کرکے آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ بھی اسی قسم کا کوئی نوٹ اپنے قیمتی رسالہ میں ایڈیٹوریل
کے تحت [illegible] کی تکلیف گوارا کریں تاکہ جشن صد سالہ یوم پیدائش پر جناب منشی دیا نرائن نگم ۔ ایڈیٹر زمانہ کانپور کی خدمات ادب اردو
زبان زیادہ نمایاں کی جا سکیں اور اگر ہو سکے تو حکومت سے ایک یادگار ٹکٹ ڈاک یوم پیدائش ۲۲ / مارچ سنہ ۱۹۸۲ء کو جاری کرنے
کا پُرزور اپیل کی جائے تاکہ خادمان اردو و ادب کے حصے میں مناسب عزت و شہرت آ سکے ۔
میں اس مراسلے کے ساتھ دو اقتباسات انگریزی بھی بھیج رہا ہوں کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے مشہور رسالہ کا اسپیشل نمبر یا کم سے کم کچھ
مضامین بحیثیت منشی جی یا انکی خدمات کے سلسلے میں اپنے مارچ ۱۹۸۲ء کے نمبر میں شائع کر سکیں ۔ میں بہت ممنون ہونگا ۔
اگر ہو سکے تو ایک کاپی اپنے رسالہ کی بندہ کو بھیجنے کی زحمت گوارا کریں ۔ شکریہ ۔ صد شکریہ ۔

خاکسار (برج نرائن نگم)

منشی دیا نرائن نگم (مرحوم) نے "زمانہ" کے ذریعہ اردو کی جڑیں مضبوط کرنے میں جو خدمات انجام دیں انھیں اردو
کے شیدائی کبھی نہیں بھول سکتے ۔ اردو کے وہ مسلمان دانشور بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے جو اردو کو مسلمانوں کی زبان کے طور
کے طور پر تسلیم کرکے تقسیم زبان کے گناہ کے مرتکب ہو چکے ہیں ۔
۲۲ / مارچ ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں منشی دیا نرائن نگم کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے ۔ خوش قسمتی سے اتر پردیش اردو
اکاڈمی نے یہ جشن منانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی ہیں ۔ اس موقع پر "زمانہ" کا ایک یادگار نمبر بھی شائع کیا جا رہا ہے ۔ جس میں
"زمانہ" کے پرانے شماروں سے اقتباس و چند اردو ادب کے ستاروں کے مضامین بھی شامل کئے جائیں گے ۔
ہر اردو داں اور اردو پرست کا فرض ہے کہ منشی دیا نرائن نگم کے اس جشن صد سالہ کو کامیاب کرنے میں ہر طرح سے اعانت
فرمائے اور اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے ہندوستان کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کو اردو میں خط لکھے کہ اس مبارک موقع پر ایک یادگار
ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے جس پر مرحوم منشی دیا نرائن نگم کی تصویر ہو ملک بھر کے اردو رسائل و جرائد کے مدیران کرام سے امید کی جا سکتی ہے
کہ وہ منشی دیا نرائن نگم کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں اداریاتی نوٹ لکھیں اور اس جشن کو کامیاب بنانے کے لئے مناسب اقدام اٹھائیں ۔
اخبارات کے ذریعہ حکومت کی توجہ مبذول کرائی جائے کہ وہ منشی دیا نرائن نگم کے جشن صد سالہ کے موقع پر ڈاک ٹکٹ جاری کرے ۔

۵. دہلی کا یادگار مشاعرہ — ۱/۵۰

۶. دستہ گل — ۰/۴۰

۷. دوشیزہ قاف (ناول) — خان محبوب طرزی — ۱/۵۰

۸. دلربا — " — ۱/۵۰

۹. دلی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید ایڈیشن) — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۲/-

۱۰. دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

۱. ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۰/۵۰

(ذ)

۱. ذوق جستجو — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۲/-

۲. ذوق ادب و شعور — سید احتشام حسین — ۸/-

۳. ذوق جنوں مجموعہ کلام — آل احمد سرور — ۱۱/-

(ر)

۱. روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — ۶/-

۲. رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ — سید امیر حسن نورانی — ۴/۵۰

۳. رہبر مضمون نویسی — شفاعت علی صدیقی — ۲/-

۴. راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰

۵. رخسار سحر — انصر کریم صدیقی — ۱/۵۰

۶. رفتار — وحشی محمود آبادی — ۳/۵۰

۷. رموز حکمت معہ مقدمہ اردو — محمد شریف — ۴/-

۸. ریاض فارسی — منتخب کلام فارسی — ۳/-

۹. ریختہ دلی ایڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/-

(ز)

۱. زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات ... — مولانا تھانوی — ...

۱۳. زنبیوں کا بادشاہ حکیم یانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی — ۲/-

۱۴. زینب ساحرہ — وحشی محمود آبادی — ۳/-

(س)

۱. سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۴/-

۲. سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۵/-

۳. سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیر — ۹/-

۴. سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۴/۵۰

۵. سنگ گہر — سید احتشام حسین — ۵/-

۶. سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰

۷. سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۹/-

۸. سو (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/-

۹. سیاحت زمین " — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰

۱۰. ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰

۱۱. سنہرا حلقہ — ۰/۷۵

۱۲. سر سید احمد خاں — انوارالحسن صدیقی — ۰/۵۰

۱۳. سوشل اسٹڈیز — احمد محسن کاکوروی — ۱/۵۰

(ش)

۱. شعر نو تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۸/-

۲. شرح دیوان غالب مزاحیہ — نظام مدفرقت — ۲/-

۳. شرح مسلک گوہر — عبدالقوی دریابادی — ۴/-

۴. شاہ غمگین ... — پروفیسر عبدالشکور — ۱۰/-

۵. شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی

۶. شرح ادب پارے نظم — ڈاکٹر محمود الحسن — ۵/-

۷. شرح منتخبات فارسی — نقوی ... — ۵/-

۸. شبلی نعمانی — ...ارالحسن نورانی — ۱/۵۰

۹. شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن — نظم طباطبائی — ۱...

۱۰. ... — عبدالعلی قدوائی — ۱/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۹	مطالعۂ حالی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۹/-
۲۰	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۵۰
۲۱	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۲	معنوی پیانگ	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۳	مقدمۂ شعر و شاعری	مطابق نصاب بی۔اے حالی	۲/۵۰
۲۴	مرثیۂ غالب	حالی	-/۷۵
۲۵	محبوبۂ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۶	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۷	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۵۰
۲۸	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی مہاراج بلی رتن ناتھ سرشار لکھنوی		
۲۹		ڈاکٹر حسن فاروقی	۲/۵۰
۳۰	مسٹر ملا نوک جھونک	خواجہ عزیز حسن مجذوب	-/۷۵
۳۱	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۳۲	مصباح بلاغت مع مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۳۳	مطالعۂ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۳۴	مقدمات و مقالات	عبد الاحد خاں	۵/۵۰
۳۵	منتخب سوانح اولادِ ملک	نجم الدین نقوی	-/۵۰
۳۶	مفتاح العربیہ شرح	محمد حسین شمس علوی	۲/-

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندانِ دار العلوم کے نام	عبد الماجد دریابادی	-/۸۰
۲	نقش امروز ایران	ڈاکٹر رغب حسین	
۳	نشاطِ غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴/-
۴	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۳/-
۵	نقش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین	۱۲/-
	دوم	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۲/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۶		شجاعت علی سندیلوی	۲۸/-
۷	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۸	نفحات الہند مع مقدمۂ اردو	محمد شریف	۳/-
۹	نظم سائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۰	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۳/-
۱۱	نثر بے نشتر	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۲	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۶/-
۱۳	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندانِ اسلام کے نام	عبد الماجد دریابادی	-/۸۰
۱۵	نوائے سرور جہان آبادی دیوان	ڈاکٹر حکم چند نیر	۴/۵۰
۱۶	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۷۵
۱۷	نوروز	" مائل ملیح آبادی	۱/۵۰
۱۸	نئے اور پرانے چراغ مع اضافۂ جدیدہ	آل احمد سرور	۱۲/-
۱۹	نیلم	انتصار حسین	۳/۵۰
۲۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۲۱	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۸/-
۲۲	نصاب فارسی	مع مقدمہ فارسی عبد الاحد خاں	
۲۳	منشی نولکشور نمبر		

(و)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	وعدۂ فردا	اثر رحیم آبادی	۱۵/-

(ہ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۲/-
۲	ہندی کے مسلمان شعرا		

	جادۂ جستجو	حامد اللہ افسر	1/-
۲	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	2/50
	ہندوستان کا تعمیری منصوبہ	"	1/50
	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ احسن علوی	1/-
	" " حصہ ۲	" "	1/30
	" " حصہ ۳	" "	1/40
۹	ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفیٰ احسن علوی	1/40

(ب)

	یادگار غالب	مولانا حالی	8/-
۲	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	2/50
۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	5/50

ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو نمبر ۲۸ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱. پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲. جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

۳. اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴. جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

۵. ناقابل اشاعت مضامین کو واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو / این پی ۹۳
لائسنس نمبر ۴۰۸۸/۲۰/۱۷/۹۴/۲۰
دفتر فون ۴۶۱۳۵
فون رہائش گاہ ۴۶۶۵۶

ادارۂ فروغ اردو کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۷) نومبر ۱۹۸۱ء جلد (۲۸)

ایڈیٹر: محمد حسین شمس علوی
قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند

مجلس ادارت
عبدالقوی دریابادی (بی۔اے)
سعادت علی صدیقی (ایم۔اے)
محمد حسنین علوی (ایم۔اے)

ترتیب

مجلس مشاورت

پروفیسر سید نجیب الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب شمیم قریشی ریڈر شعبۂ اردو	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر انوار الحسن	" "
پروفیسر حکم چند نیر	بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر فضل امام	راجستھان "

زر سالانہ اعزازی: تیس روپے
عوام سے: پندرہ روپے
فی پرچہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ
ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید افضال حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

سعادت علی صدیقی

اپنی باتیں

سیاست کے بازی گروں اور مفاد پرست اُردو رہنماؤں کی ملی بھگت کے باعث گذشتہ ۳۴-۳۵ برسوں میں اُردو کا مسئلہ اتنا پیچیدہ اور تشویش ناک ہو گیا ہے کہ جس کا سلجھنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جب کوئی نازک وقت آتا ہے یا اپنا مطلب ہوتا ہے تو اس شدت اور کثرت سے اُردو کی یاد آتی ہے کہ ہر شخص دھوکا کھا جائے اور مطلب پورا ہوتے ہی اسے اس طرح فراموش کر دیا جاتا ہے، اُردو جیسی " میٹھی بھاشا، کا نام ان کی زبانِ مبارک پر کبھی آیا ہی نہ ہو۔ جمہوری ہندوستان میں ہر حکومت کا خواہ اس کا تعلق کسی بھی جماعت یا نظریے سے رہا ہو، یہی طرزِ عمل رہا ہے۔ الیکشن سے قبل کیسے کیسے سنہرے خواب دکھائے جاتے ہیں، کتنے خوبصورت وعدے کئے جاتے ہیں، اور نت نئے ڈھونگ رچائے جاتے ہیں، نام نہاد اُردو دوست اور رہنما کی سیاسی جماعتوں کے ڈرامے میں صرف شریک ہی نہیں ہوتے، اہم رول بھی ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سادہ لوح اُردو والے دھوکا کھا جاتے ہیں، سیاسی بازی گروں کی لن ترانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور کاردانِ اُردو کے خود ساختہ ٹھیکیداروں کی بن آتی ہے، حکومت اُردو کے نام پر جو کچھ دیتی ہے، کوئی کمیٹی بناتی ہے یا کسی ادارے کا قیام عمل میں آتا ہے، اس پر " وفادار اور فرماں بردار خادمانِ قوم " کی اکثریت کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی اور سعادت مندی کے ساتھ نباہتے ہیں، فطری بات یہ ہے کہ نمائشی اور فرضی کام تو بڑی دھوم دھام سے ہوتے ہیں، اصل مسائل سرد خانے کی زینت ہو جاتے ہیں اور ' بیچاری اُردو ' مولانا یونس خالدی کے اس شعر کی تفسیر ہو کر رہ گئی ہے ؎

ان کی خفگی گردشِ تقدیر دورِ آسماں
ایک میں وتنی بلائیں الاماں میرے لئے

ریاست کے موجودہ وزیر اعلیٰ مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے برسر اقتدار آنے کے بعد اُردو والے بجا طور پر یہ امید کرنے لگے تھے کہ اب ان کی زبان ... انصاف ہوگا۔ اسے ان کا جمہوری اور بنیادی حق ملے گا گذشتہ

حق تلفیوں کا ازالہ ہوگا۔ انتخابی منشور میں کئے گئے وعدوں پر عمل درآمد ہوگا۔ نیتاؤں کے منہ سے نکلے ہوئے شبد اور بانی کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ اور اُردو کو بھی یہ فخر حاصل ہوگا، کہ جمہوری ملک میں اسے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے حقوق بحال کئے جاچکے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے کرسی نشین ہونے کے بعد جس صاف گوئی اور دیدہ دلیری کے ساتھ وعدوں پر عمل درآمد کرنے کا اعلان کیا، اس سے محبانِ اُردو کو بڑی تقویت پہونچی اور انھیں یقین ہوچلا تھا کہ ان کی مادری زبان کے دن پھر گئے ہیں، اسے بہت جلد اپنے اصل وطن میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل جائے گا۔ لیکن افسوس ناک سچائی یہ ہے کہ ایک سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود اس سمت کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کی بات تو بہت دور کی ہے ابھی ان معمولی مسائل پر بھی توجہ نہیں دی گئی اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل درآمد نہیں ہوا جن کا اعلان زور و شور سے کیا جاچکا ہے وہ اعلانات اور بیانات جن کو سن یا پڑھ کر یہ تاثر عام ہوتا ہے کہ ریاستی حکومت نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہے۔ قول و عمل کے اس تضاد کی تفصیلات کی نشاندہی کرنے کے لئے دفتر درکار ہے۔ چند معمولی مثالوں سے ہی حکومت کی غیر معمولی کارکردگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

وزیر اعلیٰ کے واضح اعلانات کے بموجب ریاستی حکومت اتر پردیش میں اُردو کو اس کا جائز مقام دینے، اُردو تعلیم کی سہولیت فراہم کرنے، تعلیمی اداروں میں اُردو تعلیم کا معقول بند و بست کرنے، سرکاری دفاتر میں اُردو داں عملہ کا تقرر کرنے، بھاشا وبھاگ، محکمۂ اطلاعات وغیرہ میں اُردو کو مناسب درجہ دینے، اُردو سیل کی تشکیل کرنے اور اس نوع کے دیگر اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ محبانِ اُردو انگشت بدنداں ہیں کہ ان اعلانات کی تشہیر ہوئے کئی ماہ گزر چکے ہیں، ان پر عمل کہاں اور کیسے ہو رہا ہے؟ ان کا مشاہدہ و تجربہ تو یہ ہے کہ جن مسائل پر "اُردو دشمن جنتا سرکار" نے توجہ دینا شروع کی تھی، "اُردو دوست وشوناتھ پرتاپ سنگھ سرکار" انہیں بھی فراموش کر چکی ہے، اپنے وعدوں پر کس طرح اور کب عمل کرے گی۔ دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ، وعدہ فردا کا شکار ہو رہا ہے۔

جن تعلیمی اداروں میں اُردو تعلیم کا بند و بست جنتا حکومت کے زمانے میں ہوگیا تھا، ان کا مستقبل خطرے میں ہے۔ مرادآباد کمشنری کے، ہندو کالج مرادآباد، گوکل داس گرلز کالج مرادآباد، ہریش چندر کالج مرادآباد کو چار سال گذرنے کے باوجود "مستقل الحاق" سے محروم رکھا گیا ہے، گلاب سنگھ کالج چاندپور ضلع بجنور کا مسئلہ لیت و لعل کا شکار رہے، رُکتا، چھاوے دیا لیہ بھوڑ بریلی، گرلز ڈگری کالج بریلی، کے، جی، کے کالج مرادآباد میں یونیورسٹی سے اجازت ملنے کے باوجود اُردو پڑھانے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ مرادآباد کے دیانند گرلز ڈگری کالج، پرتاپ سنگھ گرلز انٹر کالج، دیانند گرلز انٹر کالج، آریہ سماج گرلز انٹر کالج سنبھل، گورنمنٹ گرلز انٹر کالج حسن پور، راجہ دھانی کے بھیلا ودیالیہ ڈگری کالج، ناری شکشا نکیتن ڈگری کالج، جبلی ڈگری کالج، نجیب آباد کے جین ڈگری کالج، بدایوں کے ایم۔ ایس۔ ڈگری کالج، وغیرہ وغیرہ میں اُردو پڑھنے کے خواہشمند طلبا و طالبات کی نمایاں تعداد ہونے اور محبانِ اُردو کے دیرینہ مطالبات

کے باوصف اردو تعلیم کا انتظام نہیں کیا جارہا ہے، ان اداروں اور مقامات کی بات ہی کیا، جہاں خود اُردو والے خاموش تماشائی ہیں۔ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں اُردو کا چلن کس طور اور کس پیمانے پر ہو رہا ہے اس کا جائزہ ان اضلاع خصوصاً مغربی اضلاع میں، جنھیں خود حکومت نے اُردو کا علاقہ تسلیم کیا ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں اُردو کے استعمال سے لیا جا سکتا ہے۔ صرف محکمہ روڈویز کی مثال کافی ہے، نہ تو روڈویز اسٹیشنوں پہ اُردو کے ساتھ ہونے والا سوتیلا سلوک ختم ہوا ہے، نہ بسوں پر اُردو میں نام لکھے گئے ہیں اور نہ کوئی اور سہولت دی گئی ہے۔ انفارمیشن کے دفتروں میں اُردو کا چلن تو اس وقت ہو جب خود سکریٹریٹ کے بھاشا وبھاگ (اُردو) اور ریاستی محکمہ اطلاعات میں اُردو کے ساتھ انصاف ہو، نئی اسامیوں پر تقرری کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا، جو اسامیاں گذشتہ کئی برسوں سے خالی ہیں ہنوز سرکار کی توجہ سے محروم ہیں۔ بھاشا وبھاگ (اُردو) میں ناکافی اسٹاف ہونے کی وجہ سے وہاں کا کام بُری طرح متاثر ہو رہا ہے، اُردو گزٹ جیسے تیسے چھپ تو رہا ہے لیکن اس کا ترجمہ "ماشاء اللہ" اور معیار "سبحان اللہ" ہوتا ہے، ٹھیکے پر دیے گئے کام کا جو حشر ہوتا ہے وہی اُردو گزٹ کا بھی ہے، نہ تو کسی ادارہ کو توفیق ہوتی ہے کہ اس طرف توجہ دے اور نہ حکومت کو یہ احساس کہ ماہرین زبان کی کمیٹی تشکیل کرکے، اس کی اصلاح کی جائے۔ محکمہ اطلاعات کے ضلعی دفاتر میں اُردو کے ساتھ ہونے والا سلوک ناقابل بیان ہے۔ ریاستی حکومت کا اُردو سیل کہاں ہے اور کس حال میں ہے، کون بتا سکتا ہے؟

یہ اور ایسے بہت سے مسائل ہیں جن پر فوری توجہ دینا چاہیئے تھی لیکن ریاستی حکومت پہلو تہی سے کام لے رہی ہے، اس کی توجہ "عالمی اُردو کانفرنس" کے انعقاد پر ہے، قصور حکومت کا ہو یا اس کے ان صلاح کاروں کا جو اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے اسے گمراہ کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ نقصان اُردو اور اُردو والوں کا ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ معمولی مسائل کو حل کئے بغیر، اور اپنے وعدوں پر عمل درآمد کئے بنا عالمی اُردو کانفرنس کا خواہ وہ کتنی ہی اہم اور مفید کیوں نہ ہو، جواز کیا ہے؟

ماہنامہ فروغ اُردو کی بقاء کی خاطر جو کہ وہ مسلسل ۱۹۵۲ء سے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے کر رہا ہے، ہر محب اُردو کا فرض ہے کہ وہ ماہنامہ فروغ اُردو کے لئے خریدار فراہم کرے تاکہ ماہنامہ برابر جاری رہ سکے ورنہ اقتصادی حالات اور روز افزوں اخراجات نے اراکین ادارہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ سوچنے پر مجبور ہوں، کہ آئندہ کیا قدم اُٹھایا جائے، اس کیلئے ہم پُر زور اپیل کرتے ہیں کہ قارئین عملی اقدام کرکے ماہنامہ کی بقاء کی خاطر جدوجہد کریں اور پانچ پانچ خریداری کی ذمہ داری سنبھال کر اراکین ادارہ کو ممنون کرم فرمادیں۔

منیجر
ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

مانک ٹالہ:

پریم چند سیکولر انسان تھے
وہ ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف سینہ سپر رہے

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم جو نہ صرف عربی، فارسی اور اُردو کے عالم فاضل تھے۔ بلکہ اُردو کے صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ عالم اسلام میں مولانا نہایت ہی عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ نہایت ہی نڈر مقرر اور مصنف تھے۔ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کے لئے سینہ سپر ہوجاتے تھے۔

مولانا مرحوم اپنی کتاب "معاصرین" میں صـ ۱۶۹-۱۷۰ پر منشی پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں: "..... جب ان کا ناول "چوگان ہستی" نکلا تو میں نے خوش ہوکر ان سے کہا۔ "اس کا مصنف مسلمان کیوں نہیں ہوجاتا" تو اس پر ہنسا کئے اور بولے تو یہ بولے "کیا ہندو کیا مسلمان سب ایک ہی ہیں"..... بڑی حد تک گاندھی جی کے پیرو تھے، تشدد، مارپیٹ، بلوہ، فساد کے آدمی کبھی نہیں ہے۔ ہمیشہ انسانیت و شرافت ہی کی خدمت و نصرت کیا کئے۔

مولانا مرحوم منشی پریم چند کے معاصرین میں سے تھے اور بقول مولانا "..... کچھ روز بعد ان کی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی"

(ایضاً صـ ۱۶۹)

اتنی بے تکلفی کے بعد مولانا نے پریم چند کے اندر اور پریم چند نے مولانا کے اندر ضرور جھانکا ہوگا۔ لیکن مولانا کو پریم چند میں کہیں فرقہ واریت کی بو نہیں آئی۔ مولانا مرحوم جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر ہوجاتے تھے۔ انھیں پریم چند میں کہیں بھی جارحانہ فرقہ پرستی کی بو" نہ آئی لیکن شبلی صاحب قبلہ کو دودھ کے دانت ٹوٹتے ہی منشی پریم چند کے منہ سے جارحانہ فرقہ پرستی کی بو آنے لگی۔

مولانا مرحوم نے منشی پریم چند کے نام اپنے خط میں خود اقرار کیا ہے کہ "..... صاحب سے زیادہ FANATIC قسم کا مسلمان ہوں۔"

لیکن اس قدر فینٹک مسلمان ہوتے ہوئے بھی پریم چند انھیں پریم کی مورتی ہی نظر آئے طوالت کے اندیشہ کے باوجود کہ کل کلاں کوئی مجھ پر یہ الزام نہ لگا دے کہ میں نے مولانا کے الفاظ سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کئے۔ حالانکہ اس فن میں قبلہ شبلی صاحب ماہر ہیں، چھٹی پتری جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۸۱ پر مولانا کا جو خط چھپا ہے وہ من و عن پیش ہے:

۲۰ راکتوبر ۱۹۷۸ء . دریاباد بارہ بنکی

مکرم گستر۔ کتاب پروانہ بھو ہو گئی تھی۔ شکریہ ادا کرنا الگ رہا آج کے قبل رسید تک لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ بہرحال رسید و شکریہ دونوں عرض ہیں ریویو بھی اگر خدا کو منظور ہے کچھ روز میں نکل جائے گا۔

چوگان ہستی، میں نے ایک مسلمان نوجوان دوست کو دے دی تھی جو کلکتہ یونیورسٹی کے تازہ ایم۔ اے (ہسٹری) ہیں اور اُردو ادب کا بھی اچھا خاصہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان سے اور کئی کتابوں پر بھی ریویو لکھوا چکا ہوں۔ آپ کی کتاب جب ان کے پاس بھیجی تو مختصراً بعض POINTS لکھ دیئے تھے کہ ان پہلوؤں کو ریویو میں دکھائیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے کتاب سے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی اور آج

خدا خدا کرکے ریویو لکھ کر بھیجا ہیں اس ریویو کو بجنسہٖ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس سے متفق نہیں اور اس لئے اسے شائع بھی نہ کراؤں گا۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ آپ کے نوٹس میں یہ بات آجائے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس کتاب کو اس پہلو سے بھی دیکھ رہا ہے۔ میں ریویو نگار کے دعوے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ مجھے کہیں بھی PESSIVE اور ANTI ISLAMISM AGG۔ قسم کی ہندویت نظر نہیں آئی (حالانکہ میں ریویو نگار صاحب سے کہیں زیادہ FANATIC قسم کا مسلمان ہوں) تاہم آپ کے علم میں یہ ضرور آنا چاہیئے کہ ایک جماعت کے نزدیک آپ کی عبارت سے ایک ایسا مفہوم بھی نکلتا ہے۔

بعد ملاحظہ یہ ریویو واپس فرما دیا جائے میں ان صاحب کو واپس کرکے کسی دوسرے صاحب سے لکھواؤں گا خود لکھنے کی فرصت کہاں سے نکالوں۔ زیادہ تسلیم عبدالماجد "

منشی پریم چند پر علی گڑھ، بیلچھی، جمشید پور، بشرامپور وغیرہ میں فرقہ پرستی کا بارود جھڑکنے سارا ماحول بھسم کر دینے والے

[illegible]

دکھانے والے حضرات کی خدمت میں اب وہ تحریریں پیش کی جاتی ہیں جو پریم چند نے ہنس اور جاگرن میں وقتاً فوقتاً لکھیں اور جن کا تین جلدوں کا سنگرہ "ودودھ پرمنگ" کے نام سے امرت رائے نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر ٹی۔ این لکھنہ نے ہماری زبان ۸ فروری ۱۹۸۱ء) میں اپنے مضمون "پریم چند اور فرقہ واریت" (صفحہ نمبر ا۔ ۲ اور ۵) میں ان کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

"اگر فرقہ پرستی اچھی ہو سکتی ہے تو غلامی بھی اچھی ہو سکتی ہے۔ مکاری بھی اچھی ہو سکتی ہے، جھوٹ بھی اچھا ہو سکتا ہے"..... (ہنس جنوری ۱۹۳۴ء)

"یہ ماننے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان دو فرقوں میں کشمکش، شبہ اور نفرت کی جڑیں تاریخ میں ہیں۔ مسلمان فاتح تھا اور ہندو مفتوح۔ مسلمان بادشاہوں نے سختی سے کچھ ظلم کئے..... ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اذان اور قربانی کے موقعوں پر مسلمانوں کی طرف سے زیادتیاں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر مسلمان اب بھی، میرے دادا سلطان تھے، کے نعرے لگاتے ہیں..... تبلیغ کے معاملے میں زیادتی مسلمانوں نے کی مگر ان ساری وجوہ ودلائل اور واقعات کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کو اس سے کہیں زیادہ برداشت کی ضرورت ہے"

(اس تحریر کا ڈاکٹر لکھنہ نے حوالہ نہیں دیا اور جہاں نقوسے کاٹے ہوئے ہیں یعنی..... لکھا ہوا ہے وہ بھی ڈاکٹر لکھنہ کی طرف سے ہے ـــــ اس تحریر سے پہلے ڈاکٹر لکھنہ کے یہ الفاظ بھی نوٹ کر لئے جائیں جو انھوں نے مندرجہ بالا پریم چند کی تحریر سے پہلے لکھیں ہیں ـــــ "پریم چند اعلان کرتے ہیں کہ فرقہ پرستی سماج کا کوڑھ ہے اس کوڑھ کی وجہ کیا ہے۔ یہ سوال ملک کے سامنے ہمیشہ بنا رہا۔ پریم چند کے ذہن پر یہ سوال برابر منڈلاتا رہا ہے جو دوسرے لوگ چاہے وہ سیاسی رہنما ہوں یا سماجی مصلح، تہذیب و تمدن کے ماہر ہوں یا فلسفی ـــــ اس سوال سے سید ھے نہ

نکلتے۔ لیکن پریم چند اس سوال کو تاریخ اور تہذیب کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں ــــ")

اس کے بعد ڈاکٹر کھنہ لکھتے ہیں :۔

"اس مشورے کے بعد پریم چند اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں جنھیں سنہری لفظوں میں لکھا جانا چاہیے۔

تاریخ سے ورثے میں ملی ہوئی عداوتیں مشکل سے مرتی ہیں لیکن مرتی ہیں۔ امر (جاوداں۔ مانک شالہ) نہیں ہوتیں۔ مسلمانوں کی اس مانگ پر کہ ہندو مسجدوں کے آگے باجے نہ بجائیں ہندوؤں نے یہ مانگ رکھی تھی کہ مسلمان مندروں کے سامنے سے باجے بجاتے ہوئے مت جائیں۔ ہندوؤں کی اس مانگ کی مخالفت کرتے ہوئے پریم چند فرماتے ہیں۔ "ایک تو کسی بھی شہر میں مندروں کی تعداد زیادہ ہے۔ دوسرے ہندوؤں میں پوجا گھنٹے گھڑیال کے ساتھ ہوتی ہے۔ تیسرے ہندوؤں کی سندھیا۔ ہیون، اوپاسنا ایکانت میں ہوتی ہے۔ اس لئے ایک واجب مانگ کے سامنے جوابی مانگ رکھنا کوئی اچھی مانگ نہیں ہے..... گئوکشی کے معاملے میں ہندوؤں نے شروع سے ابتک نامنصفانہ ڈھنگ اختیار کیا ہے..... ہم جس جانور کو مقدس سمجھیں، لیکن دوسرے بھی ایسا سمجھیں یہ خام خیالی ہے..... رہا تبلیغ کا مسئلہ..... ہر مذہب کو اختیار ہے۔ بشرطیکہ مقصد سچے معنوں میں مذہب کا فروغ اور اس کے اصولوں کا پرچار ہو ــــ"

پریم چند نے ملکانہ راجپوتوں کی شدھی کے مسئلہ کو لے کر اسی لئے آریہ سماجوں سخت مخالفت کی تھی کہ اس میں سچے معنوں میں مذہب کے فروغ اور اس کے اصولوں کے پرچار کا مقصد نہیں تھا بلکہ فتنہ و فساد کو بڑھاوا دینے کی تحریک کارفرما تھی (دیکھئے پریم چند کا دو خط دیا نرائن نگم کے نام جو ہیں نے یکم فروری [illegible] کے 'عظیم آباد ایکسپریس' میں نوٹ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پریم چند نے زمانہ میں آریہ سماجیوں کے خلاف ایک سخت مضمون لکھا تھا جسے پڑھ کر آریہ سماجی برافروختہ بھی ہوئے تھے) اگر پریم چند جناب شبلی صاحب کے قائم کردہ معیار کے آریہ سماجی ہوتے تو وہ باجے، قربانی اور شدھی کے مسئلوں کو لیکر آریہ سماجیوں / دوسرے ہندوؤں کے ہر مطالبے یا اقدام کی حمایت میں لکھتے۔ خاص کر جب کہ وہ اُردو سے ہندی میں منتقل ہو گئے تھے۔ اور انھیں ہندی میں اپنا امیج بنانے کے لئے اس بات کی سخت ضرورت تھی۔

ہندو مسلم فسادات کی مخالفت میں وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے کانپور کے ایک فساد کے بارے میں وہ سرکار کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں "ایک ہفتہ تک کانپور میں بدامنی کا دورِ دورہ رہا سرکار پوری طاقت کے بعد بھی اس پر قابو نہ پا سکی۔ عقل یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتی کہ جو سرکار سیاسی تحریکوں کو توڑنے میں سرگرمی سے کام لیتی ہے۔ اتنی آسانی سے گولی چلوا سکتی ہے وہ اس موقع پر کمزور ہو گئی کہ اس کی موجودگی میں خون کی ندی بہہ گئی اور وہ کچھ نہ کر سکی...... (ہنس مارچ ۱۹۳۱)

آگے ڈاکٹر کھنہ کے الفاظ میں پڑھئے :

"پریم چند یہ واضح کرتے ہیں کہ اگر سرکار کو کوئی ڈر ہوتا۔ اپنی جڑیں اکھڑ جانے کا اندیشہ ہوتا تو وہ یوں الگ تھلگ نہ رہتی۔ پریم چند اس زمانہ میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادوں سے بے چین ہو کر جنگ آزادی کی ایک خامی کو پوری طرح سامنے لاتے ہیں۔ وہ صاف صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ ان فسادوں سے اگر کوئی سبق حاصل ہوتا تو وہ یہ کہ ـــ مسلم بھائیوں کو اپنے ساتھ نہ لے چلنے میں ہم نے بھول کی ہے"

اسی سلسلے میں پریم چند آگے لکھتے ہیں۔ "جس کام میں ہم

شریک نہیں ہوتے۔ جس کی کامیابی کی ہمیں کوئی اُمید نہیں تھی۔ اسے کامیاب ہوتے دیکھ کر ہمیں قدرتی طور پر چڑ ہوتی ہے۔"

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کی پریم چند نے کھلم کھلا نہایت شدید مخالفت کی۔ زمانہ فروری ۱۹۲۴ء میں لکھتے ہیں: "ایک بھی ذمہ دار کانگریس کے نیتا نے اعلان کر کے ان تحریکوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں کیا پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ لالہ بھگوان داس۔ لالہ شری پرکاش ان آدمیوں میں ہیں جن سے زیادہ اخلاقی حوصلے کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے ایک روز ان کے خلاف ورزی کی اور دوسرے روز اس خلاف ورزی سے انحراف کر لیا جب ایسے لوگ دباؤ میں آجائیں تو پھر انصاف کی اُمید کس سے کی جائے۔"

ڈاکٹر ٹکھنے کے مضمون میں پریم چند کے اور بھی بہت اہم حوالے تھے۔ لیکن طوالت کے ڈر سے پیش نہیں کئے گئے۔ میرے خیال میں شبلی صاحب اور ان کے قبیلے کے لوگوں کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

جیسا کہ میں عظیم آباد اکسپریس میں لکھ چکا ہوں کہ آریہ سماج ہندوؤں کی ایک خالص دھارمک اور اصلاحی تحریک تھی۔ جس میں مہرشی دیانند نے ہندو سماج کو اس کی خرافات پر جھنجھوڑا تھا۔ اس زمانہ میں ہر پڑھا لکھا آدرش وادی ہندو اس تحریک سے متاثر ہوا تھا۔ حتیٰ کہ پریم چند نے اس تحریک سے متاثر ہو کر خود ایک بال ودھوا سے شادی کی تھی۔ مہرشی دیانند نے مورتی پوجا کی مخالفت کر کے ایک بھگوان کی عبادت کی تلقین کی تھی جو اسلام کے مسلک سے بالکل میل کھاتی ہے۔ آریہ سماجیوں میں اگر کوئی انفرادی طور پر فرقہ پرستی کی حمایت کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساری آریہ سماج قابل گردن زدنی ہو گئی۔ مسلمانوں میں بہت سے اکابر ایسے ہیں جو سوائے اسلام کے باقی سب مذاہب کو جھوٹا قرار دیتے ہیں اگر سوامی دیانند نے یہ نعرہ لگایا کہ ویدک دھرم ہی ایک سچا مذہب ہے تو اس میں اُبلنے اُچھلنے کی کیا بات ہے۔ اگر آپ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں، اس کے اصولوں کا پرچار کر سکتے ہیں تو ہندوؤں کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہوئے اس کے فروغ اور اس کے اصولوں کا پرچار کریں۔ مسلمان اسے تبلیغ کا نام دیتے ہیں۔ ہندو اسے شدھی کا نام۔

اس کے باوجود جب منشی پریم چند نے یہ محسوس کیا کہ آریہ سماجی شدھی کی آڑ میں فتنہ و فساد کو ہوا دے رہے ہیں تو انھوں نے اس کی شدید مذمت کی کیا اس شخص کی اس زمانہ کی تحریروں کو (جو خطوط کی شکل میں ہیں۔ اور اگر ان کے مرتبین انھیں سنسر کر کے جیسا کہ شبلی صاحب نے ان پر الزام لگایا ہے شائع کرتے حالانکہ وہ چاہتے تو وہ پریم چند کا امیج بوسٹ BOOST کرنے کی خاطر ایسا کر سکتے تھے) جس زمانہ میں کہ اس کا شعور پختہ نہیں تھا اور ذہن پر ایک الگ ہی رنگ تھا، یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کہ وہ اس لئے فرقہ پرست تھے کہ انھوں نے نگم صاحب کو لکھا تھا "آپ کے اخبار کا نمونہ، کامریڈ ہو لیکن پالیسی خالص ہندووانا کہ میرا اب ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا۔" یا یہ کہ "کسی ہندو کو اُردو سے فائدہ ہوا ہے۔ بال مکند گپت کی طرح مجھے بھی ہندی میں جانا پڑے گا۔" تو کیا آپ منشی پریم چند کی ساری زندگی کی ہندو مسلم ایکتا کی کوششوں پر پانی پھیر کر ان کی ان تحریروں کو پکڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اُچھل کود مچانا شروع کر دیں گے؟ کیا یہ ایک ایماندار محقق کا طرز انداز ہے یا ایک جماعت اسلامی والے اور مسلم لیگی کا طرز فکر ہے؟

۲۶ جنوری ۱۹۸۱ء کے عظیم آباد اکسپریس کے انٹرویو میں ادیندر ناتھ اشک صاحب نے اور بھی بہت سی باتیں واضح کر دی ہیں جن کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ ان باتوں کو یہاں دہرانے

کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ کچھ حاسد قسم کے مسلمان ادیبوں نے یہ شور مچایا تھا کہ "ہندو لوگ اچھی اُردو نہیں لکھ سکتے۔ (مدن گوپال کے مضمون کا ترجمہ عظیم آباد ایکسپریس ۱۱ جنوری صفحہ نمبر ۱) اور کہ حالانکہ اُردو رسالوں کے تمام اڈیٹر مسلمان تھے اور پریم چند جیسے عظیم افسانہ نگار کی تخلیق کو ایم اسلم جیسے تھرڈ ریٹ افسانہ نگار کے بعد ہی جگہ دیتے تھے جب یہ بات مجھے معلوم تھی تو پریم چند کو کیوں نہ بری لگتی ہوگی ـــ ایسے میں اگر وہ ہندی میں لکھنے لگے۔ اور شہنشاہِ ناول کہلائے تو میں ان کے اس ردِ عمل کو ایک خوددار ادیب کا عمل کہوں گا ایک فرقہ پرست کا نہیں۔" (اشک)

اور یہ بات انتہائی خوشی کی بات ہے کہ کچھ تنگ نظر مسلمانوں کو چھوڑ کر اُردو کے سبھی نقادوں نے ایم۔ اسلم پر منشی پریم چند کو فوقیت دی (جو کہ ان کا حق تھا) باوجود ہندی میں بھی لکھنے کے، اُردو والوں نے پریم چند ہی کو اولیت دی۔ اور ایم اسلم صاحب کو بانس پر چڑھانے کے باوجود انھیں اُردو ادب میں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ کیوں کہ ان کی تحریروں میں دم ہی نہ تھا۔

پریم چند کے خلاف شبلی صاحب کے لگائے ہوئے اس الزام (کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں جتنے مسلمان کردار پیش کئے ہیں وہ سب بُرے کردار ہیں) کے بارے میں اشک صاحب نے نہایت خوبصورت وضاحت پیش کی ہے۔ "میرے خیال میں دیکھنا یہ نہیں چاہئے کہ کردار ہندو ہے یا مسلمان۔ بلکہ یہ کہ تخلیق میں کیسا اترا ہے۔ نقلی لگتا ہے یا اصلی۔ بنا ہوا لگتا ہے۔ یا زندگی سے اٹھایا گیا ...... پریم آشرم کا ولن ہندو ہے۔ گیان شنکر لیکن ایسا لاجواب کیریکٹر پریم نے کاغذ پر اتارا ہے..... اس کے علاوہ "عیدگاہ" پریم چند کی عظیم کہانی ہے جو آج بھی دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کا ہیرو ایک مسلمان لڑکا ہے۔ اگر پریم چند جیسا کہ ان کی شہرت کو دھندلانے کی ناکام کوشش کرنے والے، غالباً خود تعصب کے مارے مخالفین کہتے ہیں، سچ مچ فرقہ پرست ہوتے تو اتنے بھلے اور آدرش کردار کو مسلمان رکھنے کے بجائے ہندو کیوں نہ رکھتے؟ حامد کی جگہ رام اور شام ہوتے تو کہانی میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ عید کی جگہ کوئی ہندو تہوار رکھ دیا جاتا۔

اس کے علاوہ آدمی کا شعور پہلے بھی خام ہوتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ پختہ ہوتا ہے۔ ادیب کے خام شعور سے لکھی گئی تخلیقات کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بددیانتی ہے۔ میں نے پریم چند کے خلاف جو مضامین پڑھے ہیں وہ مجھے فرقہ وارانہ ذہنیت والے ان لوگوں کے ایسے ہی مضمون لگے ہیں جنھیں ادب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور جنھیں اس عظیم فنکار کا نام بدنام کرنے سے غرض ہے، جو بدقسمتی سے غیر قوم کا ہے......" (عظیم آباد ایکسپریس یوم جمہوریہ نمبر 25 جنوری صفحہ 8/9)

پریم چند کی ایک اور مشہور کہانی ہے حج اکبر کیا شبلی صاحب کی نظر سے وہ کہانی گزری ہے۔ پریم چند اگر چاہتے تو وہ سب کردار ہندو ہو سکتے تھے۔ اور عباسی کی جگہ کوئی دیوکی حج کی تمنا کے بجائے تیرتھ یاترا کی تمنا کر سکتی تھی۔ پریم چند کی حج اکبر اگر میں نے نہ پڑھی ہوتی تو شاید ہندو مسلمان فساد پر (تقسیم وطن کے) میں اپنی کہانی 'حج اکبر' نہ لکھ سکتا۔ یہ وہ کہانی ہے جسے ڈاکٹر واحد [illegible] نے خاص طور پر سراہا ہے۔ اور دیگر نقادوں نے بھی بہت پسند کیا ہے اس کی بنیاد صرف اس ایک واقعہ پر ہے کہ فسادات کے دنوں میں ہماری ایک چھوٹی سی ورکشاپ کے مسلمان ٹھیکے دار نے ورکشاپ کے ہندو چوکیدار کو سامان ڈھونے والے ایرٹے پر لٹا کر اس کو بوٹوں کے گٹھوں سے ڈھانپ کر لاہور ریلوے اسٹیشن پر صحیح سلامت پہنچا دیا تھا۔

میں بہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منشی پریم چند کے کچھ

... بارے

... زمانہ میں

... کیا جا سکتا ہے کہ اسکا

... یا ہوگا۔

... پریما کے نام سے ۱۹۰۷ء میں انڈین پریس سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ (ایضاً) یعنی اُردو میں شائع ہونے کے ڈیڑھ دو برس بعد شائع ہوا ہوگا۔ اور اُردو کا مسودہ تیار ہونے کے بعد ہی ہندی کا مسودہ تیار ہوا ہوگا۔ جس کی تیاری میں بھی کم سے کم ایک سال تو لگا ہوگا۔

آپ اوپندر ناتھ اشک صاحب کے یہ الفاظ بھی پڑھئے۔

"...... آدمی کا شعور پہلے خام ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پختہ ہوتا ہے۔ ادیب کے خام شعور سے لکھی ہوئی چیزوں کو اُچھالنا اور پختہ شعور سے لکھی ہوئی تخلیقات کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بد دیانتی ہے....."

اس کے بعد شبلی صاحب کی یہ تحریر (مطبوعہ عظیم آباد اکسپریس صفحہ تین ۲۸ ستمبر ۱۹۸۰ء ملاحظہ فرمائیے۔

"...... قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی وہ اُردو کے مخالف ہو چکے تھے (ذرا لہجہ ملاحظہ فرمائیے۔ مانک ٹالہ) ان کے ابتدائی ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کے یہ الفاظ ثبوت کے لئے کافی ہیں۔" جناب من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نہ نقل کر لی۔ اُردو زبان پر ایسے ... آتا ہے (ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے — مانک ٹالہ) — اور یہ غصہ 'پریما' میں ہندی زبان پر نہیں آتا بلکہ اپنے آپ پر آتا ہے..... (یہاں بھی ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے۔ مانک ٹالہ)

پہلے منشی پریم چند نے اُردو کو بہت بُرا بھلا کہہ ڈالا ... اس نے شبلی صاحب کا برہم ہونا اور منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کا بھانڈا پھوڑا ہے میں پھوڑنا بالکل بجا ہے۔ بس اس خاکسار کی اس قدر عرض ہے کہ قبلہ شبلی صاحب کی ایک چھوٹی سی خراب عادت ہے کہ اپنی مطلب برآری کے لئے وہ اکثر باتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں اس لئے وہ "ہم خرما و ہم ثواب" کے پہلے چار صفحے (کیونکہ صفحہ تین پر یہ اقتباس ہے) عظیم آباد اکسپریس میں شائع فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ تاکہ عظیم آباد اکسپریس کے قارئین کو بھی پتہ چل جائے کہ انھوں نے غریب اُردو پر کس قدر دست درازی فرمائی ہے۔ چار صفحے اس لئے لکھے ہیں کہ ہر بات پورے تناظر میں سامنے آئے۔ (ویسے میں اپنے طور پر اس ناول کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ بہر حال شبلی صاحب کے پاس یہ ناول موجود ہو اور وہ فروخت کرنے کے موڈ میں ہوں۔ آپ اسے خریدنے کے لئے تیار ہوں، اور اس کی قیمت کسی RARE BOOKS EXPERT سے ڈلوا کر مجھے لکھ بھیجیں)

اگر پریم چند نے اپنے ناپختہ زمانے کے دور میں ایک غلط بات کہی (میرا اپنا خیال ہے کہ بات کچھ اور ہی ہوگی) اور اسے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت یہ فالتو بات کاٹ دی ہوگی تو اس میں برہم ہونے کی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے —— معافی چاہتا ہوں اگر انھوں نے اُردو کو ایک گالی دی تو ہندی کو دو گالیاں کیوں نہ دیں، کم سے کم ایک ہی گالی دیتے تاکہ ان پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگتا اور مجھے اپنا وقت برباد کر کے یہ طویل مضامین تو نہ لکھنے پڑتے۔

اس بات میں شک و شبہہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ کہ منشی پریم چند نے اپنے اس ناول کو اپنے ناپختہ دور کی ایک،

کہانیوں میں اس طرح کے بہت سے آدرش مسلمان کردار مِل جائیں گے۔

شبلی صاحب نے ہندی کی جن بارہ کہانیوں کا ذکر کیا ہے۔ براہِ مہربانی وہ اِن کی نشاندہی فرمائیں کہ وہ کونسی کونسی کہانیاں ہیں اور ان کے کس کس مجموعہ میں چھپی ہیں اور اس نشاندہی کے بعد وہ اِن سارے مجموعوں کی ایک ایک جلد مجھے اور دوسرا سیٹ رضوان احمد صاحب کی خدمت میں ارسال فرمادیں تاکہ انھیں عظیم آباد اکسپریس میں چھپوا کر منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کو ننگا کیا جا سکے۔ میں دونوں سیٹوں کی پوری قیمت رجسٹری ڈاک خرچ سمیت ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اور اگر شبلی صاحب کُل قیمت رجسٹری ڈاک خرچ کا تخمینہ مجھے ارسال فرمادیں تو میں یہ رقم پیشگی ان کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر بنک ڈرافٹ ارسال کر دوں گا (میرا پتہ رضوان صاحب سے حاصِل کیا جا سکتا ہے)۔

شبلی صاحب نے پریم چند کے جو پونے دو سو افسانے پڑھے تھے اور انھیں اِن میں ایک بھی اچھا کردار نظر نہیں آیا، اِن کے سارے کے سارے مسلم کردار انتہائی گھناؤنے مکروہ اور گندی ذہنیت کے حامل تھے۔ (عظیم آباد اکسپریس صفحہ ۳، ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء) کیا انھیں ان میں مندرجہ بالا دونوں افسانے نظر نہیں آئے؟ منشی پریم چند کی مندرجہ بالا مبینہ فرقہ پرست بارہ کہانیوں کو اُردو میں پیش نہ کر سکنے کی ایک وجہ میں نے یکم فروری کے عظیم آباد اکسپریس میں پیش کی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ شوا بدے۔ پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کی بہت سی ہندی کہانیاں زیر ترجمہ تھیں تاکہ انھیں اردو [illegible] لیکن ان کی مسلسل بیماری کے باعث اس کام میں تاخیر ہوتی رہی۔ اِن کہانیوں کا ترجمہ ان کی موت سے پہلے ممکن [illegible] اصل

[illegible] مسکا اور پریم چند کو اس پر نظر ثانی کرنے کا بھی موقع نہ مِل سکی۔ یہ ترجمہ انتہائی ناقص تھا۔ مترجم محض باتکا تھے۔ جو بڑے غلط قسم کے شخص تھے۔ مثلاً ہندی میں پریم چند نے لکھا تھا: اس کا خون کھول رہا تھا" سحر ورما صاحب نے اُردو میں اسے "اس کا خون اُبل رہا تھا" بنا دیا۔ اسی طرح بر وٹیاں پکائیں کو روٹیاں بنائیں / ایک جون چبینے ہی پر کٹتا کو ایک جون چرن ہی پر کٹتا تھا / کو مل سنگیت کا گیت دان کر رہی تھی کو کومل راگنی کی خفیہ خیرات کر رہی تھی اجیسی تحریر سے سجایا تھا (یہ مثالیں میں نے ڈاکٹر صفدر آہ کے مضمون جو عظیم آباد اکسپریس میں ۹ نومبر کو شائع ہوا تھا سے لی ہیں)۔ مختصر یہ کہ پریم چند کی اکثر کہانیاں بحالت مجبوری اُردو میں منتقل نہیں ہو سکی تھیں۔

"ہم خرما و ہم ثواب" منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں سے ایک ناول ہے جس کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ (ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند تنقیدی مطالعہ صفحہ 136) پھر بھی خیال غالب ہے کہ وہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ ۲ فروری ۱۹۰۸ء کو لکھے ہوئے نگم صاحب کے نام لکھے ہوئے انگریزی خط میں جس ناول کا ذکر ہے (جس کا مسودہ پریم چند نے نگم صاحب کو بغرض مشورہ ارسال کیا تھا) وہ مسودہ اسی ناول کا تھا (ایضاً "ماہنامہ زمانہ" اور اس کے بعد "زمانہ" میں ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ اشتہار برابر شائع ہوتا رہا..." (ایضاً صفحہ نمبر 130)

ڈاکٹر صاحب کا خیال غالب ہے کہ یہ اِن کا دوسرا ناول ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق ان کا پہلا ناول "اسرارِ معابد" دوسرا ہم خرما و ہم ثواب [illegible] (".... کہ ہم خرما و ہم ثواب [illegible] سے بہت پہلے شائع ہوا....

[illegible]

تاریخ اشاعت درج نہیں (ایضاً) اسی لئے اس کے بارے میں حتمی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس سن میں اشاعت پذیر ہوا لیکن چونکہ اس کے اشتہار ستمبر ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں نکلنے شروع ہوئے تھے اس لئے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مسودہ ۱۹۰۵ء میں تیار ہو گیا ہوگا۔

ہندی ترجمہ پریما کے نام سے ۱۹۰۷ء میں انڈین پریس سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ (ایضاً) یعنی اُردو میں شائع ہونے کے ڈیڑھ دو برس بعد شائع ہوا ہوگا۔ اور اُردو کا مسودہ تیار ہونے کے بعد ہی ہندی کا مسودہ تیار ہوا ہوگا جس کی تیاری میں بھی کم سے کم ایک سال تو لگا ہوگا۔

آپ اوپندر ناتھ اشک صاحب کے یہ الفاظ پھر پڑھئے۔

"...... آدمی کا شعور پہلے خام ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پختہ ہوتا ہے۔ ادیب کے خام شعور سے لکھی ہوئی چیزوں کو اُچھالنا اور پختہ شعور سے لکھی ہوئی تخلیقات کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بد دیانتی ہے ....."

اس کے بعد شبلی صاحب کی یہ تحریر (مطبوعہ عظیم آباد اکسپریس صفحہ تین ۲۸ ستمبر ۱۹۸۰ء ملاحظہ فرمائیے۔

"...... قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی وہ اُردو کے مخالف ہو چکے تھے (ذرا لہجہ ملاحظہ فرمائیے — مانک ٹالہ) ان کے ابتدائی ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کے یہ الفاظ ثبوت کے لئے کافی ہیں — ' جنابِ من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نہ نقل کر لی۔ اُردو زبان پر ایسے ہی وقت غصہ آتا ہے (ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے — مانک ٹالہ) — اور یہ غصّہ 'پریما' میں ہندی زبان پر نہیں آتا بلکہ اپنے آپ پر آتا ہے ..... (یہاں بھی ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے۔ مانک ٹالہ)

لیجئے منشی پریم چند نے اُردو کو بہت بڑی گالی دے ڈالی ہے۔ اس لئے شبلی صاحب کا برہم ہونا اور منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کا بھانڈا پھوڑا ہے میں پھوڑنا بالکل بجا ہے۔ بس اس خاکسار کی اس قدر عرض ہے کہ قبلہ شبلی صاحب کی ایک چھوٹی سی خراب عادت ہے کہ اپنی مطلب برآری کے لئے وہ اکثر باتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں اس لئے وہ "ہم خرما و ہم ثواب" کے پہلے چار صفحے (کیونکہ صفحہ تین پر یہ اقتباس ہے) عظیم آباد اکسپریس میں شائع فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ تاکہ عظیم آباد اکسپریس کے قارئین کو بھی پتہ چل جائے کہ انھوں نے غریب اُردو پر کیسی دست درازی فرمائی ہے۔ چار صفحے اس لئے لکھے ہیں کہ ہر بات پورے تناظر میں سامنے آئے۔ (ویسے میں اپنے طور پر اس ناول کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ بہر حال شبلی صاحب کے پاس یہ ناول موجود ہو اور وہ فروخت کرنے کے موڈ میں ہوں۔ تو میں اسے خرید کرنے کے لئے تیار ہوں، اور اس کی قیمت کسی RARE BOOKS EXPERT سے ڈلوا کر مجھے لکھ بھیجیں)

اگر پریم چند نے اپنے نا پختہ زمانے کے دور میں ایک غلط بات کہی (میرا اپنا خیال ہے کہ بات کچھ اور رہی ہوگی) اور اسے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت یہ فالتو بات کاٹ دی ہوگی تو اس میں برہم ہونے کی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے — معافی چاہتا ہوں اگر انھوں نے اُردو کو ایک گالی دی تو ہندی کو دو گالیاں کیوں نہ دیں، کم سے کم ایک ہی گالی دیتے تاکہ ان پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگتا اور مجھے اپنا وقت برباد کر کے یہ طویل مضامین تو نہ لکھنے پڑتے۔

اس بات میں شک و شبہہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ کہ منشی پریم چند نے اپنے اس ناول کو اپنے نا پختہ دور کی ایک،

کہانیوں میں اس طرح کے بہت سے آدرش مسلمان کردار مل جائیں گے۔

شبلی صاحب نے ہندی کی جن بارہ کہانیوں کا ذکر کیا ہے۔ براہِ مہربانی وہ اِن کی نشاندہی فرمائیں کہ وہ کونسی کونسی کہانیاں ہیں اور ان کے کس کس مجموعہ میں چھپی ہیں اور اس نشاندہی کے بعد وہ اِن سارے مجموعوں کی ایک ایک جلد مجھے اور دوسرا سیٹ رضوان احمد صاحب کی خدمت میں ارسال فرمادیں تاکہ انھیں عظیم آباد اکسپریس میں چھپوا کر منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کو ننگا کیا جاسکے۔ میں دونوں سیٹوں کی پوری قیمت رجسٹری ڈاک خرچ سمیت ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اور اگر شبلی صاحب کُل قیمت رجسٹری ڈاک خرچ کا تخمینہ مجھے ارسال فرمادیں تو میں یہ رقم پیشگی ان کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ارسال کردوں گا (میرا پتہ رضوان صاحب سے حاصل کیا جاسکتا ہے)

شبلی صاحب نے پریم چند کے جو پونے دو سو افسانے پڑھے تھے اور انھیں اِن میں ایک بھی اچھا کردار نظر نہیں آیا، اِن کے سارے مسلم کردار انتہائی گھناؤنے مکروہ اور گندی ذہنیت کے حامل تھے، (عظیم آباد اکسپریس صفحہ ۳، ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء) کیا انھیں ان میں مندرجہ بالا دونوں افسانے نظر نہیں آئے؟ منشی پریم چند کی مندرجہ بالا مبینہ فرقہ پرست بارہ کہانیوں کو اُردو میں پیش نہ کرسکنے کی ایک وجہ میں نے یکم فروری کے عظیم آباد اکسپریس میں پیش کی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ [illegible] پتہ چلتا ہے کہ یہ ہرچند کی بہت سی ہندی کہانیاں زیرِ ترجمہ تھیں تاکہ انھیں [illegible] لیکن ان کی مسلسل بیماری کے باعث اس کام میں تاخیر ہو رہی۔ [illegible] گئو دان بھی ان کی موت سے پہلے مکمل [illegible]

[illegible] نہ ہوسکا۔ اور پریم چند کو اس پر نظرِ ثانی کرنے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ یہ ترجمہ انتہائی ناقص تھا مترجم سحر ورما صاحب تھے۔ جو زیادہ تر غلط ترجمے کے مرتکب ہوئے تھے۔ مثلاً ہندی میں پریم چند نے لکھا تھا: اس کا خون کھول رہا تھا" سحر ورما صاحب نے اُردو میں اسے "اس کا خون اُبل رہا تھا" بنادیا۔ اسی طرح روٹیاں پکائیں کو روٹیاں بنائیں / ایک جون چبینے ہی پر کٹتا کو ایک جون چربن ہی پر کٹتا تھا / کومل سنگیت کا گیت دان کر رہی تھی کو کومل راگوں کی خفیہ خیرات کر رہی تھی اجیسی تحریر سے بدل دیا گیا تھا (یہ مثالیں میں نے ڈاکٹر صفدر آہ کے مضمون جو عظیم آباد اکسپریس میں ۹ نومبر کو شائع ہوا تھا سے لی ہیں)۔ مختصر یہ کہ پریم چند کی اکثر کہانیاں بحالت مجبوری اُردو میں منتقل نہیں ہوسکی تھیں۔

"ہم خرما و ہم ثواب" منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں سے ایک ناول ہے جس کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔ (ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند تنقیدی مطالعہ صفحہ 136) پھر بھی خیال غالب ہے کہ وہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ ۲۰ فروری ۱۹۰۶ء کو لکھے ہوئے نگم صاحب کے نام لکھے ہوئے انگریزی خط میں جس ناول کا ذکر ہے (جس کا مسودہ پریم چند نے نگم صاحب کو بغرضِ مشورہ ارسال کیا تھا) وہ مسودہ اسی ناول کا تھا (ایضاً)

"ماہنامہ زمانہ" اور اس کے بعد "زمانہ" میں ۱۹۰۸ء کے اوائل تک یہ اشتہار برابر شائع ہوتا رہا......" (ایضاً صفحہ نمبر 133)

ڈاکٹر صاحب کا خیال غالب ہے کہ یہ اِن کا دوسرا ناول ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق ان کا پہلا ناول "اسرارِ معابد" دوسرا ہم خرما و ہم ثواب [illegible] آشنا ہے (".....کہ ہم خرما و ہم ثواب [illegible] سے بہت جلد شائع ہوا....."

[illegible]

تاریخ اشاعت درج نہیں (ایضاً) اس لئے اس کے بارے میں حتمی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس سن میں اشاعت پذیر ہوا لیکن چونکہ اس کے اشتہار ستمبر ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں نکلنے شروع ہوئے تھے اس لئے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مسودہ 1905ء میں تیار ہو گیا ہوگا۔

ہندی ترجمہ پریما کے نام سے 1907ء میں انڈین پریس سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ (ایضاً) یعنی اُردو میں شائع ہونے کے ڈیڑھ دو برس بعد شائع ہوا ہوگا۔ اور اُردو کا مسودہ تیار ہونے کے بعد ہی ہندی کا مسودہ تیار ہوا ہوگا۔ جس کی تیاری میں بھی کم سے کم ایک سال تو لگا ہوگا۔

آپ اوپندر ناتھ اشک صاحب کے یہ الفاظ پھر پڑھئے۔

"...... آدمی کا شعور پہلے خام ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پختہ ہوتا ہے۔ ادیب کے خام شعور سے لکھی ہوئی چیزوں کو اچھالنا اور پختہ شعور سے لکھی ہوئی تخلیقات کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بد دیانتی ہے ....."

اس کے بعد شبلی صاحب کی یہ تحریر (مطبوعہ عظیم آباد ایکسپریس صفحہ تین ۲۸ ستمبر 1980ء ملاحظہ فرمائیے۔

"...... قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی وہ اُردو کے مخالف ہو چکے تھے (ذرا لہجہ ملاحظہ فرمائیے — مانک ٹالہ) ان کے ابتدائی ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کے یہ الفاظ ثبوت کے لئے کافی ہیں — ' جناب من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نہ نقل کر لی۔ اُردو زبان پر ایسے بیہودہ تہمت آتا ہے (ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے — مانک ٹالہ) — اور یہ غصہ 'پریما' میں ہندی زبان پر نہیں آتا بلکہ اپنے آپ پر آتا ہے ....." (یہاں بھی ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے۔ مانک ٹالہ)

لیجئے منشی پریم چند نے اُردو کو بہت بڑی گالی دے ڈالی ہے۔ اس لئے شبلی صاحب کا برہم ہونا اور منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کا بھانڈا پھوڑا ہے میں پھوڑنا بالکل بجا ہے۔ بس اس خاکسار کی اس قدر عرض ہے کہ قبلہ شبلی صاحب کی ایک چھوٹی سی خراب عادت ہے کہ اپنی مطلب برآری کے لئے وہ اکثر باتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں اس لئے وہ "ہم خرما و ہم ثواب" کے پہلے چار صفحے (کیونکہ صفحہ تین پر یہ اقتباس ہے) عظیم آباد ایکسپریس میں شائع فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ تاکہ عظیم آباد ایکسپریس کے قارئین کو بھی پتہ چل جائے کہ انھوں نے غریب اُردو پر کس قدر دست درازی فرمائی ہے۔ چار صفحے اس لئے لکھے ہیں کہ ہر بات پورے تناظر میں سامنے آئے۔ (ویسے میں اپنے طور پر اس ناول کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ بہرحال شبلی صاحب کے پاس یہ ناول موجود ہو اور وہ فروخت کرنے کے موڈ میں ہوں۔ تو میں اسے خرید کرنے کے لئے تیار ہوں، اور اس کی قیمت کسی RARE BOOKS EXPERT سے ڈلوا کر مجھے لکھ بھیجیں)

اگر پریم چند نے اپنے ناپختہ زمانے کے دور میں ایک غلط بات کہی (میرا اپنا خیال ہے کہ بات کچھ اور رہی ہوگی) اور اسے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت یہ فالتو بات کاٹ دی ہوگی تو اس میں برہم ہونے کی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے — معافی چاہتا ہوں۔ اگر انھوں نے اُردو کو ایک گالی دی تو ہندی کو دو گالیاں کیوں نہ دیں، کم سے کم ایک ہی گالی دیتے تاکہ ان پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگتا اور مجھے اپنا وقت برباد کر کے یہ طویل مضامین تو نہ لکھنے پڑتے۔

اس بات میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ کہ منشی پریم چند نے اپنے اس ناول کو اپنے ناپختہ دور کی ایک

کہانیوں میں اس طرح کے بہت سے آدرش مسلمان کردار مل جائیں گے۔

شبلی صاحب نے ہندی کی جن بارہ کہانیوں کا ذکر کیا ہے براہِ مہربانی وہ اِن کی نشاندہی فرمائیں کہ وہ کونسی کونسی کہانیاں ہیں اور ان کے کس کس مجموعہ میں چھپی ہیں اور اس نشاندہی کے بعد وہ اِن سارے مجموعوں کی ایک ایک جلد مجھے اور دوسرا سیٹ رضوان احمد صاحب کی خدمت میں ارسال فرمادیں تاکہ انھیں عظیم آباد اکسپریس میں چھپوا کر منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کو ننگا کیا جاسکے۔ میں دونوں سیٹوں کی پوری قیمت رجسٹری ڈاک خرچ سمیت ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اور اگر شبلی صاحب کُل قیمت رجسٹری ڈاک خرچ کا تخمینہ مجھے ارسال فرمادیں تو میں یہ رقم پیشگی ان کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر بنک ڈرافٹ ارسال کردوں گا (میرا پتہ رضوان صاحب سے حاصل کیا جاسکتا ہے)

شبلی صاحب نے پریم چند کے جو پونے دو سو افسانے پڑھے تھے اور انھیں اِن میں ایک بھی اچھا کردار نظر نہیں آیا، اِن کے سارے کے سارے مسلم کردار انتہائی گھناؤنے مکروہ اور گندی ذہنیت کے حامل تھے، (عظیم آباد اکسپریس صفحہ ۳ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء) کیا انھیں ان میں مندرجہ بالا دونوں افسانے نظر نہیں آئے؟ منشی پریم چند کی مندرجہ بالا مبینہ فرقہ پرست بارہ کہانیوں کو اُردو میں پیش نہ کرسکنے کی ایک وجہ میں نے یکم فروری کے عظیم آباد اکسپریس میں پیش کی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کی بہت سی ہندی کہانیاں زیر ترجمہ تھیں تاکہ انھیں اُردو [illegible] لیکن ان کی مسلسل بیماری کے باعث اس کام میں تاخیر ہوتی جارہی۔ [illegible] گئودان بھی ان کی موت سے پہلے مکمل [illegible] کردا حل

[illegible] نہ ہوسکا۔ اور پریم چند کو اس پر نظر ثانی کرنے کا بھی موقع نہ مل سکی۔ یہ ترجمہ انتہائی ناقص تھا۔ مترجم سحر ورما تھے جو [illegible] غلط قسم کے شخص تھے۔ مثلاً ہندی میں پریم چند نے لکھا تھا: اس کا خون کھول رہا تھا" سحر ورما صاحب نے اُردو میں اسے "اس کا خون اُبل رہا تھا" بنا دیا۔ اسی طرح [illegible] روٹیاں پکائیں کو روٹیاں بنائیں / ایک جون چبینے ہی پر کٹتا کو ایک جون چربن ہی پر کٹتا تھا / کوئل سنگیت کا گیت دان کر رہی تھی کو کوئل راگوں کی خفیہ خیرات کر رہی تھی / جیسی تحریر سے سجایا گیا تھا (یہ مثالیں میں نے ڈاکٹر صفدر آہ کے مضمون جو عظیم آباد اکسپریس میں ۹ نومبر کو شائع ہوا تھا سے لی ہیں)۔ مختصر یہ کہ پریم چند کی اکثر کہانیاں بحالت مجبوری اُردو میں منتقل نہیں ہوسکی تھیں۔

"ہم خرما و ہم ثواب" منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں سے ایک ناول ہے جس کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔ (ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند تنقیدی مطالعہ صفحہ ۱۳۶) پھر بھی خیال غالب ہے کہ وہ سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۸ء کے درمیان کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ ۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۸ء کو لکھے ہوئے نگم صاحب کے نام لکھے ہوئے انگریزی خط میں جس ناول کا ذکر ہے (جس کا مسودہ پریم چند نے نگم صاحب کو بغرض مشورہ ارسال کیا تھا) وہ مسودہ اسی ناول کا تھا (ایضاً) "ماہنامہ زمانہ" اور اس کے بعد "زمانہ" میں سنہ ۱۹۰۸ء کے اوائل تک یہ اشتہار برابر شائع ہوتا رہا..... "(ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۶) ڈاکٹر صاحب کا خیال غالب ہے کہ یہ اِن کا دوسرا ناول ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق ان کا پہلا ناول "اسرارِ معابد" دوسرا ہم خرما و ہم ثواب اور تیسرا "کشنا" ہے ("..... کہ ہم خرما و ہم ثواب [illegible] نشنا سے بہت پہلے شائع ہوا....")

[illegible]

تاریخ [illegible] درج نہیں (ایضاً) اُن ما اِس کے بارے میں حتمی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس سن میں اشاعت پذیر ہوا لیکن چونکہ اس کے اشتہار ستمبر ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں نکلنے شروع ہوئے تھے اس لئے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مسودہ ۱۹۰۵ء میں تیار ہو گیا ہوگا۔

ہندی ترجمہ پریما کے نام سے ۱۹۰۷ء میں انڈین پریس سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ (ایضاً) یعنی اُردو میں شائع ہونے کے ڈیڑھ دو برس بعد شائع ہوا ہوگا۔ اور اُردو کا مسودہ تیار ہونے کے بعد ہی ہندی کا مسودہ تیار ہوا ہوگا۔ جس کی تیاری میں بھی کم سے کم ایک سال تو لگا ہوگا۔

آپ اوپندر ناتھ اشک صاحب کے یہ الفاظ پھر پڑھئے۔

"...... آدمی کا شعور پہلے خام ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پختہ ہوتا ہے۔ ادیب کے خام شعور سے نکلی ہوئی چیزوں کو اُچھالنا اور پختہ شعور سے نکلی ہوئی تخلیقات کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بد دیانتی ہے ....."

اس کے بعد شبلی صاحب کی یہ تحریر (مطبوعہ عظیم آباد اکسپریس صفحہ تین ۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء) ملاحظہ فرمائیے۔

"...... قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی وہ اُردو کے مخالف ہو چکے تھے (ذرا لہجہ ملاحظہ فرمائیے — مانک ٹالہ) ان کے ابتدائی ناول "ہم خرما و ہم ثواب" کے یہ الفاظ ثبوت کے لئے کافی ہیں —" جناب من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نہ نقل کی۔ اُردو زبان پر ایسے موقعہ [illegible] آتا ہے (ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے) — مانک ٹالہ) — اور یہ غصہ 'پریما' میں ہندی زبان پر نہیں آتا بلکہ اپنے آپ پر آتا ہے ..... (یہاں بھی ان الفاظ کو خط کشیدہ میں نے کیا ہے۔ مانک ٹالہ)

لیجئے منشی پریم [illegible] اُردو کو بہت بڑی گالی دے ڈالی ہے۔ اس لئے شبلی صاحب کا برہم ہونا اور منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کا بھانڈا پھوڑا ہے میں پھوڑنا بالکل بجا ہے۔ بس اس خاکسار کی اس قدر عرض ہے کہ قبلہ شبلی صاحب کی ایک چھوٹی سی خراب عادت ہے کہ اپنی مطلب برآری کے لئے وہ اکثر باتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں اس لئے وہ "ہم خرما و ہم ثواب" کے پہلے چار صفحے (کیونکہ صفحہ تین پر یہ اقتباس ہے) عظیم آباد اکسپریس میں شائع فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ تاکہ عظیم آباد اکسپریس کے قارئین کو بھی پتہ چل جائے کہ انھوں نے غریب اُردو پر کس قدر دست درازی فرمائی ہے۔ چار صفحے اس لئے لکھے ہیں کہ ہر بات پورے تناظر میں سامنے آئے۔ (ویسے میں اپنے طور پر اس ناول کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ بہرحال شبلی صاحب کے پاس یہ ناول موجود ہو اور وہ فروخت کرنے کے موڈ میں ہوں۔ آپ سے خریدنے کے لئے تیار ہوں، اور اس کی قیمت کسی RARE BOOKS EXPERT سے ڈلوا کر مجھے لکھ بھیجیں)

اگر پریم چند نے اپنے ناپختہ زمانے کے دور میں ایک غلط بات کہی (میرا اپنا خیال ہے کہ بات کچھ اور رہی ہوگی) اور اسے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت یہ فالتو بات کاٹ دی ہوگی تو اس میں برہم ہونے کی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے —— معافی چاہتا ہوں اگر انھوں نے اُردو کو ایک گالی دی تو ہندی کو دو گالیاں کیوں نہ دیں، کم سے کم ایک ہی گالی دیتے تاکہ ان پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگتا اور مجھے اپنا وقت برباد کر کے یہ طویل مضامین تو نہ لکھنے پڑتے۔

اس بات میں شک و شبہہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ کہ منشی پریم چند نے اپنے اس ناول کو اپنے ناپختہ دور کی ایک

ناپختہ تصنیف ہی سمجھا ہوگا اور [illegible] بنانے کی اسکیم ان کے دماغ میں ہمیشہ کلبلاتی رہی ہوگی۔ ورنہ ۱۹۲۷ء میں "پریما" کے پلاٹ میں کچھ تبدیلیاں کرکے نئے سرے سے کیوں لکھتے۔ اس کا نام "پرتگیا" کیوں رکھتے ——— ؟

"..... جو اولاً ہندی رسالہ 'چاند' الٰہ آباد میں جنوری ۱۹۲۷ء سے نومبر ۱۹۲۷ء تک قسط وار شائع ہوا۔ یہی ناول ہندی میں ۱۹۲۹ء میں "پرتگیا" کے نام سے شائع ہوا۔ اور پھر اس کا ترجمہ ۱۹۳۰ء میں "بیوہ" کے نام سے اُردو میں شائع ہو (ایضاً۔ ڈاکٹر قمر رئیس صفحہ 38 کا فٹ نوٹ) یعنی "ہم خرما و ہم ثواب" 6 – 1905ء / "بیوہ" 1930ء اور پریما 1907ء / پرتگیا 1928ء ایک ہی ناول کے نام ہیں۔

میرے پاس مکتبہ جامعہ کا ۱۹۷۷ء کا اڈیشن ہے۔ بیوہ میں ایسی کوئی تحریر نہیں جس پر انگشت نمائی کی جاسکے۔ ظاہر ہے پریم چند نے اپنی پہلی کتاب میں ترمیم اور / یا اضافہ ضرور کیا ہوگا اور انھوں نے وہ فضول جملے جو انھوں نے اپنے ناپختہ شعور کے زمانہ میں لکھے ہوں گے کاٹ دیئے ہوں گے۔ بیوہ کی ابتدا بھی آریہ سماج میں ایک لیکچر سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس میں نہ لیکچر کی تفصیل ہے اور نہ خلاصہ لیکن دان ناتھ اور امرت رائے کے مکالموں سے (جو وہ تقریر کے دوران آپس میں بول رہے ہیں) پتہ چلتا ہے کہ وہ ودھوا دواہ کی حمایت میں بول رہے ہیں۔ اس میں غریب اُردو کا مذاق اڑانے کے بجائے آریہ سماجی مقرر کی لمبی داڑھی کا مذاق اڑایا گیا ہے (صفحہ نمبر۱) بہرحال اس بات سے انکار نہیں کرتا (انکار کرنے کی فی الحال اس لئے کوئی وجہ نہیں کیونکہ میں نے ہم خرما و ہم ثواب کے ابھی تک درشن ہی نہیں کیے) اور نہ ہی یہ فیصلہ کرسکتا ہوں کہ پریم چند نے غریب اُردو سے کس حد تک بدتمیزی کی ہے) کہ شبلی صاحب کے نقل کئے ہوئے پریم چند کے الفاظ نہیں ہوں گے۔

شبلی صاحب ۱۱ جنوری ۸۱ء کے عظیم آباد اکسپریس صفحہ ۵ پر فرماتے ہیں "ہم لوگ شخصیت کے جھگڑے میں اصل اور اہم باتوں کو الجھا دیتے ہیں۔ شخصیت کی اہمیت بھی ہے مگر مذہبی سماجی اور سیاسی افکار و نظریات زیادہ اہم ہیں جنھیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں کہیں ان کی شخصیت کے متضاد رویہ کا اظہار ہوا ہے۔ وہاں بقدر ضرورت ان تضاد کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ورنہ پریم چند کی شخصیت میرے قریب اہم نہیں ہے۔ شخصیت ان کے ساتھ چلی گئی افکار و نظریات آج بھی باقی ہیں۔ حاشیہ آرائی کے ساتھ ان کی تبلیغ بھی ہو رہی ہے۔ اور ان کے اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔"

یکم فروری 1981ء کے اور مندرجہ بالا مضمون میں میں نے ضرورت سے زیادہ پریم چند کے مذہبی سماجی اور سیاسی افکار و نظریات تفصیل کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں کسی بات کو سیاق و سباق سے الگ کرکے کچھ لکھتا ہے۔ مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پریم چند فرقہ پرست تھے؟ پریم چند مسلمانوں یا اسلام کے دشمن تھے؟ اب شبلی صاحب اپنی ساری تحروں کی روشنی میں بتائیں کہ وہ خود کیا ہیں ان میں پریم چند کی خوبیوں میں سے کونسی خوبی موجود ہے۔

"اگر کوئی حاشیہ آرائی کے ساتھ ان کی تبلیغ" کر رہا ہے تو اس میں پریم چند کا کیا قصور ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی وہ "سوزِ وطن" کا قضیہ بھی گھسیٹ لائے ہیں۔ اس کا جواب ایک الگ مضمون چاہتا ہے۔ لیکن شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے چند باتیں عرض خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ پریس ایکٹ جس کا وہ بار بار ذکر فرما رہے

ہیں وہ 1867ء میں نافذ ہوا تھا یعنی آج سے 113 سال پیشتر اس کا نام تھا:۔

"THE PRESS And REGISTERATION OF BOOKS Act, 1867 (XXV of 1867)"

اس ایکٹ کی رو سے "نئی چھپی ہوئی کتابوں کے داخلہ فارم میں مصنف کا پورا نام اور پتہ مع دستخط درج کیا جانا ضروری تھا۔ اور منشی دیا نرائن نگم کا یہ بیان غلط نہیں ہے کہ "ناتجربہ کاری اور پریس ایکٹ سے ناواقفیت سے یہ غلطی ہوگئی تھی"۔ کیا شبلی صاحب نے اس ایکٹ کی تفصیلات ملاحظہ فرمائی ہے؟ شاید انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ایک سو تیرہ سال پہلے یہ ایکٹ نافذ ہوا تھا اور کہ ایک استبدادی امپیریل طاقت نے یہ ایکٹ اسلئے نافذ کیا تھا کہ ملک کے اہل الرائے لوگوں کے خیالات، زبان اور قلم کو کنٹرول میں لانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

۴۔ ۱۸۹۸ء میں اس ایکٹ میں ترمیم و اضافہ کیا گیا اس ایکٹ کا نام تھا "NEWS PAPERS (INCITEMENT TO OFFENCES) ACT." یہ ایکٹ 13 جون 1908ء کے گورنمنٹ آف انڈیا کے گزٹ میں گزٹیڈ ہوا تھا۔ یہ ایکٹ شبلی صاحب کے (مارچ 1910ء والے) پریس ایکٹ کا پیش رو تھا۔ اس میں اخباروں اور جن پریسوں میں یہ اخبار چھپتے ہیں ان پر کنٹرول بہت سخت کر دیئے تھے کیونکہ زبردست سیاسی تحریکات کے باعث گورنمنٹ سخت پریشان ہو رہی تھی۔

۵۔ شبلی صاحب جس پریس ایکٹ کا ذکر فرما رہے ہیں وہ مارچ 1910ء میں نہیں بلکہ 1910ء کے روز نازل ہوا تھا۔ اور ۱۲ فروری کے گزٹ میں گزٹیڈ ہوا تھا۔ اس میں اخبارون اور پریسوں کے ساتھ کتابوں بلکہ ہر چھپی ہوئی چیز چاہے وہ سائیکلو اسٹائل پر ہی کیوں نہ چھپی ہو پر سخت کنٹرول ہوگئے تھے۔ اسی ایکٹ سے اخبارات، رسائل اور پریسوں سے ضمانت طلبی اور ضمانت کی ضبطی کی دفعہ بھی شامل کر دی گئی۔ لیکن مضمون نگاران ایکٹوں سے پیشتر بھی سیڈیشن ایکٹ (انڈین پینل کوڈ 1860ء) کے تحت پکڑے دھکڑے جاتے تھے۔ جیسا کہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ ہوا اور اس سے بھی پہلے دوسرے بہت سے اکابرین کے ساتھ ہوا۔

۶۔ "سوز وطن" باضابطہ ضبط "نہیں ہوئی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ فروری ۱۹۱۰ء والا پریس ایکٹ اس وقت لاگو نہیں تھا اسی وجہ سے شبلی صاحب سب کو چکر میں ڈال رہے ہیں۔ یہ کتاب "بے ضابطہ ضبط" ہوئی تھی یا ہوئی ہوگی۔ کیونکہ 1867ء کے پریس ایکٹ کی رو سے جب کتاب پر ضروری تفصیلات حاصل نہ ہوئیں تو سی۔ آئی۔ ڈی نے معاملے کی تفتیش کی ہوگی اور اس تفتیش کے نتیجے میں سرکار پر واضح ہوا ہوگا کہ نواب رائے دراصل دھنپت رائے (منشی پریم چند کا اصلی نام ہے) جو کہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہے۔ جب یہ تفصیلات معلوم ہوئیں تو محکمہ کے افسران اعلیٰ کے سامنے یقیناً ان کی پیشی ہوئی ہوگی اس لئے کہ ایک سرکاری ملازم ہو کر وہ دیش بھگتی کی باتیں کر رہے تھے اور لوگوں کو سرکار کے خلاف اکسا رہے تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سرکاری ملازم کو تو ہر وقت گرفت میں لایا جا سکتا ہے چاہے (مارچ) 1910ء کا پریس ایکٹ نافذ ہوا یا نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شخص کو سیڈیشن ایکٹ کے تحت گرفت میں لاکر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ اور اسی ایکٹ کے تحت بہت سے اکابرین پر مقدمے چلے بھی تھے۔ لیکن چونکہ "ڈپٹی انسپکٹر صاحب کی محبت" ان کے آڑے آئی اور آپسی معاہدہ کے مطابق انھیں وہ کتابیں سرکار کے حوالہ کرنا پڑیں اور ان سے تحریری یا زبانی یہ وعدہ لے لیا ہوگا کہ وہ آئندہ کوئی مضمون

/افسانہ محکمہ کے افسران بالا کو دکھائے بغیر شائع [illegible] گے
(اس وقت تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ اس [illegible] پر ایک
علیحدہ مفصل مضمون کی ضرورت ہے) افسانہ/قصہ مضمون پرچی
ڈاکٹر قمر رئیس کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس زمانہ میں یہ تینوں
ایک ہی معنی میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ شبلی صاحب نے مدن
گوپال صاحب کی "پریم چند کے خطوط" اور چٹھی پتری جلد ۱
پڑھی ہے۔ "پریم چند کے خطوط" میں اسکی بیسیوں مثالیں دی
جا سکتی ہیں۔ "پریم چند کے خطوط" میں نگم کے نام صرف 55 خطوط
ہیں۔ جبکہ چٹھی پتری جلد ۱ میں ان کی تعداد 281 ہے۔ لیکن
میں نے صرف "پریم چند کے خطوط" کے خطوط کا ہی پورا مطالعہ
کیا ہے۔ بہر حال فی الحال صرف ایک مثال دے کر یہ چیز واضح
کرنا چاہتا ہوں"..... یہ سب مضامین جن کا آغاز کنڈا افسانہ گنا
کا اگن کنڈ کی طرف اشارا ہے۔ مانک ٹالہ) سے ہوا ہے۔ ایشور
نے چاہا تو شاید کچھ دنوں تک اس کا سلسلہ جاری رہے....."
(صفحہ 36-37) اس کے بعد صفحہ نمبر 52، صفحہ 61، 62، 64
65، 70، 71، 75 پر بھی اسکی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ باقی
کے صفحات پر میں نے مارکنگ کر دی ہے لیکن ابھی نوٹ نہیں لئے
یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ صفحہ 36 جس کا شبلی صاحب نے
خود جگہ جگہ حوالہ دیا ہے کہ "... نواب رائے تو غالباً کچھ دنوں
لئے ہوئے....." اسی خط میں مندرجہ بالا حوالہ صفحہ 37/5-6
پر مضامین افسانوں کے معنی میں ہے۔ لیکن شبلی صاحب جان
بوجھ کر اسے گول کر گئے کیونکہ یہ شبلی صاحب کے مسلک مطالعہ کی
نفی کرتا تھا۔ اور وہ اپنی دلائل میں وزن پیدا کرنے کے لئے پریم چند
کی تحریروں کو توڑ مروڑ کر اور سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش
کرنے کی عادت میں مبتلا ہیں۔

اب آیئے "یو پی میں ابتدائی تعلیم" کے مسئلے کی طرف۔ شبلی
صاحب نے اس مضمون کا بار بار ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ منشی پریم
چند کی پیشی اس مضمون کے سلسلے میں ہوئی تھی "سوزِ وطن" کے سلسلے
میں نہیں۔ لیکن شبلی صاحب نے اس بات کی نشاندہی کہیں نہیں
کی کہ یہ مضمون زمانہ کے کون سے پرچے میں (مہینہ/سن) میں شائع ہوا
تھا۔ شبلی صاحب سے عرض ہے کہ وہ اس کی نشاندہی کرنے کے ساتھ
ساتھ پورا مضمون (سیاق و سباق سے کاٹے بغیر) عظیم آباد ایکسپریس
کے کسی پرچے میں شائع فرمائیں اور جملوں کی نشاندہی فرمائیں جو انکے
خیال میں قابلِ گرفت ہو سکتے تھے۔ تاکہ اس سچ اور جھوٹ کا بھی
فیصلہ ہو جائے۔

دیانرائن نگم اور پریم چند نے کئی جگہ یادداشت سے کام لیا
ہے۔ یعنی بہت سی جگہوں پر یہ دونوں کے بیانات میں ایک دوسرے
کی تردید ہوتی ہے۔ "سوزِ وطن" کا سن اشاعت پریم چند نے
لکھا ہے۔ جبکہ نگم صاحب نے 1907ء میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر [illegible]
کی تحقیق کے مطابق یہ جون 1908ء کے قریب ہے۔ کیا یادداشت
کی غلطی سے نگم اور پریم چند دونوں قابلِ گرفت ہو گئے۔ اسی طرح
"سوزِ وطن" کی ضبطی کے سلسلے میں اگر پریم چند نے لکھا کہ باقی کتابیں
(یعنی سات سو) زمانہ سے لیکر محکمہ کے حوالہ کر دی گئیں۔ اور نگم نے
لکھا کہ جو کتابیں میرے اسٹاک میں پڑی رہیں انھیں کسی نے نہیں پوچھا
تو کیا انھیں BENFAT OF DUOBT نہیں دیا جا سکتا ہے۔ منشی
پریم چند نے یہ واقعہ 23/24 سال کے بعد تحریر کیا اور نگم
صاحب نے اس کے بھی بہت بعد زمانہ کے پریم چند نمبر میں پانچ
دس سال پہلے کے واقعات اکثر انسان بھول جاتا ہے یا انکا
غلط تفصیل پیش کرتا ہے۔ 25/30 کے بعد اگر دو انسان الگ
الگ یہی واقعہ بیان کریں گے تو کیا ان میں WTRADIC TION

ہونا ممکن نہیں۔ ان باتوں کو لے کر شبلی صاحب کا ان نیتوں پر شک کرنا انھیں دروغ گو، غلط بیان، اپنا امیج بنانے کی خاطر یہ قصے گھڑنے والے کہنا کہاں کی ایمانداری ہے اور یہ کس قسم کے محقق کا لب و لہجہ ہے؟

اسی طرح چھٹی پتری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے پریم چند کے امیج کو بوسٹ BOOST کرنے کے لئے اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے سنسر کیا ہے۔ شبلی صاحب اپنی تحقیق سے بتائیں کہ مرتبین نے ان کی چٹھیوں کو کہاں کہاں اور کس مخصوص نقطۂ نظر سے سنسر کیا ہے۔ اگر وہ یہ خطوط سنسر کرنا چاہتے کہ پریم چند کا امیج بوسٹ ہو تو سب سے پہلے وہ خطوط سنسر کرتے جن میں پریم چند نے نگم کو اپنے نئے پرچے کو ہندوانہ بنانے کی تلقین کی ہے۔ یا جس میں ذکر کیا ہے کہ میں نے تین آسامیوں کو سو سو روپیہ ۱۸ فی صدی سود پر دیا ہے۔" (یہ جملہ یادداشت سے لکھا ہے) یا پھر کسی ہندو کو اُردو سے کیا ملا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر شبلی صاحب کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ چھٹی پتری کے مرتبین نے ان مشاہیر کے خطوط کو مستقبل کی نسل کے لئے محفوظ کر دیا گناہ ہے۔ کیا ان میں نون تیل کا حساب لکھا تھا جن کو شائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی یا کہ اصل بات یہ تھی کہ شبلی صاحب کو یہ بات ناگوار گزری کہ ان خطوط میں عبدالماجد دریابادی مرحوم کا وہ خط بھی شامل تھا جو شبلی صاحب کے مسلک / مطلب کے خلاف جاتا تھا کیوں کہ وہ پریم چند کے امیج کو بوسٹ کرتا تھا۔

اب آیئے شبلی صاحب کے اس الزام کی طرف کہ پریم چند "آدھیہ بھاشا"، پرچارنی سبھا، ہندی ساہتیہ منڈل۔ ہندی پرچارنی سبھا وغیرہ کے ممبر تھے یا ان کے سالانہ جلسوں کی صدارت فرماتے تھے۔ شبلی صاحب پریم چند کی ان سبھاؤں میں دی گئی تقریر دن، صدارتی خطبوں میں سے ایک جملہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہیں جس میں انھوں نے اُردو کے خلاف ایک لفظ بھی کہا ہو؟

اب پھر پلٹئے پریم چند کے خطوط کی طرف ــــ مدن گوپال نے لکھا ہے کہ نگم صاحب نے ان کو پچپن خطوط دیئے تھے ...... یہ خطوط "من وھن" "پریم چند کے خطوط" مطبوعہ جون ۱۹۵۵ء میں شامل ہیں۔ اس سے پہلے چھٹی پتری جلد نمبر ایک ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی اس میں نگم کے کل ۲۸۱ خطوط شامل ہیں۔ جن میں مدن گوپال والے ۵۵ خطوط میں سے ۴۶ خطوط بھی شامل ہیں۔ ۹ خطوط نہ جانے کن وجوہات کے باعث چھپنے سے رہ گئے۔ اور بجائے اس کے کہ مدن گوپال اور امرت رائے سے اس کی وضاحت مانگی جاتی، ان پر یہ الزام دھر دیا گیا کہ انھوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے سنسر کر دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان نو کے نو خطوط میں کہیں بھی ایک جملہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر انگشت نمائی کی جا سکے۔ منشی پریم چند کے امیج کو جو خطوط DAMAGE کر سکتے تھے وہ سبھی کے سبھی خطوط "چھٹی پتری" اور پریم چند کے خطوط میں شامل ہیں۔ شبلی صاحب کو رائی کا پہاڑ اور رنبیونٹی کا ہاتھی بنا ڈالنے کی عادت ہے اس لئے وہ مرتبین کی اس سہو کو اُچھال کر لکھ رہے ہیں کہ انھوں نے انھیں" اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے سنسر کیا ہے۔

اور میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو سامنے رکھ کر انھوں نے مدن گوپال کا مضمون ترجمہ کر کے عظیم آباد ایکسپریس کے ۱۹ جنوری کے شمارے میں شائع کروایا ہے تاکہ عظیم آباد ایکسپریس کے قارئین بھی یہ پڑھ لیں کہ مدن گوپال نے یہ لکھا ہے کہ "چاہے کیسے ہی حالات رہے ہوں مہان ساہتیہ کار پریم چند کے خاندان ــ

دخصائل نچلے درجے کے لوگوں جیسے ہی رہے"..... کیا اِس لئے کہ انھوں نے دوسری شادی سے پہلے ایک داشتہ رکھ چھوڑی تھی / انھوں نے دو ایک مرتبہ 18 ر فیصدی سود لیا۔ (خدا معلوم اصل بھی واپس ملا یا نہیں) / دوسری بیوی سے جھوٹ بولا کہ ان کی پہلی بیوی مرچکی ہے۔

غالب کی دستنبو (فارسی) جس کا مکمل ترجمہ تحریک میں کئی سال پہلے شائع ہوا تھا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے / انکی ڈومنی کے ساتھ عشق کی داستان / جوا کھیلنے کھلانے اور اِس سلسلے میں اِن کے جیل جانے / مسلمان ہوتے ہوئے بھی جام و مینا سے ان کے عشق کے قصے کیا یہ سب باتیں آپ کو معلوم نہیں؟ لیکن اِن سب ذاتی خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی غالبِ ذاتی زندگی میں اور اُردو۔ فارسی ادب میں ایک بہت عظیم شخص تھے۔ اِسی طرح پریم چند بھی ذاتی خامیوں کے باوجود اپنی ذاتی زندگی اور اُردو ہندی کے ادب کے بہت ہی عظیم انسان تھے۔ اِن کی عظمت کا بُت نہ کوئی مدن گوپال توڑ سکتا ہے۔ اور نہ کوئی ابو محمد شبلی۔

آخر میں گوپال متل صاحب کی اِس تحریر کو پھر سے پڑھیے۔ "ادیبوں کے معاملے میں قول و فعل کا تضاد کوئی نئی بات نہیں۔ اکثر ان کا آدرش وادان کی نجی خامیوں کا ردِ عمل ہوتا ہے۔

اِن ساری خامیوں کے باوجود پریم چند کسی بھی حالت میں فرقہ پرست نہیں تھے۔ بلکہ زندگی بھر انھوں نے بزبان ہندی ہندوؤں کو اِن کی فرقہ پرستی پر للکارا اور انھیں ہر مرحلہ پر یہ تلقین کی کہ جنگِ آزادی کی جدو جہد میں مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلیں۔ وہ اگر چاہتے تو ہندی جگت میں ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اُردو اور مسلمانوں کے خلاف جی بھر کر زہر اُگلتے۔ لیکن ان کے ضمیر اور ضمیر کی اُٹھان الگ تھی۔

ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب

کتاب	مصنف	قیمت
باغ و بہار۔ میر امن مع مقدمہ	ڈاکٹر سجاعت علی	6/-
تاریخ ادب مکمل دو جلد۔	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	70/=
اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	15/=
تنقیدی نظریات۔ حصہ اوّل	سید احتشام حسین	15/=
" حصہ دوم	"	15/=
تنقید عملی تنقید	"	9/=
ذوق ادب و شعور	"	8/=
روایت و بغاوت	"	9/=
تنقیدی جائزے	"	9/=
عکس اور آئینے	"	9/=
سید احتشام حسین نمبر	"	30/=
انتخاب جدید [illegible]	"	5/=
سلک گہر	"	5/=
نقش حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر ۲		20/=
سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	6/=
فروغ اُردو	پریم چند نمبر	15/=
چکبست نمبر		12/=
امیر خسرو نمبر		5/=
عبدالماجد دریابادی نمبر		12/-
محسن کاکوروی نمبر		3/50
نول کشور نمبر		4/=
فراق کاکوروی نمبر		6/=
ادبی نقوش	شاہ معین الدین احمد ندوی	9/=
فروغ اُردو جگر نمبر		8/-

جمیل مہدی
ایڈیٹر، روزنامہ عزائم لکھنؤ

حسرت موہانی
دور اور شخصیت

حسرت موہانی اس زمانے میں شباب کو پہونچے کہ ظفر علی خاں، ہر مولوی کو مولانا بنا رہے تھے۔ ان کے تھوڑے دنوں پہلے، مولوی قاسم نانوتوی تھے، مولوی مملوک علی تھے، مولوی ممتاز علی تھے، مولوی یعقوب نانوتوی، مولوی محمد علی مونگیری تھے۔ مولوی الطاف حسین حالی تھے، مولوی صہبائی تھے، مولوی شبلی تھے۔ شیخ الہند ہونے کے باوجود مولوی محمود حسن دیوبندی تھے۔ ظفر علی خاں نے مولوی کو مولانا بنانا شروع کیا۔ تو حسرت موہانی مولانا ہوئے، محمد علی، شوکت علی مولانا ہوئے۔ عبدالماجد دریابادی مولانا ہوئے۔ خود ظفر علی خاں مولانا ہوئے۔ یہاں تک کہ حسرت اور پیشوا کے مشہور ایڈیٹر عزیز حسن بقائی تک مولانا ہو گئے۔ اس انقلاب کو ذہن و قلم کی کرشمہ سازی سے کہیں زیادہ اردو صحافت کی قوت نفوذ اور ذہن سازی کے ثبوت کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور زمانہ کی سطحیت کی طرف مائل اس رفتار کا بھی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ جس نے بالآخر آج سماج کی ساری درجہ بندیوں کو ختم کرکے فرد کو یہ اختیار سونپ دیا ہے کہ جو کچھ وہ بننا چاہتا ہے خود ہی اپنے زبان اور قلم سے اس کا فیصلہ سنا دے۔

اردو صحافت کو مقصد سے روشناس کرنے میں بھی سرسید احمد نے وہی کام کیا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہمکنار کرنے کے سلسلہ میں انجام دیا تھا ؎

تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی
تجھ سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

اگرچہ حسرت موہانی نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا ہے، لیکن یہی بات سرسید کی صحافت کے بارے میں بھی کہہ دی جائے تو اس کی چول چول ٹھیک سے بیٹھ جائے گی۔

حسرت موہانی کے سلسلے میں علی گڑھ محمڈن کالج کے سرسید احمد خاں کا نام ویسا ہی ایک ناگزیر نام ہے۔ جیسا کہ میرامن کے سلسلے میں فورٹ ولیم کے جان گلکرائسٹ کا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی سمتیں مختلف تھیں، انھوں نے اردو ادب کے لئے، اردو صحافت کے لئے، اردو شاعری کے لئے اور قومی ریاست کے لئے جو کچھ کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے اس سارے سلسلے کا دردناک پہلو یہ ہے۔

کہ حسرت موہانی کی پیدائش اس دور میں ہوئی تھی جب تاریخ خود ا
حرکت میں تھی اور انیسویں صدی نے اپنے سارے لعل و جواہر،
رخصت ہوئے بیسویں صدی کو اس لئے سونپ دیئے تھے کہ اس
موجودہ صدی کے اندر کسی عہد ساز شخصیت کی تخلیق کی قوت سے
محرومی کا شاید پیشگی ادراک اس صدی کو ہو چکا تھا۔ ثبوت کے لئے
بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے منظر کی طرف پلٹ کر دیکھئے
تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائیگا کہ دیو زادوں کی کتنی بیشمار اور
عظیم الشان تعداد، سیاست، معاشرت، ادب، صحافت اور
قومی تعمیر کے میدانوں میں رست و خیز میں مصروف ہے۔ گاندھی جی
جواہر لال نہرو۔ قائد اعظم جناح۔ لاجپت رائے، تلک، آربندو
گھوش۔ رابندر ناتھ ٹیگور، سی۔ آر۔ داس۔ سبھاش چندر بوس،
ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں۔ سہروردیوں اور راماموں کے
خاندان کے خاندان۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی
شوکت علی، مظہر الحق، مولانا آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری
مولانا تھانوی۔ مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ۔ اقبال
اکبر۔ حالی۔ شبلی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا ظفر علی
خاں۔ سید حبیب۔ سید جالب۔ حسن نظامی۔ راشد الخیری
پھول اور تہذیب نسواں کے مولوی ممتاز علی دوسری صف
میں عبدالمجید۔ سالک۔ غلام رسول مہر۔ عثمان فارقلیط۔ ابوسعید
بزمی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ سید حسین۔ عبداللہ بریلوی۔
پھر نیاز فتح پوری۔ شاہد احمد دہلوی۔ جوش۔ جگر۔

یہ سب نام جس طرح یاد آتے گئے، تقدیم و تاخیر کے بغیر
بیان کئے جا رہے ہیں۔ فہرست پوری نہیں ہے۔ ذرا سی کوشش
سے درجنوں ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے درمیان
تفرد اور ترجیح کا حوصلہ طلب کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے۔
جو ان سے زیادہ اہلیت اور امتیازی صلاحیتوں کا مالک
ہو تاہم ان سب شخصیتوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ
یہ کہ یہ سب کے سب انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے
تھے اور بیسویں صدی کو تحفہ میں ملے تھے۔ اور انھوں نے بیسویں
صدی کی ادبی۔ سیاسی۔ تہذیبی اور قومی حرکت و عمل کے منظر
کو اس طرح لبالب بھر دیا تھا کہ جگہ نہ رہی تو بہت لوگ اس
منظر پر چھا گئے۔ حسرت موہانی، اسی قافلے کے ایک مسافر
اور عبقریوں کی اس نسل کے ایک فرد تھے جس نے تاریخ نہیں
بنائی۔ تاریخ کی حرکت کو تیز کرنے میں حصہ بھی لیا۔ اور اپنی
آوازوں۔ اپنی نقل و حرکت، اپنے حوصلوں اور ولولوں سے
ماحول کو اتنا گرما دیا۔ اور جوش۔ جذبات اور خروش کی
اور قوت عمل کی شدت سے زلزلوں کی ایسی کیفیت پورے
ملک میں پیدا کر دی وقت کے قدرتی بہاؤ تک کو ان جنبشوں
کے ہل چل اور جھٹکوں کی تاب نہ لاکر اپنا راستہ بدل دینے
میں عافیت نظر آئی۔

ان شخصیتوں میں سے ہر شخصیت اپنے عہد اور اس عہد
میدان کو اپنے حوصلوں اور ولولوں کے لئے ناکافی پاکر ایک
ایسی نئی دنیا کی جستجو میں لگ گئی جو اس کی جولانیوں کو سمو
سکے۔ اور کفایت کر سکے۔ اس تحقیق و تلاش کا ہی خمیازہ
کی نسل بھگت رہی ہے کہ چاروں طرف دیکھتی ہے تو اسے تنگ
گھاٹیوں، محدود اور غیر مسطح زمینوں، خار دار جھاڑیوں
پیچ در پیچ پگڈنڈیوں کے سوا چلنے تک کا راستہ تک دکھ
نہیں دیتا۔ اور ان ہی لوگوں کی برق سامانیوں، اور
دہائیوں کے نتائج آج کی نسل کے سامنے اس طرح آ۔
کہ ان لوگوں کی یاد آتی ہے تو آج کے وقت اور ان کے د

دُھند کا ایک ایسا دبیز پردہ حائل نظر آتا ہے کہ ان کی قدر وقیمت کا احساس تو دُور کی بات رہی، اِن کے چہرے بھی تک کو نمایاں اور واضح طور پر دیکھنے میں دقت ہونے لگتی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ جگر کے نغموں سے اِس ملک کی سرزمین گونج رہی تھی لیکن آج جگر کا تصور آئے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ ایک صدی پہلے غالب اور مومن کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔

یہ وقت کے اثرات کی وہ کارفرمائی ہے جس کے سمجھنے کے لئے لیبان اور ابن خلدون کے بجائے آئن اسٹائن کی مدد درکار ہوگی، اور یہی سبب ہے کہ ہم موجودہ دور میں محض رسمی عقیدت کے سروسامان کے ذریعہ یہ نقاب اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

حسرت موہانی شاعر تھے، صحافی تھے قومی رہنما تھے۔ صوفی اور درویش تھے اور شبلی کے بقول جن تھے لیکن یہ سب خصوصیات انکی شخصیت میں اس طرح گڈمڈ اور مخلوط ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ خانوں میں تقسیم کرکے انھیں پرکھا نہیں جاسکتا۔

شاعر کی حیثیت سے وہ نمایاں طور پر ابھرتے ہیں لیکن اس حیثیت میں بھی وہ داغ اور جگر فانی اور اصغر کے درمیان فصیل بناتے ہیں، اور اختر شیرانی اور مجاز کے لئے راہیں تراشنے کا کام کرتے ہیں ان کی پوری زندگی خط مستقیم نہیں ہے منحنی، نامکمل، چھوٹی بڑی، ٹیڑھی، ترچھی، واضح اور مبہم لکیروں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے فوٹو نہیں بنتا، تجریدی آرٹ کا ایسا شاہکار ضرور تیار ہو سکتا ہے جسکی تشریح کے دوران خود ناقدوں کے باہمی اور نظریاتی اختلاف سے ایک نیا میدان کارزار تیار ہو جائے۔

وہ حسن نظر، اور حسن خیال کا پیکر تھے، حسن عمل کے ساتھ انکی شناسائی کبھی سلام و دُعا کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکی، یہی وجہ ہے کہ ہر نئی تحریک، اور ہر نئی مہم کو انھوں نے کندھا دیکر اٹھایا۔ اس کی پرورش و پرداخت میں دن رات ایک کر دیئے۔ اسے ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھایا، دوڑنے کی اڑنے کی مشق کرائی۔ لیکن جونہی یہ تحریک چلنے کے قابل ہوگئی، وہ پرندوں کی مانند، اس سے الگ ہو گئے، اسے گھونسلے سے نکال کر اس کے لئے اجنبی بن گئے۔

اس کے بارے میں سب کچھ بھول کر کسی نئی مہم کسی نئی تحریک کسی نئی نسل کی تیاری میں از سر نو منہمک ہو گئے۔

اُردوئے معلیٰ انکی صحافت، کھادی کی دوکان، انکی تجارت اور سودیشی جذبات گاندھی جی سے لڑائی، اُن کی قوم پرستی اور لنگڑے لولے پاکستان پر جناح سے اختلاف یہ واقعات ان کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا نقطۂ عروج ہی نہیں ہیں اُن کے خاتمہ کی حد بندی بھی کرتے ہیں۔

ہندوستان کے دستور کو، انھوں نے ایک ایک انچ بحث کے ذریعہ تکمیل کی طرف بڑھایا تھا۔ اور اس کی تدوین کے ایک ایک حصہ پر اپنے خیالات کے نقوش مرتب کئے تھے، لیکن یہ دستور مکمل ہوکر آخری منظوری کے لئے دستور ساز اسمبلی کے سامنے آیا۔ تو اس کے باوجود کہ اسکی تشکیل کے کسی ایک مرحلے پر بھی انھوں نے اختلاف کے تحتی مظاہرے یا واک آؤٹ کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ دستور ساز اسمبلی کے ایوان میں انکی پہلی آواز گونجی۔ نہیں! مجھے منظور نہیں۔ آخر عمر میں وہ کمیونسٹ بن رہے تھے۔ اور حج کا سفر بند کرکے اُردو کا مقدمہ اقوام متحدہ میں لیجانے کیلئے روپیہ اکٹھا کر رہے تھے۔ اور گہرے مذہبی انہماک اور اشتراکیت کے درمیان مشترکہ عناصر کی تلاش کرکے ایک نئے شیرازے کی حد بندی کر رہے تھے کہ باغ مولوی انوار کی کشش نے انھیں لکھنؤ کھینچ بلایا اور ایک مختصر علالت کے بعد وہ اپنے پیر کے جوار آسودہ بہ خواب ہوگئے۔ ● ●

سعادت علی صدیقی :		(طلبہ کے لئے)

رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی

علی سکندر جگر مرادآبادی کا نام آتے ہی ایک ایسی شخصیت کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے جو دل آویز بھی تھی، دل نواز بھی بے پناہ مقبول بھی تھی اور محبوب بھی جسے رند شاہد باز بھی کہا گیا۔ اور زاہد پاک باز بھی۔ جس نے شہنشاہِ تغزل کا خطاب بھی حاصل کیا۔ اور غزل کی آبرو بھی قرار دیا گیا۔ جو محض ایک اچھا شاعر ہی نہیں اچھا انسان بھی تھا۔ اُس نے سارے جہاں کو پیغام محبت ہی نہیں دیا۔ اُس کا جگر بھی سارے جہاں کے درد سے بے چین رہتا تھا۔ وہ ایسا گلشن پرست تھا جسے گل کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی عزیز تھے۔ اُس کی غزلیں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ زندگی کی، احول کی، فطرت کی، اور زمانے کی حقیقی اور سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ اُس کے دل پر جو کیفیت گزرتی ہے۔ غزل کا روپ اختیار کرلیتی ہیں۔ چاہے قحط بنگال ہو یا مادرِ وطن کی تقسیم، گاندھی جی کی شہادت ہو یا انقلاب زمانہ غرض کہ وہ کسی جذبہ سے سرشار ہو اُس نے غزل کا پیرہن اختیار کیا۔ اور جس کے یہ اشعار اُس کی زندگی کے حقیقی ترجمان ہیں۔

سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغِ تمنا ہوں
مجھے دنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دُنیا ہوں

کبھی کیف مجسم ہوں کبھی شوقِ سراپا ہوں
خدا جانے کس کا درد ہوں کس کی تمنا ہوں

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی

جگر رہ جائے بن کر آہ جواک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

جگر مرادآبادی دنیائے ادب میں ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوئے۔ اُن کی دُنیا حسن و عشق کی دُنیا تھی۔ اسی لئے ان کی شاعری تمام تر حسن و عشق ہی کی شاعری تک محدود رہی۔ خود اُن کو اس کا اعتراف تھا کہ انکی شاعری غزل ہی تک محدود ہے۔ اور بعض مستثنیات کو چھوڑ کر باہر کبھی دوسرے میدان میں قدم نہیں رکھا۔

جگر صاحب کو اپنے عہد میں جس قدر مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی وہ انکی اپنی رنگا رنگ شخصیت، رنگِ تغزل اور نغمہ و ترنم کی بدولت ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی رائے ہے،

"جگر مرادآبادی اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آخری دَور میں بلکہ کہنا چاہیئے کہ غالبؔ و مومنؔ کے بعد جو دور شروع

ہوتا ہے اُس میں روایتی غزل گوئی جس کی بنیاد فارسی تغزل، نزاکت
خیال اور معاملہ بندی پر پڑی تھی۔ حسرت و جگر پر ختم ہو گئی۔ آخر
میں جگر ہی رہ گئے تھے جن کے سر پر اس برِ اعظم کے ادبی
حلقوں نے ملک الشعرا کا تاج رکھ دیا تھا۔ ہندوستان اور
پاکستان کے مشاعرے اُن کی شرکت کے بغیر معتبر ہی نہ سمجھے جاتے
اور لکھنؤ تو اُردو کا مرکز اور گونڈے سے قریب ہونے کی
وجہ سے اُن کے نام و کلام سے گونج رہا تھا اور اُن کی شاعری
اور خوش نوائی کی دھوم مچی ہوئی تھی غرض شوکت تھانوی
کے بلیغ و معنی خیز انداز میں ایک دنیا کی دُنیا جگر کی مریض تھی۔"
شاید ایک دُنیا کی دنیا کے جگر کے مریض ہونے کا ہی نتیجہ تھا
کہ اُن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے محمود علی خاں جامعی مصنف
تذکرۂ جگر کے بہ قول "دورِ جدید کے شعرا میں اقبال کے سوا کسی
اور شاعر کے متعلق اُن کی زندگی میں اتنا زیادہ نہیں لکھا گیا،
جتنا کہ جگر کے متعلق لکھا گیا ہے۔ جگر کے نقادوں میں ایک طرف
سید سلیمان ندوی، مرزا احسان احمد، پروفیسر رشید احمد صدیقی
پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر
عبدالقادر سروری، شاہ معین الدین ندوی، جیسی سخن فہم
اور سخن شناس شخصیتیں ہیں جو جگر سے اس قدر خلوص و عقیدت
رکھتی ہیں کہ اُن کو جگر کے کلام میں خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے، اُن کی
خامیوں پر اِن کی نظر ہی نہیں پڑتی تو دوسری طرف پروفیسر کلیم
الدین احمد، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری
اور علامہ نیاز فتح پوری جیسے ناقد و مبصر ہیں جنھوں نے جگر کی
کوتاہیوں اور خامیوں پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور وہ کسی
طرح جگر کو عظیم شاعر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اِن اکابرین
میں اگر جگر کے شیدائیوں نے کچھ غلو سے کام لیا ہے تو مخالفین
نے بھی انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں سب کا تذکرہ
کرنا یا تنقیدی جائزہ لینا ممکن ہی نہیں۔ چند اشارے ہی پیش کئے
جا سکتے ہیں:

جگر نے ایسے پُر آشوب زمانے میں کہ جب اُردو غزل دورِ
انحطاط سے گزر رہی تھی، غزل کے معیار اور وقار کو بلند رکھا۔
اور اسے نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
لکھتے ہیں۔

" حسرت، فانی، اصغر اور جگر ہم عصر ہیں لیکن اپنے انداز
و اسلوب اور اپنے احساس و تاثر میں ایک دوسرے سے مختلف
ہیں۔ جگر محبت کے شاعر ہیں، حسرت محبوب کے، اصغر حسن کے، فانی
زہرِ غم کو پسند کرتے ہیں اور جگر عرفانِ غم کو۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا
ہے کہ سب کے یہاں وہی شاہد و شراب، زلف و گیسو اور شمع و
پروانہ کی داستان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جگر مرحوم نے اس
بادہ و ساغر اور زلف و گیسو کی نئی نئی توجیہات پیش کی ہیں اور اس
طرح غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ اسی لئے اُن کے یہاں
حسن و عشق رمز و علامت نہیں قدر ہیں۔"

پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ

" حسرت و جگر سے غزل کو وہ سرمستی واپس مل گئی جو زندگی
کی روح ہے اور جس کی وجہ سے زندگی روشن اور گوارا ہے۔"

جگر کی شاعری میں جو روانی اور رنگینی ہے وہ حسرت کے علاوہ
کسی اور کے یہاں نہیں ملتی، اُن کے یہاں فکر اور جذبات کی رعنائیاں
ہیں جنھوں نے انھیں امتیازی درجہ عطا کیا۔ انھیں میر اور اصغر
سے ہوتا ہوا جو ورثہ ملا تھا۔ اُس میں سوز و گداز، سرمستی اور والہانہ
کیفیات کی آمیزش ہے جگر کے خیالات، طرزِ فکر اور طرزِ ادا نے
انھیں انفرادیت بخشی۔ جگر کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار
کرتے ہوئے علی جواد زیدی نے لکھا ہے:

" جگر رندی کے نہیں، محبت کے نغمہ گو ہیں اور محبت میں بھی

فراق و مہجوری کے۔ انھوں نے محبت کی ہے اور محبت برتی ہے۔ چوٹ کھائی ہے اور وہ تڑپے ہیں۔ جب حالات نے انھیں حسن کے قریب رکھا۔ اور جب اُس سے وقتی طور پر جدا کر دیا تب بھی اُن کے دل میں محبت کی چنگاریاں اُڑتی رہیں۔ یہ چنگاریاں خاکستر کی چنگاریاں نہیں تھیں جو اندر ہی اندر سلگتی رہیں۔ بلکہ ایک آواز کے ساتھ فضا میں بکھر جانے والی چنگاریاں تھیں۔ جن کی چمک اور گرمی نہ صرف جگر بلکہ اُنکے ہر ایک ہمعصر نے محسوس کی۔ اور اُس نے جگر کو جگر بنایا۔"

جگر پر پہلا مقالہ مرزا احسان احمد نے لکھا تھا۔ اُن کے پیشِ نظر جگر کا وہ کلام تھا جو بعد میں داغِ جگر کے نام سے شائع ہوا۔ مرزا احسان احمد لکھتے ہیں۔

• ہمارا دوست نہ کوئی بڑا آدمی ہے نہ وہ فلسفہ یا پالیٹکس وPolitics کہتا ہے نہ وہ تاریخی واقعات لکھتا ہے، نہ وہ رہبرانِ قوم کی مداحی کرتا ہے۔ وہ صرف شاعر ہے، عشق و محبت اس کا خمیر ہے، وہ ازل سے ایک دردمند دل لے کر آیا ہے۔ اُس کا ہر شعر ایک جذبۂ مجسم ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے دردِ دل کا اظہار کرتا ہے۔ اسکو اسکی پروا نہیں کہ کوئی اسکا سننے والا بھی ہے۔ خود اس کا دل اُسکی شاعری کی داد دیتا ہے اور یہی اس کے کمالِ شاعری کا حقیقی ثبوت ہے۔" چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بیتابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر
اب خدا جانے تیری یاد ہے یا دِل میرا

ہم اور اُن کے سامنے عرضِ نیازِ عشق
لیکن، ہجومِ شوق سے مجبور ہو گئے۔

ہر قدم پر، ہر روش پر، ہر ادا پر ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

سید سلیمان ندوی نے تشعلہ طور میں اپنی گراں قدر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

• جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں اور وہ انھیں اُلٹ پلٹ کر دُہراتے رہتے ہیں۔ مگر وہ جب کہتے ہیں۔ تو سُننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ ہر فطری شاعر کا رنگ مذاق یہی ہوتا ہے کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں ..... جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر بلکہ ہمہ شاعر۔ اُنکا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ لکھنؤ اور دہلی حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، پُر تکلف، تعق اور آورد سے پاک۔ طلسمِ الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا..... جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود ابھی بے حد فطری آرائش اور از خود نمائشِ حُسن ہے.....

• جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ، نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوسِ بالائے بام، نہ شکایتِ منظرِ عام نہ اُس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے نہ اُس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اُس کے کوچہ میں شہدا کے دل و جگر کی گلکاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاقِ نظر ہے۔

جگر مستِ ازل ہے اُس کا دل سرشارِ الست ہے۔ وہ محبت کا متوالہ ہے اور عشقِ حقیقی کا جویا وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بُت خانے کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو دورِ خُم خانہ کے بادہ کیف سے خود فراموش ہو کر بزمِ ساقیِ کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے۔ جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے اُس کی آنکھیں پُر خمار مگر اُس کا دل ہشیار ہے اور

کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو
اس کے کلام میں اثر نہ ہو۔
ان ارشادات کی روشنی میں جگر کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اُن کو بلا کے اور پشیماں ہوئے جگر
یہ کیا خبر تھی ہوش میں آیا نہ جائے گا۔

اے چارہ ساز، حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اک راز ہے، جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم۔

ہمیں بھی ہم اب چین آئے گا جب تک
ان آنکھوں میں آنسو نہ بھر لائیے گا۔

کیا بتائیں عشقِ ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو، جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے۔

اپنے جی میں تو کر ذرا انصاف :: کب سے نامہرباں ہے پیارے

جگر کے ایک قریبی دوست محمود علی خاں جامعی نے جگر کی شاعری
پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"زبان اور فن کے معاملہ میں جگر صاحب کی نہ فنی استعداد
بہت زیادہ ہے نہ وہ زبان میں مسلّم حیثیت کے مالک ہیں۔
لیکن فن کے تمام مبادیات سے وہ پوری طرح واقف ہیں اور بہت
صاف ستھری زبان لکھتے ہیں جو دلکش اور خوشگوار معلوم ہوتی
ہے۔ ان کا طرزِ ادا و اندازِ بیان بہت، بانکا، نیا، دلکش
اور پُراثر ہے۔ جگر صاحب بات ہمیشہ عام روش سے ہٹ کر کہتے
ہیں اور اتنے انوکھے انداز میں کہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔"

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ —

"جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے — جگر کی
شاعری میں جو نیاپن ہے اس کا تعلق دراصل انداز اور
اسلوب سے زیادہ ہے فکر و احساس سے کم ہے اور جدید
اُردو غزل میں یہی اسلوب جگر کا اضافہ ہے —"

پروفیسر کلیم الدین احمد کی رائے ہے کہ

"جگر کے شعر داغ کی صفائی، سادگی، سلاست، روانی
رنگینی تو رکھتے ہیں لیکن داغ کی تازگی، شوخی، معاملہ بندی،
بے ساختگی نہیں رکھتے"

کلامِ جگر پر نکتہ چینی کرنے والوں میں علامہ نیاز فتح پوری کا
نام سرِ فہرست ہے، انھوں نے اپنے مشہور جریدے نگار میں
جگر کے خلاف بہت کچھ لکھا اور سخت تنقیدیں کیں۔ نگار کا جگر
نمبر اس کا بیّن ثبوت ہے ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے۔

"جگر اس میں شک نہیں کافی ذہین انسان تھے، بلند
و پاکیزہ خیالات بھی ان کے ذہن میں آتے تھے لیکن جیسا کہ میں
پہلے عرض کر چکا ہوں وہ بڑے لااُبالی قسم کے انسان تھے اور
اُن کا یہی مزاج اُنکی شاعری میں منتقل ہو گیا اسکے علاوہ انکی
ابتدائی تعلیم بھی معمولی تھی، مطالعہ بھی وسیع نہ تھا اور اساتذہ
کی صحبت بھی انکو میسر نہیں ہوئی ۔۔۔ اُن کے یہاں جوش و
سرمستی اور ایک خاص والہانہ کیفیت ضرور پائی جاتی ہے —
جگر کے یہاں سب سے بڑا عیب نقصِ بیان ہے اور اگر وہ اساتذہ
کے کلام کا غائر مطالعہ کرتے یا انھیں اہلِ کمال کی صحبت نصیب
ہوئی ہوتی جو علم بیان و معانی کے ماہر ہیں تو غالباً یہ نقص انکے
کلام میں نہ پایا جاتا ۔ ۔ ۔"

ان آرا کی روشنی میں جن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یہ رائے
بھی شامل ہے کہ

"جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ
اصلاً وہ دوری و مہجوری کے شاعر ہیں اُن کی شاعری کی رفتار
اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے
کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں، ان کا محبوب [illegible]
کا انداز مرکز گریز ہے یہی سبب ہے کہ جگر کی شاعری میں [illegible]

عقیدت میں کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا اور اُنکا کلام اُس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب تر اور جسم و جان کے اعتبار سے دُور سے دُور ہو اُس شاعر سے بالعموم بہتر اور برتر ہوگا جس کی پوزیشن اسکے بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔"

تو جگر کے شیدائیوں اور مخالفوں دونوں کے یہاں جزوی صداقت نظر آتی ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں خود جگر کا بیان بھی قابلِ غور ہے، وہ لکھتے ہیں :

" اغلاط سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے پرواہ رکھا ہے اور نہ انھیں کا ہوکر رہ گیا ہوں اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے، بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں۔"

اُن کا دعویٰ ہے کہ :

" مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے تضاد نہیں۔"

اس نقطۂ نظر سے جب ہم کلامِ جگر کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جگر نے غزل کو حسن و عشق کے معاملات کے بیان میں بڑی دلکشی اور سادگی بخشی، اُن میں نازِ حسن کے ساتھ نیازِ عشق بھی پیدا کیا، اُنھوں نے غزل کو والہانہ آہنگ دیا اُسکو بے پناہ خلوص اور صداقت بخشی۔ اِن میں وارداتِ قلبیہ کی عکاسی کی، اِن کا عشق رومانی اور حسن زندہ و تابندہ حقیقت ہے، انکی شاعری میں ایک کیف، ایک مستی، ایک ترنگ، ایک ولولہ اور شعلہ و شبنم کی امتزاجی کیفیت کے ساتھ ساتھ جانے اور چاہے جانے [illegible] لذت اور [illegible] جوانی کا دلفریب عالم ہے۔ انکی شخصیت جمال زدہ اور جمال پروردہ ہے۔ وہ اداشناسِ حسن تو ضرور ہیں۔ مگر انکی محبت مریضانہ رنگ لئے ہوئے نہیں ہے۔ بلکہ صحت مند جذبہ لئے ہوئے ہے۔ اُن کا محبوب رگِ جاں سے قریب محسوس ہونے والا خیالی محبوب نہیں، اسی دُنیائے آب و گل کا جیتا جاگتا اور بولتا ہوا نقشِ حسیں ہے جو چاک پردہ سے غمزے کرتا ہے جس کا کافر حسن توبہ شکن بھی ہے اور فتنہ دوراں بھی ـــــ

جگر کی غزلوں میں سادگی بھی ہے اثر بھی، دلکشی بھی ہے سوز و گداز بھی، مستی و سرشاری بھی ہے شگفتگی اور شیرینی بھی، ترنم بھی ہے موسیقی بھی۔ روانی بھی ہے کیف بھی۔ غمِ جاناں بھی ہے غمِ دوراں بھی۔

وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دُنیا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم ـــ

وہ جھکی جھکی سی پلکیں وہ عرق عرق عارض
شکوۂ ستم کرکے خود مجھے حجاب آیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

کیا لطف ہے کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ [illegible] گا

جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

لطیف الرحمٰن اسمٰعیلی - ایم - اے

غالب اور آزردہ

مفتی صدرالدین آزردہ ایک بلند پایہ عالم و فاضل تھے۔ نجابت و شرافت میں یکتا و یگانہ تھے۔ مولانا فضل الحق خیرآبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے اجلہ تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اِن دونوں بزرگانِ دین کی نیک نفسی و پاک باطنی کے خصائل ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ مفتی صاحب — ان کا لقب نہیں۔ بلکہ باقاعدہ دہلی میں افتاء کے اہم منصب پر فائز تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی شہادت ہے کہ "وہ فنونِ عقلی و نقلی اور ادب میں مہارت تام رکھتے تھے۔

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے: —

"آزردہ گنجینۂ علم و کانِ علم و بحر سخا مخزنِ لطف و جود و عطا، بیدر دوران حبان ہندوستان، عالم کامل، فاضل اجل، فصیح بے مثل، عالم با عمل، مدح میں اِن کی جو لکھوں سو کم ہے، کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے...... ہر چند کے مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اُن کا نام لکھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدون نام نامی ان کے یہ کتاب رونق نہ پاوے گی۔ اور پسند احباب نہ ہوگی۔ اس زمانہ کے شعرائے اردو گویوں میں وہ مثل شاہنشاہ کے ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی لکھا ہے کہ آزردہ کے دیوان خانہ میں اہلِ علم کا مجمع رہتا تھا اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔

غالب اُن کے معاصر تھے۔ دونوں میں راہ و رسم بھی اچھے تھے۔ انھوں نے آزردہ کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ جو اِن کے فارسی کلام میں شامل ہے۔ غدر کے الزام میں مولوی فضل حق خیرآبادی اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے ساتھ ان کو بھی قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے تھے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے:

"حضرت مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹیننٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔

اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے، اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بیوی۔ تیس چالیس روپیہ کی آمدنی ہے۔ لیکن امام بخش کی اولاد اِن کی عزت ہے اور دس بارہ آدمی ہیں، فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے مختصر یہ ثانیہ کے اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں"۔

ایک اور خط میں یوں گویا ہیں: -

" دلی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا...... اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین اور بلی ماران میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم"۔

غالب کے ان دونوں خطوط سے عیاں ہے کہ آزردہ کے متعلق ان کی رائے محض کسی حسن ظن کی بنا پر نہ تھی بلکہ ان کی عظمت و رفعت کا سکہ ان کے تمام ہی معاصرین پر ثبت تھا۔ وہابی اور بدعتی، مقلد اور غیر مقلد اپنے متنازعہ مسائل میں انھیں کو حکم بناتے تھے رواداری اور بے تعصبی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

نواب صدیق حسن خاں اور والیان رامپور سے بھی ان کے مراسم اچھے تھے۔ بہ حالت بیماری انتقال سے ایک دن قبل مفتی صاحب نے نواب کلب علی خاں کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں اپنی زندگی سے یاس کا اظہار بھی ہے اور نواب صاحب موصوف کے لئے دعا بھی۔ علاوہ بریں ان کا جو اکرام والیٔ رام پور سے ہوتا ہے اس کو اپنی حیات کے بعد بھی پسماندگان کے لئے جاری رکھنے کی استدعا بھی اس خط میں کی گئی ہے۔ آزردہ کا خط نواب کلب علی خاں کے نام ملاحظہ ہو!

" القاب و آداب کے بعد...... شکر الطاف والی میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کے عوض خدائے وند کریم کے کرم سے ہونا جملہ محالات سے ہے۔ اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہِ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مدارج علیا عطا فرمائے میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے، ایک میری زوجہ اور دوسرا خواہرزادہ محمد احسان الرحمان نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت لائق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے، ان دونوں کو آپ کے سپرد کئے جاتا ہوں، اگر ناگوار عالم خاطر نہ ہوتی تو میرے بعد ان کی خبرگیری کس قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک طور کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا، شاید یہ میرا آخری خط ہے، ذوالجلال والاکرام آپ کو عمر خضری اور دانش افلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرمائے"۔

معروضہ پانزدہم، جولائی ۱۸۶۸ء

محمد صدرالدین خاں

مفتی صاحب کی استدعا قبول ہوئی اور ان کی تجہیز تکفین وغیرہ کے لئے پانچسو روپیہ سرکار رامپور سے منظور ہوئے وہی غالب جس نے آزردہ کی زندگی میں ان کو "بہ مخدوم و مطاع اور والی و مولا" لکھا تھا اور زندگی بھر ان سے اچھے مراسم رہے تھے۔ اب مرحوم دوست کے کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کرکے اپنا کام نکالنا چاہا ہے غالب کی سیرت کے اور بھی بہت سے پہلو قابل اعتراض ہیں۔ مگر ان کی سیرت کا یہ داغ ایسا ہے جس سے ان کی شخصیت ان کی انانیت سے مغلوب ہو جاتی ہے اور ان کی اس تخریبی کارروائی سے انکی [illegible]

زندگی کا یہ پہلو قابلِ اعتراض بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ ہم اس خط کو نقل کرتے ہیں :—

" حضرت ولی آیۂ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانچسو روپیہ مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رامپور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی۔ میرا مردہ بھی بے گور و کفن نہ رہے گا..... میں نے کل مرزا صاحب کو لکھا ہے وہ نہ جانے حضرت کی نظر سے گذرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپیہ کرایہ کے مکان اس کے تحت ہیں۔ امین الرحمان اس کا بھانجہ ہے۔ مفتی جی کا کوئی نہیں۔ اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں التماس ہیں (کذا) ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپیہ کا قرض رکھتا ہوں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسرا التماس یہ ہے کہ حسین علی خاں کا شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپیہ مہینہ جو مجھے ملتا ہے اسکے نام پر اس کے حسین حیات قرار پائے۔ یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں "

مشہور محقق اور انشاء پرداز خواجہ احمد فاروقی اپنے ایک مضمون میں ارقام فرماتے ہیں :—

غالب نے نوابان رامپور کو خاصے خوشامدانہ خط لکھے ہیں۔ لیکن زندگی میں بھلا نہ ہونا عبد المعبود دونوں کے لئے شرمناک ہے۔ اس لئے غالب کا جرم بڑا ضرور ہے لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے "

ہم فاروقی صاحب کی اس رائے سے قطعی متفق نہیں ہیں۔ کردار کا اس سے زیادہ نیچ پن اور کیا ہوگا کہ اپنے مرحوم دوست کی بیوہ پر غالب جیسے عظیم فنکار کو جس کی دنیا سراسر حساس ہی ہوتی ہے، رحم نہ آیا۔ شقاوت اور سنگ دلی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی ؟ ہم غالب کی شاعرانہ عظمت اور مجتہدانہ سربلندی کے معترف ہیں۔ لیکن فن کار کے فن پارے کو اس کی سیرت و کردار سے الگ کر کے دیکھنے کے ہم بالکل قائل نہیں ہیں۔ خواجہ صاحب غالب کو کٹہرے میں کھڑا کرنا تو چاہتے ہیں۔ مگر وہ سزا تجویز کرنا نہیں چاہتے جس کے وہ اصلاً سزاوار ہیں۔ اتنے واضح اور غیر مبہم جرم کے لئے کوئی وجہ جواز تلاش کرنا ہی میرا انصاف نہیں ہے۔

مفتی صاحب کے متعلق تذکرہ کریم الدین کی شہادت اور خود غالب کے اعتراف کے بعد ان کی برگزیدگی شرافت دیانتداری کی کس کو شبہہ ہو سکتا ہے !

مولوی ذکاء اللہ نے صاحب آب حیات محمد حسین آزاد کو ایک خط میں لکھا ہے !—

" مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا "۔

مولوی ذکاء اللہ کی رائے بادی النظر میں کتنی ہی کڑوی محسوس ہو مگر حقیقت کے بہت قریب ہے۔

ادارۂ فروغ اردو کی قابلِ قدر تحریرپیشکش

دیوانِ غالب

فروغ اردو ۔ طاہر ایڈیشن

جو کہ علامہ غالب نے خود اپنے کلام کو منتخب کر کے شائع کیا تھا

قیمت: چھ روپئے

نظم بعرنی :

مولانا محمد علی جوہر نمائش

(قسط نمبر ۲)

بعد ازیں ایک ایسا گروپ فوٹو بھی چسپاں تھا جس

میں خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین نمایاں تھے۔ دوسری طرف مولانا شوکت علی کے ایک خط کا عکس آویزاں تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا نے ۱۴ ستمبر ۱۹۲۸ء کو اپنے اس خط کے ذریعہ یہ اطلاع ڈاکٹر انصاری کو دی تھی کہ سنٹرل خلافت کمیٹی نے بیس ہزار روپے کی ایک اہم رقم جامعہ ملیہ کی امداد کے طور پر منظور کی ہے۔

تیسری تصویر ۱۹۲۶ء کی جامعہ کی ہے جبکہ جامعہ ملیہ علی گڑھ سے منتقل ہو کر قرول باغ دہلی آچکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک تصویر ترکی سفیر رؤف بے کی ہے جو جامعہ کے چند اساتذہ و طلبا کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ یہ تصویر غالباً ۱۹۳۲ء کی ہے۔

اگلے پینل پر سب سے اوپر جامعہ کے ایک وفد کی تصویر ہے جو غالباً ۱۹۲۹ء کو کھینچی گئی تھی اس میں دائیں سے بائیں کرسی پر عبدالحق اور عبدالمجید خواجہ بیٹھے ہوئے ہیں جبکہ کھڑے ہوئے اصحاب میں ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین شامل ہیں۔

اس کے گروپ فوٹو بھی ہے۔ دائیں سے بائیں کرسیوں پر جو لوگ بیٹھے ہیں ان میں قاضی عبدالغفار، حکیم احمد خاں، ڈاکٹر انصاری ہیں اور کھڑے ہوئے لوگوں میں دائیں سے بائیں

شوکت اللہ انصاری اور چودھری سلیم الزماں صدیقی وغیرہ ہیں۔

علاوہ ازیں ایک اور گروپ فوٹو میں ڈاکٹر انصاری، خالدہ ادیب خانم، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب وغیرہ آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

لکڑی کے بورڈ پر کاتی موٹے کپڑے سے بنا ہوا ایک جبہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس کو مولانا محمد علی زیب تن کیا کرتے تھے۔ شجرہ بھی نمائش کا حصہ تھا جو جبہ کے برابر میں لگایا گیا تھا۔ یہ انگریزی اردو زبانوں میں تھا۔ تیسری عکسی تصویر مولانا محمد علی کی املاک وغیرہ کے متعلق ضروری دستاویزات سے متعلق تھی۔ جس سے ان کی خانگی زندگی کے بعض اہم مالی امکانات اجاگر ہوتے ہیں۔ جبہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ نایاب تحفہ کتب خانہ ہیجراحمد، سعید خاں صاحب (رئیس خواجہ) کی عنایت سے ملا تھا۔

"معاصرین" کا گوشہ نہایت وسیع تھا جس کو دیکھ کر مولانا کی ہمہ جہت زندگی اور حلقۂ احباب کی وسعت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس ذیل میں ایک تصویر 7.431 (مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد) کی بھی ہے جس پر اجمل ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن دہلی لکھا ہوا تھا۔ اس تصویر میں جو شخصیات نمایاں نظر آئیں ان میں تقریباً سب وہی لوگ تھے جنکا مولانا

کی تحریکوں اور شخصیت سے کافی نزدیک کا قرب رہا ہے۔
دائیں سے بائیں (کرسیوں پر)
مولانا شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، حکیم محمد
احمد خاں، خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار، نواب
سائل دہلوی، حکیم ذکی احمد، حکیم کبیر الدین اور سید احمد
امام جامع مسجد دہلوی۔
پہلی صف (کھڑے ہوئے) آغا اشرف علی، حکیم شریف خاں
دوسری صف (دائیں سے بائیں) حکیم محمد احمد خاں۔
ایک علاحدہ پینل پر جن معاصرین کی تصویر آویزاں تھیں،
ان کے نام یہ ہیں مفتی کفایت اللہ، بیرسٹر آصف علی، حسن
نظامی، گروپ فوٹو میں سروجنی نائیڈو، عبدالرحمان صدیقی
اور دیگر۔ مولوی مظہر الدین، مولانا عرفان حبیب احمد ندوی،
ضیاء الدین احمد برنی، سید عبداللہ بریلوی، وقار الملک،
سر سید احمد خاں، جسٹس سید محمود، مولانا حسرت موہانی
(پگڑی پہنے ہوئے)، وٹھل بھائی پٹیل، مولانا مظہر الحق،
مولانا ظفر علی خاں، لالہ لاجپت رائے، سر تیج بہادر سپرو،
سر نیواس شاستری۔
اس کے بعد پینل پر جن معاصرین کی شکلیں نظر آئیں۔
ان میں مسعود الحسن (یہ مولانا کے بچپن کے دوست تھے) سر محمد
یعقوب عبداللہ سندھی، سر محمد شفیع، شبلی نعمانی، قاضی
عبدالغفار اور مولانا عبدالسلام (بچپن کے ساتھی) قابلِ ذکر ہیں۔
بعد ازیں سروجنی نائیڈو، سی آر داس، مولانا حسرت
موہانی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید حسن اور ایک نامعلوم
شخص کا گروپ فوٹو، محمد علی جناح، مسز نائیڈو کے ساتھ
مولانا محمد علی، نواب حمید اللہ خاں آف بھوپال، جسٹس
سید امیر علی، ہز ہائی نس سر سلطان محمد آغا خاں، ہارڈن
عبداللہ، چودھری خلیق الزماں، سر محمد اقبال، اور جینا
لعل نہاچ کی تصویریں آویزاں تھیں۔
اس کے بعد معاصرین کے گوشہ میں نواب وقار الملک،
نواب محسن الملک، راجہ محمد علی خاں، آف محمود آباد کے
علاوہ ایک گروپ فوٹو میں جناح شوکت علی، عبدالحق وغیرہ
اور گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء کا ایک منظر بھی پیش نظر تھا۔
مولانا محمد علی کی شاعرانہ حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لئے
چند تصاویر آویزاں تھیں۔ جن میں مولانا کی تصویر کے علاوہ
داغ دہلوی کی تصویر بھی شامل تھی۔ داغ دہلوی، محمد علی
جوہر کے معنوی استاد تھے۔ اسی پینل پر صاحبزادہ آفتاب
احمد خاں کی تصویر، ایک مشاعرہ کا منظر (اسمیں مولانا بھی
موجود تھے) اور مولانا کی ایک غزل کی عکسی تصویر بھی شامل تھی۔
جس پر انھوں نے اسیری کے دوران اپنی بیمار بیٹی آمنہ خاتون
کے نام پیغام دیا تھا۔
"کامریڈ" اور "ہمدرد" اخبار و رفقا کے کالم
میں بعض ایسی شخصیتوں کے فوٹو پیش کئے گئے تھے۔ جو یکتائے زمانہ
ہیں۔ رئیس احمد جعفری، عبدالماجد دریابادی، راجہ غلام
حسین، ولایت علی بمبوق، عبدالحلیم شرر، عارف ہسوی
(مترا جیل) سوریہ کانت ایک انگریز اے سی والٹر کے
ساتھ، عبدالماجد دریابادی کے عالم شباب کی تصویر،
رانا جنگ بہادر اور ترکی سفیر دفتر کامریڈ میں (۱۹۱۲) اسکے
علاوہ دونوں اخبارات کے صفحات کی عکسی تصاویر نے
دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔
مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی ایک قلب دو قالب
سمجھے جاتے تھے۔ اس گذشتہ میں ینگ انڈیا (۱۰ اپریل ۱۹۲۴ء)
Campaigh of Pepresentshin کا تراشہ بھی

نظر آیا جس میں گاندھی جی نے اپنے اداریہ کے ذریعہ اس افواہ کی تردید کی تھی جس کو بعض مفاد پرستوں نے علی برادران اور مہاتما گاندھی کے درمیان خلش پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ ایک تصویر میں مہاتما گاندھی علی برادران کے ساتھ ہیں اور دوسری تصویر میں مہاتما گاندھی کی خاصی بڑی شبیہ دکھائی گئی ہے۔ دوسری تصویر میں کوکناڈا کانفرنس میں ڈیلی گیٹوں کو جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے دوسری تصاویر میں جواہر لال نہرو، سالانہ اجلاس (۱۹۲۲ء) کا اندرونی حصہ اور مین گیٹ کے بعض حصوں کے مناظر اور پلان کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جواہر لال نہرو کا ایک خط مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۲۴ء بھی نمائش کی زینت تھی۔

"امتیازات وتقریبات" کے پینل کے تحت پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ مولانا محمد علی جوہر کانفرنس کی چند تصاویر قابل ذکر ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں مولانا کی یاد میں جاری ہونے والے ڈاک ٹکٹوں کو بھی اس نمائش میں رکھا گیا تھا۔ پاکستان کے افراد نے مولانا کی شخصیت اور خدمات کو اپنے پرچوں کے ضمیمے نکال اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ ان ضمیموں کو بھی نمائش میں دکھایا گیا۔ "خلافت" بمبئی کے پہلے صفحہ کی اصل کاپی آویزاں تھیں ایک گروپ فوٹو ایسا بھی نظر آیا جس میں بیگم محمد علی شامل تھیں اور اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھیں۔

"خلافت" کے تحت کافی تعداد میں تصاویر نمائش میں شامل تھیں ایک پینل پر ملایا ایک وفد کی تصویر تھی۔ یہ وفد تحریک خلافت کے دوران ہندوستان آیا تھا۔ اس کے بعد ایک گروپ فوٹو میں عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی، عبدالعزیز انصاری، چودھری خلیق الزماں اور ڈاکٹر انصاری بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تصویر مصطفیٰ کمال پاشا کی بھی تھی۔ ان تصاویر کے ساتھ بعض تہنیت نامے بھی آویزاں تھے جو انجمن ضیاء الاسلام بمبئی نے ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو علی برادران کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی کی ایک تصویر تھی جو کہ ۱۹۲۰ء میں کھینچی گئی تھی۔

دوسرے پینل پر علی برادران کا ایک گروپ فوٹو تھا جہاں دونوں بھائی خلافت کی یونیفارم میں موجود ہیں۔ دوسرا گروپ فوٹو ڈاکٹر انصاری، شعیب قریشی، رؤف بے، خلیق الزماں، عبدالرحمان صدیقی، وغیرہ پر مشتمل تھا۔ تیسرے گروپ فوٹو میں خلافت کمیٹی کے چند اراکین تھے جنکے ناموں کی تختی نہیں تھی۔

جلیانوالا باغ امرتسر میں نہتے ہندوستانیوں پر جنرل اڈوائر نے فائرنگ کا حکم دیا تھا اس موقع کی تصویر نمائش میں شامل تھی ایک دوسری تصویر میں ڈاکٹر انصاری کو طبی مشن کی نرسوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ طبی مشن کی دوسری تصاویر ڈاکٹر انصاری، ترکی میں آپریشن کرتے ہوئے، طبی مشن چند اراکین کے ساتھ اور ایک گروپ فوٹو پر مشتمل تھیں۔ خلافت بینڈ اور والنٹیرز کے ساتھ مولانا محمد علی کی تصویر جنت نگاہ بنی ہوئی تھیں۔

آگے چل کر چند رسیدیں، خطوط کی عکسی تصاویر اور اخبارات کے تراشے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔

خلافت ہاؤس بمبئی دس سال تک ہندوستان کی سیاست کا محور بنا رہا۔ اسکی عمارت کی تصویر نے دیکھنے والوں کو اپنی طرف راغب کیا۔ دوسری طرف مولانا محمد علی اراکین خلافت کے ساتھ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ایک تصویر میں علی برادران کو قیدیوں کے لباس میں دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوا۔ اس نمائش کے منتظمین کا یہ سب سے بڑا کمال تھا کہ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی ایک تصویر بھی ڈھونڈ نکالی جو واقعی بے حد نادر و کمیاب ہے ۱۹۲۰ میں خلافت کانفرنس لندن کے لئے ایک وفد روانہ کیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر سید حسین اور سید سلیمان ندوی بھی شامل

مانک ٹالہ کا خط ایڈیٹر فروغ اردو کے نام

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء

محترمی۔ تسلیمات

فروغ اردو کا اکتوبر ۱۹۸۱ء کا شمارہ چند روز ہوئے موصول ہوا تھا۔ اس میں "سمر یاترا" کی ضبطی کے سلسلے میں جو میرا خط شائع ہوا ہے۔ اس میں "سمر یاترا" کی ضبطی کے سلسلہ کی تفصیلات شائع ہونے سے رہ گئی ہیں۔ آپکے پرچے میں پروف ریڈنگ کا کوئی معقول انتظام نہیں لگتا۔ سید محمد عقیل صاحب نے بھی اس شمارے میں اپنے خط میں اسی بات کی شکایت کی ہے کہ اُن کے مضمون سے بھی اہم سطریں غائب ہو گئی ہیں۔

بہر حال جو تفصیلات چھپنے سے رہ گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) "پریم چند وشو کوش" ۔ صفحہ نمبر ۱۵۷ پر "سمر یاترا" کے سلسلہ کی تفصیلات دینے کے بعد مندرجہ ذیل اطلاع بھی ہے:۔

"27 مارچ 1933ء ——— صفحہ نمبر 6 کے جاگرن میں سرکار کی طرف سے (سمر یاترا کے) ضبط ہونے کی خبر شائع ہوئی ہے۔"

(۲) ایسی کتاب کی جلد ۲ میں صفحہ 154 پر سمر یاترا کی ضبطی کی ضبطی کی جو اطلاع جاگرن کے صفحہ نمبر 6 پر شائع ہوئی تھی۔ اس کا عکس بھی دیا گیا ہے۔

ان شواہد کی موجودگی میں امرت رائے صاحب کی اطلاع غلط ہے کہ "سمر یاترا" ضبط نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شبلی صاحب کے اس الزام کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ امرت رائے وغیرہ نے پریم چند کے امیج کو بوسٹ (Boost) کرنے کے لئے (غلط صحیح) کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ امرت رائے چاہتے تو کہہ سکتے تھے کہ "سمر یاترا" بھی ضبط ہوئی تھی لیکن اُن کی ایمانداری کی داد دیجئے کہ چونکہ یہ اطلاع اُن کے علم میں نہیں تھی انھوں نے فوراً اس کی تردید کر دی۔

اور اِدھر شبلی صاحب کی تحقیقی ایمانداری کا بھانڈا میں "سوز وطن" کے سلسلے میں فروغ اردو (مئی جون ۸۱ء) میں پوری طرح چوراہے میں پھوڑ چکا ہوں۔ لیکن وہ جان بوجھ کر غلط بیانیوں سے باز نہیں آتے۔

اکتوبر کے شمارے میں سبلیس زیدی صاحب کے مضمون "ہندی میں پریم چند کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خط" کے ترجمے کے ساتھ انھوں نے اپنی طرف سے جو نوٹ دیئے ہیں اُن میں نوٹ نمبر ایک میں فرماتے ہیں "چٹھی پتری کے مرتب کرنے والے اکیلے امرت رائے نہیں۔ بلکہ مدن گوپال ہیں۔ اس کے پہلے حصے میں جو صرف منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے مدن گوپال کا نام بھی چھپا ہوا ہے۔ بارہ سطروں کا دیباچہ لکھ کر انھوں نے امرت رائے کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ لیکن جلد دوم سے اُن کا نام غائب ہے۔"

شبلی صاحب اور قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے۔ کہ جلد ۲ میں نہ صرف مدن گوپال کا نام موجود ہے بلکہ امرت رائے سے پہلے جلی حروف میں اُن کا نام دیا گیا ہے۔ کاپی رائٹ میں بھی اُن کا نام موجود ہے۔ اور امرت رائے کی "ہاں میں ہاں" ملانے کے لئے اس مرتبہ انھوں نے سولہ سطروں کا دیباچہ لکھا ہے۔ یہ ہے شبلی صاحب کی تحقیقی ایمانداری۔۔۔ ! ایک معمولی سی

بات جس کا تحقیق پر رتی بھر بھی اثر نہیں پڑتا۔ اُس میں بھی غلط بیانی کرنے سے باز نہیں آئے۔ اسی طرح کی گوہر افشانی انھوں نے اس مضمون پر دیئے گئے۔ اپنے باقی نوٹس (NOTES) میں کی ہے۔ اِن سب کی متعدد بار میری طرف سے اور دوسروں کی طرف سے بھی تردید کی گئی ہے۔ اور وہ جان بوجھ کر اِن جھوٹے الزامات کو بار بار دہرا رہے ہیں کیونکہ ہٹلر کے دستِ راست گوئبلز نے کہا تھا کہ ایک جھوٹ بار بار نہایت شدّ و مدّ سے دُہرایا جائے تو وہ سچ بن جاتا ہے۔

فروغ اُردو (مئی۔جون ۱۹۸۱ء) میں بھی انھوں نے پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرنے کے لئے اپنی ان ہی دروغ بافیوں کو دُہرایا ہے اور میرے یا دوسروں کے ایک ایک لفظ کو پکڑ پکڑ کر بہت سی فرضی باتیں کی ہیں۔ غالباً وہ دوسروں کو تھکا کر ہرا ڈالنے کے چکر میں ہیں ورنہ تحقیق اُن کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اپنی تحقیق میں اُن کا سب سے پہلا شکار سچائی ہے حالانکہ تحقیق کا مطلب ہی سچائی کا اظہار ہے۔

بہرحال فروغ اُردو (مئی جون ۱۹۸۱ء) میں اُن کے چھپے ہوئے مضمون کے سلسلے میں اُن کی غلط بیانیوں کی میں نے پھر سے نشان دہی کی ہے۔ میرا مضمون ذرا طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اس پر نظر ثانی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ نظر ثانی کے بعد مضمون ارسال ہوتے ہی خدمت میں ارسال کروں گا۔

مخلص

مانک ٹالہ

نوٹ: ۔ سپلیش زیدی صاحب نے اپنے مقالہ میں بہت حد تک تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ انکی کئی باتوں سے اختلاف تو ممکن ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے تحقیق کا منہ چڑایا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے تین ادوار کی جھلکی پیش کی ہے جو بہت حد تک صحیح ہے۔ لیکن شبلی صاحب نے تو صرف پریم چند کے پہلے دور کے چند خطوط کو لے کر انھیں فرقہ پرست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ دور جس میں انھوں نے ہندو مسلم یکجہتی کے لئے بیسیوں مضمون لکھے۔ بلکہ اُن میں بیشتر میں ہندوؤں ہی کو مجرم ٹھہرایا۔ شبلی صاحب نے جان بوجھ کر اس دور کے پریم چند کو قارئین کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی ہے۔

— مانک ٹالہ

بسلسلہ مضمون صفحہ ۱۳ مولانا محمد علی جوہر

تھے۔ اس موقع کی تصویر بھی موجود تھی۔ قاتل قوم سر مائیکل اڈوائر کی تصویر کو ہر دیکھنے والے نے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ آگے بڑھ کر نمائش کا نظارہ کیا تو ایک تصویر میں شنکر آچاریہ جلوہ افروز نکل آئے یہ مولانا محمد علی کے ساتھ مقدمہ کراچی میں ماخوذ تھے۔ جیل کی گاڑی کی تصویر بے حد صاف اور نمایاں تھی۔ سلطان عبدالمجید دائی ترکی اور مولانا شبیر احمد عثمانی، کراچی سنٹرل جیل کے مرکزی دروازہ کی تصویر، جیل کے دروازہ کا کلوز اپ، مولانا شوکت علی جیل سے نکلتے ہوئے، عمر سبحانی، خلافت کمیٹی کے اراکین، کراچی کے مشہور مقدمہ کے جج بی سی کینڈی اور خلافت گیٹ۔ یہ وہ تصاویر ہیں جن کو دیکھ کر ناظرین کو تحریک خلافت کی وہ تاریخ یاد آنے لگی جس نے آزادیٔ وطن کے لئے راستہ [illegible] کی تھی اور جس نے قوم کے جذبہ حریت کو للکار کر جد وجہد کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ ●●

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۵	دہلی کا یادگار مشاعرہ		۱/۵۰
۶	دستہ گل		-/۶۰
۷	دوشیزہ قاف (ناول)	خان محبوب طرزی	۵/-
۸	دلربا	" "	۳/۵۰
۹	دلّی کا دبستان شاعری (سہ اضافہ جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۲۲/-
۱۰	دو سکنیں	ذکی کاکوروی	۳/۵۰

(ڈ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	-/۵۰

(ذ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ذوق جستجو	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۲/-
۲	ذوق ادب و شعور	سید احتشام حسین	۸/-
۳	ذوق جنوں مجموعہ کلام	آل احمد سرور	۱۱/-

(ر)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۹/-
۲	رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ	سید امیر حسن نورانی	۲/۵۰
۳	رہبر مضمون نویسی	شفاعت علی صدیقی	۳/-
۴	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	-/۵۰
۵	رخسار سحر	انصر کریم صدیقی	۱/۵۰
۶	رفتار	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰
۷	رموز حکمت معہ مقدمہ اردو	محمد شریف	۴/-
۸	ریاض فارسی۔ منتخب کلام فارسی		۳/-
۹	ریختہ دلی جدید ایڈیشن	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۳/-

(ز)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ	مولانا تھانوی	-/۵۰
۲	زنگیوں کا بادشاہ حکیم بابا نامزاحیہ ناول	سید علی عباس حسینی	۲/-
۳	زینب ساحرہ	وحشی محمود آبادی	۳/-

(س)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	۴/-
۲	سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۵/-
۳	سرو جہاں آبادی	ڈاکٹر حکیم چند نیر	۹/-
۴	سرو دنو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۴/۵۰
۵	سلک گہر	سید احتشام حسین	۵/-
۶	سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	سید علی عباس حسینی	۱/۵۰
۷	سرمایہ زبان اردو	جلال لکھنوی	۹/-
۸	سوز (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/-
۹	سیاحت زمیں "	محمود اعظم فہمی	۱/۵۰
۱۰	ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۳/۵۰
۱۱	سنہرا حلقہ		-/۷۵
۱۲	سر سید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	-/۵۰
۱۳	سوشل اسٹڈی	احمد محسن کاکوروی	۱/۲۵

(ش)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	شعر نو تنقیدی مجموعہ	ڈاکٹر محمد حسن	۸/-
۲	شرح دیوان غالب مزاحیہ	غلام احمد فرقت	۲/-
۳	شرح مسلک گہر	عبدالقوی دریابادی	۶/-
۴	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۵	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۵/-
۶	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۵/-
۷	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۸	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	-/۵۰
۹	شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن	نظم طباطبائی	۹/-
۱۰	شہر ... در معاشی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۱/-
	" " حصہ دوم	"	۱/۲۵

۱۲ شہری اور سماجی زندگی دوم — عبدالعلی قدوائی — ۱/-
۱۳ ،، اور ،، سوم ،، ،، — ۱/۵۰
۱۴ شاہان گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — ۲/۵۰
۱۵ شعرالعجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۴/-
۱۶ شرح نثر امروزہ ایران — احسن الظفر بی اے — ۴/-
۱۷ شرح شعر امروز ایران ،، ،، — ۴/-
۱۸ شمع و شاعر — علامہ اقبال — ۵/-
۱۹ شرح حکیم نباتات و ترجمان — نیر مسعود — ۱/۷۵
۲۰ شرح انتخاب قصائد و غزلیات درسی مطابق نصاب بی اے — ۸/-
۲۱ شرح شعر پابستان حصہ اول — ڈاکٹر انوار الحسن — ۴/-
۲۲ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبدالقوی — ۲/-
۲۳ شرح مفتاح العربیہ — عبدالقوی دریابادی — ۴/-
۲۴ شرح نصاب فارسی
۲۵ شرح شعر پابستان حصہ دوم — احسن الظفر — ۲/-
۲۶ شرح گلہائے ادب — ۲/-
۲۷ شرح آئینہ نظم اردو — ۲/-
۲۸ شرح نثر فارسی (امروزہ) — ۲/-
۲۹ شرح آئینہ نثر اردو (خلیل قدوائی) — ۴/-
۳۰ شرح غنچہ گل — ۴/-
۳۱ شرح شعر فارسی کلاسیک — احسن الظفر — ۴/-
۳۲ شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶، ۷، ۸ — خلیل قدوائی — ۲/-

(ص)

۱ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۹/-
۲ صحیفہ محبت نمبر، ادبی خطوط — ڈاکٹر محمود الہی — ۴/۵۰

(ط)

۱ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو — ۱/-
۲ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ — غلام الثقلین — ۱/۷۵
۳ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۵۰

(ع)

۱ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۴/-
۲ عکس اور آئینے تنقیدی مضامین کا مجموعہ — سید احتشام حسین — ۹/-
۳ عبدالماجد دریابادی نمبر — ۱۲/-

(غ)

۱ غالب کا تنقیدی شعور — اخلاق حسین عارف — ۴/-
۲ غالب نام آورم — نادم سیتاپوری — [illegible]
۳ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر — سید احتشام امیر حسن نورانی — ۴/-
۴ غالب کی تخلیقی تخیل — شہید صفی پوری — ۸/-
۵ غنچہ و گل — سید محمود الحسن رضوی — ۲/۵۰
۶ غالب کے کلام میں اخلاقی عناصر — نادم سیتاپوری — ۴/۵۰
۷ غزنی کا دروازہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰
۸ غزلیات — نظیری — ۱/۵۰
۹ غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید اڈیشن) — ذکی کاکوروی — [illegible]

(ف)

۱ فرقت کاکوروی نمبر — ۶/-
۲ فن خطابت یعنی استاد تقریر — کلثوم مصطفیٰ ایڈوکیٹ — ۲/-
۳ فریدہ — [illegible] — ۲/۵۰

۵. فورٹ ولیم کالج اور اکرام غنی — نادم سیتاپوری — ۹/-
۶. فلسفۂ اقبال — عبدالقوی دریابادی — ۴/-
۷. فلسفی ابن رشد — مائل ملیح آبادی — ۲/۵۰
۸. فروغ جام مجموعہ کلام — کشور واحدی — ۵/-
۹. فغان محسن — محسن کاکوروی — ۲/۵۰
۱۰. فارسی آموز — منیر احمد علوی — ۱/-
۱۱. فن داستان گوئی جدید ایڈیشن — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۹/-
۱۲. فریاد امت — علامہ اقبال — ۲/۲۵

(ق)

۱. قدیم و جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں — غلام فرقت — ۴/-
۲. قصائد ظہیر فاریابی — ۳/-
۳. قصائد مومن مع شرح — ظہیر احمد صدیقی — ۷/۵۰
۴. قطرے سے گہر ہونے تک — صالحہ عابد حسین — ۲/-
۵. قصص و مسائل — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۶. قصائد قاآنی (فارسی) — ۱/-
۷. قومی ادب نثر و نظم — حامد اللہ افسر — ۴/-
۸. قیامت صغریٰ — سائنسی ناول خان محبوب طرزی — ۳/-

(ک)

۱. کلیات اقبال — علامہ اقبال — ۱۵/-
۲. کیسر اور کالی — بدرالدین طیب جی — ۳/-
۳. کف گلفروش — مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت — ۴/۵۰

(گ)

۱. گاندھی نمبر — ۲/-
۲. گلدستہ فارسی اول و دوم — محمد غوث بیگ شفقی — ۱/-
۔ گلزار فارسی یعنی ترجمہ [illegible] — ۱/۲۵
۴. گلہائے ادب — ۴/-
۵. گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۱. لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاصفان خلیل — ۱/۷۵
۲. لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۳. لب بام — عادل رشید — ۴/-
۴. لسانیات اور اردو — سید محمود الحسن رضوی — ۲/۵۰

(م)

۱. مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲. مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو — ۱۰/-
۳. محسن کاکوروی نمبر — ۲/۵۰
۴. مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۲/۵۰
۵. مرثیہ نگاری اور میر انیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/-
۶. مضامین فرحت حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۴/-
۷. " حصہ دوم " " — ۵/-
۸. ماضی کی کہانیاں — آفتاب اختر ظہری — ۴/-
۹. میرے اسٹیج ڈرامے — ڈاکٹر محمد حسن — ۸/-
۱۰. موسم گل (ناول) — عادل رشید — ۴/-
۱۱. مجبور — خان محبوب طرزی — ۴/-
۱۲. مضامین جدید — محمد ہادی — ۲/۵۰
۱۳. مثنوی سحر حلال فارسی مع مقدمہ — قدرت اللہ بیگ — ۲/۵۰
۱۵. مطالعہ — ذکی کاکوروی — ۵/-
۱۶. مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰
۱۷. معرکۂ روم دیوان — صادق سرجنوی — ۴/-
۱۸. مثنویات حالی مع اضافہ — [illegible] — ۲/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	1/-
۳	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	1/50
۵	ہندوستان کا تعمیر منصوبہ	"	1/50
۶	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفےٰ احسن علوی ثریا	1/-
۷	" " حصہ ۲	" "	1/30
۸	" " حصہ ۳	" "	1/40
۹	ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی ثریا	1/40

(ی)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	یادگار غالب	مولانا حالی	8/-
۲	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	3/50
۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	5/50

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان
بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ڈبلیو / این پی ۔ ۹۳
لائسنس نمبر ۴۲ ، ۴۳ ۔ ۸۰ / ۸۱ / ۹۴۴۳ ۔ ۸۰

دفتر فون : ۴۶۱۳۵
فون رہائش گاہ : ۴۴۶۵۴

ایڈیٹر : محمد حسین شمس علوی
قاسمی کاکوروی فاضل دیو بند

جلد (۲۸) شمارہ (۸) دسمبر ۱۹۸۱ء

مجلس ادارت :

عبدالقوی دریابادی (بی اے)
سعادت علی صدیقی (ایم لٹ)
محمد حسنین علوی (ایم اے)

ترتیب

مجلس ادارت

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبہ اردو	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی ریڈر شعبہ اردو	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر انوار الحسن	〃
پروفیسر حکم چند نیر	بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر فضل امام	راجستھان یونیورسٹی

زر سالانہ اعزازی : بیس روپئے
عوام سے : پندرہ روپئے
فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ
دفتر ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

ادھر کچھ عرصے، دوسری سرکاری زبان، اور عالمی اردو کانفرنس پر محبان اردو اور اردو کی ترقی و بقاء کے لئے جد و جہد کرنے والے حضرات، اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اختلاف رائے ہونے کے باوجود ان سب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت آئینی اور قانونی طور پر اردو کے حقوق تسلیم کرکے اس کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان بنادے۔ اس کے بغیر عالمی اردو کانفرنس سے کوئی تعمیری اور حقیقی فائدہ نہ پہونچے گا، ہاں حکومت اور اس کے چند ہم نوا دُور کی شہرت نیک نامی یا بدنامی کی حیثیت سے ضرور ہو جائے گی۔ عالمی اردو کانفرنس کے سلسلے میں اتر پردیش اردو اکادمی، کا بھی نام لیا جاتا ہے اور یہ شائد اس لئے کہ اکادمی کی کونسل کے صدر نے بھی بیانات دیے ہیں، جبکہ کونسل میں "عالمی اردو کانفرنس" کا ذکر تک نہیں آیا، نہ کوئی تجویز پیش ہو کر پاس ہوئی۔ فروری ۱۹۸۶ء میں تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد کونسل کا جلسہ بلایا گیا، اس کے بعد آج تک کوئی جلسہ ہی نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہدے داران اور ممبران مجلس منتظمہ کے نزدیک بھی "کونسل" بر قاضلات سے ہے اور اس کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ افادیت، نہ ضرورت، پھر اتنی غیر ضروری اور غیر مفید سمجھی جانے والی کونسل کو ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ دستور العمل کے بموجب اس کا جلسہ نہ بلاکر، اس کے ممبران کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا اس کارروائی سے ان کی اہانت و ذلت نہیں ہوتی۔

صدر اتر پردیش اردو اکادمی کا عالمی اردو کانفرنس کے سلسلے میں بیانات، ممبران کونسل اور اردو حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا کر رہا ہے کہ عالمی اردو کانفرنس اتر پردیش اردو اکادمی منعقد کر رہی ہے، جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ بے جان اور بے حس ممبران کونسل کی خاموشی سے، سرکار کے سابق عہدہ دار (جو اکادمی میں بھی ذمے دار بنا دیے گئے ہیں) یہ غیر آئینی طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

اُردو کے سلسلے میں ڈاکٹر عمار رضوی صاحب وزیر قومی یک جہتی نے بی بی سی لندن کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ :-

"کانگریس نے بعض ریاستوں میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ اپنے الیکشن مینی فسٹو میں کیا تھا اور اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ بہار میں اُردو کو یہ حیثیت دینے کے لئے قانون بن گیا ہے اور اُردو کو جو حقوق وہاں قانوناً دے دیئے گئے ہیں وہ حقوق اتر پردیش میں بھی عملاً دیے جا چکے ہیں"

اس کا صاف مطلب ہے کہ اتر پردیش میں عملی حیثیت سے اُردو کے سارے حقوق تسلیم کئے جا چکے ہیں اور اُردو کی تعلیم، اس کے چلن، اور سرکاری، نیم سرکاری اداروں میں اس کے استعمال پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بہار کی طرح یہاں بھی بیسک اسکولوں سے لے کر ہائی اسکول تک ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ یہاں بھی دفتروں میں اُردو کا استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی حکومت کے تمام شعبوں میں اُردو کا بھی چلن ہے۔ لیکن سچائی کیا ہے؟ یہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر عمار صاحب جیسا بالغ نظر اور تعلیمات سے وابستہ رہنے والا، اور سماج اور ماحول سے باخبر رہنے والا، مدبّر، اُردو کی حالت سے واقف نہ ہو، دیہاتوں اور قصبوں کو چھوڑیے، شہروں ہی کا جائزہ لے لیجئے۔ اور میں تو صرف اتر پردیش کی راجدھانی، اُردو کے مرحوم مرکز لکھنؤ ہی کے جائزے پر، اس بیان کو سچّا تسلیم کر لوں گا۔ اگر لکھنؤ کے بیسک، جونیر اور ہائی اسکولوں میں سے کسی ایک سرکاری اسکول کو مثال میں پیش کر دیا جائے کہ وہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے، دفتروں اور رابطۂ عامہ کے محکموں میں اُردو کے چلن کا کیا حال ہے؟ وزیر اعلیٰ نے یہ بھی تو حکم دیا تھا کہ بسوں پر اُردو میں بھی تختیاں لگائی جائیں، لیکن آٹھ دس مہینوں کے قریب ہو گئے اس پر عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ اُردو کی ترقی کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے قومی آواز کی مثال پیش کی ہے کہ وہ اب کئی جگہوں سے شائع ہونے لگا ہے، لیکن یہ وہی قومی آواز ہے جو جنتا حکومت میں سرمایہ کی کمی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس کے عملے کی تنخواہیں تک کئی کئی مہینے نہیں ملتی تھیں اگر اُردو نے ترقی کی ہوتی تو قومی آواز کیوں بند ہوتا؟ یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اسی لکھنؤ سے متعدد اخبارات حقیقت، حق، ہمدم، اودھ اخبار، تنویر، قومی آواز وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ اب صرف قومی آواز اور عزائم شائع ہوتے ہیں یعنی ایک تہائی سے بھی کم رہ گئے۔ یہ ترقی کی علامت ہے؟ اُردو دنیا اب اس قسم کے بیانات سے مطمئن نہیں ہو سکتی، یہ دنیا صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ انگلینڈ، روس، جرمنی، فرانس، ماریشس، امریکہ وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ وہاں بھی اُردو

جاننے والے رہتے اور بستے ہیں، وہاں بھی اُردو اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں، وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ یو۔پی میں اُردو کی حیثیت کیا رہ گئی ہے

۱۹ر نومبر ۱۹۵۸ء سے قومی یک جہتی ہفتہ منایا جا رہا ہے، اور کانگریس نے اس موقع پر بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ اُردو میں بھی بینر وغیرہ لگائے جائیں۔ یہ محکمہ تو عمار صاحب کا ہے کیا ان کے نزدیک بینر پر اُردو میں بھی لکھا جانا قومی یک جہتی کے خلاف ہے۔

وزیر اعلیٰ نے ۱۹۵۸ء ختم ہونے سے پہلے اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ کیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس وعدہ کو وہ عملی جامہ کب پہنائیں گے، بہار یو۔پی سے سبقت لے گیا ہے۔ بنگال نے بھی اعلان کر دیا ہے۔ مگر اتر پردیش جو اُردو کا مرکز رہا ہے جہاں خسرو، میر، غالب، نظیر، چکبست، پریم چند، دیا نرائن نگم جیسی ہزاروں با کمال اور شہرہ آفاق ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اور اب بھی آل احمد سرور، نور الحسن ہاشمی، خواجہ احمد فاروقی، فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، جیسے بیسیوں با کمال موجود ہیں۔ کب اپنی پیشانی سے کلنگ کا ٹیکہ مٹانے کے قابل ہوگا اور اس کے با اقتدار حضرات کو کب ایمانداری ہی بہترین سیاست ہے، پر عمل کرنے کی توفیق و صلاحیت ہوگی۔

حسین احسن پوری

جسے ہمراز سمجھا تھا، نہ نکلا ہم زباں میرا
بجا فرما رہے ہیں مانتا ہوں تھا، گماں میرا

میں اپنی داستاں کو خود کہوں۔ غیرت نہیں کہتی
مزہ جب تھا کہ جب ہوتی زباں تیری بیاں میرا

بمشکل رہبر جو رہزنی کرنے کے عادی ہیں
اُنھیں دانستہ سونپا جا رہا ہے کارواں میرا

بہر صورت مجھے منزل پہ جا کر سانس لینا ہے
بہت محکم ہے دھمکی آندھیو عزمِ جواں میرا

جہاں احساس کے گوشِ سماعت کچھ نہ سُن پائیں
اب اُس منزل میں لے دوستو دردِ نہاں میرا

کھلی آنکھوں کے سوئے در نگے رہنے سے ظاہر ہے
ابھی باقی ہے شاید اور کوئی امتحاں میرا

کلی کی طرح جو چٹکے تھے کل آواز پر میری
تصوّر تک اُنھیں اُن کو ہے اب بارِ گراں میرا

غافل انصاری

گئودان تصنیف یا ترجمہ؟
تصنیف

پریم چند کے مشہور ناول گئودان کو ہندی گودان کا ترجمہ ثابت کرنے کے لئے پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے ہماری زبان کے توسط سے جو کئی مضامین پیش کئے ان میں ایک مضمون داخلی شواہد پر مبنی ہے ۱۵ جون ۱۹۷۱ء کے "میرا صفحہ" پر لکھتے ہیں:-

" ہماری زبان کے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۸ مئی ۱۹۷۱ء کے شماروں میں پریم چند کے اردو ناول گئودان کے بارے میں خارجی شواہد کی بنا پر ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی حیثیت محض ترجمہ کی ہے اور مترجم کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری اقبال ورما سحر ہتگامی پر عائد ہوتی ہے۔ موجودہ قسط میں داخلی اور لسانی شواہد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اُردو گئودان کی زبان پریم چند کی نہیں بلکہ اس کے مترجم کی ہے "۔

اس ضمن میں کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں:-

" لسانی تجزیہ کے لئے ہمارے پیش نظر گئودان کا اکیسواں باب ہے۔ صرف اس ایک باب کے تجزیہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی دو لسانی مصنف کی اصل تحریر نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے شخص کا ترجمہ ہے "۔

پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے لسانی تجزیہ کے لئے جو فقرے اور الفاظ پیش لئے وہ اکیسویں باب کے نہ ہو کر بیسویں باب سے ماخوذ ہیں موصوف نے صرف سات فقرے اور تین الفاظ کا انتخاب کیا اور ان پر لسانی گرفت کرتے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندی گودان کی زبان گئودان کی زبان سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے چونکہ گودان پریم چند کا مستند ناول ہے اس لئے گئودان میں مترجم کی کارفرمائی کا دخل ہے انھوں نے منتخب سات فقرے بھی ایک سلسلے سے اخذ نہ کرکے ادھر اُدھر سے بلا ترتیب

اُٹھائے ہیں صفحہ نمبر کے اضافہ کے ساتھ اِن فقروں کو موصوف ہی کی ترتیب میں نقل کیا جا رہا ہے۔

گودان :

(۱) اس کا رکت کھول رہا تھا۔ ص۲۰۱
(۲) روٹیاں پکائی تھیں ص۲۰۴
(۳) ہوری نے دھنیا کو سجل نیتروں سے دیکھا۔ ص۲۰۶
۴۔ ایک جون تو چبینے پر ہی کٹتا تھا۔ ص۲۰۵
۵۔ اور گوئل سنگیت کا گپت دان کر رہی تھی۔ ص۲۰۲
۶۔ آہت ابھمان کے ساتھ ص۲۰۲
۷۔ نیتر کی سی اندھ شکتی۔ ص۲۰۶

گئودان

۱۔ اس کا خون کھول رہا تھا ص۳۳۹
۲۔ روٹیاں بنائی تھیں ص۳۴۳
۳۔ ہوری نے دھنیا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر ص۳۴۳
۴۔ ایک وقت تو چربن پر ہی کٹتا تھا ص۳۴۳
۵۔ اور گوئل راگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی ص۳۲۹
۶۔ زخم کھائے ہوئے تکبر کے ساتھ ص۳۲۹
۷۔ مشین کی سی کورانہ طاقت ص۳۲۱

پروفیسر صاحب اِن فقروں پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اُردو کے روزمرہ سے واقف کار خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُردو محاورہ خون کھولنا ہے یا خون اُبلنا روٹیاں پکانا ہے۔ یا روٹیاں بنانا، آنسو بھری آنکھیں یا ڈبڈبائی آنکھیں، چربن ہے یا چبینا، ترجمہ کی غرابت راگوں کی خفیہ خیرات اور مشینوں کی سی کورانہ طاقت سے بھی ظاہر ہے۔"

(ہماری زبان ۱۵؍جون ۱۹۷۱ء ص۱۲)

پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے اُردو کے جن فقروں پر غرابت کا الزام لگایا ہے وہ ہندی کے مقابلے میں فصیح تر ہیں۔ صرف ان فقروں کو جملوں کی ساخت اور واقعاتی تسلسل میں رکھ کر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ فصیح اور غیر فصیح کا فیصلہ سیاق و سباق کے اعتبار سے کیا جانا چاہیئے تھا۔ جس سے موصوف نے چشم پوشی کی ہے۔ انھوں نے اِن فقروں کو زبردستی محاورہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی اور تقابلی مطالعہ کے بجائے اصلاحی نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔ خون کھولنا محاورہ ضرور ہے لیکن گودان میں رکت کھولنا استعمال ہوا ہے مضمون کا قاری موصوف سے یہ جاننا چاہتا ہے کہ رکت کھولنا فصیح ہے یا خون اُبلنا؟ خون کھولنا دگودان میں استعمال ہوا ہے اور نہ گئودان میں، اس کو زیر بحث کیوں لایا گیا ہے؟ خون اُبلنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ گوبر کو جھنیا کی بات سُنکر یکایک طیش آگیا۔ اور اس نے فوراً انتقام لینے کی ٹھانی۔ رکت کھولنا سے گوبر کی اِس نفسیاتی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا۔

روٹیاں پکائی تھیں اور روٹیاں بنائی تھیں دونوں روزمرہ ہیں۔ لیکن ثانی الذکر دھنیا کا مکالمہ ہے اور دھنیا سماج کے جس طبقہ سے تعلق رکھتی ہے اس کے مطابق روٹیاں بنائی تھیں زیادہ فصیح ہے۔ موصوف نے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں رکھ کر اس کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔

سجل نیتروں اور آنسو بھری آنکھوں کا استعمال پریم چند نے کیا ہے ڈبڈبائی آنکھوں کا ذکر نہ گودان میں ہے نہ گئودان میں اُردو ہندی کے فقرے ایک دوسرے کا ترجمہ ہیں۔ ڈبڈبائی آنکھوں

صوف نے اپنی طرف سے شامل کرلیاہے جبکہ اس کی مطلق
رت نہ تھی۔ موازنہ میں اگر تبصرہ اور تنقید ہی مقصود تھی تو پریم چند
دبیات سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔

چوتھے فقرے میں چرین اور چنیا زیر بحث لائے گئے ہیں
پردیش کے پوربی اضلاع میں چرین عام طور سے بولا جاتا ہے۔
روزمرہ میں شامل ہے۔ پریم چند کے دوسرے ناولوں اور
انوں میں اس کا استعمال ملتا ہے۔ چرین علاقائی خصوصیت
امل ہے۔ اور جو پریم چند کے اسلوب کی خصوصیت رہی ہے۔
سنگیت کا گیت دان اُردو کے راگوں کی خفیہ خیرات
امترادف ہے۔ اسی طرح آہٹ ابھرنا اور زخم کھائے ہوئے
پانیتر کی سی اندھہ شکتی اور مشین کی سی کورا نہ طاقت بھی لفظی
رادف ہیں پتہ نہیں اِن میں غرابت یا اقبال ورما سحر کی بو
ں سے آگئی۔

اپنے اسی مضمون میں آگے بڑھ کر موصوف نے ادکھ اور ایکھ
ے ہی لفظ کی دو شکلوں پر اعتراض کردیا۔ موصوف فرماتے ہیں:-

"... ہندی میں پریم چند نے ہر جگہ ادکھ کا
لفظ استعمال کیا ہے، مترجم نے اس باب میں دو جگہ
ادکھ لکھا ہے اور دو جگہ اس کی شکل ایکھ — اگر
پریم چند نے اس بات کو اُردو میں لکھا ہوتا تو
وہ یقیناً ایکھ کی یکسانیت کو برقرار رکھتے کہ
اُردو والے بیشتر لفظ کی اسی شکل سے واقف ہیں
اور معیاری ہندی تک کے قاعدوں میں کچھ سے
ایکھ لکھا گیا ہے ......"

موصوف کے اس بیان میں زبردست تضاد ہے
یاری ہندی تک کے قاعدوں میں کچھ سے ایکھ لکھا جاتا ہے، درست
ہے۔ تو کیا یہ مان لیا جائے کہ اُردو ہندی کا مصنف، ہندی کا
صحافی، پریم چند معیاری ہندی کے قاعدے تک سے ناواقف تھا؟
اگر نہیں تو گئودان میں ادکھ کا لفظ ہی کیوں استعمال کیا۔ اُردو میں
ادکھ اور ایکھ دو شکلوں میں ملتا ہے تو کیا یہ سحر اور پریم چند کا
مشترکہ باب ہے یا پھر گودان کے مصنف کا "یا ادکھ"، اُردو والے
لفظ کی شکل ایکھ سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے ایکھ، دونوں ہی
پریم چند کے الفاظ ہیں ایسی ہی صورتِ حال چڑھانا اور چڑا نا
کی ہے اگر گئودان سحر اور پریم چند دونوں کی مشترکہ محنت کا ثمرہ
ہے۔ تو اس کو چلنے وار الگ کرپانا پروفیسر مسعود حسین صاحب جیسے
بالغ نظر نقاد کا ہی کام ہے۔

مترجم کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں وہ ترجمہ کے
عوض حق الخدمت اور شہرت دونوں کا خواستگار ہوتا ہے
اس لئے مصنف سے زیادہ محتاط رہتا ہے۔ یہ اس کے فرائض
منصبی میں داخل ہے کہ وہ اصل تصنیف کا مفہوم اور ان کیفیات
کو ترجمہ میں برقرار رکھے۔ جو کسی طبع زاد تصنیف کا عنصر ہیں۔ مصنف
اس معاملہ میں بالکل آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے تاثرات اور جذبات
کی ادائیگی کے لئے جس طرح چاہتا ہے، الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔
وہ اپنی تخلیق صرف نقاد کے حوالے نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے قاری کے
سامنے پیش کرتا ہے۔ پریم چند کے معاملہ میں تو یہ بات اور بھی واضح
ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں عموماً اور گئودان میں خصوصاً
ایسے الفاظ، ایسے تلفظ اور ایسے املے میں پیش کئے ہیں جو عوام
کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ وہ لسانی قواعد کی پرواہ کئے بغیر
تخلیق پیش کر رہے تھے۔ اس لئے ان کی کسی تخلیق کو خالص لسانی
کسوٹی پر کسنے کے بجائے سیاق و سباق کے پس منظر میں دیکھنا
زیادہ صحت مند رجحان ہوگا۔ گودان اور گئودان میں ادکھ، ایکھ

یا چڑھانا، چڑانا ہی نہیں بلکہ بہت سے ایسے دوسرے الفاظ ہیں جن کے دو دو املے ملتے ہیں مثلاً مزدور، مجبور، بالکل، برہمن بتلانا، بتانا، آئے گا، آوے گا، پردا، پرداہ، آنچل، انچل ذمہ، ذُمہ، تمباکو، تمباکو وغیرہ

مسعود صاحب کا ایک اعتراض اُردو میں کاف بیانیہ کے کثرت استعمال پر ہے وہ گودان کے متن کو شاید اس سے عاری سمجھتے ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ گودان اور گئودان میں ایسے مقامات بھی ہیں۔ جہاں کاف بیانیہ گودان میں آیا ہے اور گئودان کا متن اس سے عاری ہے طوالت کے خوف سے صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

- کبھی کہلا دیتے ہیں فرصت نہیں ہے۔ (گئودان ص۲۴)
- کبھی کہلا دیتے ہیں کہ فرصت نہیں ہے۔ (گودان ص۱۹)
- ادا کھڑ وائی ہے تو اس کا مجاج ہی نہیں ملتا۔ (گئودان ص۲۴)
- اور مہریا ہے کہ اس کا مجاج ہی نہیں ملتا۔ (گودان ص۱۵)

گودان میں "کہ" "بلکہ" "حالانکہ" کا استعمال بھی متعدد جگہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

پروفیسر مسعود صاحب کا یہ بیان بھی خصوصی توجہ کا طالب ہے،

"...... اُردو گئودان کی زبان کا جس قدر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے گا یہ بات واضح ہوتی جائیگی کہ اس میں مترجم کا زبردست دستِ غیب ہے کیونکہ ہندی اور اُردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں اس لئے اس میں ترجمہ کا پردہ کم سے کم حائل رہتا ہے۔"

موصوف کے مطابق مترجم کا زبردست دستِ غیب اور ترجمہ کا پردہ کم سے کم حائل ہونا معنوی اعتبار سے آپس میں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ زبردست دستِ غیب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ گودان اور گئودان میں زبردست لسانی فرق ہوتا لیکن موصوف کی نظر جن اوراق پر پڑی ہوگی وہ ان کے اس قول کی تردید کرتے ہوں گے اس لئے ایک ہی زبان کے دو روپ کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف بھی کر لیا۔ پتہ نہیں زبردست دستِ غیب سے موصوف کا مفہوم کیا ہے؟

ادبیات پریم چند کی زبان و بیان کو سمجھنے کیلئے یہ بات مدِنظر رکھنی چاہیئے کہ اس کا مطالعہ دو حصوں میں کیا جائے۔ اوّل پریم چند کی زبانِ بیانیہ اور دوم ان کے کرداروں کے مکالموں کی زبان گئودان ان کے آخری دور کی آخری اُردو تصنیف ہے۔ جس کا اُردو ہندی متن ۱۹۳۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔ دونوں کی زبان میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ گئودان میں ہندی الفاظ اور فقروں کو سمویا گیا ہے۔ اس کے برعکس گودان میں اُردو الفاظ اور فقروں کی فراوانی ہے کرداروں کی زبان میں بھی یہ بات تھوڑے بہت فرق سے ملتی ہے۔ ہندی اُردو الفاظ سے ہماری مُراد یہ ہے کہ جو الفاظ سنسکرت الاصل ہیں انہیں ہندی سے اور جو عربی فارسی وغیرہ سے ماخوذ ہیں اُنھیں اُردو الفاظ سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ چونکہ زیرِ بحث گئودان کا بیسواں باب ہے اسی لئے اسی باب سے پریم چند کی لسانی اور اسلوبیاتی خصوصیات کو مختصراً ظاہر کیا جاتا ہے روزمرہ، فصاحت، بلاغت کے نقطۂ نظر سے گئودان کی زبان گودان کی زبان سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے۔ یکسانیت کو برقرار رکھنے کے لئے پریم چند نے گودان میں اُردو الفاظ اور گئودان میں ہندی الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال کئے ہیں۔

مثلاً:- (صفحہ ۹ پر دیکھئے۔)

گئودان	گودان
دھیرج	صبر
سمجھ	عقل
پر	لیکن
بات	غم
علم کی پوچھ	علم کی نذر
مجوری	غلامی
ہڑپ لیے	ہضم کر لیے
پاپی	متقی
دھرتی	زمین
ہاٹ	بازار
ڈنڈ	سزا
سکھ	آرام

سیاق و سباق کے اعتبار سے بہت سے ایسے الفاظ ہیں۔ جو گئودان میں فصیح ہیں لیکن گودان میں ان کے مترادفات غیر فصیح ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ سنسکرت آمیز ہندی سے ماخوذ ہیں۔

گئودان	گودان
بھڑاس	جلن
بھگت	سمجے
پاگلوں کی طرح	انمت کی بھانت
بھاگ	شبھ چکر
ہائے رام	ہائے بھگوان
بھاگیو	بھاگیہ
لیجے	مہر تمنا
مشر میلا	سنکوچ شیل
فتح	ڈگ ڈبے
مقابلہ	اسپردھا

دلاسا	ساہس
جوش	ہنسا بھاؤ

گودان میں بہت سے الفاظ اور فقرے غلط معنی میں بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً گئودان میں مستعمل دلاسا بمعنی تسلی کو گودان میں ساہس بمعنی ہمت استعمال کیا گیا ہے یا ابرادھ بمعنی جرم کو اپدرو بمعنی شرارت۔

پریم چند کا اُردو و ہندی کی طرف رویہ معاندانہ نہ تھا۔ انھوں نے گاندھیائی لسانی پالیسی "ہندوستانی" میں ادب کی تخلیق پر عمل کیا۔ اور اسی کا ردّ عمل تھا کہ گئودان اور گودان میں الفاظ ادل بدل کر رکھے گئے ہیں۔ گئودان میں آئے چند ہندی الفاظ اور گودان میں مستعمل اُردو الفاظ ملاحظہ ہوں۔

گئودان :- ناتا، سنیت تنیک، دوارے، میت، بھاگ، نہوں، دیہہ، سدھ چھٹی، اسیس، کُسل بسواس، لاج، من، جس، ابرادھ دھرم کا اوتار، ڈانڈ بلند، دھن، بھگت، اچھا، اسیرباد، چھا، پردان، بید، ڈول۔ سانجھ وغیرہ

گودان :- نوزذمہ داری، شروع، اندازہ، تازہ طرف تماشہ، خوب محتاج، زیادہ، وقت، بے حال، زبردستی ہوش، بدن، نصیب، عدالت، نظروں محال، قدم، عورت مطلب۔ طلب بچھڑے حال، ذرا، شرماتے، بے ایمانی، ایمان چیز، حیلے، عجمی۔ ادب لحاظ، میسر، رعب، مشکل، سلسلہ، دق، روزگار، ذمہ، بے لاگ، قانون، مالک، مزدور، تہس نہس، تار تار، ذات برادری وغیرہ

بیسویں باب میں جو بیشتر محاورے استعمال ہوئے

ہیں جن میں چھوٹن کھولنا کی جگہ، رکت کھولنا، سر نیچا ہونے کے بجائے مستک نیچا ہونا۔ اور جہاں ناخن میں سماتا کے بدلے پران نہوں میں سماتا استعمال کیا گیا ہے۔ بقیہ تمام محاورے اُردو سے جیوں کے تیوں ہندی میں لئے گئے ہیں۔ اسی باب میں بیشتر ایسے جملے ہیں جن کا اُردو متن ہندی کے مقابلے فصیح تر اور روزمرہ کے قریب ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

گئو دان

۱۔ گاؤں میں اوکھ کی بوائی شروع ہو گئی تھی ــ ص ۳۲۹
۲۔ چلانے چلانے میں جھڑک ہے۔ ــ ص ۳۳۰
۳۔ کبھی فاقہ ہو گیا۔ ــ ص ۳۳۰
۴۔ دم لینا ہے تو گھر جا کر دم لو ــ ص ۳۳۰
۵۔ سر چکرانے لگا۔ ــ ص ۳۳۱
۶۔ روپا نے کہا بھیا آئے بھیا آئے ـــ اور تالیاں بجاتی ہوئی دوڑی۔ ــ ص ۳۳۵
۷۔ لیکن اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ــ ص ۳۳۶
۸۔ اپنی گڑیا کھیل۔ ــ ص ۳۳۶
۹۔ کبھی کنارے دار تھیں۔ ــ ص ۳۳۶
۱۰۔ بچہ ان چیزوں کو پہننے سے زیادہ ہاتھوں میں لے کر کھیلنا اور کھانا پسند کرتا ہے۔ ــ ص ۳۳۷
۱۱۔ تو چلے جانا۔ ابھی ایسی جلدی کا ہے کی ہے ــ ص ۳۳۹
۱۲۔ اپنے بھاگ سراہو کر منہ پھلا کر رہ جاتے ہیں۔ ــ ص ۳۴۳
۱۳۔ جیسے بڑے بوڑھے بچوں سے مونچھیں اکھڑوا کر بھی ہنستے ہیں ــ ص ۳۴۳
۱۴۔ ہوری سے کہو اب بیٹھ کر رام رام جپیں۔ ــ ص ۳۴۳

گودان

۱۔ گاؤں میں اوکھ کی بوائی لگ گئی تھی۔ ــ ص ۲۰۴
۲۔ چلانے چلانے میں بھید ہے ــ ص ۲۰۵
۳۔ کبھی کڑاکا ہو گیا۔ ــ ص ۲۰۵
۴۔ دم مار لینا ہے تو گھر جا کر دم لو ــ ص ۲۰۵
۵۔ سر میں چکر کی سی چل رہی تھی۔ ــ ص ۲۰۶
۶۔ روپا نے کہا بھیا آئے بھیا آئے اور تالیاں بجاتی ہوئی دوڑی۔ ــ ص ۲۰۷
۷۔ لیکن اندر جانے کا ساہس نہیں ہوتا۔ ــ ص ۲۰۸
۸۔ اپنی گڑیا سے کھیل۔ ــ ص ۲۰۸
۹۔ کبھی کنار دار تھیں۔ ــ ص ۲۰۸
۱۰۔ بچہ ان چیزوں کو پہننے سے زیادہ ہاتھوں میں لے کر کھیلنا پسند کرسکتا ہے۔ ــ ص ۲۰۹
۱۱۔ تو چلے جانا ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔ ــ ص ۲۱۰
۱۲۔ اپنے بھاگ کو بکھا کر منہ پھلا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ــ ص ۲۱۱
۱۳۔ جیسے بڑے لوگ بالکوں سے مونچھیں اکھڑوا کر بھی ہنستے ہیں ــ ص ۲۱۲
۱۴۔ ہوری سے کہو اب بیٹھ کر رام رام کریں۔ ــ ص ۲۱۴

اسی طرح کتنے ہی جملے بیسویں باب میں بکھرے پڑے ہیں۔ برخلاف اس کے ایسے جملے کم ہی ہیں جو اُردو میں غیر فصیح اور ہندی میں فصیح تر ہیں۔ اس کی وجہ پریم چند کی علمی و ادبی زندگی کی وسعت اور استعداد، علمی مہارت قرار دی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ وہ ہندی کے ادیب و صحافی تھے لیکن پھر بھی ان کو اُردو فارسی میں جو استعداد حاصل تھی وہ ہندی میں نہ تھی۔ اردو جملوں میں وہیں جھول آیا ہے جو محض "ہندوستانی" بنانے کے لئے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ورنہ اُردو میں پریم چند کی زبان عام فہم ہوتے ہوئے بھی معیاری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اور ہندوستانی کی حد تک ان کی ہندی بھی قابلِ گرفت نہیں ہے۔

مسعود صاحب کا بیان کہ "دلچسپ بات یہ ہے کہ گئو دان کا مترجم ہمیشہ اس بات پر تُلا نظر آتا ہے کہ پریم چند

کے استعمال کئے ہوئے عام مستعمل الفاظ کا بھی بدل ڈھونڈ نکالے" (ہماری زبان۔ ۱۵ جون ۱۹۷۱ء صـــ ۱۲)

دراصل پریم چند کی "ہندوستانی" لسانی پالیسی کا مرہون منت ہے جس کو وہ مترجم کے نام زبردستی تھوپ دینا چاہتے ہیں۔ موصوف نے اس مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ تھی کہ آخری دَور کے بیشتر افسانے اور ناول انھوں نے پہلے ہندی میں قلم بند کیے اور پھر ان کا اُردو ترجمہ خود یا اقبال ورما سحر سے کروایا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو موصوف پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کی نام بنام درجہ بندی کر دیتے کہ کون کونسی تصانیف خود ان کی ترجمہ کی ہوئی ہیں اور کون کون سی اقبال ورما سحر کی مرہونِ منت ہیں۔ ساتھ ہی سحر صاحب کی چند طبع زاد تصانیف کے نام و ضروری حوالے درج فرما دیتے۔ بلکہ اگر ان سے اقتباسات پیش کر دیتے تو اور اچھا ہوتا۔ تاکہ اہل ذوق سحر صاحب کی طبع زاد تخلیقات کی زبان و بیان سے گئودان کی زبان و بیان کا موازنہ کر سکتے۔ اس سے گئودان کے خلاف مسعود صاحب کے دعوی کی توثیق یا تردید آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

گئودان اور گودان کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دونوں پریم چند کی طبع زاد تصانیف ہیں۔ کونسی پہلے لکھی گئی اور کون سی بعد کو، یہ بحث محض فضول اور لایعنی ہے۔ کوئی باصلاحیت اور ذی استعداد مصنف اگر اپنی کسی تخلیق کو کئی زبانوں کے قالب میں ڈھالتا ہے تو ان میں سے کسی پر بھی ترجمہ کا الزام عائد کرنا تحقیقی بددیانتی ہوگی۔

حوالہ جات:۔ پریم چند: گودان: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ بار ششم، فروری ۱۹۷۰ء

پریم چند: گئودان، سرسوتی پریس الہ آباد ایڈیشن: ۱۹۷۰ء

"آدمی کو چاہیئے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرلے کہ معلومات

اس کے ذہن سے اُبلنے لگیں۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ تیار ہو چکا ہے اس کو چھاننے کے بعد وہ محسوس کرلے کہ اب بھی کچھ لکھنے کے لئے باقی ہے۔ اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمیں اور اس کی بے تابی روکے نہ رُکے جب یہ نوبت آجائے، اُس وقت آدمی کو لکھنے کے لئے اُٹھنا چاہیئے۔ اس کے بغیر جو لوگ لکھیں وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کام کریں گے۔"

(الرسالہ۔ دہلی مئی [illegible])

میر امّن کی باغ و بہار

مرتبہ:۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

چھپ گئی

مرتب نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد، میر امّن کی حیات و ادبی خدمات اور باغ و بہار کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب بی۔ اے، و ایم۔ اے کے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید ہے۔ قیمت چھ روپیہ صرف

شیخ حبیب اللہ
کنٹریکٹر، کٹک ۳

ابلیس کی مجلس شوریٰ

اقبال

(۱)

—: سین :—

ابلیس کا دربار زرنگار ۔ ابلیس بہ کمال جاہ و جلال تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہے۔ مگر انتہائی پریشان و متفکر۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ اپنے مشیروں کے ساتھ پارلیمنٹ ابلیسیہ میں صلاح و مشورے میں مصروف ہے۔ کیونکہ نظام ابلیسیہ کی سحر کاریوں کا اثر و رسوخ زوال پذیر ہے۔

ابلیس اجلاس کی کارروائی شروع کرتا ہے۔

" میرے عزیز دستو! مجھے انتہائی افسوس کیساتھ آپ لوگوں پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم شدید سنگین اور ناسازگار حالات سے دوچار ہیں۔ بدیں وجہ کہ انسان دن بہ دن بڑے چالاک ہوتے جا رہے ہیں۔ اُن کی ذات میں بامقصد شعور و آگہی پیدا ہو رہی ہے۔ اور اب ہم فتنہ انگیزیوں کا جادو اُن پر مشکل ہی سے چلتا ہے۔ تمہیں یاد ہے؟ ہم لوگوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں

یہ عناصر کا پُرانا کھیل! یہ دنیائے دوں؟
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون

کیا تم یہ نہیں جانتے کہ یہ افرنگی دنیا جو اپنے آپ کو دانا اور دراک تصور کرتی ہے۔ اُسے اپنی آزادیٔ افکار، ایجادات و انکشافات، سائنس و ٹکنولوجی پر بڑا ناز ہے۔ انھیں یہ رتبۂ بلند کس نے عطا کیا؟ اُن کی روحانی اقدار کو کس نے تہس نہس کرکے رکھ دیا۔ کس نے انہیں مادہ پرست بنادیا؟

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

اہلِ ایشیا کو تقدیر پرستی کا سبز باغ کس نے دکھایا۔ کس نے انھیں عمل و جہد کی دُنیا سے غافل کیا۔ کس نے انھیں "جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے" کے وہم و خیال میں مبتلا کیا۔ کس نے انھیں قناعت پذیری کے گرداب میں پھنسایا۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

دیکھ لو آج دُنیا زر اندوزی کے جنوں میں اِس

بُری طرح مبتلا ہے کہ اس کے حصول کے لئے تمام اخلاقی معیار، اقدار، اور جذبہ انسان دوستی کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ خلقِ خدا کی پریشانیوں اور مصائب کی پرواہ نہیں سبھی نے انسانیت کا شکستہ ہونا زر پرستوں کی نگاہوں میں تبسم ہو کر رہ گیا ہے یہ رنگ دلی اُن کے دلوں میں کس نے پیدا کی ع

میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

جب ہماری ذات میں اس پایہ کی قوت و جبروت موجود ہے تو پھر ہم کیونکر ہار مان لیں گوشہ نشینی اختیار کر لیں اور آدم کو من مانی کرنے کی چھوٹ دے دیں اطلبیعت کی کشش نقل کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے سہ

کون کر سکتا ہے اسکی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

پہلا مشیر (اپنی نشست سے) اُٹھ کر ابلیس کو آداب بجالاتا ہے اور عرض پرداز ہوتا ہے :-

مکرم معظم سردار اعلیٰ ابلیس صاحب کا قول حرف بحرف صحیح ہے ہم کبھی بھی شکست قبول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارا ابلیسی نظام کار بلکل تمام محکم اور استوار ہے ہم ہی نے دُنیا کو بن باسی، خانقاہ نشینی، تسبیح و طوائف، ہر آن مالا جپی، دُنیا و مافیہا سے غفلت شعاری اور محنت و مشقت سے جی چرانے کا سبق پڑھایا۔ ہم سینہ تان کر کہہ سکتے ہیں کہ سہ

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم کلام

اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ ع

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی

ارکانِ مذہبی محض رسم و روایت پرستی ہو کر رہ گئے ہیں سہ

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید
ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام

دوسرا مشیر۔ سامنے آتا ہے اور بڑی سنجیدگی اور مایوسی کے عالم میں کہتا ہے :-

میں اپنے ہم نشیں مشیر سے پوری طرح متفق نہیں ہوں ابلیسیت کے خلاف تازہ بہ تازہ نو بہ نو فتنے سر اُٹھا رہے ہیں سہ

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

پہلا مشیر۔ (جوش میں آکر کہتا ہے) یہ بکواس ہے ہمیں کسی جانب سے کوئی خطرہ لاحق نہیں کیونکہ ہمارے پاس ان فتنوں کا سدِ باب موجود ہے سہ

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ "وجودِ میر و سلطاں" پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تیسرا مشیر: (پُر جوش انداز میں) مرحبا! شاد باد! یہ ڈرا یہ خوف کا ہوا جو دوسرے مشیر نے پیش کیا ہے واہمہ ہی نہیں بلکہ پیسہ ٹالی گری ہے۔ سہ

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

مگر جناب من! مارکس نے کیا اہم بہ گرمیاں نظریہ پیش کیا!
لاسلاطین۔ لاکلیسا۔ لااِلٰہ

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب

چوتھا مشیر: ۔ کمیونزم سے گھبرا گئے ہو کیا؟ دیکھتے نہیں چند ہی دن میں اربابِ قضا و قدر مملکت روس و چین میں شب و روز زر اندوزی اور اقربا پرستی کے کیسے کیسے گھناؤنے انکشافات ہو رہے ہیں۔ وہی جاہ حشمت، وہی حلوے مانڈے کی فکر وہی عوام سے دجل و فریب۔ ہم نے تو اشتراکی نظام کے بھی پرخچے اڑا دیئے ؎

تیری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے
خطوطِ خمدار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بت کدوں میں، کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

پانچواں مشیر: ۔ (چوتھے مشیر سے متاثر ہو کر) خوب! آفریں، بھائیو! میرے ساتھیو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے آقا ابلیس اعظم نے جبرئیل سے کیا کہا تھا؟

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کے تار و پو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

ہماری ہی مساعیٔ جمیلہ نے آدم کی ویران دنیا میں رنگ و نور بھر کر اُسے بہشت زاد بنا دیا ؎

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

پانچواں مشیر دست بستہ ابلیس سے مخاطب ہے۔
عالی جاہ ابلیس اعظم! میں آپ کے تدبر فسوں کار، حکمت عملی اور قیادت عدیم النظیر اور رفعت و عظمت کی خوبیاں کیا بیان کروں ؎

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گِل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز
ابلہِ جنت تیری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

ابلیس اپنے مشیروں کی پامردی اور جرأت رندانہ سے بے حد مسرور ہو کر، ولولہ انگیز تقریر کرتا ہے ؎

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسماں تو بہ تو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

مگر! میرے عزیزو! میرے ہم نشینو! سنو! مجھے اگر
کچھ ڈر ہے تو اُمتِ محمدی سے ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر مومن
جانباز اس ملت میں اب بھی جلوہ ریز ہیں۔ جن کی قوت
و جبروت کا یہ عالم ہے کہ! ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

جب میدانِ عمل میں آتے ہیں تو کائنات میں لرزہ طاری
ہو جاتا ہے۔ وہ برقِ تاباں کی طرح ہر ظلمت کو منور کر دیتے
ہیں۔ اُن کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

ایسے نفوسِ قدسی کو کسی چیز کی لالچ دامن گیر نہیں ہوتی۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دل بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب اُس کی نگہ دل نواز

مجھے اس کا بھی علم ہے کہ یہ عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جان بھی
اب معدوم ہوتا جا رہا ہے اب تو بڑے بڑے جغادری و
جید علمائے دین حکم کے نور سے محروم ہوتے جا رہے ہیں ؎

با بشیخے دین و ملت را فروخت
ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت

بر ایں ہمہ یہ اکا دکا مردانِ خدا مست و خود آگاہ
شیطانوں کی گردنیں مروڑ سکتے ہیں ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اُس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مذہبی دنیا اب تشکیک و ابہام میں مبتلا ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس قوم میں اب ہادی و قائد
مفقود ہو چکے ہیں ؎

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

میرے عزیزو! میں شب و روز یہی دعا کرتا ہوں کہ یہ
لوگ ہمیشہ ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات

ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے

تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام

چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے یہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر

جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اسی لئے میں تم سے دست بستہ عرض پرداز ہوں کہ سہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

تمام مشیر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک زبان ہو کر کہتے ہیں۔

آقائے ما! زندہ باد! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے ارشادات کو عملی جامہ پہنانے میں کسی حال میں بھی کوتاہی نہیں برتیں گے۔

ابلیس اپنے مشیروں کے جوش و خروش سے خوش ہو کر کہتا ہے:—

آج رات جشنِ خوشی و مسرت منایا جائے گا۔ اور نغمہ و نور رقص و سرود اور جام و سبو کی محفل گرمائی جائے گی۔ ہماری مہ لقائیں رقص و ادا کے ساتھ ساقی گری کے فرائض انجام دیں گی۔

(۲)

—: سین :—

خوبصورت باغ۔ رنگ برنگے پھولوں سے ملبو نظر بنا ہوا ہے۔ بجلی کے قمقموں سے گلشن بقعۂ نور ہے۔ اسٹیج جنت نگاہ بنا ہوا ہے۔ اکل و شرب جاری ہے۔ مہ جبینانِ ابلیسہ جام بدست رقص کناں ہیں اور اپنے ہم جلیس شیطانوں کے گن گا رہی ہیں اس تمہید کے ساتھ کہ:—

ہم ممنون ہیں کہ آپ کی کارگزاریوں کے طفیل مذہب پرستوں میں گمراہی پیدا ہو گئی سہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے

ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے

یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم

امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں

یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

دوسری رقاصہ (رقص کے ساتھ)

تمدن تصوف شریعت کلام

بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی

یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب

مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں فرد

محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا

یہ سالک مقامات میں کھو گیا۔

تیسری رقاصہ (مع رقص)

ستاعر بھی ہیں پیدا علما حکما بھی

خالی نہیں قوموں کی غلامی سے زمانہ

مدرسے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک

ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

ہے کہ شیروں کو سکھا دیں دم آہو

باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

اں رقاصہ :۔ رقص کے پہلے کہتی ہے :۔ یورپ کو شیطانوں

نے پہلے روحانیت سے محروم کر دیا پھر لہو لعب اور

عیش و طرب فراواں میں مبتلا کر دیا ۔

ش فراواں یہ حکومت یہ تجارت

دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی

سا ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے

یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

دیں رقاصہ :۔ اعلان کرتی ہے :۔ شیطانوں نے

مشرق و مغربی دُنیا کے جواہر ادراک کو سلب کر لیا ہے

ں کی موت سے روح عرب بے تب و تاب

بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

ں کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر

قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

ں کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور

کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

رقاصہ کہتی ہے ابلیسی سحر کی کرشمہ سازیاں

ملاحظہ فرمائیے :۔

ہے زمانہ ابھی عشق سے بے مقام ابھی

نقش گر ازل تیرا نقش ہے نا تمام ابھی

راک گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر

تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

اختتام رقص و سرود کے بعد ابلیس کا مشیر خاص نمودار ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے :۔

ہمارے قطب اعلیٰ ابلیس نے جنت بدری کے وقت چیلنج دیا تھا کہ "میں انسان کی مٹی پلید کر کے چھوڑوں گا" یہ دعویٰ ہم لوگوں نے سچ کر کے دکھا دیا ۔

کہتا تھا عزازیل خداوندِ جہاں سے

پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک

جاں لاغر و فربہ ہے مگر مشرق کی شرافت

مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک

مجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی

ویرانیٔ جنت کے تصور سے ہیں غمناک

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

---

(۳)

سین :۔

ابلیس اپنے حواریوں کے روبرو اعلان کرتا ہے :۔

کل ایک عظیم الشان جلوس نکالا جائے گا اس کی قیادت خود میں کروں گا ۔ اسلئے شیطانوں کی کثیر تعداد کا جمع ہونا لازمی ہے ۔

شیطانوں کی کثیر تعداد میں موجود ہیں ۔ جلوس نکلتا ہے قیادت ابلیس کر رہا ہے ۔ جلوس سڑکوں سے گزر رہا ہے ۔ ابلیس بلند آواز نغمہ زن ہے ۔ اس کے حواری آواز میں

انجم نعیم :-

باتیں انٹرنیشنل اُردو کانفرنس کی

"اُردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے"۔
" اُردو ہے جس کا نام وہ "ان" کی کنیز ہے"۔
" اُردو ہے جس کا نام وہ کتنی ذلیل ہے"۔
" اُردو ہے جس کا نام وہ کتنی رئیس ہے"۔
" اور نہ جانے اُردو کیا کچھ نہیں ہے"۔

اور نہ جانے اُردو کیا کچھ نہیں رہے گی لیکن بوڑھے گدھوں کے سائے سائے پلنے والی یہ زبان چاہے جو کچھ ہو جائے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قطب کی لاٹ کی طرح اٹل ہے کہ بھائی لوگوں نے اسکا نام اس نکڑ والی عورت کے ساتھ لکھ دیا جس سے کوئی آکر اپنے ڈرامے میں چتر لیکھا کا رول کراتا ہے تو کوئی پاروتی۔ کوئی لکشمی بائی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اور کوئی پتیتا کے رول میں۔ اور پھر اپنا اپنا شو ہاؤس فل کرا کے کمیشن کے سو پچاس روپئے اس کے ہاتھ میں دیکر پھر اپنا راہ لگتا ہے۔ اور یہ بیچاری پھر اس نکڑ والی کوٹھی کے کمرہ نمبر ۴ میں موجود نظر آتی ہے۔

کبھی کبھی بغیر ٹکس کے ڈراموں پر حکومت زوردار چھاپے بھی مارتی ہے لیکن جب حکومت خود امدادی فنڈ حاصل کرنے کے لئے ایسے ڈرامے اسٹیج کرنے لگے تو پھر زیادہ سے زیادہ دو چار رقاصہ کمیشن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے لیکن پھر آخری منزل۔ اسی نکڑ والی کوٹھی کا کمرہ نمبر ۴۔

ایسا ہی ایک زبردست شو ۲۰ جنوری تا ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء لکھنؤ میں سرکاری ایماء پر علی جواد زیدی صاحب کی نیجری میں اُردو اکاڈمی اتر پردیش کی ڈائرکشن میں چند غیر ملکی بہی خواہانِ اُردو کی موجودگی میں ہر خاص و عام کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اور پھر اس اسٹیج پر اُردو بائی ایسی ٹھمکی کا ناچ نا چے گی کہ بس غیر ملکی بہی خواہان و قدردان دل تھام تھام کر رہ جائیں گے۔ نیجر صاحب کو سب سے زیادہ اس کی خوشی ہے کہ سرکار مہابلی نے ۹ لاکھ روپئے کی پہلی چھوٹ سے پردہ اٹھنے سے پہلے ہی نظر گزار دی ہے۔

اگلی سیٹ پر بیٹھنے والے یہ قدرداں چاہے ہر ہر قدم پر جتنی "چھوٹ" نثار کریں اسٹیج سے اُترنے کے بعد اُردو بائی کی اصل جگہ وہی نکڑ والی کوٹھی کا کمرہ نمبر چار ہوگا۔

واہ رے قدردانی

اُردو کے نام پر سرکار سے ۹ لاکھ روپئے کی بھیک مانگ کر

لاکھ پتی بننے والے ہیں ہمدردانِ اُردو سے اُردو کا ایک معمولی طالبِ علم یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ انٹرنیشنل کانفرنس کرانے سے پہلے کیا ریاست میں آپ نے ایک آدھ اُردو میڈیم اسکول کی عمارت تعمیر کرائی ہے جسے باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو دکھا کر اُردو کی شان کا شایانِ شان مظاہرہ کیا جائیگا اور جھک جھک کر داد وصول کی جائے گی۔ اگر یہ معمولی سا کام ابھی تک نہیں کیا جاسکا ہے تو آپ سے وہ بہار کے لوگ بھلے جنھیں کبھی اُردو کے استاد ہونے کا سود انہیں رہا۔ پھر بھی پوری ریاست میں اُردو کو دوسری زبان بنوا کر ہی دم لیا اور استادانِ اُردو کے لئے ڈوب مرنے کی بات ہے۔ جنھیں تلاش کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

غیر اُردو والے علاقے کلکتہ جیسے شہر میں تو بارہ تیرہ اُردو میڈیم ہائی اسکول ہو سکتے۔ بمبئی جیسے شہر میں تو دسیوں اُردو میڈیم ہائر سکنڈری اسکول ہو سکتے ہیں۔ لیکن رنگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے والے استادانِ اُردو "کی ریاست اپنے آباؤ اجداد کی پنشن کی رقم سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کرسکی۔

وجہ۔ وہی چودھریوں کی چودھراہٹ جس کی بادن گز کی اپنی پگڑی جب تک کلف دار ہے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"بس سال دو سال میں ایک آدھ بار جشنِ یار ہو جایا کرے

مل بیٹھ کے جھیلکا لیا کریں۔

نشستند و گفتند و بر خواستند۔

اور پھر اپنا اپنا حصہ لیا اور اپنی اپنی پگڑی سنبھالے اپنے اپنے گھر چولھے بھاڑ میں جائے اُردو، میرے باپ کا کیا میرے حصہ کی جو چیز تھی وہ تو پاس آہی گئی۔

یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنے ہیں۔

جو اُردو کی روٹی کھاتے ہیں۔

جو اُردو کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

جو اُردو کو اپنی جاگیر بلکہ لونڈی سمجھتے ہیں۔

جب ان کی یہ حالت ہوگی تو

مرے کو مارے شاہ مدار۔

ہمارے شاہوں کے شاہ، سرکار بادشاہ کو اور بھی موقع ملتا ہے۔ اور خوب تھپک تھپک کر سلاتے رہتے ہیں۔ کبھی دو چار لاکھ روپئے بانٹ دیئے کبھی کسی کو خطاب سے سرفراز کیا۔ کبھی کہیں یادگارِ غالب ٹائپ کی چیز بنوا دی اور جب اُردو پر زیادہ کرم فرمائی کا خیال پیدا ہوا تو فہمیدہ ریاض جیسی شاعرۂ اعظم کو شاعرہ در جامعہ" جیسے عہدہ پر تقرر کر کے ایسا کارنامہ انجام دیا کہ نسل در نسل سرکار کے احسان کے اس بوجھ تلے ایسی دبی رہے گی کہ فہمیدہ ریاض کے خوبصورت شعر کے علاوہ کچھ یاد ہی نہ رہے گا۔ اب تو اب تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری سرکار "بھگوڑوں" کے لئے کوئی دار الامن بنانے کا منصوبہ رکھتی ہے تاکہ دنیا کے تمام زبردست پڑھے لکھے بھگوڑوں کو ایک جگہ جمع کر کے نئی نسل کی تربیت کا انتظام کیا جاسکے۔ ہوسکتا ہے اُسی تربیتی پروگرام میں اُردو کا بھی کوئی حصہ ہو جس کی دیکھ بھال کے لئے فہمیدہ ریاض کی خدمت قبول کی گئی۔ اور انھیں اعزاز و اکرام سے نوازا جا رہا ہے۔

تو صاحب ایک طرف انٹرنیشنل کانفرنس بلائی جا رہی ہے۔ تو دوسری طرف سہ لسانی فارمولہ لاگو کر کے اُردو کی قبر تیزی سے کھودی جا رہی ہے اور ایسی حالت میں اُردو کے نام پر جینے والے یہ سرکاری وظیفہ خوار خوشامد میں اُردو کے تابوت میں کیل ٹھونکنے کے لئے ہر وقت تیار نظر آتے ہیں۔

وہ تو کہتے ہیں اُردو جیسی نیم جان ہے جو اپنی جگہ کسی نہ کسی طرح گھسیٹے جا رہی ہے اگر اور کوئی دوسری زبان ہوتی تو اِس پر ابتک دو رچار لڑلے اپنا تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر چکے ہوتے۔

آخر میں ایک بات عرض کردوں گا کہ چاہے نیشنل کانفرنس کیجئے یا انٹرنیشنل کانفرنس کیجئے غیر ملکوں سے سیکڑوں اُردو کے جاننے والوں کو بلاکر ان کی تقریریں سنوا دیجئے۔ سرکار کی بغلیں اُٹھا کر چاہے جتنی زور زور سے بجائیے لیکن یقین جانئے آپ نے اِن اُونچی اُونچی جگہوں پر بیٹھ کر اُردو کا جس طرح نقصان کیا وہ نئی نسل خوب سمجھ رہی ہے۔ اور جب اسے اپنی زبان کے تحفظ کا جنون سوار ہوگا تو وہ یہ نہیں دیکھے گی کہ اس نے اُردو پر کتنی تقریریں کیں اور کس کی کتنی کتابیں بازار میں چل جاتی ہیں۔

آخر میں اپنی سرکار سے بھی گزارش کریں گے کہ ہم غریب لوگ ہیں۔
ہماری زبان بھی بڑی غریب ہے۔
اس کا اللہ مذاق نہ اڑائیے۔
لاکھ دو لاکھ میں اس کا سودا نہ کیجئے۔
خوبصورت وعدوں اور بلند وبانگ دعووں کی بھول بھلیوں کی سیر نہ کروائیے ورنہ یاد رکھئے۔
کسی قوم کی موت اس کی زبان کی موت ہوتی ہے اور ہم ابھی مرنے کے لئے قطعی تیار نہیں۔

بسلسلہ مضمون صفحہ ۱۷ کے آگے

ملا رہے ہیں :—

لاکر برہمنوں کو سیاست کے بیچ میں
زناریوں کو دیر کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلا کو اُن کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے اُن کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو۔

ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب خریدیے

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ اودھ مکمل دو جلد	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	70/-
اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	15/0
تنقیدی نظریات حصہ اوّل	سید احتشام حسین نمبر	15/0
" " حصہ دوم	"	15/-
تنقید اور عملی تنقید	"	4/-
ذوقِ ادب وشعور	"	8/-
روایت و بغاوت	"	9/-
تنقیدی جائزے	"	9/-
عکس اور آئینے	"	9/-
سید احتشام حسین نمبر	"	30/-
انتخاب جدید نثر اُردو	"	5/-
تنکے گہر	"	5/-
نقش حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر ۲		20/-
" " حصہ اول یعنی حالی نمبر ۱		15/-
اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	8/-
مسلوبات	آغا حشر کاشمیری	6/-
فروغ اُردو جگر نمبر		10/-
فروغ اُردو پریم چند نمبر		15/-
چکبست نمبر		12/-
امیر خسرو نمبر		15/-
عبدالماجد دریابادی نمبر		12/-
محسن کاکوروی نمبر		3/50

ڈاکٹر سید آفاق حسین رضوی
"ادبستان" دین دیال روڈ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

سید علی جواد زیدی کی کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ

رسالہ نیا دور لکھنؤ "مسعود حسن نمبر" بابت مارچ اپریل ۱۹۷۶ء میں علی جواد زیدی صاحب کا مضمون "مسعود صاحب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ جب میری نظر سے گذرا تو میں نے زیدی صاحب کو لکھا کہ آپکا مضمون اسوقت میرے سامنے ہے۔ خوب اور بہت خوب ہے۔ چند باتیں جو آپ نے لاعلمی میں لکھ دی ہیں اُنھیں آپ کے علم میں لانا مقصود ہے۔ آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ ایک دو باتیں ہوتیں تو نظر انداز کی جاسکتی تھیں۔ حالانکہ وہ بھی دیانتداری کے خلاف ہے۔ باتیں اتفاق سے کافی ہوگئی ہیں۔ اُن کی تصحیح نیا دور میں آپ خود ہی کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ سلسلہ وار ہی لکھ رہا ہوں۔ زیدی صاحب ان دنوں ایران کے شہر طہران میں مقیم تھے۔

میرے خط کا جواب زیدی صاحب نے ۱۰ اگست ۱۹۷۶ء کو لکھا جو مجھے ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو وصول ہوا تھا۔ اُس خط میں بعض باتوں کے متعلق زیدی صاحب نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ بعض باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ کچھ باتوں کے متعلق لکھا کہ ان کی اصلاح کے لئے میں نے ایڈیٹر نیا دور کو لکھ دیا ہے کہ وہ نیا دور کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کر دیں اور اسکی ایک نقل مجھے بھی بھیج دیں۔

نہ زیدی صاحب کا سمجھانا میری سمجھ میں آیا نہ جن باتوں کو انھوں نے نظر انداز کر دینے کے لئے قابل قرار دیا [illegible] ہو گئے۔ بات کو آگے بڑھانے کے مقابلہ میں [illegible] خاموشی اختیار کرلی کہ اچھا جن باتوں کو زیدی صاحب نے غلط تسلیم کر لیا [illegible] شائع ہو جائیں۔

مہینوں پر مہینے گذر گئے زیدی صاحب نے جن باتوں کو اصلاح کے قابل سمجھا تھا جب وہ شائع نہیں ہوئیں تو میں نے خورشید احمد صاحب اڈیٹر نیا دور کو زیدی صاحب کے خط کی عبارت نقل کر کے بھیج دی۔ میرے خط کے جواب میں خورشید صاحب نے

اپنے ۳ مارچ ۱۹۷۸ء کے خط میں لکھا کہ "آپ کی مرسلہ وضاحت نیا دور کے کسی قریبی شمارہ میں شائع ہوگی۔ اطلاعاً عرض ہے "نیا دور" کے متعدد شمارے دیکھ ڈالے مگر بقول اڈیٹر صاحب "میری مرسلہ وضاحت" کسی میں دکھائی نہیں دی۔

اتفاق کے ہاتھوں ایک شادی کی تقریب میں خورشید صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے انھیں پھر یاد دلایا۔ انھوں نے پہلے والا جملہ دُہرایا کہ کسی قریبی اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا اس قریبی زمانے کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہانتک کہ خورشید احمد صاحب کی ملازمت ہی ختم ہوگئی۔

کچھ زمانے کے بعد میں نے موجودہ ایڈیٹر نیا دور محترمی امیر احمد صدیقی صاحب کی خدمت میں اپنے سارے مضمون کے ساتھ کل واقعہ لکھ کر نیا دور کے کاتب سید علی احمد صاحب کے ذریعہ سے بھجوایا۔ ان محترم ایڈیٹر صاحب نے چھاپنا تو در کنار میرے مضمون کے ملنے کی رسید تک نہیں بھیجی۔ کئی مہینوں کے بعد میں نے ایک بہت ہی وقیع صاحب اثر اور ذمہ دار محترم شخصیت کے ہاتھوں پھر کُل مضمون لکھکر پہلے والے خط کی نقل کے ساتھ بھیج دیا۔ اس میں مخصوص طور پر یہ لکھا کہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آج بھی ریسرچ ہو رہا ہے اور قرآن کہتے ہیں کہ ان سے متعلق جب تب کچھ ہوتا رہے گا۔ میرے مضمون کا شائع ہونا انتہائی ضروری ہے ورنہ پروفیسر مرحوم سے متعلق غلط باتوں کو شہرت حاصل ہو جائے گی جو بہت ہی نامناسب بات ہوگی۔

اڈیٹر صاحب اپنے سابق رویہ پر گامزن رہے مجھے کوئی جواب اُن کی طرف سے نہیں ملا مگر درمیانی محترم شخصیت کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا رہا کہ شاید مضمون شائع کر دیا جائے۔ حالات معلوم کرنے کے لئے مجھے بار بار اپنے عنایت فرما کے یہاں حاضری دینا پڑی۔ تقریباً پانچ مہینوں کے بعد مضمون واپس آگیا۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ "زمانہ بہت گذر گیا ہے۔ اب اس کے شائع کرنے کا محل نہیں رہا" گویا زیادہ زمانہ گذر جانے سے غلط باتیں صحیح ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اتنا زمانہ گذرانے کا ذمہ دار اڈیٹر نیا دور کے علاوہ کیا کوئی دوسرا انسان ہے؟ غلط بات ہمیشہ غلط ہی رہے گی چاہے وہ حضرت آدم کے وقت وجود میں آئی ہو۔

اب اگر بدگمانیاں کانا پھوسی کریں تو انھیں سازشی قرار دینے کے بجائے حق بہ جانب سمجھنا چاہیئے۔ بادل ناخواستہ اپنے پر جبر کر کے افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ وہ دن دیکھنے میں آگئے کہ علمی اور ادبی دُنیا سے بھی دیانتداری، ایمانداری، وعدہ کی پابندی اور صحت کا خیال اُٹھ گیا۔ علی جواد صاحب نے انتہائی کتر بیونت کر کے وہ بھی صرف طفل تسلی کے لئے میرے مضمون کے پہلے حصّے کے متعلق ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء کو مجھے مطلع کیا کہ اس کے شائع کرنے کی ہدایت اڈیٹر نیا دور کو کر دی ہے کہ وہ کسی قریبی اشاعت میں شائع کر دیں۔ آج ۴ ½ برس سے زیادہ کا زمانہ ہو گیا وہ شائع ہو ہی رہا ہے۔

علی جواد صاحب، خورشید احمد صاحب کے سگے ماموں اور پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ موجودہ ایڈیٹر امیر احمد صدیقی صاحب خورشید صاحب کی ماتحتی میں رہ چکے ہیں۔ دونوں میں دوستانہ تعلقات کا ہونا تقریباً لازمی ہے۔ اب جب میں صفائی پر اُتر ہی آیا ہوں تو یہ بات بھی صاف ہی صاف لکھ دوں کہ اس سنگٹھن نے سازشی طور پر میرے مضمون کو شائع نہیں کیا۔ افسوس اس کا ہے کہ یہ سب تعلیم یافتہ حضرات ہیں۔ شہرت یافتہ حضرات ہیں۔ انتہائی سنجیدہ حضرات سمجھے جاتے ہیں ان لوگوں کی طرف سے اس طرح کا مظاہرہ حیرت، تعجب العجب۔

جہاں جہاں صحت درکار ہے وہاں پہلے واوین میں زیدی صاحب کی عبارت لکھی ہے بعد میں جو صحیح ہے وہ لکھا گیا ہے۔

۱۔ صفحہ ۱۔ کالم دوسرا۔ سطر ۱۷ "اعظم بھائی ایک علمی اور

ادبی رسالہ" ادب" بھی نکالتے تھے۔" ادب" سے حسینی تلہری اور خواجہ اطہر خاص وابستگی رکھتے تھے۔ یہ تینوں حضرات اُس کے بانیوں میں تھے اور غالباً مسعود صاحب بھی داماے اور سخنے اِن کے ساتھ تھے۔ دوستی کے علاوہ ادب کے ادارتی امور میں مشورت بھی۔۔

"مسعود کو حسینی کے یہاں کھینچ لاتی تھی"۔ یہ سرتاپا غلط ہے۔ رسالہ ادب اعظم صاحب نہیں نکالتے تھے۔ اس کے نکالنے والے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم تھے حسینی تلہری اور خواجہ اطہر رسالہ ادب کے بانیوں میں نہیں تھے۔ مشوروں کے لئے بھی ان حضرات کی کوئی خصوصی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ نہ اس کے لئے باقاعدہ میٹنگیں ہوتی تھیں۔ اس کے بانی اور مالک بلاشرکت غیرے صرف مسعود صاحب تھے روپیہ صرف انہیں کا لگتا تھا۔ اس کا دفتر مسعود صاحب ہی کے مکان پر تھا۔ اعظم صاحب رسالہ ادب کے اڈیٹر اور منیجر تھا۔

۶۔ صفحہ ۱۰ کالم دوسرا۔ سطر ۲۷۔ " زیدی صاحب نے کئی باتیں لکھی ہیں کہ ان کی وجہ سے حسینی صاحب کے یہاں مسعود صاحب اکثر آنے لگے تھے"۔ عرض ہے کہ مسعود صاحب اکثر کہیں بھی نہیں جاتے تھے انکو اپنے کاموں سے فرصت ہی نہیں تھی، حد درجہ مشغول رہا کرتے تھے۔ جہاں کہیں بھی جاتے تھے بیشتر ضرورت ہی سے جاتے تھے۔ البتہ ایک مرزا محمد عسکری صاحب مرحوم کی ذات ایسی تھی جہاں چھٹے چھ ماہے خود سے جاتے تھے۔ اور ہاں سال میں دو برس میں ایک آدھ مرتبہ پنڈت منوہر لال زتشی پرنسپل جبلی کالج کے یہاں بھی چلے جاتے تھے۔ پنڈت جی بڑے پڑھے لکھے انسان تھے۔

۷۔ صفحہ ۱۱۔ کالم پہلا۔ سطر ۱۳۔ "مسعود صاحب کے دوستوں میں شیخ ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ تھے"۔ دوست ہونا تو بڑی بات ہے کسی طرح کے بھی تعلقات نہیں تھے۔ ہاں ایک دوسرے کو جانتے ضرور تھے۔

۴۔ صفحہ ۱۱۔ کالم پہلا۔ سطر ۲۰۔ "عثمانی صاحب مسعود صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔" یہ پہلی بات سے زیادہ غلط بات ہے۔ برسوں میں کبھی کبھار سر راہے گاہے ماہے علیک سلیک ہو جائے تو ہو جائے کسی طرح کے قریبی تعلقات قطعی نہیں تھے۔ ہاں ایک مرتبہ مسعود صاحب کو عثمانی صاحب کے یہاں جانا پڑ گیا تھا۔ عثمانی صاحب نے بیخود صاحب کی کتاب گنجینۂ تحقیق کے خلاف ایک مضمون شائع کیا۔ اُس کا جواب جب بہت دنوں تک نہیں آیا تو عثمانی صاحب نے اودھ پنچ میں پھر لکھا کر جواب کہاں سے آئے۔ پروفیسر مسعود صاحب تو پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ وہ آئیں تو جواب نکلے۔ مسعود صاحب جب مسوری سے واپس ہوئے تو اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے پہلی اور آخری مرتبہ عثمانی صاحب کے یہاں گئے تھے۔ یہ بھی لکھ دوں کہ عثمانی صاحب نے پروفیسر صاحب کی باتوں کو باور نہیں کیا تھا جس سے وہ ناگواری کا تاثر لے کر اُن کے یہاں سے واپس ہوئے تھے۔ عثمانی صاحب ہمارے یہاں ایک مرتبہ بھی نہیں آئے۔ میرے معلومات میں اضافہ ہوگا اگر علی جواد زیدی صاحب اُن قرائن، اُن ذرائع، اُن دلیلوں اور اُن ثبوتوں سے مطلع فرمائیں گے جن کی وجہ سے انہوں نے اُن پر یہ اثر ڈالا ہے کہ عثمانی صاحب مسعود صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

۵۔ صفحہ ۱۱۔ کالم پہلا۔ سطر ۲۲۔ "مسعود صاحب کے ایک ہم وطن بیخود موہانی"۔ مسعود صاحب نیوتنی کے رہنے والے تھے۔

۶۔ صفحہ ۱۱۔ کالم پہلا۔ سطر ۲۳۔ "بیخود موہانی نے" ہماری شاعری" کے خلاف رسالہ بازی شروع کی۔ پہلے چھوٹے چھوٹے رسالے آئینہ تحقیق وغیرہ لکھے اور بعد میں اُن سب کو یکجا کر کے گنجینۂ تحقیق کے نام سے کتابی صورت میں شائع کرا دیا اس پر مختار حسین عثمانی نے اودھ پنچ میں گنجینۂ نا تحقیق کے نام سے وہ لے دے کی کہ بیچارے بیخود تلملا اُٹھے"۔ "مار و گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔ کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا۔ بھان متی نے ناتا جوڑا"۔ علی جواد زیدی صاحب نے دو مختلف النوع

باتوں کو ایک میں ملا کر خلط مبحث کر دیا۔ کہاں گنجینۂ تحقیق کے مضامین اور کہاں ہماری شاعری پر اعتراضات۔ اڈیٹر نیا دور سید خورشید احمد صاحب نے بھی اس کو یوں ہی چلا جانے دیا۔ اُن کے نزدیک بھی یہ دونوں چیزیں الگ الگ نہیں تھیں۔ گنجینۂ تحقیق بیجود موہانی کے پانچ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے کسی مضامین کا کوئی تعلق ہماری شاعری سے نہیں ہے۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ نے گنجینۂ تحقیق کے عنوان سے اس کتاب پر بقول زیدی صاحب، جو "لے دے" کی ہے وہ "ہماری شاعری" کی طرف داری میں نہیں۔۔۔

زیدی صاحب گنجینۂ تحقیق کے مضامین یعنی آئینۂ تحقیق، سرمایۂ تحقیق، مایۂ تحقیق، اور پایۂ تحقیق کو ہماری شاعری کے خلاف چھوٹے چھوٹے رسالے قرار دے دیا۔

زیدی صاحب کی اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں کہ ہماری شاعری کی مخالفت میں بیجود صاحب نے کئی نہیں صرف دو چھوٹے چھوٹے رسالے "جوہر آئینہ" اور "منظر آئینہ" کے نام سے شائع کئے تھے پہلی جلد کی پہلی قسط "جوہر آئینہ" کے نام شائع ہوئی تھی۔ پھر ایک سال کے بعد جلد اوّل کی دوسری "منظر آئینہ" کے نام سے وجود میں آئی تھی۔ قیاس ہوتا تھا کہ اس طرح کے مضامین بیجود صاحب کئی جلدوں میں شائع کریں گے۔ ان مضامین کے جواب میں مسعود صاحب کے دو یا تین مضمونوں کے شائع ہونے کے بعد پھر بیجود صاحب نے جلد اول کی کوئی تیسری قسط "ہماری شاعری" کے خلاف شائع نہیں کی۔

۷۔ صفحہ ۱۲۔ کالم پہلا۔ سطر ۹ "مسعود بھی صاحب تم لکھنوی تھے۔ لیکن ان کا اصلی وطن اُناؤ کے پاس ایک قصبہ نیوتنی تھا۔ اُناؤ اور لکھنؤ میں کچھ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ غالباً پچیس تیس میل کا فاصلہ ہوگا۔"

اس کو زرا اور صحیح کر دوں۔ نیوتنی ضلع اوناؤ کا ایک نمایاں اور نامور قصبہ ہے۔ لکھنؤ سے اوناؤ کوئی ۲۳، ۲۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ شہر لکھنؤ کی سرحد نیوتنی کی سرحد سے کوئی ۱۶ میل کے فاصلے پر مل جاتی ہے۔ اس طرح نیوتنی اور اُناؤ کے مقابلہ میں لکھنؤ سے زیادہ قریب ہے۔

۸ ۔ صفحہ ۱۲۔ کالم پہلا۔ سطر ۲۹: "اُن کا عقیدہ تھا: واجد علی شاہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔" واجد علی شاہ کے ذکر کا عقیدے سے کیا تعلق۔ البتہ تحقیق عمیق کے ہاتھوں پروفیسر صاحب کے پاس مضبوط شہادتیں تھیں کہ واجد علی شاہ کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔

۹ ۔ صفحہ ۱۲۔ کالم دوسرا۔ سطر ۷۔ "اور وہ سب کے لئے شہادت پاس رکھتے تھے۔" پاس کا اضافہ کاتب کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے۔

۱۰۔ صفحہ ۱۲۔ کالم دوسرا۔ سطر ۷: "انھوں نے واجد علی شاہ، اودھ اور لکھنؤ پر اُردو، فارسی اور انگریزی میں بہت سا مواد جمع کر لیا تھا۔ وہ لکھنا بھی چاہتے تھے۔ لیکن ظالم وقت نے فرصت نہ دی۔" اطلاعاً عرض ہے کہ آخری تاجدار اودھ پر مسعود صاحب کی کتاب "سلطانِ عالم واجد علی شاہ" میر اکاڈمی نے چھاپی ہے مگر ابھی تک بازار میں نہیں آئی ہے۔ میر اکاڈمی کے صدر محترم مقبول احمد لاری صاحب اس کتاب کا اجرا پہلے مرحوم صدر جمہوریہ سے کرانا چاہتے تھے۔ پھر نور الحسن صاحب کو منتخب کیا تھا وہ منشا پورا نہیں ہوا ہے۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ اب یہ کتاب بازار میں آگئی ہے۔

۱۱ ۔ صفحہ ۱۲۔ کالم پہلا۔ سطر ۲۰۔ "انتقال سے کچھ دن قبل انھیں (یعنی مسعود صاحب کو) بھی یہ خیال ہونے لگا کہ

رے کو (یعنی مراثی کے مجموعہ کو) محفوظ کر دینا چاہیئے۔ آل احمد
علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے اور ڈاکٹر محمد حسن جموں و کشمیر یونیورسٹی
لینا چاہتے تھے۔ مسعود صاحب نے اس سلسلہ میں مجھ سے بھی (یعنی
جواد زیدی صاحب) سے رائے مانگی میں نے علی گڑھ کے حق میں
دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ انھوں نے علی گڑھ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔
جو دھر کی قربت کے جن باتوں کا انکشاف زیدی صاحب نے
ہے اُن سے میں بالکل ہی واقف نہیں ہوں جن باتوں سے میں
ت ہوں وہ عرض کرتا ہوں مسعود صاحب تاریخ مرثیہ لکھنا
تے تھے۔ اس ذیل میں مواد فراہم کرنے کے لئے انھوں نے
کی بازی لگا رکھی تھی۔ ساری زندگی اس کی تلاش و جستجو
لگے رہے۔ قدیم لکھنؤ کی گلیاں مسلسل چھانتے رہتے تھے لکھنؤ
رانی قلمی اور چھپی ہوئی کتابوں کی دو تین دوکانیں تھیں۔ برادر
نے ان دوکانوں کے ہزاروں سے زیادہ ہی پھیرے لگائے
گے۔ مدتوں نخاس کی بازار جانا اُن کا معمول رہا تھا لوگ
بھی پرانی کتابیں فروخت کرنے کے لئے لایا کرتے تھے۔ غرض
بیٹھے قدیم قلمی مرثیوں کی فراہمی کو پیش نظر رکھتے تھے
جد و جہد بڑی کد و کاوش سے قدیم قلمی مرثیوں کا ذخیرہ
ہوا تھا بالکل صحیح تو نہیں بتا سکتا خیال یہی ہے کہ تین سو
ڈھائی تین سو قدیم مرثیہ گویوں کا کلام حاصل ہو گیا تھا۔
در چھپے ہوئے پرانے اور نئے شاعروں کے مرثیے بہت
تعداد میں فراہم ہو گئے تھے۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ ایک سے
جگہوں پر مرثیوں کا ذخیرہ ہمارے یہاں سے زیادہ ہو۔
نئے مرثیہ گویوں کا کلام ہمارے یہاں تھا۔ خیال یہی ہے کہ
اور نہیں ہوگا۔ بھائی صاحب کی طلب صادق کہ نتیجے
ہر طرف سے مرثیے کھنچے چلے آ رہے تھے۔

بھائی جان ایک دن فرمانے لگے۔ کہ تاریخ مرثیہ کا مواد
فراہم کرنے میں میری زندگی اپنی آخری منزل پر آگئی۔ اب میری عمر تاریخ
مرثیہ لکھنے کے قابل نہیں رہی۔ اس کے لکھنے کے لئے طویل عمر چاہیئے۔
نوجوانی سے بڑھاپے کی آخری منزل تک زندہ رہنا ضروری ہے۔
مرثیہ ملتا ہے تو تخلص نہیں ملتا تخلص ملتا ہے تو نام نہیں ملتا۔
نام ملتا ہے تو باپ دادا نہیں ملتے باپ دادا ملتے ہیں تو وطن نہیں
ملتا۔ یہ سب باتیں مل جاتی ہیں۔ تو زمانہ نہیں ملتا۔ بڑی کھکھیڑ یں
جھیلنا، بڑے پاپڑ بیلنا، بڑے ہفت خوان طے کرنا پڑیں گے۔
تحقیق کے لئے ایک عمر درکار ہے

تاریخ مرثیہ لکھنے کا خیال ترک کرنے کے بعد میرے
مرحوم بھائی کو یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ اس عظیم خزانے کی حفاظت
کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں اس کا محفوظ رہنا مشکل ہے۔
کچھ نے مشورے دیئے کہ دوسرے ملکوں سے خط و کتابت کیجئے۔ مالدار
ملک اس ذخیرے کے لاکھوں روپئے دے سکیں گے۔ یہ آپ کی
ساری زندگی کی محنت ہے۔ کسی نے حیدر آباد دکن کا نام لیا کسی نے
خدا بخش لائبریری اور کسی نے رضا لائبریری [illegible] خط و
کتابت [illegible] دن کو نیشنل میوزیم
دہلی [illegible] کا معاوضہ [illegible]

برادر معظم کا اس مجموعے سے مالی فائدہ اٹھانا پیش نظر نہیں
تھا۔ انھوں نے معاوضہ کی کمی اور [illegible] کا خیال کئے بغیر کسی وجہ
سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالے کر دیا۔

۱۳۔ صفحہ ۱۳۔ کالم دو [illegible] ذخیرے میں صرف
قدیم ہی نہیں بلکہ جدید مراثی بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں" زیدی
صاحب نے یہ بات بھی غلط لکھ دی۔ اس ذخیرے میں صرف قلمی
قدیم مراثی ہیں۔ جدید یا چھپے ہوئے مرثیے نہیں ہیں۔

۱۳۔ صفحہ ۱۶۔ کالم پہلا۔ سطر ۱۱۔ "مسعود صاحب نے ایک [illegible] پنائی" طرز اطرافِ لکھنؤ میں مذکر ہے۔

۱۴۔ صفحہ ۱۷۔ کالم دوسرا۔ سطر ۲۸ "کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے"۔ کبھی کبھی نہیں مسلسل بلا ناغہ یونیورسٹی ہمیشہ سوٹ ہی پہن کر جاتے تھے۔ زیدی صاحب دو برس تو مسعود صاحب کے طالب علم ضرور ہی رہے ہیں۔ اس کے بعد اُن کا یہ لکھنا کوئی مجھے مشورہ دے کہ ایسے میں کیا لکھوں۔ یونیورسٹی کے علاوہ کبھی سوٹ نہیں پہنتے تھے۔

۱۵۔ صفحہ ۱۸۔ کالم پہلا۔ سطر ۱ "مقدرت کے باوجود کار کبھی نہیں رکھی"۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ مارس کا ایک انگریزی کار تھا جو برسوں رہا۔ زمانۂ جنگ میں گورنمنٹ نے پٹرول پر بندش لگا دی تھی۔ چوری چھپے پٹرول خریدنا مسعود صاحب کے مسلک کے خلاف تھا۔ اب موٹر گیراج میں گیا تو پھر کبھی نہیں نکالا۔ مسعود صاحب کے انتقال سے ایک برس پہلے وہ الگ کیا گیا تھا۔

۱۶۔ صفحہ ۱۸۔ کالم پہلا۔ سطر ۱۔ "تانگہ رکھتے تھے جس میں بیٹھے ہوئے ٹلہوانے کی باگ ڈور اُن کے بھائی آفاق کے ہاتھ میں رہتی تھی۔" آپ نے ازراہِ نوازش جو منصب مجھے عنایت فرمایا ہے اُس کا شکریہ قبول فرمائیے۔ سہ

زمیں کے تلے جن کو جانا ہے اک دن — وہ کیوں سر کو تا آسماں کھینچتے ہیں

۱۷۔ صفحہ ۱۹۔ کالم پہلا۔ سطر ۱۹۔ "مسعود صاحب حسینی اور تلہری کے دوست تھے لیکن ان تینوں کے مابین احترام بھری دوستی تھی۔ تو، کون، کبھی 'آپ' سے 'تم' تک گفتگو نہ پہونچ پائی۔ آپس میں مزاح المومنین بھی ہوتا، سنجیدہ جملے بھی چست ہوتے لیکن لنگوٹیا یارانہ کی کیفیت پیدا نہ ہو پاتی"۔ زیدی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ علی عباس حسینی صاحب کے سگے چچا جو بعد میں اُن کے خسر بھی ہو گئے تھے۔ وہ حسینی صاحب کو مزید تعلیم کی غرض سے لکھنؤ لائے تھے۔ کرسچن کالج میں ایف۔ اے کے پہلے سال میں اُن کا نام لکھوایا تھا۔ کرسچن کالج سے قریب گولا گنج میں شیعہ بورڈنگ ہاؤس تھا جس میں مسعود حسن رضوی پہلے سے مقیم تھے۔ اُسی میں حسینی صاحب کے قیام کے لئے اُن کے چچا حسینی صاحب سے طے کرا آئے اور خود بھی کئی دن بورڈنگ ہاؤس میں رہے۔ اسی درمیان میں وہ بڑے لڑکوں کو پرکھتے رہے جب وہ وطن واپس ہونے لگے تو حسینی صاحب کو لے کر مسعود صاحب کے پاس آئے اور فرمایا کہ "اس ہاسٹل میں آپ مجھے مناسب انسان معلوم ہوئے ہیں میں انھیں آپ کی سپردگی میں دے رہا ہوں اس اُمید کے ساتھ کہ آپ اِن کا ہر طرح خیال رکھیں گے۔"

مسعود صاحب حسینی صاحب سے چند ہی سال بڑے ہوں گے۔ یہ کیننگ کالج میں پڑھ رہے تھے اس رشتے سے حسینی صاحب مسعود صاحب کا کافی احترام کرتے تھے۔ یہ میں برابر دیکھتا رہا کہ حسینی صاحب کو ایک ہلکی بزرگی برابر دیتے رہتے تھے۔ دوستی میں پائے داری اسی زمانے میں پیدا ہو گئی تھی۔

خواجہ اطہر حسین اور اختر علی تلہری صاحب کو تو بعد بلکہ بہت بعد کے لوگ ہیں۔ یہ تو حسینی صاحب ٹریننگ کالج کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب برسوں مختلف اسکولوں میں تبادلے ہوتے ہوتے آخر میں جوبلی کالج لکھنؤ میں آئے ہیں۔ اُس وقت خواجہ صاحب اور تلہری صاحب سے ملاقات کی ابتدا ہوئی ہے بے تکلف ہونے میں ظاہر ہے کافی زمانہ لگا ہوگا۔ اور اُس کے کافی زمانے کے بعد حسینی صاحب نے تلہری صاحب کو مسعود صاحب سے ملوایا ہوگا۔ جہاں اُن عمروں میں ملاقات کی ابتدا ہوگی وہاں لنگوٹیاں یارانہ کیفیت کیسے پیدا ہوگی۔ ایسا کے لئے تو صغر سنی ہی سے مدتوں اُٹھنا بیٹھنا، کھیلنا کودنا لازمی ہے۔

محترمی علی عباس حسینی صاحب اور محترمی سید اختر علی تلہری صاحب بھائی جان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ میں اُن حضرات کی محفلوں

ین برابر شریک رہتا تھا۔ مگر میں نے کبھی آپس میں ایک دوسرے پر فقرے بازی یا جملے بازی چست کرتے نہیں سنے۔ برادرِ معظم کو کسی سے اتنا بے تکلف ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔

۱۸۔ صفحہ ۱۸۔ کالم دوسرا۔ سطر ۱۸: "انیس کمیٹی بنائی گئی، ود (مسعود صاحب) خزانچی اور علی عباس صاحب سکریٹری بنے۔ انھوں نے (علی عباس صاحب نے) دوڑ دھوپ کرکے پچیس تیس ہزار کی رقم مہیا کرلی۔ اس میں معتد بہ حصہ حکومت ہند کا تھا" یہ بھی صحیح نہیں ہے حکومت ہند سے کہیں زیادہ رقم حکومت کشمیر نے دی تھی۔

۱۹۔ صفحہ ۱۸۔ کالم دوسرا۔ سطر ۲۰: "حسینی صاحب نے یہ فرض کرنے میں غلطی کی تھی کہ مسعود صاحب تعمیر کے کام میں مداخلت نہ کریں گے اس سلسلے کی تفصیلات کا علم نہیں کہ کیا ہوا لیکن اتنا معلوم ہے کہ حسینی صاحب نے سکریٹری شپ سے بددل ہوکر استعفیٰ دے دیا" تفصیلات ملاحظہ فرمائیے لکھنؤ تو ہم آپ سبھی جانتے ہیں کہ جو عمارتیں یادگار کے طور پر محفوظ کی جاتی ہیں اُن کا ظاہر بالکل اسی طرح رکھا جاتا ہے۔ جیسا اُن کے مالکوں نے رکھا تھا۔ اندر اندر جتنی بھی مضبوطی کردی جائے مگر اُس کے قدیم APPEAR-ANCE میں ذرہ برابر فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

حسینی صاحب نے مکان کی درستی کا ذمہ دار اپنے ایک عزیز شاگرد کو بنایا جو صرف ڈرافس مین تھے۔ اُن کو عمارتیں بنوانے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اور نہ وہ جانتے تھے کہ اس مکان کے محفوظ کرنے میں کیا کیا نزاکتیں ہیں۔ ان غریب نے مکان انیس کی دوسری منزل پر جو دو کمرے مضبوط بنے ہوئے تھے انھیں بالکل گروادیا اور اُن کا نقشہ بھی نہیں رکھا۔ زینہ جو کہ دالان میں چڑھتا تھا اُسے پتلا کردیا۔ چبوترے پر ایک جگہ انیس کے ورزش کرنے کی تھی۔ اُسے کھود ڈالا اور وہاں پھر علامت نہیں بنوائی نیچے کے بڑے کمرے اور اُس کے آگے کے دالان کی چھتیں بالکل کھول دی گئیں جن کو کھولنا چاہئے تھا۔ مگر ستم یہ کیا کہ وہی سو برس پرانی چھایاں پھر لگوا دیں اور چھت ایسی ڈالی جو پہلی ہی برسات سے ٹپکنے لگی اور اُس کی چھایاں گرنے لگیں۔ اُس میں لگایا ہوا سب روپیہ بیکار گیا۔

مزار کے ذیل میں حسینی صاحب کی رائے تھی کہ اُس پر گنبد نہ بنے۔ خالی دالان یا کمرہ بنوا دیا جائے۔ مسعود صاحب نے کہا کہ جب تک گنبد نہیں ہوگا یہ مقبرہ معلوم ہی نہیں ہوگا۔ حسینی صاحب نے پھر کہا کہ یہ بیکار خرچ ہوگا۔ اِس کو نہیں ہونا چاہیئے۔ اِس پر مسعود صاحب نے کہا کہ کمرہ یا دالان کی بھی کیا ضرورت ہے۔ انیس نہ پانی سے بھیگ رہے ہیں۔ اور نہ دھوپ سے سوکھ رہے ہیں۔ کمیٹی کے اور ممبر بھی گنبد کے طرف دار تھے۔ یہی باتیں تھیں جو حسینی صاحب کی کبیدگی کا سبب بنی تھیں۔

۲۰۔ صفحہ ۱۹۔ کالم پہلا۔ سطر ۷۔ "روزے کا حال معلوم نہیں، لیکن نمازیں پابندی سے پڑھتے تھے" جب تک طاقت رہی روزے برابر رکھتے رہے تھے۔

۲۱۔ صفحہ ۱۹۔ کالم پہلا۔ سطر ۸۔ "جوانی کے زمانے میں انھوں نے ڈرامے بھی دیکھے ہیں۔ جوانی جوانی ہی ہوتی ہے۔ انھیں ابتدا سے ڈراموں سے شغف تھا۔ اور یہ بالآخر اُن کی اُس تصنیف کا سبب بنا جس پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی سے انعام ملا" پروفیسر سید مسعود حسن رضوی سے متعلق سید علی جواد زیدی صاحب کی بیشتر تحقیقات نے مجھے مجسمۂ حیرت بنا دیا ہے۔ زیدی صاحب کے علاوہ کسی دوسرے محقق کے یہ انکشافات ہوتے تو میں بے دھڑک اسے مجنوں کی بڑ قرار دے دیتا "جوانی کے زمانے میں انھوں نے ڈرامے بھی دیکھے ہیں" "انھیں ابتدا سے ڈراموں سے شغف تھا" یہ دونوں باتیں غلط اور بے انتہا غلط ہیں۔ یہ تو پروفیسر مرحوم کی مزاجی خصوصیات کی بالکل ضد ہیں۔ زیدی صاحب نے جن مضبوط بنیادوں پر یقین کے ساتھ یہ باتیں لکھی ہیں۔ اُن سے مجھے بھی

مطلع فرمادیں۔

میری ساری زندگی اپنے بھائی کے ساتھ ایک ہی چہار دیواری میں گذری ہے۔ اُن سے متعلق تقریباً سب ہی باتیں میرے علم میں ہیں۔ مجھے دیکھنا ہے کہ بھائی صاحب سے متعلق وہ کون کون سے ماخذ ہیں جو میری دسترس سے باہر ہیں۔ زیدی صاحب کے اس جملے کا مفہوم بھی سمجھنا چاہتا ہوں کہ "جوانی جوانی ہی ہوتی ہے" کیا ہر ایک جوانی یکساں ہوتی ہے؟ اور وہ رنگ رلیوں ہی کی طرف مائل رہتی ہے صحیح محقق بات کو اتنے دلائل کے ساتھ لکھتا ہے کہ دوسروں کے قلم اُس کا تعاقب نہ کرسکیں۔

صحیح ماخذ مجھ سے حاصل کیجئے۔ ہم لوگوں کے والد مرحوم حکیم سید مرتضےٰ حسین اعلیٰ اور مقامہ عدد درجہ مذہبی انسان تھے اُنکی نماز شب بھی کبھی قضا نہیں ہوتی تھی۔ والدہ مرحومہ بھی نماز روزہ کی سخت پابند تھیں۔ اُن کی اولادوں کی اولادیں بیشتر آج بھی اس پر عامل ہیں۔ بچپنے سے اتنا گاڑھا مذہبی ماحول برادر معظم مرحوم پر چھایا ہوا تھا کہ نوجوانی اور جوانی کے زمانہ تک مجھے یقین ہے کہ وہ ڈرامہ کے تفصیلات سے واقف ہی نہیں ہوں گے۔ داڑھی جب سے وجود میں آئی تھی مذاقوں اُستہ مجھے اس سے متصل نہیں کیا۔

ڈراموں میں شرکت کا حال بھی سن لیجئے۔ "ٹریننگ کالج الہ آباد" کا دستور تھا کہ وہاں کے طالب علم ہر سال ایک ڈرامہ اسٹیج کرتے تھے۔ بھائی صاحب کے زمانۂ تعلیم میں جب حسب معمول ڈرامہ ہوا تو لڑکوں کے اصرار سے کچھ وقت کے لئے اُس میں شرکت کی تھی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے انھیں کسی ڈرامہ میں جاتے نہیں دیکھا۔ یہی حال سنیما کے ذیل میں بھی تھا۔ میرے علم میں بس ایک ہی مرتبہ گئے تھے "خانۂ خدا" ایک مذہبی فلم تھا جب پہلے پہل لکھنؤ میں آیا تھا۔ تو حضرت گنج کے جس سنیما گھر میں اُس کی ابتدا ہوئی تھی۔ اُس کے مالک نے معززین شہر کو خود سے دعوت شرکت دی تھی، اُس میں وہ شریک ہوئے تھے۔ حسینی صاحب مرحوم جو سنیما کے شیدائی تھے اُنکی مسلسل کنوسینگ مسعود صاحب کو متاثر نہیں کرسکی۔

مسعود صاحب ہر بات کو معلوم کرنا اور جس کے دیکھنے کی ضرورت سمجھتے تھے اُسے ایک مرتبہ دیکھنا ضرور چاہتے تھے۔ اپنے اس اصول کے پیش نظر ایک مرتبہ نوٹنکی ایک مرتبہ سپیرا دیکھنے بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے گئے تھے۔

ڈرامہ سے متعلق مسعود صاحب کی جو دو تصنیفیں لکھنؤ کا عوامی اسٹیج اور لکھنؤ کا شاہی اسٹیج وجود میں آئی ہیں۔ یہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے حالات کی چھان بین میں ہاتھ آگئی ہیں۔ برادر معظم کو ڈرامہ سے کوئی دور کا لگاؤ بھی نہیں تھا۔

ان کتابوں کے شائع ہونے کے بعد مسعود صاحب کو ڈرامہ کا ماہر سمجھ کر ہندوستان کے مختلف مقامات سے اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اُردو، ہندی اور انگریزی میں بہت دنوں تک خطوط آتے رہے۔ تقریباً سب ہی کو یہی جواب جاتا رہا کہ ان دو کتابوں میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے علاوہ ڈراموں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

۲۲۔ صفحہ ۱۹۔ کالم دوسرا۔ سطر ۱۴ "اُردو کے ایک ریڈر ڈاکٹر محمد حسنین صاحب": سید محمد حسنین صاحب مرحوم نہ ڈاکٹر تھے اور نہ ریڈر وہ اُردو کے لکچرر تھے۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے علاوہ عربی اور فارسی کی متعدد ڈگریاں اُن کے پاس تھیں قابل لوگوں میں اُن کا شمار تھا۔

۲۳۔ صفحہ ۱۹۔ کالم پہلا۔ سطر ۱۶ "نوابین اودھ کا آخری دور اور لکھنؤ ہی بیشتر اُن کے تصانیف اور تحقیقات کا محور رہے"

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ابو محمد شبلی
لکھنؤ

مانک ٹالہ صاحب کے مُراسلے کا تا اور لے دوڑی کی خوبصورت مثالیں

میرے نوٹ مطبوعہ "فروغ اُردو" اکتوبر ۱۹۸۱ء
سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ مانک ٹالہ صاحب کا مراسلہ (فروغ اُردو
اکتوبر اور نومبر ۱۹۸۱ء) پیش نظر ہے۔ اُسے پڑھ کر ایسا محسوس
ہوا کہ تحقیق مانک ٹالہ صاحب کے بس کی بات نہیں نہ اُن کے
پاس مطالعہ اور غور و فکر کے لئے اتنا وقت ہے کہ وہ اس اہم
کام کو انجام دے سکیں۔ اس لئے وہ کبھی جناب گوپال متل کی تحریر
کو اُڑاتے ہیں۔ کبھی ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے تال سے اپنا سُر
ملاتے ہیں۔ کبھی ڈاکٹر ٹی۔ این کھنہ صاحب کے مقالے کی بیساکھی
استعمال کرتے ہیں۔ کبھی اُوپندر ناتھ اشک صاحب کے کندھے پر
بندوق رکھ کر داغتے ہیں۔ اور کبھی مولانا عبدالماجد دریابادی
کے خطوط کو پیش کر کے تماشا بجاتے ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود
انھیں ڈھاک کے تین پات ہی ملتے ہیں۔ بات چٹھی پتری کے مرتبین
کی تھی میں نے اپنے نوٹ [illegible] میں لکھا تھا۔

"چٹھی پتری کے مرتب کرنے والے اکیلے امرت رائے
ہی نہیں بلکہ مدن گوپال بھی ہیں۔ اس کے پہلے حصے میں جو
صرف منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے
مدن گوپال کا نام بھی چھپا ہوا ہے۔ بارہ سطروں کا دیباچہ
لکھ کر انھوں نے امرت رائے کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔
لیکن جلد دوئم سے اُن کا نام غائب ہے۔ حالانکہ اُن کے
جمع کئے ہوئے خطوط اس میں بھی شامل ہیں لیکن صرف بدنامی
ہی اُن کے حصے میں آئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جلد دوئم سے
خط نمبر ۲۳ بنام جینندر کمار پروف پڑھتے۔ پڑھتے
کیوں غائب ہو گیا؟ اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے
اور ستمبر ۱۹۳۰ء والا منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھا ہوا
خط (پریم چند کے خطوط ص ۹)
جلد ۱ میں کیوں نہیں ہے۔ اس پر
امرت رائے یا مدن گوپال"
(فروغ اُردو اکتو

اس ملوث میں تحقیق کے لئے جو بنیادی باتیں تھیں اس پر تو جناب مانک ٹالہ نے توجہ دی ہی نہیں۔ بس ایک معمولی سی بات جس کا تحقیق پر رتی بھر بھی اثر نہیں پڑتا۔ کولے اڑے اور لوگوں کو آج کی تازہ خبر سنانے لگے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُنکے پاس جو کتاب ہے اُس کا اڈیشن کونسا ہے؟ جو کچھ چھپا ہے اس پر کوئی چیپی تو نہیں لگی ہے؟ پہلے ڈسٹ کور تھا یا بعد میں لگایا گیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ان کتابوں کے پہلے اڈیشن ۱۹۶۲ء کی بنیاد پر تھا اور پھر اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ پہلی جلد میں مرتب کی حیثیت سے امرت رائے اور مدن گوپال کے نام چھپے بھی ہیں اور ناشر کی جگہ اُن کے ناموں کی چیپی بھی لگی ہے۔ مگر دوسری جلد میں نہ مدن گوپال کا نام چھپا ہے نہ ہی ناشر کی جگہ کوئی چیپی یہاں لگا ہے۔ ہنس پرکاشن پہلے سے چھپا ہوا ہے۔ دونوں جلدوں پر ڈسٹ کور بعد میں لگا ہے اسلئے کہ ان پر گیارہ گیارہ روپے قیمتیں چھپی ہیں جبکہ اصل کتابوں پر گیارہ گیارہ روپئے کی چیپی بعد میں چپکائی گئی ہے۔ (پہلے شاید سات اور آٹھ روپئے بالترتیب تھی) ڈسٹ کور پر کسی بھی مرتب کا نام نہیں ہے۔ اگر کتاب (جلد ۲) پر مدن گوپال کا نام غلطی سے نہیں چھپ سکا تھا چیپی چپکانا بھی لوگ بھول گئے تھے۔ تو ڈسٹ کور پر مرتبین کا نام چھاپنے میں کیا قباحت تھی؟

مانک ٹالہ صاحب کی گرفت اور تحقیق کے لئے بہت سی چیزیں ان چار مختصر نوٹس میں موجود ہیں۔ مگر وہ کاتا اور لے دوڑی کے مصداق ایک موٹی سی بات کو لے اڑے لطف یہ کہ وہ اسے اہم بھی نہیں سمجھتے۔ پھر بھی اپنا۔ قارئین کا اور میرا وقت ضائع کرتے ہیں انھوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا کہ جلد دوم سے خط نمبر ۲۴۱ بنام جینندر کمار حرف بحرف پڑھتے۔ پڑھتے کیوں غائب ہو گیا؟

سب سے پہلے وہ "چھٹی پتری" جلد ۲ جو اُس کو تلاش کرتے اگر دوسرے اڈیشن میں خطوط کی نمبرنگ درست کر دی گئی ہے تو "پردت پڑھتے۔ پڑھتے" پر غور کرتے امرت رائے سے دریافت کرتے۔ جناب مدن گوپال کی کنڈی کھٹکھٹاتے۔ پھر مجھ سے الجھتے مگر ایسے سارے جتن کی اُمید کسی سنجیدہ اور سلیم الطبع محقق سے کی جا سکتی ہے جناب مانک ٹالہ صاحب سے نہیں۔

پریم چند کے خطوط کے متعلق میں نے ابتک جتنی باتیں لکھی ہیں۔ وہ اپنے ہی مطالعہ کی بنیاد پر تھیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جناب خلیق زیدی "پریم چند کی اپنیاس یاترا نو مول چنتن" کے صفحات پر بہت پہلے لکھ چکے تھے۔ یہ کتاب مجھے پھر ملی تو میں ان چھ صفحوں (ص [illegible]) کا ترجمہ مانک ٹالہ صاحب کی خدمت میں پیش کرونگا۔ ویسے مانک ٹالہ صاحب اس کتاب کا مطالعہ ضرور کر لیں۔ اُن کے کام کی بہت سی باتیں اس میں ملیں گی۔ قیمت زیادہ ہے۔ مگر وہ ہر وقت تھیلی بکف رہتے ہیں۔ یہ مسئلہ تو ہم غریبوں کے لئے ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ یہ کتاب پریم چند کو اپاسل یا قومی ہیرو بنا کر پیش نہیں کرتی بلکہ اپنیاس سمراٹ کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ فی الحال پبلیش کے مضمون مطبوعہ "فروغ اُردو" اکتوبر ۱۹۸۱ء کو بغور پڑھیں جسمیں لکھا ہوا ہے۔

۱۔ "چھٹی پتری" میں جمع کی ہوئی زیادہ تر چٹھیاں "مسخ شدہ" اور ناقص ہیں۔

۲۔ اس بات کا شبہہ ضرور ہوتا ہے کہ امرت رائے نے پریم چند کے کچھ خطوط دبا دیئے ہیں۔

۳۔ ان چٹھیوں کی عبارت کے بیچ۔ بیچ سے جو باتیں نکل گئی ہیں انھیں فرضی مسالوں سے بھر کر چکنا بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ اور

۱۲ نگم کی چٹھیوں کا پریم چند کے گھر میں ضائع ہو جانا انتہائی حیرت انگیز ہے۔ بنارسی داس سے نیندر۔ امرناتھ جھا۔ جلیل احمد قدوائی۔ خواجہ غلام السیدین اور اشفاق حسین وغیرہ کے خطوط اگر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تو نگم کے خطوط میں ہی ایسی کیا بات تھی کہ انھیں پھاڑ کر پھینک دیا گیا؟ اور ایک بات تو طے ہے کہ اگر یہ چٹھیاں مل جاتیں تو پریم چند کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کھل کر سامنے آسکتی تھیں۔ (فروغ اُردو۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

حیرت ہے کہ جناب مانک ٹالہ نے دو اڈیٹروں کے اڈیٹوریل نوٹ پر اپنی رائے کا اظہار نہیں فرمایا۔ محمد عباس حسین اڈیٹر "تمدن" نے انھیں متعصب اور فرقہ پرست کہا۔ اور پیارے لال شاکر اڈیٹر "ادیب" نے انھیں سرقہ کا ملزم ٹھہرایا۔ مگر وہ بالکل پی گئے۔ جناب مانک ٹالہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے "پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں سرقہ" بھی اہم ترین موضوع ہے۔ وہ چاہیں تو اس موضوع پر بھی اپنے افکار عالیہ پیش کر سکتے ہیں۔

شیلیش زیدی کے مضمون سے مانک ٹالہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ مگر مترجم کے حصہ میں ناراضی ہی آئی اس لئے کہ وہ اپنے نوٹ لکھ کر سارا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ اور یہ الزام بھی آیا کہ: ۔

"وہ دور جس میں منشی پریم چند نے ہندو مسلم یک جہتی کے لئے بیسیوں مضمون لکھے۔ بلکہ اُن میں سے بیشتر میں ہندوؤں ہی کو مجرم ٹھہرایا شبلی صاحب نے جان بوجھ کر اس دور کے پریم چند کو قارئین کی نظر سے اُجھل رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

مانک ٹالہ صاحب کو افسوس ہے کہ اگر کبھی منشی پریم چند نے صحیح سمت میں سوچا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تو ابو محمد شبلی نے اسے پیش کرنے کی سعی نہیں کی۔ بلکہ اس پر پردہ ڈالا۔ عرض ہے کہ یہ فریضہ آپ خود کیوں نہیں انجام دیتے؟ یہ کام ایک معمولی مترجم سے بھی لیا جا سکتا ہے۔

اس نالائق نے تو منشی جی کی جس تحریر کو اٹھایا وہ افسانہ ناول، خطوط یا مضامین ہوں اس نے محسوس کیا کہ منشی جی کہیں بھی اپنے تعصب کو چھپا نہیں سکے ہیں۔ بلکہ ایک جارح فرقہ پرست کی حیثیت سے دوسروں کے حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ بالمندو شکھر تیواری (شعبۂ ہندی۔ رانچی یونیورسٹی) نے ترقی پسندوں کے جلسے میں بڑی صفائی سے کہا تھا کہ جہاں کہیں دو مذہبی گروہوں کا ذکر آیا ہے۔ وہاں منشی جی کھلے ہوئے فرقہ پرست نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر منشی جی کی ایسی تحریریں بلا تبصرہ پیش کی جاتی ہیں۔ جو پریم چند کے ہم نوا و ہم مشرب نے اپنے مضامین میں پیش کی ہیں۔

منشی جی نے ایک مضمون "شدھی" قلمبند فرمایا تھا جسے پڑھ کر بقول اُن کے آریہ سماجیوں کے بھنا جانے کی توقع تھی مگر اس میں لکھا کیا تھا؟

"جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں ہندوؤں کو آسائش اور اطمینان میسر نہیں۔ اُنکی لڑکیاں اُن کی بیوائیں ہمیشہ اسلامی دست برد کا شکار رہی ہیں۔"

(نقل کردہ جناب سری رام شرما۔ "زمانہ" جون ۱۹۳۳ء)

اور شاید ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کے سنین میں لکھا تھا کہ

"مسلمان فاتح تھے اور ہندو مفتوح۔ مسلمان بادشاہوں نے سختی سے سخت ظلم کئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اذان اور قربانی کے موقعوں پر مسلمانوں کی طرف سے زیادتیاں ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ تر

مسلمان اَب بھی میرے داعدا سلطان تھے کے نعرے لگاتے ہیں ..... تبلیغ کے معاملہ میں زیادتی مسلمانوں نے کی مگر

ان سارے وجوہ و دلائل اور واقعات کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کو

اس سے کہیں زیادہ برداشت سے کام لینے کی ضرورت ہے ..... تاریخ سے ورثے میں ملی ہوئی عداوتیں مشکل سے مرتی ہیں۔ لیکن مرتی ہیں امر نہیں ہوتیں"۔

(نقل کردہ ڈاکٹر۔ بی۔ این کھنہ صاحب۔ فروغ اُردو۔ مارچ سنہ ۱۹۹۱ء)

یہ ہیں اُن وجوہوں کے پریم چند جنھیں پیش نہ کرنے کا الزام مانک ٹالہ صاحب نے مجھ پر ڈالا ہے۔ اور یہ بات شاید اُن کے ذہن سے اتر گئی کہ ان چودہ افسانوں میں سے بارہ (۱۲) افسانے بھی انھیں وجوہوں (سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۳۶ء) میں لکھے گئے تھے۔ جن میں سے دس (۱۰) کی نشاندہی میں نے کی ہے اور دو کی امتیاز علی تاج (زنجیر ہوس) اور محمد عباس حسین (خون حرمت) نے میرے پیش کئے ہوئے دو افسانے "اندھیر" (سنہ ۱۹۱۳ء) اور "غیرت کی کٹار" (سنہ ۱۹۱۹ء) سے پہلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس میں منشی جی اعلان کر چکے تھے کہ اب وہ متحد قومیت کے قائل نہیں رہے اور اس کی کوشش بھی فضول سمجھتے تھے۔

(پریم چند کے خطوط ص ۴۲)

(باقی مضمون آئندہ)

نقش حالی

از پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

قیمت حصہ اول و دوم کامل ۲۸/=

بسلسلہ مضمون صفحہ ۲۸ سید علی جواد زیدی

یہ بھی غلط ہے اسی رسالے کے صفحہ ۴۸ پر مسعود صاحب کی کتابوں کی فہرست درج ہے اُسے ملاحظہ فرمائیے۔

۴۲۔ صفحہ ۴۵۔ کالم دوسرا سطر ۲۵ " غالباً جوانی میں انھیں سوز خوانی سے بھی شغف تھا " جی نہیں ایسا نہیں تھا۔ قدرت نے مسعود صاحب کی آواز میں بڑی کشش بھر دی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ صلاحیت بھی قدرت کا عطیہ تھی کہ اُن کے زمانے کے جتنے بھی نمایاں شاعر تھے اُن سب کے پڑھنے کی نقل مطابق اصل کر لیتے تھے یہی حال سوز خوانی کا بھی تھا۔ کوئی مشہور سوز خوان جسکو انھوں نے سُنا ہو ایسا نہ تھا جس کا سادہ پڑھ نہ سکیں۔ بعض فن سوز خوانی سے واقف حضرات تو یہاں تک کہتے تھے کہ آپ جن کی نقل کر رہے ہیں۔ اُن سے بہتر پڑھتے ہیں۔ پُرانے نوحوں کا پڑھنا تو گویا اُن کا حصہ تھا۔ رامائن اس طرح بانچتے تھے کہ بڑے بڑے مشتاق پڑھنے والے سُنتے رہ جائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید علی جواد زیدی صاحب کو صرف تصنیف کرنے سے دلچسپی ہے وہ بس قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ غالباً یہ خیال اُن کے قلم کو منہ زور بنائے رکھتا ہے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ تحقیق سے اُن کا مزاج میل نہیں کھاتا۔ حقیقی ذوق تحقیق ہوتا تو خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے۔ اُنھیں پوشیدہ رکھنے کا طریقہ اختیار نہ فرماتے اور اُس وقت تک بے چین رہتے جب تک صحیح باتیں منظر عام پر نہ آجاتیں۔

زیدی صاحب کے اس عمل سے مجھے متاثر ہونا پڑا جس کے نتیجہ میں میں نے اُنھیں جو چھوٹ دے دی تھی۔ وہ واپس لے لی۔

۱۔ تنقید اور عملی تنقید — سید احتشام حسین — ۹/-
۔ ترانہائے نیام — ڈاکٹر غیب حسین — ۳/-
۱۔ تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص — محمد حسین — ۲/-
۔ تصویر درد مع ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/۲۵

(ٹ)

۔ ٹیگور — نادم سیتاپوری — ۳/-
۱۔ ٹھیکرے کی مانگ — صدیقہ بیگم سیوہاروی — ۳/-

(ث)

۔ ثنائے حبیب نعتیہ کلام — بہزاد لکھنوی — ۲/۲۵

(ج)

۔ جہان غالب — محمد حسین شمس علوی — ۲/-
۔ جانثار — انور سیوانی — ۳/-
۱۔ جواہرات اسمٰعیل — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۔ جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اردو — ۴/-
۔ " " نمبر ۲ " " — ۴/-
۱۔ جوئے رواں مجموعہ کلام — حامد اللہ افسر — ۲/۵۰
۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) — ڈاکٹر اثر بلگرامی — ۲/۵۰
۔ جنگ ہنسائی مجموعہ افسانہ — قیصر تمکین — ۲/۵۰
۹۔ جلوے — معین الدین دردائی — ۲/-
۱ جمیلہ بوائری (ناول) — خان محبوب طرزی — ۲/۵۰
۔ جگر نمبر حصہ اول — سید احتشام حسین — ۸/-

(چ)

۱۔ چوتھی بہن مجموعہ افسانہ — مسیح الحسن رضوی — ۲/-

(ح)

۱۔ حیات فضل الحق — خیرآبادی — ۱/۵۰
۲۔ حالی بحیثیت شاعر جدید اڈیشن مع اضافہ — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/-
۳۔ حسرت موہانی — عبدالشکور — ۹/-
۴۔ حجاج بن یوسف — جرجی زیدان — ۱/۵۰
۵۔ حکیم نباتات — وزیر خادم لنگراں — ۱/-
۶۔ حبیبہ غالب — سعادت علی صدیقی — ۲/۵۰

(خ)

۱۔ خطوط بیخود — سید اثر حسین — ۔
۲۔ خضر راہ مع ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-
۳۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی — عبدالماجد دریابادی — [illegible]
۴۔ خضر راہ مع ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-
۵۔ خلاصہ شریف زادہ — [illegible] — ۱/-
۶۔ خلاصہ روح تنقید — ۲/-
۷۔ خلاصہ جواہر العروض — ۲/-
۸۔ خطبات حزایہ محمد علی داحدی مع مقدمہ — شوکت تھانوی — ۲/۵۰
۹ خوشی کی تلاش — احسن الظفر بی۔اے — ۴/-
۱۰۔ خلاصہ شعرالہند حصہ دوم — ۱/۴
۱۱۔ خلاصہ المیزان — ۔/۶۵

(د)

۱۔ دیوان آبرو — ۱/-
۲۔ دلچسپ کہانیاں — ۴/-
۳۔ دیوان فنائی — ۲/۵۰
۴۔ داستان سہراب ورستم مع مقدمہ فارسی عبدالواحد خان خلیل — ۲/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۵	دہلی کا یادگار مشاعرہ		۱/۵۰
۶	دستہ گل		/۶۰
۷	دوشیزہ قاف (ناول)	خان محبوب طرزی	۵/-
۸	دلرُبا	" "	۳/۵۰
۹	دکّی کا دبستان شاعری (دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن)	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۲۲/-
۱۰	دھڑکنیں	ذکی کاکوروی	۳/۵۰

(ڈ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	/۵۰

(ذ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ذوقِ جستجو	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۲/-
۲	ذوق، ادب و شعور	سید احتشام حسین	۸/-
۳	ذوقِ جنوں مجموعۂ کلام	آلِ احمد سرور	۱۱/-

(ر)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۹/-
۲	رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ	سید امیر حسن نورانی	۲/۵۰
۳	رہبرِ مضمون نویسی	شفاعت علی صدیقی	/۳۰
۴	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	/۵۰
۵	رخسارِ سحر	انصر کریم صدیقی	۱/۵۰
۶	رفتار	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰
۷	رموزِ حکمت معہ مقدمہ اردو	محمد شریف	۴/-
۸	ریاضِ فارسی۔	منتخب کلام فارسی	۳/-
۹	ریختۂ ولی نیا ایڈیشن	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	/۳۰

(ز)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ	مولانا تھانوی	/۲۵
۲	زیتیوں کا بادشاہ حکیم بابا مزاحیہ ناول	سید علی عباس حسینی	۲/-
۳	زیبِ ساحرہ	وحشی محمود آبادی	۳/-

(س)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	سلور رنگ	آغا حشر کاشمیری	۴/-
۲	سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۵/-
۳	سرور جہان آبادی	ڈاکٹر حکیم چند نیر	۹/-
۴	سرودِ نو (مجموعۂ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۴/۵۰
۵	سلکِ گہر	سید احتشام حسین	۵/-
۶	سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	سید علی عباس حسینی	۱/۵۰
۷	سرمایۂ زبانِ اردو	جلال لکھنوی	۹/-
۸	سو (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/-
۹	سیاحتِ زمین "	محمود اعظم فہمی	۱/۵۰
۱۰	ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۳/۵۰
۱۱	سنہرا حلقہ		/۷۵
۱۲	سر سید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	/۵۰
۱۳	سوشل اسٹڈیز	احمد محسن کاکوروی	۱/۲۵

(ش)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	شعرِ نو تنقیدی مجموعہ	ڈاکٹر محمد حسن	۸/-
۲	شرح دیوانِ غالب مزاحیہ	غلام احمد فرقت	۲/-
۳	شرح سلکِ گہر	عبدالقوی دریابادی	۶/-
۴	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۵	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۵/-
۶	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۵/-
۷	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۸	شبلی نعمانی	ابرار الحسن نورانی	/۵۰
۹	شرح دیوانِ غالب جدید ایڈیشن	نظم طباطبائی	۹/-
۱۰	شرح ؟؟ ، دو سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۱/-
	" " " (دوم)		۱/۲۵

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۵	فورٹ ولیم کالج اور ڈاکرام غنی	نادم سیتاپوری	۹/-
۶	فلسفہ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۴/-
۷	فلسفی ابن رشد	ماکھن ملیح آبادی	۱۲/۵۰
۸	فروغ جام مجموعہ کلام	فشور واحدی	۵/-
۹	فغان محسن	محسن کاکوروی	/۵۰
۱۰	فارسی آموز	مشیر احمد علوی	۱/-
۱۱	فن داستان گوئی جدید اڈیشن	پروفیسر کلیم الدین احمد	۹/-
۱۲	فریاد امت	علامہ اقبال	[illegible]

(ق)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	قدیم و جدید بیت پر مزاحیہ نظمیں	غلام احمد فرقت	۴/-
۲	قصائد ظہیر فاریابی		۱۴/-
۳	قصائد مومن مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۷/۵۰
۴	قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۲/-
۵	[illegible] و مسائل	عبدالماجد دریابادی	۳/-
۶	قصائد قاآنی (فارسی)		۱/-
۷	قومی ادب نثر و نظم	حامد اللہ افسر	۳/-
۸	قیامت صغریٰ	سماجی ناول خان محبوب طرزی	۲/-

(ک)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	کلیات اقبال	علامہ اقبال	۱۵/-
۲	اسرار کائنات	بدر الدین طیب جی	۲/-
۳	[illegible]	مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت	۴/۵۰

(گ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	گاندھی نمبر		۲/-
۲	گلدستہ فارسی اول دوم	محمد غوث بیگ صفی	۱/۵۰
	[illegible]		۱/۲۵
۴	گلہائے ادب		۱۲/-
۵	گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰

(ل)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	لوائح جامی معہ مقدمہ	عبدالاحد خان خلیل	۱/۵۰
۲	لال قلعہ	ماکھن ملیح آبادی	۴/-
۳	لب بام	عادل رشید	۴/-
۴	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۲/۵۰

(م)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	مرقع اقبال	عصمت فاطمہ علویہ	۱۲/-
۲	مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو		۲۰/-
۳	محسن کاکوروی نمبر		۱۲/۵۰
۴	مسلمان اور کانگریس	ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۵	مرثیہ نگاری اور میر انیس	ڈاکٹر احسن فاروقی	۴/-
۶	مضامین فرحت حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	۴/-
۷	" " حصہ دوم	" "	۴/-
۸	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر ظہری	۲/-
۹	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۸/-
۱۰	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۷/-
۱۱	مجبور	خان محبوب طرزی	۲/-
۱۲	مضامین جدید	محمد حادی	۲/۵۰
۱۳	مثنوی سحر حلال فارسی معہ مقدمہ		
۱۴		قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۱۵	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۶	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۱۷	معرکۂ روم دیوان	صادق سرحدی	۴/-
۱۸	مثنویات حالی مع اضافہ	[illegible]	۴/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۹	مطالعۂ حالی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	9/-
۲۰	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	1/50
۲۱	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	2/-
۲۲	مثنوی بیانگہ	خان محبوب طرزی	4/-
۲۳	مقدمۂ شعر و شاعری مع مطالب نصاب بی۔اے	حالی	2/50
۲۴	مرثیۂ غالب	حالی	/75
۲۵	محبوبۂ کربلا	جرجی زیدان	3/50
۲۶	معمار	مائل ملیح آبادی	4/50
۲۷	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	/50
۲۸	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی میاں آزاد جیلی رتن ناتھ سرشار لکھنوی		
۲۹		ڈاکٹر رحمن فاروقی	2/50
۳۰	مرزا کلا لوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	/75
۳۱	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	1/50
۳۲	مصباح بلاغت مع مقدمہ	محمد شریف	1/-
۳۳	مطالعۂ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	[illegible]
۳۴	مقدمات و مقالات	عبد الاحد خاں	5/50
۳۵	منتخب سوانح یورپ کے	نجم الغنی نقوی	1/-
۳۶	منتخب العربیہ مع شرح	محمد حسین شمس علوی	2/-

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم کے نام	عبد الماجد دریابادی	/80
۲	نثر امروز ایران	ڈاکٹر شریف حسین	
۳	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	
۴	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	3/-
۵	نقش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر	مرتبہ ضیاء احتشام حسین	16/-
۶		ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی دوم	20/-
۶		شجاعت علی سندیلوی	7/-
۷	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	4/-
۸	نفحات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	3/-
۹	نظم سائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	12/-
۱۰	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	3/-
۱۱	نسرین نسترن	ذکی کاکوروی	4/-
۱۲	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	6/-
۱۳	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	1/25
۱۴	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبد الماجد دریابادی	/80
۱۵	نوائے سرور جہاں آبادی دیوان	ڈاکٹر حکم چند نیر	4/50
۱۶	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	3/50
۱۷	نوروز	مائل ملیح آبادی	1/50
۱۸	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	12/-
۱۹	نیلم	انتصار حسین	3/50
۲۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	1/50
۲۱	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	8/-
۲۲	نصاب فارسی	مع مقدمہ فارسی عبد الاحد خاں	[illegible]
۲۳	منشی نولکشور نمبر		

(و)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	وعدۂ فردا	ڈاکٹر مشتاق رحیم آبادی	15/-

(ہ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	2/-
۲	ہندی کے مسلمان شعرا	میر حسن	

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	1/-
۴	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	1/50
۵	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	"	1/50
۶	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی زریاب	1/-
۷	" " حصہ ۲	" "	1/30
۸	" " حصہ ۳	" "	1/40
۹	ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی زریاب	1/40

(ی)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	یادگار غالب	مولانا حالی	8/-
۲	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	3/50
۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	5/50

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) اطلاع — مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

رجسٹرڈ نمبر ایل۔ڈبلیو/ این۔پی۔ ۹۳
لائسنس نمبر: ۲۰۶۴/۱۷/۲۰/۸۸۸
دفتر فون: ۴۶۱۲۵
فون رہائش گاہ: ۴۴۴۵۶
ادارہ فروغ اردو ہند کا ترجمان

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY JAMIA NAGAR NEW DELHI

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ

ایڈیٹر: محمد حسین شمس علوی
قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند

مجلس ادارت:
عبدالقوی دریابادی (بی۔اے)
سعادت علی صدیقی (ایم۔اے)
محمد حسنین علوی (ایم۔اے)

جلد (۲۸) جنوری ۱۹۸۲ء شمارہ (۹)

ترتیب

مجلس ادارت

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی	صدر شعبۂ اردو	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی	ریڈر شعبۂ اردو	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی		لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر انوار الحسن		〃
پروفیسر حکم چند نیر		بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن		لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر فضل امام		راجستھان یونیورسٹی

زر سالانہ اعزازی: بیس روپے
عوام سے: پندرہ روپئے
فی پرچہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ
ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

ڈاکٹر [illegible] سندیلوی

اپنی باتیں

نیا سال شروع ہونے سے پہلے وزیر اعلیٰ اتر پردیش، اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا کر اردو دُنیا کو ایک نیا تحفہ مرحمت فرمائیں گے۔ یہ تحفہ کیا ہوگا؟ اس کی اہمیت و افادیت کیا ہوگی؟ یہ کہاں تک محبانِ اردو کی آرزوئں اور تمناؤں کو پورا کرے گا، اس تحفہ سے اردو دُنیا کس حد تک مطمئن و مستفید ہوسکے گی؟ اور اس سے ایک باشعور جمہوریت کو کتنا استحکام نصیب ہوگا؟ یہ تو تحفہ ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ ابھی تک (۲۷ دسمبر ۱۹۸۱ء) وزیر اعلیٰ بار بار یقین دلا چکے ہیں۔ کہ "مرد کی زبان ایک ہوتی ہے"۔ اور وہ ۱۹۸۱ء کے خاتمہ تک اردو کو دوسری سرکاری زبان ضرور بنا دیں گے۔ اردو دُنیا کو ان کے اس یقین دہانی پر پورا بھروسہ ہے۔ اسی لئے ہر گوشے سے، انفرادی اور اجتماعی طور پر انھیں مبارکباد دی جارہی ہے۔ (ہر طرف سے ایفائے) وعدہ کے لئے بار بار یاددہانی کرائی جارہی ہے۔ ہم یہ فرض نہیں بلکہ یقین کئے لیتے ہیں کہ وزیر اعلیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے، اور اردو کے سارے غصب شدہ حقوق، آئینی طور پر تسلیم کرلیں گے۔ اس کے بعد اردو دُنیا سخت آزمائش میں پڑجائے گی۔ اگر ان کے اندر اپنی زبان سے بے لوث محبت ہے۔ تو انھیں زبانی نہیں عملی طور پر اس کو ثابت کرنا ہوگا۔ اور تن من دھن سے کوشش کرنا ہوگی۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں قدم قدم پر اتنی رکاوٹیں، اتنی مشکلیں، اتنی خاردار جھاڑیاں ہیں، کہ پاؤں لہو لہان ہوجائیں گے کبھی کبھی لسانی تعصب کے خونخوار اژدہے، اور درندے زور شور سے حملے کرکے ہمتیں پست کرنے کی کوشش کریں گے۔ نوکرشاہی جس میں زیادہ تر مخالفین ہیں۔ اردو کو کسی حالت میں بھی قبول نہیں کریں گے۔ اس کے چلن میں رکاوٹیں ڈالیں گے "بیالیس"۔ چونتیس سال کی مدت میں اردو کو منظم اور مؤثر طریقے سے ان تمام حقوق سے محروم کردیا گیا، جو اس کو غیروں۔ یعنی انگریزوں کی حکومت میں حاصل تھے اس کا چلن سرکاری، نیم سرکاری محکموں اور اداروں میں عام تھا۔ اس کی تعلیم ہر سطح کے اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں عام تھی، کسی قسم

کوئی شرط یا پابندی نہیں تھی۔ اس پر سرکاری دروازے کھلے ہوئے تھے اور ہر محکمے ہر شعبے میں اردو جاننے والے موجود تھے۔ لیکن انہوں کی حکومت آئی اور اس نے سب سے پہلا کام، اس ریاست اُتر پردیش میں یہی کیا کہ اردو کو زندہ درگور کردیا۔ اس کے زندہ رہنے کے تمام وسائل و ذرائع ختم کردیئے۔ سرکاری محکموں میں اس کا استعمال ممنوع ہوگیا۔ درسگاہوں میں اس کی تعلیم بند کردی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو پڑھنے اور جاننے والے دن بدن کم ہوتے گئے۔ نئی نسل اردو بالکل نہیں جانتی ہے۔ اس میں سے بیشتر سرکاری فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اردو نہ جاننے کا عذر ہر محکمے میں ہر فرد کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سہولتیں جو سرکار نے وقتاً فوقتاً دی تھیں ان پر عملدرآمد نہیں ہوسکا کیونکہ اس نے اپنے عملے کے لئے اردو جاننا ضروری نہیں قرار دیا۔ دوسری سرکاری زبان ہے اگر یہ دشواریاں اور رکاوٹیں دور نہیں ہوتیں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے ان دشواریوں کو دور کرنے میں وقت لگے گا۔ اس کے لئے باقاعدہ پروگرام بناکر ہر ہر سطح پر اردو جاننے والوں کو مقرر کرنا ہوگا۔ اور جو لوگ کام کررہے ہیں انھیں پڑھنے لکھنے کے لئے آسانیاں فراہم کرنا ہوں گی اور ایک میعاد متعین کردینا ہے کہ اس کے اندر وہ اردو سے واقفیت حاصل کرلیں۔ اسی طرح اسکولوں میں ہر ٹیچر کو اردو جاننا ضروری ہے جب تک پرائمری سے لے کر انٹرمیڈیٹ تک ہر ٹیچر اتنی اردو نہیں جانے گا کہ وہ اپنا مضمون "ہندی اردو" دونوں زبانوں میں پڑھا سکے۔ اس وقت تک نہ تو اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہوسکتا ہے اور نہ ذریعہ تعلیم اردو کا۔ اس کے لئے اساتذہ کو موقع دیا جائے کہ وہ کم از کم ہائی اسکول کے معیار کی اردو پڑھ لیں اور ڈیپارٹمنٹ اس معیار کا امتحان لے لیا کرے۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم اور اس کے طریقہ تعلیم کا کوئی ٹیچر یا لکچرر نہیں ہے۔ یہ جو آئے دن اردو کے سلسلے میں پریشانیاں اور شکائتیں اور غلطیاں و کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسی جگہوں پر بھی اردو داں کا تقرر نہیں کیا جاتا۔ جن میں اردو کا جاننا لازمی ہے۔ مثلاً اس سال بیسک اور جونیر ہائی اسکولوں کے نصاب میں اردو سرے سے غائب کردی گئی۔ جبکہ آٹھویں درجہ تک ہر مضمون کی کتابیں قومیا لی گئی ہیں۔ اور محکمہ تعلیم کی طرف سے شائع کرائی جاتی ہیں اردو میں بھی سب مضمونوں کی کتابیں وہی شائع کراتا ہے۔ اردو کی کتابوں کا نصاب میں نہ رکھا جانا صرف اسی وجہ سے ہے کہ دوسرے مضامین کی طرح اس کے لئے کوئی اسسٹنٹ نہیں رکھا گیا۔ ہر مضمون کے لئے لیکچرر گریڈ کا اسسٹنٹ مقرر ہے وہ اپنے مضمون کا ذمہ دار ہے اردو کے لئے کوئی اسسٹنٹ نہ ہونے سے اتنی فاش غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ محکمہ تعلیم اردو کا اسسٹنٹ کیوں نہیں مقرر کرتا ہے؟ وہ اس کی ضرورت اور اہمیت کیوں نہیں سمجھتا ہے؟ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اگر اردو کی مخالفت اتنی شدت کے ساتھ نہ کی جاتی اور جمہوری قدروں اور عدل و انصاف کا ذرا بھی پاس کیا جاتا تو ممکن تھا کہ ایسی جگہوں پر بھی اردو والوں کا تقرر نہ کیا جاتا جہاں اردو کے بغیر کام خراب ہوجاتا ہے اور ذمہ دار اس کو اپنی بدنامی نہیں بلکہ نیک نامی سمجھتے ہیں۔

ایڈیٹر فروغ اُردو کو صدمہ:۔

انوار بک ڈپو اور ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کے مالک جناب محمد حسین شمس علوی کے بزرگوار الحاج محمد حسن علوی کاکوروی کا انتقال ۹۸ سال کی عمر میں ۱۲ ردسمبر ۱۹۸۱ء کراچی میں ہو گیا اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ مرحوم حسان الہند، کے پوتے محسن کاکوروی اور ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی کاکوروی کے بڑے بھائی تھے۔ علم و دین سے رغبت ورثے میں ملی تھی۔ شرافت و انسانیت کے پیکر، اور نہایت متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید خاص اور خلیفہ مجاز تھے۔ تقسیم ملک کے بعد، پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں کراچی میں کتابوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ پیرانہ سالی اور بیماری نے عرصہ سے بہت کمزور کر دیا تھا۔ آخر وقت موعود آپہونچا، اس نیک بندے نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ اپنے قارئین کرام کی خدمت میں سال نو کی مبارکباد پیش کرتا ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ادارۂ فروغ اُردو ہند لکھنؤ کی شائع کردہ کتب پر ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک خصوصی رعایت۔

جو حضرات ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کی ادبی اور تنقیدی کتب جو کہ کورس میں داخل نہیں ہیں پچاس روپیہ قیمت تک کی خریدیں گے اور درج ذیل کوپن اپنے آرڈر کے ہمراہ روانہ فرمائیں گے ان کو پچیس ۲۵ پیسہ فی روپیہ خصوصی کمیشن دیا جائے گا۔ لہٰذا یکم جنوری ۱۹۸۲ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک اس خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد از جلد مطلوبہ کتب کی فہرست اور کوپن اور اپنا صاف صاف پتہ لکھ کر ادارۂ فروغ اُردو ۳۲ امین آباد پارک لکھنؤ سے اس خصوصی رعائت کا فائدہ اٹھائیں۔

کوپن

نام ....

پتہ ....

قصبہ۔ شہر۔ ضلع ....

ظفر حبیب ۔ صدر شعبۂ اُردو
اے۔ پی۔ ایس۔ ایم کالج برونی ۔ متھلا یونیورسٹی سوس

غیر اُردو دانوں میں اُردو تعلیم کا مسئلہ

جد وجہد آزادی کی تاریخ کے اوراق پریشاں کو پیش نظر
رکھئے ۔ اس عہد کو یاد کیجئے ۔ جب ہندوستانیوں کی یہ تحریک کامیابی کے مراحل
سے گذرتی ہوئی ساحل مراد تک پہونچنے ہی والی تھی ۔ اور پھر آزادی کے بعد
کے حالات کا جائزہ لیجئے ۔ تو آپ کو اس نتیجے تک پہونچنے میں کوئی دشواری نہیں
محسوس ہوگی کہ اُردو برادری ہی وہ فراخدل وسیع النظر، جیالی اور جراُت مند
برادری تھی، جس نے اپنی زندہ فعال اور ہر دلعزیز زبان کے بالمقابل
نسبتاً فروتر اور کمزور تر زبان کو قومی حیثیت حاصل کر لینے میں کسی بھی طرح
اور کسی بھی سطح پر رخنہ اندازی نہیں کی ۔ یقیناً اسوقت کے سماجی حالات
خون آشام تھے ۔ ہندوستانی عوام راحت کی سانس لینا چاہتے تھے ۔ لیکن
اس سکون کی تمنائی کوئی ایک جماعت یا کوئی ایک فرقہ و طبقہ نہیں تھا ۔
بلکہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص اس غم میں گھلا جا رہا تھا ۔ اور گھل گھل
پورا قومی وجود آدھا ہوا جاتا تھا ۔ اس لئے یہ تسلیم کر لینا کہ اُردو والوں
کی یہ قبولیت اور رواداری، فراخدلی اور حب الوطنی کے بجائے کچھ
اور تھی ۔ ایک جیالی برادری پر سہل پسندی اور دون ہمتی کا الزام دھرنے
کے مترادف ہے ۔ بات صرف یہی تھی کہ اس زبان کے شیدائیوں کے مزاج
میں حب الوطنی، رواداری اور فراخدلی کوٹ کوٹ کر اس وقت بھی
بھری ہوئی تھی اور اب بھی ہے ۔

تصویر کا یہ ایک رُخ ہے اور اب آیئے دوسری طرف ۔ اپنے
گھروں سے نکل کر اپنے ہم وطنوں کا جائزہ لیجئے ۔ آپ کو لسانی عصبیت کا
ہیولیٰ کھڑا کر کے سیاست کی دوکان چمکانے والے انتہائی قلیل تعداد میں
نظر آئیں گے ۔ پڑھے لکھے عوام کی بھاری اکثریت اسوقت بھی اُردو سے محبت
کرنے والی ہے ۔ اور میں بلا جھجک یہ بھی کہونگا کہ اس میں نئی اور پرانی دونوں
نسلیں برابر کی شریک ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس زبان کی مخالفت میں
اگر کچھ لوگ ہیں تو وہ پرانے لوگ ہیں ۔ نیوں کو اس کی مخالفت سے کوئی
سروکار نہیں ۔ نئی نسل بڑے فخر سے اپنے روزمرہ میں اُردو زبان استعمال
کرتی ہے ۔ اُردو اشعار پر سر دھنتی ہے ۔ اُردو ماحول سے تعلق کو اپنے
لئے باعث افتخار سمجھتی ہے ۔ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ سب زبانی جمع
خرچ نہیں کھلی اور نری حقیقت ہے ۔ جو مبنی بر مشاہدہ ہے اور
مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں اپنے اس مشاہدہ میں یکا و تنہا نہیں ۔ آپ
حضرات کی کثیر تعداد بھی اس میں شریک ہے ۔ تصویر کے اس دوسرے

رخ کا جو سب سے قبیح اور کریہہ پہلو ہے وہ یہ ہے کہ ہم اُردو سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن ہم اُردو کی جڑ کاٹتے ہیں۔ اسکی آبیاری کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اپنی ناکارگی اور کاہلی کو غیروں کی عصبیت کا نام دیتے ہیں سیاسی مفاد کو اولیت دیتے ہیں۔ اور دیانتدارانہ خدمت سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہم ایک ایسی نسل کے مالک بن چکے ہیں۔ جو اُردو خوانوں کے گھرانوں میں پیدا ہونے کے باوجود اُردو مخالف کا مزاج رکھتی ہے۔ ابھی پچھلے برس (سنہ ۱۹۷۹ء میں) لکھنؤ میں منعقدہ ایک مسلم کانفرنس میں شرکت کے موقع پر مجھے ایک ایسے ہی جانکاہ اور دلدوز واقعہ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جس کا یہاں ذکر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہماری اُردو برادری کو خود احتسابی کا خیال پیدا ہو۔ کانفرنس کی کمیشن برائے لسانیات و ثقافت کا ذیلی اجلاس چل رہا تھا۔ تجویزیں سامنے آرہی تھیں۔ اور ان پر بحث و مباحثہ چل رہا تھا کہ ہماری سب سے بنیادی تجویز پر میرٹھ سے آئے ہوئے ایک ڈاکٹر اور ایک وکیل اور بریلی سے آئے ہوئے ایک سماجی کارکن نے زبردست صدائے احتجاج بلند کیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ اُردو کو دفتری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کی مانگ ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جبکہ اُردو نہ تو ہمیں روٹی دیتی ہے۔ اور نہ عزت۔ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ سارے کے سارے میاں صاحبزادے اُردو گھرانوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اگر میں یہ کہوں قصور اس نسل کے ان نوجوانوں کا نہیں تھا۔ مجرم تو ان کے وہ سرپرست حضرات ہیں جنہوں نے خالص ہوس دنیا میں اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم سے محروم رکھا اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی زبان کا گلا گھونٹنے کا گناہ کیا ہے۔

بلاشبہ ہماری اُردو برادری زندگی کے تمام میدانوں میں پچھلی صدیوں میں کمتر ہو گئی اور میرٹھ و بریلی جیسے مشہور رکھنے والے صوبوں کے لوگ آگے نکل گئے۔ لیکن ہم آج سر اُٹھا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی زبان کے قاتل نہیں۔

بہر حال پانی اب بھی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے۔ لوگ اُٹھیں اور بقدر گناہ اپنا اپنا کفارہ ادا کریں۔

کفارہ ادا کرنے کی اہم ترین صورت یہ ہے کہ اُردو والے یہ تہیہ کر کے اُٹھیں کہ جو ان کا قریب ترین ہمنشیں، اور حلقہ اثر کا اہم ترین فرد ہوگا۔ اگر وہ اُردو سے نابلد ہوگا۔ تو اسے اُردو پڑھنا اور لکھنا سکھائیں گے۔ ہم ایک بار پھر اس خوشخبری کو دہرا دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ اُردو کی بھرپور پذیرائی ہر جہار طرف ہوتی ہے۔ اور ہوگی بشرط مخلصانہ کوشش و کاوش کی جائے۔

اس سلسلے میں میں آپکے لئے غیر اُردو دانوں کو اُردو لکھنا اور پڑھنا سکھانے کا ایک نیا قاعدہ پیش کر رہا ہوں جس کے متعلق مجھے یہ گمان ہے کہ یہ ایجاد و اختراع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مشاہدہ سے انتہائی زود اثر کامیاب ثابت ہوا ہے۔

گستاخی معاف! اب آپ تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر اُردو داں کا طالبعلم بن جائیے۔ اور میرے طریقۂ کار پر توجہ دیجئے۔
سب سے پہلی بات تو یہ سن لیجئے کہ

نہیں کھیل ہے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

پہلا سبق ——— (۱) اُردو میں اکچھر کو حرف کہتے ہیں جس طرح اکچھر کا بہو وچن اکچھروں ہوتا ہے اسی طرح حرف کا بہو وچن حروف ہوتا ہے۔

۲۔ اُردو میں شبد کو لفظ کہتے ہیں۔ اور شبدوں کو الفاظ یا لفظوں۔

۳۔ ٹھیک اسی طرح واکیہ کو جملہ کہا جاتا ہے اور واکیوں کو

جملے یا جملوں ۔

دوسرا سبق :۔ (۱) اُردو میں تین طرح کے حروف ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے حروف ہوتے ہیں ۔ جن میں کوئی نقطہ یا کسی طرح کی دوسری نشانی نہیں ہوتی۔ ہے ایسے حروف کو ہم بے نقطہ حروف کہتے ہیں۔ اِن کی تعداد تیرہ ہے ۔

۲۔ کچھ حروف ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں ایک دو یا تین نقطہ دیا ہوا ہوتا ہے ۔ ایسے نقطہ والے حروف کو ہم منقوط حروف کہتے ہیں۔ اُن کی تعداد اُنیس ہے ۔

۳۔ اُردو کچھ ایسے حروف ہیں۔ جن میں نقطہ تو نہیں ہوتا البتہ کوئی دوسرا نشان ہوتا ہے جس سے اسے پہچان لیا جاتا ہے ان کی تعداد صرف پانچ ہے ۔ اور ان تینوں طرح کے حروف کی کُل تعداد ۳۷ ہے ۔ ان ۳۷ حروف کو ہم حروف مفرد کہتے ہیں۔

۴۔ ان حروف مفرد کے علاوہ کچھ حروف ایسے بھی ہیں جو دو حرفوں کے ملنے سے بنے ہیں ۔ ایسے ملے ہوئے حروف کو ہم حروف مرکب یا حروف مخلوط کہتے ہیں ان کی کُل تعداد پندرہ ہوتی ہے۔

تیسرا سبق :۔ یہاں سے بلیک بورڈ اور کھلی کا سہارا لیجئے خوب ٹھہر ٹھہر کر لکھیئے ۔ اور لڑکوں کو اس کی نقل اپنی کاپی پر اُتار لینے دیجئے ۔ اب انہیں بتائیے کہ تیرہ بے نقطہ حروف کون کون ہیں۔ اور کس طرح لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً بے نقطہ حروف ہیں ۔ ا ۔ ح ، د ، ر ، س ، ص ، ط ، ع ، ل ، م ، و ، ہ اور ھ ، لڑکے بہت آسانی سے ان حروف کو نقل بھی کر لیتے ہیں ۔ اور یاد بھی کر جاتے ہیں۔

چوتھا سبق :۔ جس طرح ہندی زبان میں آکار ، اِکار ، اوکار ، ہرسئی ، درگھی اور ہرسو ، درگو وغیرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اُردو میں دو حروف کو جوڑنے کے لئے کچھ نشانات مقرر کرلئے گئے ہیں۔ جنہیں ہم مد (ٓ) زبر (َ) زیر (ِ) پیش (ُ) جزم (ْ) تشدید (ّ) اور ہمزہ (ء) کہتے ہیں۔

پانچواں سبق :۔ (۱) اب حرف حروف بے نقطہ میں سے دو تین حروف لے لیجئے ۔ اور ان سے الفاظ بنائے جایئے ۔ اور بلیک بورڈ پر لکھتے جایئے ۔ ساتھ ہی ساتھ ہجے کرنے کا طریقہ بھی انہیں سکھاتے جایئے ۔ مثلاً رم ، رام ، ارم ، آرام ، راما ، مار ، مارا ، امر ، ماما ، اور امام وغیرہ ۔ اس طرح ا ، ر اور م سے جہاں تک الفاظ بنا سکیں بناتے چلے جائیں ۔ اور لڑکوں کو اس کے نقل کرنے کی ہدایت کرتے جائیں ۔ نفسیاتی طور پر اس پر یہ اثر ہوگا کہ اس نے صرف تین حروف کے سیکھ لینے کے بعد اُردو کے بہت سارے الفاظ لکھنا اور پڑھنا دونوں سیکھ لیا ہے ۔

۲۔ اِن تین حروف کے بعد کوئی ایک نیا حرف لے لیجئے ۔ مثلاً ح اور پھر الفاظ بنانا شروع کیجئے ۔ حرم ، رحم ، حرام محرم اور محرر وغیرہ ۔ الفاظ لکھانے کے ساتھ ساتھ اِن کے مفاہیم بھی بتاتے جایئے ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایئے کہ دیکھو ایک ہی حرف اپنی جگہ بدلنے پر اپنی شکل میں بھی تھوڑی سی تبدیلی لے آتا ہے اس کا اصل روپ ہر حال میں برقرار رہتا ہے ۔

۳۔ پھر ایک نیا حرف لے لیجئے ۔ مثلاً د اور الفاظ لکھاتے جایئے مثلاً ادا ، آدم ، دام ، مد ، دم ، دم دم ، دمادم مادام ، درم ، مرد ، مردم ، دوا ، ردا ، دار ، داد ، دادا در ، در در ، درد ، مادر ، اور حد وغیرہ ۔

۴ ۔ پھر ایک یا دو نیا حرف لے لیجئے ۔ اور الفاظ لکھایئے مثلاً ر اور و کو لے لیجئے اور الفاظ بنایئے —— در ، رد دور ، رود ، دار ، دارد ، دارو ، دادر ، دوا ، دوار دوارا ، حور ، روح ، حدود ، محدود ، روم اور مورد وغیرہ اس طرح صرف چھ حروف کی مدد سے آپ لڑکوں کو بیسیوں الفاظ

کے معنی اس کا لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھا دیں گے۔

۵ ۔ اِن چھ حروف کو قدم بہ قدم سکھانے کے بعد ایک ہی بار باقی چھ حروف کو اختیار کر لیجئے۔ اور الفاظ بنانا شروع کر دیجئے۔ مثلاً مر، سدا، سارا، سم، سما، ماس، داس، سور، روس، سحر، محسوس، احساس، حس، مر ما، اسر مر، سدا، دس، درس، ادارہ، اداس، امس، ساحر، حراس، حسد، آمد، سرحد، آمد، سردار، لا، لاد، آمادہ، لالا، الم، مال، ملا، مالا، دال، رال، سال، حال، حلال، دلال، ردمال، والد، دلدل، مولا، مولد، سالا، سلام، اسلام، سالار، دلاسا، رسول، مالامال، لادا، اسرار، اسہال، اسوار، آلام، آلو، آلود، آلس، آلودہ، اصرار، اصل، اصلاح، اصول، اطلاع، طالع، مطلع، لوط، راہ، ہار، رہا، ہرا، علم، معلم، عالم، آلہ، رعد، عدد، عدہ، عدل، طعام، عطا، عطر، آس، آسرا، آسودہ، اور آسام وغیرہ۔

لڑکوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے بیچ بیچ میں شعر ضرور سنائیے۔ کوشش کیجئے کہ وہ شعر رومانی ہو اور اسکی زبان ہلکی پھلکی ہو۔ ساتھ ساتھ آپ کے سکھائے ہوئے الفاظ میں سے کوئی نہ کوئی لفظ اس شعر میں ضرور موجود ہو ؂

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

(۲) کچھ ہم کہتے کچھ تم سنتے کچھ تم کہتے کچھ ہم سنتے
ہم اور کبھی تم اور کبھی پھر رام کہانی کیا کہیئے

(۳) کاتبِ وقت نے یہ مقدر لکھا کہ ہم ایک دوسرے کے نہیں بن سکے
دشتِ فرقت میں یونہی بھٹکتے پھر ہم کہاں تم کہاں تم کہاں ہم کہاں

اس سلسلے میں لڑکوں کو پہلے شعر کے معنی سمجھا دیجئے۔ اور پھر یہ بھی تاکید کیجئے کہ وہ آپکا سنایا ہوا شعر اپنی زبان میں تحریر کر لیں اور یاد بھی کرتے جائیں۔

دوچشمی ھ کے متعلق یہ بھی بتا دیجئے۔ کہ اس کا استعمال مرکب حروف میں ہوا کرتا ہے۔

بارہ غیر منقوط حروف سے تقریباً ایک سو الفاظ لکھنا اور پڑھنا سیکھ لینے کے بعد لڑکوں کے اندر اسقدر اولوالعزمی اور جواں ہمتی پیدا ہو جاتی ہے کہ بہتیرے لڑکے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ انہیں اُردو زبان آ چکی ہے ایسے موقع پر ضرورت ہمت افزائی کی ہوا کرتی ہے۔ اور دم دلاسے سے کام چلانا پڑتا ہے۔

چھٹا سبق ـــــ تیرہ غیر منقوط حروف لکھنا سکھانے کے بعد اب انہیں وہ پانچ حروف سکھا دیجئے جس میں کسی نہ کسی طرح کی نشانی موجود ہے۔ اور وہ حروف ہیں ٹ، ڈ، ڑ، ک اور گ

اِن حروف کو سکھانے کے بعد بھی کچھ الفاظ بنا دیجئے۔ مثلاً اکال۔ اکرم۔ اکرام۔ کرم۔ ادرک، ادراک، اداکار، آلہ کار، اکمل، اٹوٹ، آٹا، ٹوٹا، اٹک، اٹل، اٹلس، آڑ، آڑا، کواڑ، کواٹر، ٹڈی، ڈالڈہ، اڈہ، آڈٹ، اگر، مگر، گڑ، گڑا، گرم، گٹ، آگ، اگل، آگاہ، اگال، الگ، کاگ اور راگ وغیرہ۔

ساتواں سبق ـــــ غیر منقوط اور نشانی والے حروف سکھا دینے کے بعد آپ خود بہت ساری سہولتیں محسوس کرنے لگیں گے۔ اور لڑکوں کو جب ان سہولتوں کا خیال آئے گا تو اِن کی رفتار میں سُرعت پیدا ہو جائیگی۔ مثلاً اس وقت تک آپ لڑکوں کو ٹ لکھنا سکھا چکے ہوں گے۔ اور اسکی مختلف شکل بھی آپ انہیں سمجھا چکے ہوں گے۔ اب آپ صرف ٹ کی شکل کے چار حروف ب، پ، ت اور ث کو لے لیجئے۔ اور ان سے الفاظ بنانا شروع کر دیجئے ـــــ اب آب، ابا، آپا، ابد، ابر، آبدار، آباد، آبادکار، آبرو

پورے صبر و تحمل کے ساتھ صرف الفاظ سکھاتے جائیے۔ البتہ انکی دلچسپی برقرار رہے۔ اس کی خاطر خوبصورت اور دلنشیں اشعار اور چھوٹی چھوٹی ہلکی پھلکی نظمیں ضرور سناتے جائیے۔ یہاں تک کہ بے سے مفرد حروف کے ختم ہوتے ہوتے آپ دیکھیں گے کہ آپ کے لڑکے خود بخود لکھنے پڑھنے لگے ہیں۔ ہاں اسوقت تک انہیں مخلوط حروف نہیں جاننے کی وجہ سے دقت ہوگی۔ اگلے سبق میں انہیں ایک وقت تمام مخلوط حروف سکھا دیجئے۔ اور کچھ الفاظ بنا کر بتا دیجئے یعنی آپکا گیارہواں سبق ہے ـــــ مخلوط حروف اور ان سے بنے الفاظ کا ہوگا۔ ساتھ ساتھ اس گیارہویں سبق میں انہیں ایک سے دس تک کی گنتی بھی سکھا دیجئے۔ پھر گیارہ سے آگے وہ خود سیکھ لیں گے۔ مخلوط حروف کے الفاظ بنانے کے ساتھ ہی ترتیب کے ساتھ سو دو سو نئے الفاظ اور ان کے معنی لکھوا دیجئے مثلاً ـــــ باب، بابا، بات، باٹ، باٹنا، باپ، باتھ، باد، باس، باگ، بال، باہ، بد، بدھ، بڑبڑ، بڑھ، بڈھا، بغل، بطا، بل، بم، بتا، بٹا، بجا، بچا، بڑا، برّا، بسا، بقا، بلا، باجرا، بابل، باجہ، بادبان، بدام، بادشاہ، بادشاہت، بادشاہی، بادل، بادہ، بالات، باراں، بارش، باڑھ، بازار، بازو، بازی، باطل، باطن، باعث، باغ، بالا، بالائی، بالغ، بالک، بالم، بالو، بالی، بام، باوا، باورچی، باہر، بُت، بتن، بٹیا، بجٹ، بجلی، بچہ، بچی، بحث، بخار، بخت، بخشش، بخشش، بخیل، بدچلن، بدمزہ، بدکار، بدمست، بدنام، بدلہ، بدلی، بدن، بدھائی، برتر، برحق، برخلاف، برداشت، برخاست، برطرف، برعکس، برگشتہ، برمحل، برملا، برابر، برانچ، برت، برتن، برس، برسات، برسی، برش، برف، برق، برگ، برگد، برما، برہم، بڑھیا، بزرگ، بزم، بزدل، بستر، بسنت، بسواس، بسیرا، بشاش، بشر، بصر، بعد، بغداد، بغل، بقاد، بقال، بکرا، بکری، بگاڑ، بگلا، بگھی، بلا، بلایا، بلاد، بلب، بلغم، بلند، بلیڈ، بلیک، بناوٹ، بند، بندر، بندہ، بندگی، بندوق، بنڈل، بنگالہ، بنگالی، بوٹا، بوٹی، بوجھ، بورا، بورڈ، بوتل، بوڑھا، بوسہ، بول، بول بالا، بولی، بھاپ، بھار، بھاڑ، بھاگوان، بھاگ، بھگوان، بھال، بھالا، بھالو، بھانجہ، بھانجی۔ بھاوج، بھاؤ، بھرم، بھینس، بھوسا، بھکاری، بھکت، بھگت، بھگتان، بھلا، بھونپال، بھوکنا، بھید، بھیڑ، بھیس، بھیک، بے چین، بے حس، بے حیا، بے خطر، بے خواب، بے خود، بے داغ، بے راہ، بے رخ، بے رنگ، بے روزگار، بے زبان، بے زور، بے شک، بے طرح، بے صبر، بے طلب، بے عقل، بے عیب، بے غرض، بے فعل، بے قابو، بے قدر، بے قرار، بے قید۔ بے کار، بے کس، بے کل، بے لاگ، بے لاگ، بے لگام، بے مول، بے مزہ، بے نمک، بے وفا، بے وقت، بے وقوف، بے ہمت، بے صبر، بیابان، بیاج، بیان، بیاہ، بیج، بیچ، بیخ، بید، بیدار، بیر، بیراگ، بیراگی، بیراگن، بیگ، بیگار، بیگانہ، بیل، بیلا، بیلن، بیمار، بیوہ اور بیوی وغیرہ وغیرہ۔

ب سے بنے الفاظ لکھواتے ہوئے لڑکوں کو یہ ذہن نشین کراتے جائیے کہ نقطہ یا دوسری نشانی پر غور کرتے جائیں۔ اگر لفظ بار میں تین نقطہ لگا دیجئے گا تو پار ہو جائے گا۔ نیچے کے بجائے اوپر دو نقطہ دے دیجئے گا تو تار ہو جائے گا۔ اور نقطوں کے بجائے طا لکھ دیجئے گا تو ٹار ہو جائے گا۔ صرف اسقدر سمجھا دینے کے بعد ج سے بنے کچھ الفاظ لکھا دیجئے اور ج، ح اور خ کا فرق اور استعمال بتا دیجئے۔ اسی طرح د اور ذ، ر اور ز، س اور ش وغیرہ کے الفاظ سکھاتے چلے جائیے لیکن اس بات کو بھی مدنظر رکھیئے۔

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

ابو محمد شبلی، لکھنؤ

مانک ٹالہ صاحب کے مراسلے

(دوسری قسط)

"سمریاترا" کا شاخسانہ

میں نے منشی پریم چند کی جارحانہ فرقہ پرستی کو اپنا موضوع
بنایا تھا۔ لیکن دورانِ مطالعہ "سوزِ وطن" کی کہانی سامنے آئی تو
سے حوالہ کے ساتھ پڑھی لکھی دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک تہلکہ
مچ گیا اب بظاہر دو موضوع ہو گئے۔ ایک "فرقہ پرست پریم چند"
اور دوسرا "قومی ہیرو پریم چند" ڈاکٹر قمر رئیس لکھنؤ صاحب نے
فرقہ پرست پریم چند" کے دفاع میں کہانیوں اور ناولوں کو
نظرانداز کرتے ہوئے دوسرا محاذ کھولا اور پریم چند کے خطوط اور مضامین
کی رواداریوں سے انھیں سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور جناب
مانک ٹالہ نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود دوسروں کے سہارے سے
قومی ہیرو پریم چند" کا محاذ قائم کرنے کی سعیٔ نامشکور کی اور "سمریاترا"
کو موضوع اپنایا۔ اس لئے کہ جناب ہنس راج رہبر نے اپنی ۸۰۰ صفحے کی
کتاب "پریم چند" (پہلا ایڈیشن ۱۹۵۲ء) میں "سمریاترا" کے لئے
دو صفحے وقف کئے ہیں۔ مانک ٹالہ صاحب رہبر کے الفاظ کے طلسم میں
کھو گئے اور یقین کر لیا کہ یہ کتاب ضبط ہوئی تھی۔ میرا بیان ہے کہ

مانک ٹالہ صاحب "سوزِ وطن" کے سلسلے میں "بے ضابطہ" ضبطی کو
بھی ہضم نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے "باضابطہ" کی تلاش تھی۔ مگر پہلا ہی
پانسہ اُلٹا پڑا۔ اور ساری بساط اُلٹ گئی۔ اُنکی تفتیش کے جواب میں جناب
امرت رائے نے لکھا کہ "سمریاترا" ضبط نہیں ہوئی تھی۔ تو جناب
ہنس راج رہبر کی ساری رہبری دھری رہ گئی۔ اور بلا توقف ایک
مراسلہ داغ دیا کہ "سمریاترا ضبط نہیں ہوئی تھی" اور اپنی تحقیقی بصیرت
کی چھاپ مارنے کے لئے یہ لاف زنی بھی کر بیٹھے کہ

"ایک ایماندار محقق کا رویّہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب
کوئی سچی بات اُس کے علم میں آتی ہے تو اس کا اظہار کرنے
سے باز نہیں آتا چاہے اس سے کسی کا بت ٹوٹتا ہو یا سر
پھوٹتا ہو۔"

اور جب کسی ترقی پسند نے نشاندہی کی تو فوراً رجعت قہقری کا
مظاہرہ کیا اور لکھ دیا کہ "امرت رائے صاحب کی اطلاع غلط ہے
"سمریاترا" ضبط ہوئی تھی" اور ایک ایسا حوالہ پیش کر دیا جو میری

...تو نظر سے ہی نہیں، شاید اُن کی نگاہ سے بھی نہیں گزری ہوگی۔ بجائے اس کے کہ وہ امرت رائے سے دریافت کرتے ——— کہ بھائی پریم چند تمھارے والد تھے۔ تم سن شعور کو پہونچ چکے ہو گے۔ جب "سمر یاترا" شائع ہوئی تھی جسے انگریزی حکومت نے "باضابطہ" ضبط کیا تھا۔ پولیس نے تمھارے گھر پر باقاعدہ "چھاپا مارا تھا اور "سمر یاترا" کی ساری جلدیں لے گئی تھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی تحقیق کے مطابق تمھارے والد نے اس واقعہ پر اڈیٹوریل بھی لکھا تھا۔ اتنے اہم حادثہ سے تم بے خبر کیوں رہے؟ کیا تم نے صرف چٹھیوں اور کہانیوں کی بنیاد پر ہی پریم چند کی ضخیم سوانح لکھی تھی؟ کیا تمھاری نگاہ میں "ہنس اور جاگرن" کے شمارے اُنکی سوانح لکھنے کے لئے اہمیت کے حامل نہیں تھے؟ جن کے مطالعے کے بغیر ہی تم نے "قلم کا سپاہی" لکھ ڈالی ——— اپنی جھینپ مٹانے کے لئے امرت رائے کی تعریف کرنے لگے۔

"امرت رائے چاہتے تو کہہ سکتے تھے کہ "سمر یاترا" بھی ضبط ہوئی تھی۔ لیکن اُن کی ایمانداری کی داد دیجئے کہ چونکہ یہ اطلاع اُن کے علم میں نہیں تھی۔ انھوں نے فوراً اس کی تردید کر دی۔

بیچارے مانک ٹالہ صاحب میں تو یہی جرأت نہ تھی کہ وہ امرت رائے صاحب سے کم از کم یہی دریافت کر سکتے کہ "سمر یاترا" ضبط ہونے کی اطلاع انھیں کیوں نہیں ہوئی؟ میرا خیال ہے مانک ٹالہ صاحب جری تو ہیں مگر تحقیقی صلاحیت سے محروم ہیں۔ وہ فی الفور سے (INSTANT) قلمکار ہیں۔ سوچ اور فکر کے پھندے میں نہیں پھنستے۔ قلم اٹھایا اور لکھ مارا چاہے کسی کا امیج ٹوٹے یا پھوٹے انھیں صرف تیس مار خاں بننے کا شوق ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امرت رائے ——— پریم چند کے لائق فرزند ہی نہیں سوانح نگار بھی ہندی زبان وادب میں تقریباً ۸ کتابوں کے مصنف بھی ——— "جادو توڑ" کے چشم دید گواہ ہیں کہ "سمر یاترا" ضبط نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ صرف "سوز وطن" کی طرح کہانی گڑھ دی گئی تھی۔ وہاں صرف یہ جبلت کام کر رہی تھی کہ اُردو کا ایک مجموعہ "ضبط" ہوا تھا۔ تو ہندی کا بھی ایک مجموعہ "ضبط" ہونا چاہیئے۔ وہاں بھی کہانی لکھی گئی تھی۔ یہاں بھی کہانی پھیلائی گئی۔ اور یہ کام ایسا چپ چاپ ہو گیا کہ گھر کے لڑکے کو بھی خبر نہ ہوئی۔ اور اگر ہوئی تو اس نے اہمیت نہیں دی۔ کہ وہ اس ڈھونگ اور ڈھکوسلے کی حقیقت سے واقف تھا۔ اسی لئے "قلم کا سپاہی" میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ جبکہ "سوز وطن" کی کہانی کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کی پیدائش سے دس سال پہلے کا واقعہ تھا اور اس واقعہ کو لے کر اُردو اور ہندی زبان و ادب میں اتنے ڈھول تاسے بج چکے تھے کہ منشی جی کو بھی اس واقعہ کے سچ بن جانے کا یقین آگیا تھا۔ اور ۱۹۳۲ء میں اپنے "جیون سار" میں اس خود ساختہ کہانی کو حقیقت کے روپ میں پیش کر بیٹھے پھر اُن کے بیٹے کے غلط فہمی میں نہ پڑنے کی کوئی وجہ نہ تھی مگر "سمر یاترا" کا ڈھونگ امرت رائے کے سامنے رہ گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے اُسے مسترد کر دیا اور ۱۹۸۱ء میں بھی استفسار کے جواب میں صاف لکھ دیا کہ:

"جہاں تک مجھے علم ہے "سمر یاترا" نام کی کہانیوں کا مجموعہ کبھی ضبط نہیں ہوا۔

(مراسلہ مانک ٹالا مطبوعہ فروغ اُردو)

یہ ناممکن سی بات ہے کہ امرت رائے صاحب کی نگاہیں زمانۂ طالب علمی میں اپنے والد کے پرچوں (ہنس اور جاگرن) پر نہ پڑی ہوں۔ یا قلم کا سپاہی لکھتے وقت بھی انھوں نے ان پرچوں سے استفادہ کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ وہ منشی دیا نرائن نگم کے گرے ہوئے مکان کے کھنڈر میں پریم چند کے خطوط کو تلاش کر سکتے

ہیں۔ اور کامیابی سے نکال بھی لاتے ہیں۔ لیکن اپنے گھر میں رکھی ہوئی "ہنس" اور "جاگرن" کی فائلوں سے استفادہ نہیں کرتے۔ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اب اگر کوئی تاویل امرت رائے صاحب کی طرف سے بھی پیش کی گئی گو اس کی اُمید نہیں تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔ اس سارے ڈھونگ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ منشی پریم چند اپنی فرقہ پرستی پر پردہ ڈالنے کے لئے خود کو ایک قومی ہیرو بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے ضبطی کی کہانیاں انگریزوں کی مدد سے گڑھی تھیں۔

حسب تحریر مانک ٹالہ صاحب "پریم چند وشو کوش" میں "سمر یاترا" کی ضبطی کی جو اطلاع "جاگرن" کے صفحہ ۷ پر شائع ہوئی تھی اس کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر صاحب کے مضمون کا درج ذیل اقتباس پیش کرکے حسب عادت مجھ پر الزام عاید کر چکے ہیں۔

"پریم چند کے ہندی افسانوں کا ایک دوسرا مجموعہ "سمر یاترا" جب ۱۹۳۰ء میں باضابطہ طور پر ضبط کیا گیا تھا تو پولیس باقاعدہ طور پر اُن کے گھر پر چھاپہ مار کر ساری جلدیں لے گئی تھی۔ اس کا ذکر بھی پریم چند نے ایک اداریہ میں کیا ہے:"

تعجب کی بات ہے کہ جناب مانک ٹالہ اپنے زیرِ نظر مراسلہ (نومبر ۱۹۸۲ء) میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ شاید اس لئے کہ جو کیسٹ انھیں ترقی پسندوں کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ اس میں یہ بات درج نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے اُن کے ٹیپ ریکارڈ سے یہ انکشاف برآمد نہیں ہوا۔ جو اُن کے موجودہ موقف کی تائید میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ اور وہ اس سے استفادہ بھی کر چکے تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے اطلاع کسی ایڈیٹوریل کو کھا کر اپنا تحقیقی فرض انجام دیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اطلاع "باقاعدہ" اور "باضابطہ" ہی ہو اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اُسے اڈیٹوریل کا درجہ دے دیا ہو (واضح رہے ڈاکٹر صاحب نے "ہنس" یا "جاگرن" کا نام نہیں لکھا ہے)

جناب مانک ٹالہ میں ذرا بھی تحقیقی مادہ ہوتا تو وہ ان تاریخی تضادات پر بھی غور کرتے۔ اور تحقیق و تفتیش کرتے جبکہ ساری متضاد تاریخیں انھیں کے قلم سے دہرائی گئی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے مطابق "سمر یاترا" باضابطہ اور باقاعدہ "۱۹۳۰ء" میں ضبط ہوئی تھی۔

۲۔ ہنس راج رہبر کے سہارے مانک ٹالہ خود لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ ضبط ہوئی تھی ——— اور

۳۔ اب جناب مانک ٹالہ ہی "پریم چند وشو کوش" کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اس کتاب کی ضبطی کی اطلاع ہفتہ وار "جاگرن" کے ۲۷ مارچ ۱۹۳۴ء کے شمارہ میں چھپی تھی۔

ضبطی کیا ہوئی ایک مذاق ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ جناب مانک ٹالہ کی مزید معلومات اور غور و فکر کے لئے عرض ہے۔

۱۔ جناب مدن گوپال اپنی تازہ ترین تصنیف "امر کتھا کار پریم چند" مطبوعہ ۱۹۸۱ء ص ۱۱۰-۱۱۱ پر "سمر یاترا" کا سن اشاعت ۱۹۳۰ء لکھتے ہیں۔ وہ اسی سن میں ایک ہزار روپئے کی ضمانت طلبی کی بات تو کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ یہ ضمانت "ہنس" سے طلب کی گئی تھی یا سرسوتی پریس سے اور کس وجہ سے؟ صفحہ ۱۲۴ پر بھی بات صاف نہیں ہے۔ "سمر یاترا" کی ضبطی کے لئے "پرتی بند" اور "روک" دو معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ تاکہ وہ گرفت میں نہ آسکیں۔

۲۔ ہنس راج رہبر صاحب "قاتل" کہانی کے سلسلہ میں "ہنس" سے ضمانت طلبی کی تاریخ ۱۹۳۱ء بتاتے ہیں۔ (پریم چند ص ۲۱۴)

لیکن ابتک طے نہیں ہے کہ یہ منشی پریم چند کی کہانی ہے یا مشیو رانی دیوی کی۔

ملا۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب اپنی تازہ ترین تصنیف "پریم چند فکر و فن" مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۲۴۴ پر "قربانی۔ جیل۔ ہولی کا تحفہ۔ جلوس اور انتقام" جیسی کہانیوں کی "ہنس" میں اشاعت کے سلسلہ میں "سرسوتی پریس" سے ضمانت طلبی کی اطلاع دیتے ہیں جبکہ ڈاکٹر جعفر رضا صاحب :—

"قربانی" کی اشاعت ماہنامہ "سرسوتی" الہ آباد کے شمارہ مئی ۱۹۱۷ء میں "ہولی کا اپہار" (تحفہ) کی اشاعت ماہنامہ "مادھوری" لکھنؤ کے شمارہ اپریل ۱۹۳۰ء میں اور "انتقام" کی اشاعت ماہنامہ "زمانہ" کانپور کے شمارہ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں بتلاتے ہیں۔ باقی دو کہانیاں "جلوس" (مارچ ۱۹۳۰ء اور "جیل" نومبر ۱۹۳۰ء) "ہنس" میں چھپی تھیں۔

(پریم چند فن اور تعمیر فن پہلا اڈیشن صفحہ ۱۲۴-۱۱۱)

ملا۔ خود منشی پریم چند ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے خط میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔ "ہنس" کی ضمانت جمع کر رہا ہوں۔ ایک صورت نکل آئی ہے"۔ (پریم چند کے خطوط صفحہ ۲۴)

لیکن ۷ جون ۱۹۳۳ء تک وہ ضمانت جمع نہیں کر پائے تھے منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"ہنس کا خاص نمبر نکالنے کا ارادہ ہے لیکن ضمانت کا مسئلہ ہے اگر یہی ہنس کا اعادہ ہوگیا اور ہمارے ہاتھ پاؤں پھر بندھ جائیں گے دیکھئے چہ می شود" (پریم چند کے خطوط صفحہ ۲۳)

(یہ خط چٹھی پتری میں نہیں ہے۔ کیوں نہیں؟ جناب مانک ٹالہ بتائیں) •

ملا۔ منشی پریم چند کا "جیون سار" "ہنس" فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا جس میں "سوز وطن" کا افسانہ بھی ہے مگر "سمریا ترا" کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ "سمریا ترا" کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ تین باتیں بھی ذہن نشین رہنی چاہئیں۔

ملا۔ منشی جی ۱۷ دسمبر ۱۹۳۲ء کو جے نیندر کمار صاحب کو لکھتے ہیں

"سرسوتی پریس اور "جاگرن" سے ۲۰۰-۱۰۰-۲۰ کا "اس کا انت" نام کی کہانی کے دنڈ میں دو ہزار کی ضمانت مانگی بہت پریشان ہوا۔ بھاگا ہوا لکھنؤ پہونچا۔ وہاں چیف سکریٹری سے مل کر کہا۔ "آدمی بھیجا۔ اور اپنی لائلٹی (LOYALTY) کے پرمان دیئے۔ اب آشا ہے ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔

(پریم چند کے خطوط صفحہ ۲۴۷)

ملا۔ ڈاکٹر جعفر رضا صاحب کی اطلاع کے مطابق "سمریا ترا" نام کی کہانی "ہنس" اپریل ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی اور "سمریا ترا" کہانیوں کا مجموعہ بھی ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔ جناب مدن گوپال بھی اسکی تصدیق کرتے ہیں۔

ملا۔ اسی زمانہ میں سر میلکم ہیلی گورنر یو۔پی (۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۴ء) نے منشی پریم چند کو "رائے صاحب" کے خطاب کی پیش کش کی تھی۔

کیسی پرلطف بات ہے کہ ایک طرف کتاب ضبط ہو رہی تھی اور دوسری طرف گورنر یو۔پی منشی جی کو "رائے صاحب" کا خطاب پیش کر رہے تھے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر منشی دیا نرائن نگم سے مقابلہ نہ ہوتا اور حسد کی حد تک رشک و ریس نہ ہوتی تو وہ اسے قبول بھی کر لیتے۔ بقول جناب مدن گوپال "نگم ایک طرح سے اُنکے لئے ماڈل تھے" اور وہ "ماڈل" رائے بہادر تھے۔ "اتر دسوخ والے آدمی تھے" پھر منشی جی رائے صاحبی کیوں قبول کر لیتے؟ ■■

عافل انصاری سنسار پوری

چوگانِ ہستی ایک طبع زاد تصنیف

چوگانِ ہستی کے ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرائے جانے کے بارے میں پریم چند کے کئی خطوط ملتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی ایک ناول ہے جس میں اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی کا کچھ تصرف شامل ہے۔ اور جس کی وجہ سے چوگانِ ہستی کے آگے پیچھے ہمیشہ اُردو ناولوں کو وہ اپنے نامۂ اعمال میں درج کراتا جاتے تھے، ورنہ پریم چند کے بقیہ ناولوں میں سحر کی ساحری کو بالکل دخل نہیں۔ تحقیق کی رو سے اس ایک معاملہ کا اطلاق دوسرے پر نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ پریم چند نے چوگانِ ہستی کو بھی سحر سے ترجمہ کرایا تھا یا صرف ڈرافٹ کو فیئر کرایا۔ آخر اس ترجمہ کی نوعیت کیا تھی؟

چوگانِ ہستی کے بارے میں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ ناول اولاً اُردو میں لکھا گیا لیکن جب اس کا ہندی مسودہ پریم چند نے تیار کیا تو اس کے متن میں تخفیف و اضافہ کا عمل [illegible] رہا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ ہم جب کسی مضمون کا ڈرافٹ [illegible] ہیں تو بعض اوقات جملے کے جملے بدل جایا کرتے ہیں۔ ورنہ تو دو تین الفاظ کا تبدیل ہوجانا ایک معمولی بات ہے۔ تحریر کو حسین سے حسین تر بنانے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

چوگانِ ہستی سے رنگ بھوم بنی اور پھر رنگ بھوم سے دوبارہ چوگانِ ہستی نے جنم لیا۔ اس طرح چوگانِ ہستی کا اولین مسودہ اور رنگ بھوم کا مسودہ دونوں کے پریم چند کی طبع زاد تصنیف ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے یہ دونوں مسودے ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ [illegible] بالا دونوں مسودات اور چوگانِ ہستی کا دوسرا مسودہ یعنی مکمل تینوں مسودات کا موازنہ کیا جائے اور یہ پتہ لگایا جائے کہ چوگانِ ہستی اول اور رنگ بھوم میں کتنا فرق ہے۔ [illegible] رنگ بھوم اور چوگانِ ہستی ثانی میں کتنا فرق ہے؟ اسی طرح اقبال بہادر ورما سحر کا تصرف اتنا کیا جاسکتا ہے سحر نے اپنی [illegible] قلم سے جو بھی گلکاریاں کی ہیں۔ ان کی تفصیل سامنے آنے پر ہی ترجمہ کی اصل نوعیت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سحر نے پریم چند کے اسلوب کو کہاں تک متاثر

کیا اور اگر کچھ تبدیلیاں کی بھی ہیں تو وہ کس خاص نوعیت کی ہیں؟ ابھی تک ایسا سُراغ نہیں ملتا کہ کسی محقق نے اس امرِ خاص کی طرف توجہ کی ہو یا اتنی زحمت گوارا کی ہو۔ صرف خطوط کے اقتباسات پیش کر دینے سے ترجمہ ثابت کرنا تحقیق کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔

چوگانِ ہستی کو رنگ بھوم کا ترجمہ ماننے والے اپنے دعوٰی کے ثبوت میں پریم چند کے خطوط کو پیش کرتے ہیں، لیکن ان خطوط کا لفظی فائدہ اُٹھانے والے صرف لفظ "ترجمہ" کا فائدہ اُٹھانے تک اکتفا کرتے ہیں۔ ترجمہ کی نوعیت پر روشنی نہیں ڈالتے۔ کیونکہ اس سے موقف کے باطل ثابت ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ پریم چند ہی کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے چوگانِ ہستی کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ سحر نے رنگ بھوم کا اُردو ترجمہ نہیں کیا بلکہ ڈرافٹ صاف کیا۔ ڈرافٹ فیر کرنے کو پریم چند سے لے کر اب تک کے ادیب اسے ترجمہ ماننے کا سہو کرتے آ رہے ہیں۔

چوگانِ ہستی پریم چند کا سب سے ضخیم ناول ہے جو اُردو میں دو جلدوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ مکتوبات پریم چند کی روشنی میں رنگ بھوم کی ضخامت نوسو تینتیس صفحات پر مشتمل تھی۔ چوگانِ ہستی سے پہلے پریم چند کئی ناول لکھ چکے تھے اور ناول نگاری میں انھیں خاصی مہارت حاصل تھی۔ چوگانِ ہستی کا زمانہ تصنیف سنہ ۱۹۲۴ء ہے۔ ان دنوں پریم چند کی مصروفیات قدرے زیادہ تھیں۔ رنگ بھوم کی ضخامت اور مصروفیات کی شدت اسے دوبارہ صاف کرنے میں مانع ہوئی۔ اس لئے پریم چند نے سحر کا سہارا لیا۔ پریم چند کو خوشفہمی تھی کہ سحر ان کے دوست ہیں اس لئے سو، سوا سو روپئے کے عوض ڈرافٹ صاف کر دیں گے ساتھ ہی رنگ بھوم کے اندراجی حصص کا اضافہ ہوا ہے اسے بھی سحر اسی طرز میں چوگانِ ہستی میں شامل کر دیں گے۔ بقول ان کے سحر کے لئے ۳۔۴ گھنٹے روزانہ کام کرنے سے ۳۔۴ ماہ میں کام ختم کرنے کی اُمید تھی، سو انھوں نے بغیر شرائط طے کئے ہی رنگ بھوم سحر کو سونپ دی۔ نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ سحر نے رنگ بھوم کے صفحات پر آٹھ آنہ فی صفحہ کا مطالبہ کیا۔ اور اس کام کے لئے چار سو چھیاسٹھ روپیہ کا مطالبہ کیا پریم چند کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا وہ ڈیڑھ سو روپئے سے زیادہ دینے کو آمادہ نہ تھے۔ معاملہ برسوں اُلجھا رہا۔ اور بلا آخر دو سو روپے معاوضہ پر سحر کو بہ مشکل راضی کیا جا سکا۔

سنہ ۱۹۲۴ء کے ایک مکتوب میں پریم چند نے مکتوب کو لکھا تھا.....

"اُردو بازارِ قلم کی حالت دیکھ کر ۱۵۰ روپیہ برا معاوضہ نہیں ہے۔ اور یہ میں خوشی سے دینے کو تیار ہوں۔ ان کے زیادہ سے زیادہ ۳ یا ۴ گھنٹے روز کام کر کے ۱۵۰ ملتے ہیں تو کیا کم ہیں؟ مگر وہ نہ جانے کس خیال میں ہیں۔ اگر ۴۶۵ انھیں دوں تو مجھے کچھ نہ ملے گا۔

(پریم چند کے خطوط ص ۱۲۱)

۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے خط سے نگم کو دوبارہ اطلاع دی،

" حضرت سحر کو میں نے دو سو دینا طے کر لیا ہے اور وہ راضی بھی ہو گئے ہیں۔ (پریم چند کے خطوط ص ۲۲۹)

گویا اس طرح جیسے بھی ہوا پریم چند نے تقریباً پانچ آنے فی صفحہ کی اجرت پر سحر کو راضی کر لیا جو سحر کے مطالبہ سے بہت کم تھی۔ اور پریم چند کے خیال سے سوائی اُجرت تھی۔"

دیکھنا یہ ہوگا کہ ان دنوں ترجمہ کے لئے مترجم کتنا مطالبہ کرتے تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دس بیس مترجمین کی اُجرت کا پتہ لگا یا جائے۔ حالانکہ سرِ دست یہ کام دشوار گذار ہے۔ اس لئے ہم صرف پریم چند کے مطالبہ کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پریم چند صرف مصنف ہی نہ تھے بلکہ مترجم بھی تھے۔ "زلزلہ" انکا کیا ہوا ترجمہ ہے۔ جواہر لال نہرو کے خطوط "باپ کے خط بیٹی کے نام"

پریم چند کے تراجم ہیں۔ اِن کے علاوہ بھی ان کے دوسرے تراجم موجود
ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں سحر نے رنگ بھوم کو چوگانِ ہستی میں بدلا تھا اور آٹھ
آنہ فی صفحہ کا مطالبہ کیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں نگم نے پریم چند سے اُردو
تاریخ کا ترجمہ کرانا چاہا تو پریم چند نے شرائط ترجمہ اور معاوضہ
ترجمہ کے بارے میں نگم کو مطلع کیا: "اُردو کی تاریخ کے ترجمہ کے متعلق
کیا عرض کروں۔ اس میں آپ کا فیصلہ میرے فیصلے سے بہتر ہوگا۔ اگر زمانہ
کی تقطیع کے صفحات ہیں تو دو روپے فی صفحہ اُجرت کسی طرح زیادہ
نہیں۔ اس سے کم میں ترجمہ کرنا میرے حق میں نقصان کا باعث ہوگا۔ اگر
منظور فرمائیں تو میرے پاس مسودہ بھیج دیں (مکتوب بنام نگم۔
۱۷ر جولائی ۱۹۲۶ء : پریم چند کے خطوط ص ۱۷۵ ج)

غور کا مقام ہے کہ جو پریم چند سحر کو آٹھ آنہ فی صفحہ دینے پر راضی
نہ تھے وہ اپنے لئے دو روپئے فی صفحہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اس سے
کم اُجرت پر ترجمہ کے کام کو ہاتھ میں لینے سے منع کرتے ہیں۔ جہاں تک
"زمانہ" کی تقطیع کا سوال ہے "زمانہ" کی اشاعت کتابی سائز پر ہوتی
تھی اور رنگ بھوم یا چوگانِ ہستی کا سائز بھی تقریباً اسی کے مماثل ہے۔

دونوں تراجم میں مطالبۂ اُجرت کا یہ فرق ترجمہ کی نوعیت
کا مظہر ہے۔ سحر کا پانچ آنہ فی صفحہ پر راضی ہو جانا اور پریم چند کا
دو روپیہ سے کم پر راضی نہ ہونا اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ سحر نے
رنگ بھوم کا اُردو ترجمہ نہیں کیا بلکہ چوگانِ ہستی کے مسودہ اول کی نقل
کی اور جہاں اضافہ و تخفیف ہوئی تھی وہاں کے حصص کو تبدیلیٔ متن سے
مزین کیا۔ سحر کی اس کارگذاری کو پریم چند نے ترجمہ کا نام دیا جس کی تقلید
میں بعد کے ادیبوں نے اسے ترجمہ سمجھنے کی غلطی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ
چوگانِ ہستی پریم چند کی طبع زاد تصنیف ہے۔

حوالہ جات :

مدن گوپال: پریم چند کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
جون ۱۹۶۱ء

بسلسلہ مضمون صفحہ نمبر ۱۰ کا باقی (غیر اُردو دانوں میں..

کہ ابھی لڑکا نہ ہو پوری لغت لکھنے اور سکھانے کی نوبت آجائے۔ اسلئے اپنے
اندازہ کے مطابق ایک ہزار الفاظ سے زیادہ کسی بھی صورت میں نہ
سکھائیے۔ ورنہ یکسانیت اور بے دلی پیدا ہو جائے گی۔

ان گیارہ اسباق تک جو لڑکے آپکا ساتھ دینگے انکا اگلا
سبق رابطہ، ربط اور ... کا مطالعہ ہوگا۔ اب آپ کو صرف انہیں مفہوم
بتانے کی حاجت ہوگی۔ ایسے لوگوں کو بچوں کی طرح جملہ بنانا سکھانے
کی حاجت نہیں۔

اگر اس قاعدے کے تحت غیر اُردو دانوں کو اُردو سکھائی جائے تو
میرا دعویٰ ہے کہ لڑکے پندرہ گھنٹے میں اُردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائینگے۔
آپ انہیں شروع میں صرف پندرہ منٹ پڑھائیں۔ انہیں
وقت نوٹ کروا دیں اور زیادہ وقفہ یاد کر لینے کے لئے دیں۔
پانچویں سبق سے بیس منٹ کو بڑھا کر چالیس منٹ کر دیں لیکن
کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہ پڑھائیں۔ جس دن اور جس گھڑی اسکے
نوٹ کئے گئے منٹوں کی تعداد پندرہ گھنٹے ہوگی وہ لڑکا اُردو لکھنا اور
پڑھنا سیکھ چکا ہوگا۔ بشرطیکہ اس نے دیانتداری برتی ہو۔

یہ طریقہ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں بھی کامیاب طریقہ ثابت
ہو سکتا ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کام کو فرض
کی طرح لادا نہیں جائے۔ بلکہ اس طرح اس سے لطف اندوز ہوا
جائے۔ تب ہی یہ طریقہ معلم اور طالب علم دونوں کے لئے دلچسپی کے
سامان فراہم کرے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے نویں اجلاس منعقدہ مظفر پور بہار
بتاریخ ۱۴، ۱۵، ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء کی نشست میں پڑھنے کے لئے لکھا گیا۔

از: مانک ٹالہ

منشی پریم چند اور جارحانہ فرقہ پرستی

جناب ابو محمد شبلی صاحب کی پریم چند کے سلسلہ میں پہلی ہی تحریر پڑھ کر اُن کے ذہن کی ساخت، و پرداخت کے بارے میں جو تاثر پیدا ہوا تھا، اُس کے علاوہ ایک تاثر یہ بھی پیدا ہوا تھا کہ وہ حق... [illegible] ... حقیقت ہیں بلکہ حقیقت بھی ایسے کہ زیادہ تر ہوا ہی میں لاٹھی چلاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی سینہ زوری (...) کی داد بھی چاہتے ہیں۔

ورنہ وہ پریم چند کے پہلے دَور کے ناپختہ ذہن کی بے ضرر تحریروں کو پکڑ کر اپنا سارا زور قلم پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرنے پر صرف نہ کرتے۔ پریم چند کی یہ تحریریں انتہائی بے ضرر ہیں۔ اور ان میں مسلمان فرقہ یا اسلام کے خلاف کسی بھی طرح کا جارحانہ قسم کا منفی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ شبلی صاحب نے اکثر و بیشتر انکی تحریروں کو جان بوجھ کر پورے تناظر سے کاٹ کر پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرتے کرتے خود اپنی فرقہ پرستی کا چوراہے میں مظاہرہ فرما دیا ہے۔

شبلی صاحب کے تازہ ترین مضمون ("فروغ اردو" مئی جون ۱۹۸۱ء اور عظیم آباد ایکسپریس ۲۹ - ۲۲ مارچ ۱۹۸۱ء) میں بھی کوئی نئی بات پیش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ انھیں پرانی باتوں کو دُہرایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بہت سی فروعی اور غیر متعلق باتیں کر کے نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا وقت بھی برباد کیا ہے۔

بہر حال اس مضمون کے بارے میں میری معروضات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) شبلی صاحب نے ساری بحث کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میرے نزدیک "مسلمان فرقہ پرست ہو سکتے نہیں بلکہ ہوتے ہیں اور ہندو (فرقہ پرست) ہو ہی نہیں سکتے۔"

حالانکہ شبلی صاحب کی ساری تحریروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلم فرقہ کو سَو فیصد معصوم سمجھتے ہیں اور ملک کی ساری تباہی و بربادی کا ذمہ دار ان کے نزدیک ہندو فرقہ ہے اور تو اَور وہ پریم چند کی موت کے چالیس سال بعد کے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات کا ذمہ دار بھی پریم چند ہی کو ٹھہراتے ہیں کہ پریم چند نے سنہ ۱۹۱۲ء میں نگم صاحب کو "فرقہ پرستی" کے بارود" میں لپٹی ہوئی یہ چٹھی لکھی تھی کہ "..... اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد

نہیں رہا۔ اور اصلی کوشش فضول ہے۔" یا "مجھے یقین ہے کہ یکا ہندو پرچہ جو اچھا کاغذ اچھی چھپائی دے اس کے لئے گنجائش کافی ہے۔" یا" (نوبت رائے) نظر نے اپنے رسالہ کو بالکل اسلامی ڈھنگ سے چلانے کا بیڑا اٹھایا ہے" یا "اُردو نویسی سے کسی ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہوگا"

شبلی صاحب کا یہ جملہ بھی اُن کی اسی ذہنی اُپج کا آئینہ دار ہے "مسلمانوں کی جاں بازی اور سرفروشی نے مہاتما گاندھی کو بھی مجبور کیا تھا۔ کہ وہ خلافت کمیٹی کے صدر بن کر ہندوؤں میں جیل جانے کی ہمت پیدا کریں۔......" قربان جائیے اس استدلال کے یعنی خلافت کی تحریک سے پہلے ہندو بزدل اور حب الوطنی کے جذبات سے ناآشنا تھے۔

میرا موقف یہ ہے کہ سرفروشی اور حب الوطنی کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ اور نہ ہی فرقہ داریت اور تنگ نظری کسی فرقہ یا مذہب کی وراثت ہے۔ اور اس ملک میں فرقہ وارانہ .. فسادات کے ذمہ دار شبلی صاحب کی ذہنیت کے ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہیں۔

۲۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے سلسلے میں مولانا کے جنگ آزادی (یعنی 1857ء کی جنگ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا — مانک ٹالہ) میں براہِ راست شمولیت کی تردید میں مالک رام صاحب کا گریبان تو پکڑ لیا۔ اس سلسلے میں جناب مولانا امتیاز علی عرشی کے ارشادات کو کیوں گول کر گئے۔ مولانا عرشی ہی نے سب سے پہلے اس بحث کا آغاز کیا تھا۔ مالک رام صاحب نے تو عرشی صاحب کے مضمون کا آخری سرا پکڑ کر تحقیق اور دلائل کی روشنی میں عرشی صاحب کی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا تھا۔

اور پھر شبلی صاحب چلے ہیں اپنا مقابلہ کرنے مالک رام جیسے عالم فاضل محقق کے ساتھ۔ کیا شبلی صاحب کو اُن کے طرز تحریر اور اپنے اندازِ گفتگو میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

مالک رام صاحب نے مولانا فضل حق کے متعلق جو کچھ لکھا وہ اس لئے نہیں لکھا تھا کہ مولانا مسلمان تھے۔ بلکہ مالک رام صاحب نے اپنی تحقیق کی روشنی میں صرف اس قدر لکھا کہ مولانا عملی طور پر جنگ آزادی کی تحریک سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ اور کہ انہیں کالے پانی کی سزا کے پیش نظر غلط طور پر جنگ آزادی کا ہیرو قرار دیا گیا تھا۔

مالک رام صاحب نے ان کے علم و فضل اور اُن کی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کو کہیں بھی جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی انھیں فرقہ پرست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آپ تو پریم چند کی لاش پر نشتر لگا کر انھیں جمشید پور اور بھیونڈی، مرادآباد اور احمدآباد بلکہ ملک کے سارے اگلے پچھلے فسادات میں فرقہ داریت کا زہر پھیلانے کا ذمہ دار ٹھہرا کر تحقیق اور تنقید کا شہنشاہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔!

تحقیق ایک جاری و ساری عمل ہے۔ مولانا عرشی نے جہاں اپنی تحقیق کا سرا چھوڑا وہاں سے مالک رام صاحب نے پکڑ کر آگے بڑھایا۔ اور جہاں مالک رام صاحب نے اس کو خیرباد کہا۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے اسے اور آگے بڑھایا۔ اور مولانا کے ایک عربی قصیدے کا ترجمہ کر کے پیش کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ مولانا ذہنی طور محب الوطن تھے۔ اور انگریزوں سے نفرت کرتے تھے لیکن عملی طور پر وہ اس تحریک کے ساتھ نہیں تھے۔ تبھی اس قصیدے میں انہوں نے لکھا ہے "..... جب [illegible] نے دیکھا کہ دشمن کا مقابلہ کرنے والا نہیں۔ اور مقابلے کا سوال نہیں تو [illegible]......" اور اب وہ الفاظ بھی پڑھ لیجئے۔ [illegible] قصیدے میں بہادر شاہ ظفر کی تعریف و توصیف میں کہے —— "اب تمام لشکری ایک بزدل و کمزور شخص کے گرد جمع ہو گئے جس کا نام

بہادر شاہ تھا۔ اور دہلی پر قبضہ کر لیا ...."

مجاہدینِ آزادی کے تئیں مولانا کے کیا خیالات تھے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے ـــــ "انکے ارادے غیر مستقل، انداز غلط اور بے سود۔ نہ ان میں دین نہ ایمان۔ جو نظر آیا اسے لوٹ کھایا۔ ایک بڑا گروہ زناکاری میں لگ گیا۔ اور ہزاروں عورتوں کی عزت و ناموس پر ڈاکا ڈال کے اُن کو بدکار بنا دیا۔"

(سہو و سراغ۔ صفحہ نمبر 58)

مولانا فضل حق کے انہیں خیالات اور جذبات کا اظہار اگر پریم چند یا کسی دوسرے ہندو ادیب نے اپنے قلم سے کیا ہوتا تو ابو محمد شبلی صاحب کی ذہنی تربیت کے مجاہدین اُس پر ہندو جارحانہ فرقہ پرستی کا فتویٰ صادر فرما کر سر پر کفن باندھ کر اُس کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔

(۳) قبلہ شبلی صاحب کا پریم چند پر یہ الزام کہ "...... منشی پریم چند کا ذہن اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے صاف نہ تھا...... اگر یہ صحیح ہے کہ افسانہ نویس اپنے زمانہ اپنے ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔ تو منشی پریم چند کے وہ افسانے جن میں مسلم کردار کو جگہ دی گئی ہے یا اسلام کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ خود اُن کے کانٹے پر پورے نہیں اُترتے۔ اور اگر انھوں نے پوری ایمانداری اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ تو اُن کے یہ افسانے آزادیٔ ہند کی تاریخ کا دوسرا پہلو پیش کرتے ہیں......" بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ بلکہ شر انگیز بھی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث ایک الگ مضمون میں کروں گا۔ فی الحال صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ اگر انھوں نے کچھ کٹھ ملاؤں کے خلاف لکھا ہے۔ تو اس سے کہیں زیادہ ہونگے پنڈتوں لُچے، لفنگے، سادھوؤں، سنتوں اور مہنتوں کی مٹی پلید کی ہے اُنکا سب سے پہلا ناول "اسرار معابد" اسی قسم کے رنگے سیاروں اور ڈھونگی پنڈتوں اور مہنتوں کا بھانڈا پھوڑنے میں وقف ہوا ہے۔ اگر انھوں نے کہیں کچھ بدخود غلط قسم کے مسلمان کرداروں کو عریاں کیا ہے تو بہت زیادہ جگہوں پر بہت سے نیک دکار اور راہ بچے کردار کے مالک مسلمان کردار بھی پیش کئے ہیں۔ جن کے سامنے عقیدت سے سر جھک جاتا ہے۔

اگر پریم چند فرقہ دارانہ ذہنیت کا حامل ہوتا تو وہ شیخ سعدی کی سوانح حیات حضرت علی اور حضرت محمدؐ کی تعریف و توصیف میں لکھنے کے بجائے ہندوؤں کے پیغمبروں اور دوسرے اونچے کردار کے لوگوں ہی کے بارے میں سوچتا اور لکھتا۔ حضرت محمد کے بارے میں انھوں نے ہنس میں جو اداریہ سپردِ قلم کیا تھا اُس کا ترجمہ پھر کبھی علیحدہ سے پیش کیا جائے گا۔

منشی پریم چند نے اسلام کے خلاف ایک بھی لفظ نہیں کہا اسلام اور مسلمانوں کو ایک ہی خانے میں رکھ کر شبلی صاحب نے خود اپنی فسادی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

(۴) آگے چل کر شبلی صاحب فرماتے ہیں "زکی انور کو مارنے والے کون تھے" اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ زکی انور کو مارنے والے شبلی صاحب کی فسادی ذہنیت کے ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ کیا شبلی صاحب کو نہیں معلوم کہ فسادوں میں کئی ہندوؤں نے مسلمانوں کی حفاظت کی تھی۔ کیا فسادات میں ہندو نہیں مرے تھے؟ ان ہندوؤں کا نام اس لئے نہیں آیا۔ کہ وہ ذکی انور کی طرح مشہور نہ تھے۔ اور نہ ہی ادیب تھے؟ [illegible] یا جنیندر کمار کو فسادی مسلمان قتل کر ڈالتے تو کیا مجھے یہ کہنے کا حق تھا کہ سارے کے سارے مسلمان فرقہ پرست ہیں۔ کیونکہ انکے ذہنوں محمد علی جناح کی زہرناک تحریروں اور تقریروں کی چھاپ ابھی تک بہت گہری ہے۔

شبلی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے

نہیں بچتی۔ اگر ایسا ممکن ہو سکتا تو عیسائی فرقہ آزادی کے تیس بتیس سال کے اندر اندر ختم ہو چکا ہوتا۔ صدیاں سال سے تہذیبی تمدنی اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن پارسی طبقہ اب تک ہندو دھرم میں مدغم ہو چکا ہوتا۔ اور پھر حال ہی میں ہریجنوں کے اسلام قبول کرنے پر اشتعال کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات کیوں نہیں ہوئے؟ مسجدِ اقصیٰ میں آتش زنی کے واقعہ پر احمد آباد میں فرقہ وارانہ فسادات کا بارود کس نے پھیلایا۔ خانہ کعبہ کی بے حرمتی کیا ہندو فرقہ نے کی تھی؟ پھر حیدرآباد میں فسادات کی آگ کیوں لگی ......؟

فرقہ وارانہ فسادات میں ہندو فرقہ کو بالکل معصوم و بےگناہ نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ انسان جو چیونٹی کو چاول کھلاتا ہے۔ پیپل کو دیوتا اور گائے کو ماتا سمجھتا ہے۔ کنکر میں شنکر کا جلوہ دیکھتا ہے۔ وہ اگر مسلمان کے خون کا پیاسا ہے تو اس کے جواب کے لئے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگوں کو اپنے گریبان کے اندر جھانک لینے کی بھی ضرورت ہے۔

اب شبلی صاحب مجھ سے ایک سیدھا سوال کرتے ہیں کہ میں نے "ذکی انور۔ ایک ادیب۔ ایک انسان کا خون" ہونے پر کیا لکھا؟"——

حضور! نہ تو میں سیاسی رہنما ہوں اور نہ ادبی مجاہد۔ اس لئے نہ میں نے ذکی انور کا خون ہونے پر ہی کچھ لکھا اور نہ فرقہ وارانہ فسادات ہی کے بارے میں ہنگامہ آرائی کی —— اور مجھے اپنی ادبی حیثیت کے بارے میں بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ اور نہ ہی مجھے سر کے بل چل کر شہرت بٹورنے کا شوق ہے۔

اور قبلہ شبلی صاحب ذکی انور کی شہادت پر ابھی تک اس لئے تصویرِ غم بنے بیٹھے ہیں کہ "ذکی انور مسلمان تھا اور اسلام اسے وراثت میں ملا تھا" (واوین میں خط کشیدہ الفاظ شبلی صاحب کے ہیں کہیں غلط فہمی نہ ہو۔ میں یہاں ان کے پورے الفاظ نقل کرتا ہوں —— "جلوس کی قیادت کی۔ جلوس کو مسلمان محلہ سے نکال کر لے گئے تھے مگر پھر بھی مار ڈالے گئے کیونکہ وہ اس لئے کہ اسلام انہیں وراثت میں ملا تھا اور ان کا نام ذکی انور تھا ......")

مجھے ذکی انور کی موت کا غم اس لئے ہے کہ وہ نہ صرف ایک سچا اور روشن خیال مسلمان تھا۔ بلکہ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ اور مجھے اپنے غم کے اظہار کے لئے بیان جاری کرنے اور واویلا مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۵) شبلی صاحب نے جن افسانوں کا نام لے کر پریم چند کو فرقہ پرست ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن پر تفصیل کے ساتھ الگ سے بحث کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ شبلی صاحب کے ساریے کے سارے الزامات سو فیصدی جھوٹے اور شرارت آمیز ہیں۔ انھوں نے باقی جگہوں کی طرح یہاں بھی پریم چند کے افسانوں کی جزئیات کو پورے سیاق و سباق سے الگ کرکے پریم چند کی تحریروں کو انتہائی غلط اور گمراہ کن انداز میں پیش کیا ہے۔ خاص کر افسانہ "شدھی" کے نام کو پکڑ کر انھوں نے قارئین کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وہ جزئیات انھوں نے اس لئے (QUOTE) نہیں کیں کہ جن میں پریم چند نے ایک دیندار اور سچے مسلمان "ملا" کا کردار پیش کیا ہے۔ اُس کے کردار کو گول کر گئے لیکن ادھر اُدھر کی فروعی باتیں کرکے پریم چند کو مسلمان اور اسلام کا مخالف ظاہر کرنے کی نہایت نازیبا حرکت فرمائی ہے۔

شبلی صاحب پریم چند کو بالکل اسی طرح (ان کی افسانوں کو پورے تناظر سے کاٹ کر) فرقہ پرست ظاہر کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ جس طرح سکھ فرقہ پرست خواجہ احمد عباس کے افسانے "سردار جی" کی جزئیات پیش کرکے واویلا مچا رہے ہیں۔ اور جان کو

کر افسانے کے مجموعی تاثر کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

آگے چل کر شبلی صاحب فرماتے ہیں۔ "ڈاکٹر ٹی۔ این کھنہ نے پریم چند کے دفاع میں 'پریم چند اور فرقہ داریت' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے حوالے اُن کے ناولوں یا افسانوں سے نہیں بلکہ دوسری تحریروں سے دیئے گئے ہیں...."

خود شبلی صاحب اپنے جھوٹے موقف کی حمایت میں پریم چند کے افسانوں کے علاوہ اُن کی دوسری تحریروں بلکہ خطوط سے بھی حوالے دیتے ہیں۔ اور جب اُن کے موقف پر چوٹ پڑتی ہے تو فرماتے ہیں کہ ہم پریم چند کو افسانہ نویس اور ناول نگار کے طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور کہ جب وہ خطوط لکھے گئے تھے وہ قارئین کے روبرو نہیں تھے۔ ایسا استدلال پیش کرنے والے شخص کے ساتھ بحث کرنا اپنا وقت برباد کرنا ہے۔

شبلی صاحب ضرورت پڑے پر پریم چند کی تحریروں سے "ان دونوں فرقوں میں کشمکش اور شبہ اور نفرت کی جڑ ہیں" پکڑ کر "تاریخی وراثت" کو نظر انداز کر کے پریم چند کے الفاظ کو پکڑ کر انھیں فرقہ پرست ثابت کرتے ہیں لیکن کھنہ صاحب یا کوئی اور انکی ان ہی تحریروں کا حوالہ دیتا ہے تو فرماتے ہیں کہ انکے حوالے انکے ناولوں یا افسانوں سے نہیں بلکہ دوسری تحریروں سے دیئے گئے ہیں۔ قربان جایئے ایسے استدلال کے ـــ

مولانا محمد علی جوہر نے خود اس تاریخی ورثے کا اپنی تحریروں میں اعتراف کیا ہے۔ (ہماری زبان 22-15 مئی 1981ء میں عتیق جیلانی سالک صاحب نے اپنے مضمون 'مولانا محمد علی جوہر اور قومی یک جہتی' میں اس کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اس کی تفصیل میں اس لئے نہیں جانا چاہتا کہ یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ اس کی تفصیل "مورچہ" گیا کے ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں پیش کر چکا ہوں میرا یہ مضمون بھی "مورچہ" نے جولائی ۱۹۸۱ء میں چھپے ہوئے شبلی صاحب کے ایک اسی قبیل کے زہرناک مضمون کے جواب میں تھا)

خود شبلی صاحب نے پریم چند کے جس مضمون کا حوالہ دیا تھا۔ (قحط الرجال، ـــ زمانہ، فروری ۱۹۲۴ء) اُس میں پریم چند نے ہندوؤں کی فرقہ پرستی پر جس طرح لعنت و ملامت کے کوڑے برسائے ہیں۔ مختصراً پیش کرتا ہوں ـــ"...... اس قول کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہندو مہاشے اپنے دل میں شرمندہ ہوتے...... ہندو قوم کبھی اپنی سیاسی فراخدلی کے لئے مشہور نہیں رہی۔ اور اس موقع پر تو اس نے جتنی تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے اس سے مجبوراً اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ اس قوم کا سیاسی دیوالہ نکل گیا ہے۔ ...... ہم کہتے ہیں کہ اگر ہندوؤں میں ایک بھی کچلو۔ محمد علی یا شوکت علی ہوتا تو ہندو سنگھٹن اور شدھی کی اتنی گرم بازاری نہیں ہوتی۔ ...... ہندوؤں میں ایسی ہستیاں پیدا کرنے کے لئے ابھی صدیاں لگیں گی......"

پریم چند اس تاریخی ورثے کو پکڑ کر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو اُبھارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اُن ہندوؤں کی مذمت کی ہے جو اس تاریخی ورثے کو پکڑ کر ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔

شبلی صاحب اپنے اُس آئینہ میں اپنا چہرہ خود دیکھیں۔ جو آئینہ خود پریم چند کو دکھا رہے ہیں۔ اور پھر اپنے گریبان میں منھ ڈال کر سوچیں کہ فرقہ داریت کا بارود پھیلانے کی گھناؤنی، قابلِ نفرت اور مذموم حرکت کا مرتکب کون ہو رہا ہے؟ وہ خود یا پریم چند ـــ!

آگے چل کر شبلی صاحب فرماتے ہیں کہ "مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ فرقہ داریت کے خلاف ہماری تحریک نے لوگوں کو

مجبور کیا ہے کہ وہ پریم چند کو پڑھیں۔ اور پرکھیں۔۔۔۔۔ جو کام وگیان بھون نئی دہلی میں پریم چند کے نام پیسہ کمانے والوں سے نہ ہو سکا وہ شرپسند فرقہ پرستوں، نے انجام دیا ہے۔۔۔۔۔"

جی ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی تخریب سے بھی تعمیر کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور آپ نے بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ اور اگر میرے سرٹیفکیٹ کی کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے تو شبلی صاحب میرا یہ سرٹیفکیٹ اپنے گلے میں تعویز بنا کر ڈال لیں۔ شاید وہ اس حمل سے "پریم چند کی فرقہ واریت" کے فاسد اثرات سے محفوظ ہو جائیں اور اُنھیں زکی انور کی طرح کے انجام سے دو چار ہونا پڑے۔

(۱۱) آگے چل کر شبلی صاحب اس طرح گوہر افشانی کرتے ہیں۔

"آپ خود ہندو سہی لیکن آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں"

سے میرے موقف کی تائید مزید ہوتی ہے کہ پریم چند 'ہندوپانی' اور مسلم پانی طرح 'ہندو افسانے' اور 'مسلم افسانے' لکھا کرتے تھے۔ اس طرح ایک سیکولر ذہن کے حامل ادیب ہندوؤں اور مسلمانوں کو علمی اور ادبی سطح پر بھی علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو کوئی ہمیں بتائے کہ 'جج اکبر' کو 'مہا تیرتھ' میں تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ صرف نام ہی نہیں کردار بھی بدلے گئے کیا ہندوستان کے ہندو "جج اکبر" نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔۔"

شبلی صاحب نے امتیاز علی تاج کے نام پریم چند کے اس خط کا حوالہ دیکر (حالانکہ اپنی موقف کی حمایت کے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ اُس وقت جب یہ لکھے گئے وہ قارئین کے سامنے نہیں تھے ــــ مالک رام) پہلے بھی اکثر جگہوں پر واقعات کو اُلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسکا جواب دیا جا چکا ہے لیکن وہ ایک مرتبہ پھر پورے خط سے صرف یہی الفاظ نکال کر پھر سے ساری بات کو اُلجھانا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے انھوں نے لکھا تھا" امتیاز علی تاج نے انہیں

"زنجیر ہوس" پر ٹوکا تو انھیں آتمارام نہیں بھیجا گیا۔ اس لئے کہ وہ ہندو ہو گیا تھا۔ کہکشاں کے لائق نہیں تھا"

"زنجیر ہوس" پر امتیاز علی تاج نے پریم چند کو ٹوکا نہیں تھا۔ بلکہ وضاحت طلب کی تھی کہ کہیں افسانہ چھپنے پر شبلی صاحب کی ذہنیت کے مسلمان بھڑک نہ اٹھیں۔

پریم چند نے اپنی وضاحت میں یہ بتایا تھا کہ اس واقعے کے ذکر میں جو قاسم ہے اُس کا تعلق محمد قاسم فاتح سندھ سے بالکل نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی تواریخی واقعہ ہے"۔۔۔۔۔ اس میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ انسان ہوس کے ہاتھوں کتنا اندھا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہوس کس طرح تیزی سے بڑھتی جاتی ہے۔ اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔"

(پریم چند کے خطوط مرتبہ مدن گوپال ــــ صفحہ 72-71 +)

اس وضاحت کے بعد یہ کہانی کہکشاں (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء) کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اور پریم بتیسی نمبر ۲ میں موجود ہے۔

اب "آتمارام" کے 'ہندو' ہو جانے کی کہانی سنئے ــــ

پریم چند نے اس کے بارے میں جو خط امتیاز علی تاج کو لکھا اُسکا اقتباس درج ذیل ہے ــــ

"میں نے ان دنوں ایک قصہ لکھا ہے" آتمارام" وہ زمانہ میں بھیج رہا ہوں۔ وہ اُسقدر ہندو ہو گیا ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں۔ آپ خود ہندو سہی پر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں"

(ایضاً ــ صفحہ نمبر ۹۱)

قبلہ شبلی صاحب نے پریم بتیسی میں دو کہانیاں پڑھی ہیں۔ اور اُن میں انہیں کوئی ایسی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی جس پر وہ اُنگلی اُٹھا سکیں لیکن چونکہ انھیں تو پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرنا ہی ہے اس لئے کہانیوں کو لپیٹ گئے اور خطوط کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کر دیا۔

اب آتمارام کی مختصر ترین تلخیص پیش ہے۔ (تاکہ میرا یہ مضمون بہت طویل نہ ہو جائے)

"مہادیو سنار اپنے گاؤں میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ نہایت عسرت کی زندگی گذار رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک طوطا تھا۔ جسے لے کر صبح سویرے سیر کے لئے نکل جاتا تھا۔ سیر کے دوران مختصر وقفوں کے بعد وہ "ست گرو دت، شو دت داتا" کا ورد کرتا رہتا تھا۔ ایک دن شرارتی لڑکوں نے پنجرہ کھول کر طوطے کو آزاد کر دیا مہادیو پنجرہ لئے طوطے کے پیچھے مارا مارا پھرتا رہا۔ اور اسی طرح "ست گرو دت ... " کا اُچارن کرتا رہتا۔ آخر طوطا گاؤں کے باہر ایک پیڑ کی پھنگی پر جا بیٹھا۔ مہادیو بھی اُس درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اندھیرا ہو گیا لیکن طوطا ہاتھ نہ آیا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے رات بیت گئی۔ بھوکا پیاسا بیٹھا تھا کہ اُسے دُور کسی دوسرے درخت کے نیچے روشنی نظر آئی۔ چلم کی طلب اُسے وہاں تک لے گئی۔ وہاں چند چور چوری کا مال بانٹ رہے تھے۔ اُسے آتا دیکھ کر سب چور بھاگ کھڑے ہوئے۔ مہادیو پکارتا ہی رہ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ چور اپنی کمائی یعنی اشرفیوں کا ڈیگچہ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ وہ اشرفیوں سے لدا پھندا اپنے گھر پہنچا جہاں اس نے ست نرائن کی کتھا کروائی اور لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ میں زندگی بھر آپ لوگوں کے زیور بنانے میں بے ایمانی کرتا رہا اس لئے جس جس نے مجھ سے زیور بنوائے ہیں۔ اپنے اندازے کے مطابق اپنے نقصان سے کچھ زیادہ کی رقم طلب کر لیں۔ ہر کوئی اس کی ایمانداری پر عش عش کر اٹھا۔ اور کسی نے ایک بھی پیسہ طلب نہیں کیا لیکن لالچی پجاری نے پچاس روپئے طلب کر لئے جو اُس نے ادا کر دیئے۔ اس پر لوگوں کے دلوں میں پجاری کے لئے نفرت کے جذبات بھر گئے ۔۔۔ پچاس سال بیت گئے وہ کلسا ٹھاکر دوارے (مندر) کا کلسا بنا۔ وہاں ایک تالاب ہے جس میں کمل کھلے رہتے ہیں۔ اسی تالاب کی مچھلیاں کوئی نہیں پکڑتا۔ اس کے بارے میں کئی حکایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ قیمتی پتھر کا جڑا ہوا پنجرہ سورگ چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ابھی تک آدھی رات کو تالاب کے کنارے سے آواز آتی ہے ۔۔۔ ست گرو دت۔ شو دت داتا۔ رام چرن میں چت لگا ۔۔۔ مہادیو ہمالیہ چلا گیا اور اُس کا نام آتمارام مشہور ہو گیا۔"

یہ تھی وہ ہندوانہ کہانی جس کا پلو پکڑ کر شبلی صاحب پریم چند پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں۔ اور "ہندو پانی" اور "مسلم پانی" کی گردان فرما کر پریم چند کی گردن پکڑ رہے ہیں۔

پچپن فیصدی مسلم آبادی کے پنجاب میں "کہکشاں" (لاہور) میں اگر یہ افسانہ شائع ہوتا تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ "کہکشاں" کے قارئین جن کی اکثریت یقیناً مسلمانوں کی تھی۔ غیر شناسا ماحول وغیرہ کے باعث شائد یہ افسانہ اُن کی پسند کے معیار پر پورا نہ اُترتا۔ یا وہ اس افسانے کو اس قدر APPRECIATE نہ کر سکتے۔ جو "زمانہ" کے ہندو اکثریت کے قارئین پسند کر کے اُس کا مزہ لے سکتے۔ اس سلسلے میں پریم چند کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن اس میں بھی شبلی صاحب کو پریم چند میں فرقہ پرستی کی بو آ گئی۔ اسے کہتے ہیں۔ "ماروں گھٹنا اور پھوڑوں آنکھ"۔ دوسرے کی آنکھ پھوٹے نہ پھوٹے قبلہ شبلی صاحب نے تو اپنا گھٹنا چلا دیا۔ اور یہ نہ سوچا کہ اس عمل میں اُن کے گھٹنے کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔

بالکل یہی پریم چند کی کہانی "جج اکبر" کا حال ہے۔ ہندی کے ہندو اکثریت کے قارئین کو شناسا ماحول دینے کی خاطر اگر انھوں نے کرداروں کے نام بدل کر اُس کا نام مہاتیرتھ رکھ دیا تو اس پر بھی شبلی صاحب کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ ہندی کے قارئین جج کا مطلب تو سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن "جج اکبر" کے نہ ہی معنی سمجھتے ہیں اور نہ ہی پورے تناظر میں اس کو APPRECIATE کر سکتے ہیں۔

شبلی صاحب اس تسلسل میں آگے فرماتے ہیں: "..... مصرع
منشی جی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوئی کی دیوار کھڑی کر رہے
رہے تھے۔ اور دوسری طرف علامہ اقبال جنہیں اس بحث میں گھسیٹنے کی
دھمکی دی جارہی ہے، گا رہے تھے:۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
(بانگ درا ۔ نیا شوالہ)

پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے کسی نے
بھی اس بحث میں علامہ اقبال کو نہیں گھسیٹا۔ کم از کم میں نے ساری
بحث میں علامہ اقبال کا اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ خود ہی
انہیں اس بحث میں گھسیٹ کر اپنی ذہنیت کے لوگوں کی ہمدردیاں
حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس بحث میں علامہ اقبال کو گھسیٹنے کی کسی نے
دھمکی بھی نہیں دی۔ بلکہ شبلی صاحب کے اپنے من کا چور خود ہی بول رہا
ہے کہ انھوں نے "نیا شوالہ" کا حوالہ بانگِ درا سے دے دیا ہے کہیں
کوئی ایسی بانگِ درا سے شکوہ اور جوابِ شکوہ کا حوالہ دینے کی
جسارت نہ کر بیٹھے۔ اب شبلی صاحب نے علامہ اقبال کو اس بحث
میں گھسیٹ ہی لیا ہے تو مجھے بھی کچھ عرض کرنے کا حق حاصل ہے۔
ہر کوئی جانتا ہے کہ "ہمالہ" "ترانۂ ہندی" "ہندوستانی
بچوں کا گیت" "نیا شوالہ" وغیرہ نظمیں اُن کے پہلے دَور کی
یادگار ہیں۔ دوسرے اور آخری دَور میں "ترانۂ ملی" اور "شکوہ"
"جوابِ شکوہ" اسی قسم کی تخلیقات ہیں۔ نقشِ دوئی مٹانے کے بعد علامہ
شکوہ میں فرماتے ہیں:۔

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا ۔
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی سی تھی بنائی کس نے ...
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟
کس کی شمشیر جہاں گیر جہاں دار ہوئی؟
کس کی تکبیر سے دُنیا تیری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
مُنہ کے بل گر کے ھُوَ اللّٰہُ اَحَد کہتے تھے
مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
عجمی خُم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

اس کے بعد علامہ اقبال اللہ میاں کے مُنہ سے شکوہ جواب میں یہ
کہلواتے ہیں:۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرما جائیں یہود

منشی پریم چند نے جس تاریخی ورثے کی طرف اشارہ کرکے ہندو
فرقہ پرستوں کو للکارا ہے، مولانا محمد علی جوہر نے ندامت سے اس کا
اعتراف کیا ہے۔ لیکن علامہ اقبال نے اس تاریخی ورثے کا نہایت
فخر سے اقرار۔ اور اعتراف کیا ہے۔ اس کے باوجود پریم چند ...

"جارحانہ فرقہ پرستی کا حامل ہے" جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے!

اب ابن بطوطہ کا سفر نامہ (تلخیص و ترجمہ بمعہ حواشی۔ سلامت علی مہدی — محراب ڈائجسٹ کتاب نمبر صفحہ 225-258،
سن اور مہینہ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ پہلے چار صفحے پھٹے ہوئے ہیں۔ اور آخری سرورق پر سن اور مہینہ درج نہیں ہے۔ غالباً ستر ویں دہے کے ابتدائی سالوں میں شائع ہوا تھا — مانک ٹالہ) سے کچھ
• اقتباسات پیشِ خدمت کرتا ہوں۔ صفحہ نمبر 246 پر لکھا ہے۔

فصل (۱۲) جامع مسجد دلوہے کی لاٹ و مینار | شہر کی جامع مسجد بڑی وسیع ہے (حاشیہ میں اس کی وضاحت فرماتے ہوئے سلامت علی مہدی صاحب نے لکھا ہے: اس مسجد کا نام مسجد قوتِ اسلام تھا۔ پہلے اس جگہ پر پرتھوی راج کا مندر رہتا۔
سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی فتح کرنے کے بعد اپنے غلام اور سپہ سالار قطب الدین ایبک کی معرفت اس مسجد کی بنیاد رکھوائی۔ پہلے یہ مسجد صرف پانچ در کی تھی لیکن بعد میں ان کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ مسجد کی بڑی محراب کی بلندی 53 فٹ ہے۔ ایک زمانہ میں اس مسجد کے داخلی دروازے کے قریب راجہ بکرماجیت کا بُت پڑا رہتا تھا۔ جو التمش اجین کی فتح کے بعد مہاکال مندر سے اٹھا لایا تھا)
اس کی دیواریں اور چھتیں اور فرش ہر ایک چیز تراشی ہوئی سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ جس کو سیسہ لگا کر جوڑ لگایا گیا ہے۔ اور لکڑی کا اس میں نام نہیں۔ اس مسجد میں تیرہ گنبد ہیں۔ جو پتھر کے ہیں اور منبر بھی پتھر کا ہے۔ چار صحن ہیں۔ اور اس کے وسط میں ایک لاٹ ہے۔ (یہاں بھی مہدی صاحب نے حاشیے میں یوں فرمایا ہے۔ ایک مشہور انگریز محقق جنرل کننگھم کی تحقیق کے بموجب یہ لاٹ خالص لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ مشہور یہ ہے۔ کہ یہ لاٹ سات دھاتوں کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک اس پر زنگ نہیں آیا۔ ایک روایت کے بموجب یہ راجہ دھاؤ نے بنوائی تھی۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہ راجہ اننگ پال نے ایک برہمن کے کہنے پر بنوائی تھی — اس لاٹ کے بارے میں ایک کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ ایک ناگ کے پھن پر ٹھونکی گئی تھی۔ تاکہ دنیا تمام آفات سے محفوظ رہے۔) یہ معلوم نہیں کس دھات کی بنی ہوئی ہے۔ کسی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ ہفت جوش یعنی سات دھاتوں کو جوش دیکر اُن سے یہ لاٹ بنائی گئی ہے۔ کسی نے اس لاٹ میں سے اُنگل بھر ٹکڑا تراشا ہے۔ وہ جگہ نہایت چکنی ہے۔ لوہا اس پر اثر نہیں کرتا۔ اس کا طول تیس ہاتھ کا ہے۔ جو میں نے اپنی پگڑی سے ناپا تھا۔ مسجد کے مشرقی دروازے کے باہر تانبے کے دو بڑے بُت پتھر سے جڑے ہوئے پڑے ہیں۔ مسجد میں آنے جانے والے اُن پر پاؤں رکھ کر جاتے ہیں۔ اس مسجد کی جگہ پہلے بُت خانہ تھا۔ جب دہلی فتح ہوئی تو بُت خانہ کی جگہ یہ مسجد تیار کی گئی۔"

مندرجہ بالا تحریر اُدک یا مدھوک کی نہیں ہے۔ بلکہ ابن بطوطہ کی ہے۔ اور سلامت علی مہدی نے اپنے حواشی میں اسی کی تصدیق و توثیق کی ہے۔

مذہب کے بارے میں اسلام میں جبر و کراہ کی ممانعت ہے۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی بھی سخت ممانعت ہے پھر قرآن شریف۔ حضرت محمدؐ اور اسلام کی تعلیمات پر سترہ بار نہیں بلکہ سترہ سو بار پچھلی پندرہ صدیوں میں کس نے حملے کئے؟

اور اگر پریم چند تاریخ نہ ورثے میں ملی ہوئی ان باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (لیکن اس نشاندہی کے بعد وہ ان باتوں کو پکڑ کر نفرت اور کدورت پھیلانے والے ہندوؤں پر لعنت کے کوڑے برساتے ہیں) تو پریم چند قابلِ گردن زدنی قرار دیئے جاتے ہیں۔

منشی پریم چند پر آریہ سماجی ہونے کا الزام لگا کر انھیں

فرقہ پرست گرداننا بھی شبلی صاحب کی کج بحثی اور کج دماغی کی ایک ادنیٰ علامت ہے۔ اگر آپ شیعہ مسلمان / سُنی مسلمان / وہابی مسلمان ہو سکتے ہیں تو پریم چند آریہ سماجی کیوں نہیں ہو سکتے؟ لیکن شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آج تک آریہ سماجیوں یا سناتن دھرمیوں نے ایک دوسرے کا خون نہیں بہایا۔ نہ ہی ایک دوسرے کی املاک نذرِ آتش کی لیکن محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑے کر دینے کے باوجود علامہ اقبال شیعہ اور سنی مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خون بہانے اور ایک دوسرے کی املاک نذرِ آتش کرنے سے باز نہ رکھ سکے کیا اس کے لئے بھی پریم چند ہی نے نفرت کا بارود پھیلایا تھا؟

شبلی صاحب نے فراق جیسے غیر متوازن ذہن کے مالک شخص کے ان الفاظ کو اچھال کر بھی اپنی ذہنی کج روی کی مثال پیش کی ہے۔ اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں کہ "پریم چند دسویں درجے کے افسانہ نویس تھے" میں نے فراق صاحب کو غیر متوازن ذہن کا مالک اس لئے کہا ہے کہ وہ اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ پریم چند کو ایک عظیم افسانہ نویس کہہ چکے ہیں۔ اور تو اور انڈین ایکسپریس (انگریزی) میں اُردو کی حمایت میں دھواں دھار سلسلہ مضامین کی ٹانگ یہاں توڑی تھی کہ اُردو کو ہندی لپی اختیار کر لینی چاہیئے۔ اور آخر میں یہ فرمایا کہ ہندی رسم الخط ایسا ہے جیسے صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں گوبر پڑا ہو ——

شبلی صاحب نے اپنے مضمون میں مجھ پر ذاتیات پر بھی اُتر آنے کا الزام لگایا ہے (".... میں اس بحث کو فرقہ واریت کی حد تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، یہی گندگی کیا کم متعفن ہے کہ میں ذاتیات کی غلاظت میں پھنس کر وقت برباد کروں۔")

اگر شبلی صاحب پریم چند کو حال اور ماضی کے سارے فسادات میں نفرت کا بارود پھیلانے کا الزام دے کر انہیں اور اُن جیسوں کو آئینہ دکھلانے کے درپے ہیں۔ تو کیا مجھے یہ حق نہیں پہونچتا کہ میں شبلی صاحب کو اُن کی اپنی تحریروں کی نشاندہی کر کے یہی آئینہ خود اُن کے سامنے رکھوں؟ فرقہ پرستی کا پیمانہ کیا پریم چند کے لئے الگ ہے اور شبلی صاحب کے لئے الگ؟

شبلی صاحب نے پریم چند کو اُردو کا غدار اس لئے کہا ہے کہ پریم چند نے اپنے ایک خط میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے کی ایک انتہائی نازیبا اور ناشائستہ حرکت کی تھی۔ وہ الفاظ یہ ہیں "..... کسی ہندو کو اُردو سے کیا ملا ہے جو مجھے مل جائے گا ......"

اس سلسلہ میں میں اوپندر ناتھ اشک اور گوپال متل صاحب کے خیالات پیش کر چکا ہوں اب انشا اور حالی کے خیالات بھی پڑھ لیجئے —— انشا صاحب نے دریائے لطافت میں لکھا ہے "محاورہ اُردو عبارت از گویائی اہلِ اسلام است" —— اور حالی صاحب فرماتے ہیں۔ (فرہنگِ آصفیہ پر ریویو فرماتے ہوئے) —— "ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو۔ کیونکہ خود دلی میں فصیح اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشل حالت اُردوئے معلیٰ کو اُن کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی (بحوالہ شاعر شمارہ ۶۔۵ بابت ۱۹۸۱ء صفحہ 33۔ ڈاکٹر گیان چند کے ساتھ ڈاکٹر سید مجاور حسین اور ڈاکٹر مغنی تبسم کا انٹرویو)

اب اُردو ہی کے سلسلہ میں جگن ناتھ آزاد کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں سے آزاد صاحب کے مضمون تاجور نجیب آبادی کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں ——

"..... ہاں ایک بات کی طرف ضرور اشارہ کرنا چاہوں گا۔ اور وہ یہ کہ مولانا کے ہندو شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ پنجاب میں بلکہ سارے ہندوستان میں اُردو کی ترویج

"جارحانہ فرقہ پرستی کا حامل ہے" جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے!

اب ابن بطوطہ کا سفر نامہ (تلخیص و ترجمہ بمعہ حواشی۔ سلامت علی مہدی ـــ محراب ڈائجسٹ کتاب نمبر صفحہ 225-259) سن اور مہینہ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ پہلے چار صفحے پھٹے ہوئے ہیں۔ اور آخری سر ورق پر سن اور مہینہ درج نہیں ہے۔ غالباً ستر دہائی کے ابتدائی سالوں میں شائع ہوا تھا ـــ مانک ٹالہ) سے کچھ

• اقتباسات پیشِ خدمت کرتا ہوں۔ صفحہ نمبر 246 پر لکھا ہے۔

فصل (۱۲) جامع مسجد دلوہے کی لاٹ و مینار شہر کی جامع مسجد[1] بڑی وسیع ہے (حاشیہ میں اس کی وضاحت فرماتے ہوئے سلامت علی مہدی صاحب نے لکھا ہے ـــ اس مسجد کا نام مسجد قوتِ اسلام تھا۔ پہلے اس جگہ پر پرتھوی راج کا مندر تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی فتح کرنے کے بعد اپنے غلام اور سپہ سالار قطب الدین ایبک کی معرفت اس مسجد کی بنیاد رکھوائی۔ پہلے یہ مسجد صرف پانچ در کی تھی لیکن بعد میں ان کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ مسجد کی بڑی محراب کی بلندی 53 فٹ ہے۔ ایک زمانہ میں اس مسجد کے داخلی دروازے کے قریب راجہ بکرماجیت کا بُت پڑا رہتا تھا۔ جو التمش اجین کی فتح کے بعد مہاکال مندر سے اٹھا لایا تھا) اس کی دیواریں اور چھتیں اور فرش سب ایک جیسے تراشے ہوئے سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ جس کو سیسہ لگا کر جوڑ لگایا گیا ہے۔ اور لکڑی کا اس میں نام نہیں۔ اس مسجد میں تیرہ گنبد ہیں۔ جو پتھر کے ہیں اور منبر بھی پتھر کا ہے۔ چار صحن ہیں۔ اور اس کے وسط میں ایک لاٹ ہے۔[2] (یہاں بھی مہدی صاحب نے حاشیے میں یوں فرمایا ہے۔ ایک مشہور انگریز محقق جنرل کننگھم کی تحقیق کے بموجب یہ لاٹ خالص لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ مشہور یہ ہے۔ کہ یہ لاٹ سات دھاتوں کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک اس پر زنگ نہیں آیا۔ ایک روایت کے بموجب یہ راجہ دھاؤ نے بنوائی تھی۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہ راجہ اننگ پال نے ایک برہمن کے کہنے پر بنوائی تھی ـــ اس لاٹ کے بارے میں ایک کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ ایک ناگ کے پھن پر ٹھونکی گئی تھی۔ تاکہ دنیا تمام آفات سے محفوظ رہے) یہ معلوم نہیں کہ یہ کس دھات کی بنی ہوئی ہے۔ کسی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ ہفت جوش یعنی سات دھاتوں کو جوش دیکر اُن سے یہ لاٹ بنائی گئی ہے۔ کسی نے اس لاٹ میں سے انگل بھر ٹکڑا تراشا ہے۔ وہ جگہ نہایت چمکتی ہے۔ لوہا اس پر اثر نہیں کرتا۔ اس کا طول تیس[3] ہاتھ کا ہے۔ جو میں نے اپنی پگڑی سے ناپا تھا۔ مسجد کے مشرقی دروازے کے باہر تانبے کے دو بڑے بُت پتھر سے جڑے ہوئے پڑے ہیں۔ مسجد میں آنے جانے والے اُن پر پاؤں رکھ کر جاتے ہیں۔ اس مسجد کی جگہ پہلے بُت خانہ تھا۔ جب دہلی فتح ہوئی تو بُت خانہ کی جگہ یہ مسجد تیار کی گئی۔"

مندرجہ بالا تحریر اُوک ناتھ مدھوک کی نہیں ہے۔ بلکہ ابن بطوطہ کی ہے۔ اور سلامت علی مہدی نے اپنے حواشی میں اسی کی تصدیق و توثیق کی ہے۔

مذاہب کے بارے میں اسلام میں جبر و کراہ کی ممانعت ہے۔ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی بھی سخت ممانعت ہے پھر قرآن شریف۔ حضرت محمدؐ اور اسلام کی تعلیمات پر سترہ بار نہیں بلکہ سترہ سو بار پچھلی پندرہ صدیوں میں کس نے حملے کئے؟

اور اگر پریم چند تاریخ سے درثے میں ملی ہوئی ان باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (لیکن اس نشاندہی کے بعد وہ ان باتوں کو پکڑ کر نفرت اور کدورت پھیلانے والے ہندوؤں پر لعنت کے کوڑے برساتے ہیں) تو پریم چند قابلِ گردن زدنی قرار دیئے جاتے ہیں

منشی پریم چند پر آریہ سماجی ہونے کا الزام لگا کر انھیں

فرقہ پرست گردانتا بھی شبلی صاحب کی کج بحثی اور کج دماغی کی ایک اور علامت ہے۔ اگر آپ شیعہ مسلمان / سنی مسلمان / وہابی مسلمان ہو سکتے ہیں۔ تو پریم چند آریہ سماجی کیوں نہیں ہو سکتے؟ لیکن شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے۔ کہ آج تک آریہ سماجیوں یا سناتن دھرمیوں نے ایک دوسرے کا خون نہیں بہایا۔ نہ ہی ایک دوسرے کی املاک نذرِ آتش کی لیکن محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑے کر دینے کے باوجود علامہ اقبال شیعہ اور سنی مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خون بہانے اور ایک دوسرے کی املاک نذرِ آتش کرنے سے باز نہ رکھ سکے کیا اس کے لئے بھی پریم چند ہی نے نفرت کا بارود پھیلایا تھا؟

شبلی صاحب نے فراق جیسے غیر متوازن ذہن کے مالک شخص کے ان الفاظ کو اچھال کر بھی اپنی ذہنی کج روی کی مثال پیش کی ہے۔ اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں کہ "پریم چند دسویں درجے کے افسانہ نویس تھے"۔ میں نے فراق صاحب کو غیر متوازن ذہن کا مالک اس لئے کہا ہے۔ کہ وہ اس سے پہلے بیسوں مرتبہ پریم چند کو ایک عظیم افسانہ نویس کہہ چکے ہیں۔ اور تو اور انڈین ایکسپریس (انگریزی) میں اردو کی حمایت میں دھواں دھار سلسلہ مضامین کی ٹانگ یہاں توڑی تھی کہ اردو کو ہندی لپی اختیار کر لینی چاہیئے۔ اور آخر میں یہ فرمایا کہ ہندی رسم الخط ایسا ہے جیسے صاف ستھرے ڈرائینگ روم میں گوبر پڑا ہو ـــــ

شبلی صاحب نے اپنے مضمون میں مجھ پر ذاتیات پر بھی اُتر آنے کا الزام لگایا ہے۔ ("۔۔۔ میں اس بحث کو فرقہ داریت کی حد تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، یہی گندگی کیا کم متعفن ہے کہ میں ذاتیات کی غلاظت میں پھنس کر وقت برباد کروں"۔)

اگر شبلی صاحب پریم چند کو حال اور ماضی کے سارے فسادات میں نفرت کا بارود پھیلانے کا الزام دے کر انہیں اور اُن جیسوں کو آئینہ دکھلانے کے درپے ہیں۔ تو کیا مجھے یہ حق نہیں پہونچتا کہ میں شبلی صاحب کو اُن کی اپنی تحریروں کی نشاندہی کر کے یہی آئینہ خود اُن کے سامنے رکھوں؟ فرقہ پرستی کا پیمانہ کیا پریم چند کے لئے الگ ہے اور شبلی صاحب کے لئے الگ؟

شبلی صاحب نے پریم چند کو اردو کا غدار اس لئے کہا ہے کہ پریم چند نے اپنے ایک خط میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے کی ایک بہت ہی نازیبا اور ناشائستہ حرکت کی تھی۔ وہ الفاظ یہ ہیں "..... کسی ہندو کو اردو سے کیا ملا ہے جو مجھے مل جائے گا ....."

اس سلسلہ میں میں اوپندر ناتھ اشک اور گوپال متل صاحب کے خیالات پیش کر چکا ہوں اب انشا اور حالی کے خیالات بھی پڑھ لیجئے ـــــ انشا صاحب نے دریائے لطافت میں لکھا ہے "محاورہ اردو عبارت از گویائی اہلِ اسلام است" ـــــ اور حالی صاحب فرماتے ہیں۔ (فرہنگِ آصفیہ پر ریویو فرماتے ہوئے) ـــ "ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو۔ کیونکہ خود دلی میں فصیح اردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشل حالت اردوئے معلیٰ کو اُن کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی (بحوالہ شاعر شمارہ ۶۔ ۵۔ ۱۹۸۱ء صفحہ 33۔ ڈاکٹر گیان چند کے ساتھ ڈاکٹر سید سجاد حسین اور ڈاکٹر مغنی تبسم کا انٹرویو)

اب اردو ہی کے سلسلہ میں جگن ناتھ آزاد کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں سے آزاد صاحب کے مضمون تاجور نجیب آبادی کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں ـــــ

"..... ہاں ایک بات کی طرف ضرور اشارہ کرنا چاہوں گا۔ اور وہ یہ کہ مولانا کے ہندو شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ پنجاب میں بلکہ سارے ہندوستان میں اردو کی ترویج

واشاعت کے بارے میں مولانا مرحوم کا ایک خاص نظریہ تھا۔ اور وہ یہ کہ جب تک اُردو ہندوؤں میں مقبول نہیں ہوگی اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اور ہندوؤں میں اُردو کو مقبول بنانے کے لئے مولانا نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

"بدقسمتی سے یہ وہ دور تھا کہ بعض مسلّمہ حیثیت کے مسلمان حامیانِ اُردو اپنے اس نظریے پر سختی سے قائم تھے کہ ہندوؤں کو اُردو نہیں آتی......"

اب اس کے ساتھ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے ہندو شعراء کے بارے میں وہ اشعار بھی پڑھ لیجئے جنہیں آزاد صاحب نے فرمایا ہے:-

ہیں وہ ہندو شعراء دشمنِ جانِ اُردو
مٹنا چاہتے ہیں نام و نشانِ اُردو
فارسی سے انہیں ضد ہے کہ جو ہے روحِ ادب
عربی سے انہیں کد ہے، ہے جو جانِ اُردو
ٹھاٹ ہندی کا بنارس میں اُلٹ کر چمکی
آریہ ورت کی منڈی میں دکانِ اُردو

اس کا جواب پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی نے ان اشعار میں دیا تھا:- ہیں وہ مسلم شعراء دشمنِ جانِ اُردو

جو مٹانے کو ہیں تیار نشانِ اُردو
جو مٹانے کی جگہ مٹنا لکھ جاتے ہیں
رہ گئی ان کی اس اُردو پہ زبانِ اُردو
دورِ اُردوئے معلیٰ کرمِ ایزد سے ہے
ہم سے آئے گی جب آئے گی زبانِ اُردو

اس کے بعد آزاد صاحب یوں فرماتے ہیں:- "اس ایک مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں پنجاب کی ادبی فضا کس قدر گرد آلود تھی۔ مولانا تاجور مرحوم کا دامن اس گرد سے ہمیشہ پاک رہا اور اُردو کو ہندوؤں میں ہر دل عزیز بنانے کے لئے انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔" (صفحہ ۱۰۲)

یہ ہے وہ پس منظر جس کے پیشِ نظر پریم چند کے قلم سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ کہ "وہ کسی ہندو کو اُردو سے کیا تعلق ہے جو مجھے مل جائیگا"۔ اور پریم چند کے ان الفاظ کو پکڑ کر انھیں "غدارِ اُردو" اور "فرقہ پرست" کے خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔

(۷) شبلی صاحب نے کاشی داس گپتا رضا صاحب کو اس بحث میں گھسیٹ کر پھر اپنا گھٹنا چلایا ہے۔ شبلی صاحب کے یہ الفاظ پڑھیئے۔ "...... بہر حال مانک ٹالا صاحب کے حوصلے بلند ہیں۔ وہ "سوزِ وطن" کے شاخسانہ کی تحقیق بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ مبارک کرے۔ آخر کاشی داس گپتا رضا کی دوستی کس کام آئیگی"۔

(جی ہاں رضا صاحب کی مدد کے بغیر ہی تحقیق کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں اور شبلی صاحب کی تحقیق ایمانداری کا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑ چکا ہوں۔ ویسے رضا صاحب کو میں اس قسم کی چھوٹی موٹی تکلیف نہیں دیا کرتا ـــ مانک ٹالہ)

شبلی صاحب آگے فرماتے ہیں۔ "مگر میری درخواست ہے کہ وہ اس کوچہ میں قدم رکھنے سے پہلے "فن و شخصیت" کے آپ بیتی نمبر میں منشی پریم چند کی آپ بیتی پڑھ ڈالیں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ کس نے بھان متی کا کنبہ جوڑا؟ مجھے خبر نہیں البتہ معلوم ہے کہ اس آپ بیتی نمبر کے نگراں جناب کاشی داس گپتا رضا تھے۔ جن کی تحقیقی صلاحیتوں کے ہم لوگ تو قائل ہیں ہی۔ جناب مانک ٹالا بھی انہیں محقق تسلیم کرتے ہیں۔ وہی ان سے دریافت فرمائیں کہ پریم چند کی آپ بیتی سے درج ذیل سطور کیوں محذوف ہیں؟ کیا رضا صاحب منشی جی کے اس بیان کو غلط سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی دریافت فرمائیں کہ اس آپ بیتی کے مرتب کو حذف و اضافہ کا اختیار کس نے دیا؟

اور کس ادبی ضابطے کے تحت یہ خدمت انجام دی گئی؟ ......"

(اس کے بعد شبلی صاحب نے منشی پریم چند کا وہ طویل اقتباس پیش کیا ہے جس میں پریم چند نے سوزِ وطن کی تفصیل بتائی ہے۔ طوالت کے پیشِ نظر اسے پیش نہیں کر رہا۔ نہ ہی اس کی ضرورت ہے)

شبلی صاحب رضا صاحب کی صلاحیتوں کے قائل تو ہیں لیکن انھوں نے اُن کی تحریروں سے تحقیق کا سلیقہ نہیں سیکھا ورنہ وہ اس طرح کی اول جلول باتیں نہ کہتے۔ کیا شبلی صاحب کو نگراں اور مرتب / ایڈیٹر کا مطلب نہیں معلوم؟ اگر پریم چند نے پانچسو صفحوں کی آپ بیتی لکھی، تو نگراں ــــ مرتب / اڈیٹر کا فرض تھا کہ وہ پانچ سو کے پانچ سو صفحے ... دعن شائع کرتا۔ شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ آپ بیتی مرتب / ایڈیٹر نے جیون سار سے نہیں لی۔ بلکہ نقوش کے شخصیت نمبر سے لی ہے۔ نقوش کی آپ بیتی ۲۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جب کہ فن و شخصیت میں اس آپ بیتی کے لئے صرف 8 ہی صفحات نکالے جا سکے۔ اس لئے اسے اور بھی مختصر کرنا پڑا۔ شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ طویل اقتباس نقوش میں موجود نہیں ہے۔ اگر یہ پیراگراف محذوف ہے تو اس کا الزام نقوش کے سر پر آتا ہے۔ آپ بیتی تحقیق کا معاملہ نہیں ہے۔ اسے جس طرح بھی چاہے مختصر کیا جا سکتا ہے۔ (اُس کے معنی بدلے بغیر)۔ لیکن آپ تو تحقیق میں حذف و اضافہ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ دوسروں کی تحریر کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ مجھ پر دوسروں کا وقت برباد کرنے کا الزام لگانے سے پہلے آپ نے سوچا تھا کہ اس بحث میں "فن و شخصیت" کی آپ بیتی کی بحث خواہ مخواہ گھسیٹ کر آپ نے خود میرا اور دوسرے کا وقت برباد کیا ہے۔؟

آگے چل کر شبلی صاحب فرماتے ہیں: "اگر مانک ٹالہ صاحب کو تحقیق ہی کا شوق ہے تو پریم چند کی زندگی کے بہت سے پہلو تحقیق طلب ہیں......"

شبلی صاحب کے اس مشورے کا شکریہ۔ لیکن قبلہ مجھے تحقیق کا بالکل شوق نہیں۔ کیونکہ اس کے لئے بہت وقت اور علم کی ضرورت ہے۔ میرے پاس وقت بھی نہیں۔ اور نہ علم نہ شعور۔ ان سب پر آپ ہی کی اجارہ داری ہے۔ پریم چند کی فرقہ واریت کو بے نقاب کرنے انہیں ملک کے فرقہ وارانہ فسادات اور لاکھوں افراد کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں اور اُن جیسوں کو آئینہ دکھا دینے کے بعد آپ خود ہی پریم چند کی زندگی کے رہے سہے ڈھکے چھپے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی زحمت فرما ڈالئے۔ اُردو ادب اور پریم چند کی اولاد رہتی دُنیا تک آپ کی احسان مند رہے گی۔

(۸) وہ فرشتہ رحمت کون تھا جس نے پریم چند کو اٹھارہ روپئے کی ملازمت دی۔/ ٹریننگ سکول میں حساب میں فیل ہو جانے کے باوجود بھی پاس کر دیئے گئے / پریم چند کا استعفیٰ کہاں ہے / ہنس کی ضمانت طلبی کی حقیقت وغیرہ سب فروعی باتیں ہیں۔ ان کا اس بحث سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ میں بھی اُن کا فرضی بُت بنانے کا قائل نہیں ہوں۔ پریم چند آخر انسان تھے فرشتہ نہیں تھے۔ اور انسانی خوبیوں کے ساتھ انسانی کمزوریاں بھی اُنکی شخصیت کا حصہ تھیں۔ اقبال۔ غالب وغیرہ کونسا ادیب ایسا ہے جو محض فرشتہ تھا۔ لیکن پریم چند پر فرقہ پرستی / جارحانہ فرقہ واریت کا الزام لگانا چاند کے مُنھ پر تھوکنے کے مترادف ہے۔

(۹) "اسلام کا دشن درکش" (اسلام کا زہریلا درخت) کے بارے میں بھی شبلی صاحب نے اسی طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اور اُن کا یہ استدلال تو بہت ہی مضحکہ خیز ہے کہ "پریم چند

اِس کتاب کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اُن کے خطوط جو آج چھپ کر جا رہے ہیں وہ اسوقت منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ جب اُن کی ضرورت تھی بلکہ مکتوب الیہ کی جیبوں میں پڑے تھے (— چھپ کر پیٹنے) پریم چند کے خلاف اِن خطوط کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اُنکے معنی بدل کر اپنے موقف کی حمایت میں اُن کی تحریریں کیوں پیش کیں —— مانک ٹالہ)۔ اِس لئے اُن کی کوئی اہمیت نہیں (قربان جائیے اِس استدلال کے —— مانک ٹالا) دوسروں کے مضامین اپنے اخبار میں چھاپنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایڈیٹر مضمون نگار کی رائے سے متفق بھی ہو۔ (اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ —— مانک ٹالا) نیز دوسروں کے مضامین چھاپنا اور کسی واقعہ پر خود ایڈیٹوریل سپردِ قلم کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ صفائی پیش کرنے والے آج تک اِس کتاب کے خلاف منشی پریم چند کا کوئی نوٹ "ہنس" "جاگرن" یا کہیں اور نہ دکھا سکے۔

شبلی صاحب کے اِس بے ہودہ اور بودے استدلال کے بارے میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔ میں لکھنا بھی چاہتا تھا لیکن طوالت کے ڈر نے قلم روک لیا۔

بہرحال شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ "جاگرن" کے ۲۴ جولائی ۱۹۳۳ء کے شمارے میں پریم چند نے خود اپنے ہاتھوں سے اداریہ سپردِ قلم کیا تھا جس کا اختصار امرت رائے نے وِودھ پرسنگ جلد ۲ کے صفحات ۱۱۴ سے ۱۱۶ تک دیا تھا جلد ہی یہ تحریر ترجمہ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔

اِس سلسلے میں یہ سہیل اگیا کہ پریم چند نمبر میں امرت رائے نے علی محمود خالدی کے حوالہ سے اِنکا حوالہ دیا ہے وہ میں نے پھر سے پڑھا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ امرت رائے نے اِس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کئی باتیں انسان کے ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ بہرحال انھوں نے "حق" ضمنی باتوں کے جواب میں لمبی چوڑی تقریر کی ہے"— اُس تقریر کا لبِ لباب وہی ہے جو میں شبلی صاحب اور ان کی قبیل کے لوگوں کے بارے میں "پریم چند کی فرقہ پرستی" کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں اور حق کی بات تو یہ ہے کہ یہ نمبر بھی حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔

(۱۵) عفو/معافی کو چترسین شاستری کی کتاب اسلام کا وِش ورکش کی خاموش ہمنوائی قرار دینا بھی شبلی صاحب کے شرارتی ذہن کی اُپج ہے۔ پریم چند کی کہانی کا پورا تاثر بہت اچھا اثر پیدا کرتا ہے اور ایک دیندار [illegible] جس کا بیٹا عیسائی نوجوان نے قتل کیا تھا۔ اُس عیسائی نوجوان کو پناہ دیتا ہے۔ پریم چند نے اسلام اور اسلام کی تعلیمات کا استحصال EXPLOIT کرنے والے مسلمانوں کے مقابلے میں ایک سچے معنی میں دیندار مسلمان کو پیش کیا ہے جو اسلام کی رُوح کو سمجھتا ہے اور اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیتا ہے۔ پریم چند نے عیسائی نوجوان کے مُنہ سے جو الفاظ کہلوائے ہیں وہ کہانی کو بھرپور تاثر دینے کے لئے ضروری تھے اُنکی تصدیق و توثیق خود علامہ اقبال نے "شکوہ" میں کر دی ہے پھر پریم چند ہی کیوں گناہ گار ٹھہرائے جاتے ہیں؟ پریم چند نے آخر کا جو پیراگراف حذف کیا ہے کبھی بھی اچھے ناقد سے پوچھ لیجئے کہ اُس کے حذف کر دینے سے کہانی کا اثر زیادہ بھرپور اور دیرپا ہو جاتا ہے کہ نہیں۔ اور انھوں نے اِس سے کہانی کو پھسپھسا ہونے سے بچا لیا ہے کہ نہیں؟ بہرحال اِس پر تفصیل سے ایک الگ مضمون میں بحث کروں گا۔ جس میں شبلی صاحب کی پیش کردہ بارہ کہانیاں زیرِ بحث آئیں گی۔

(۱۱) پریم چند نے خواجہ حسن نظامی کی "کرشن بیتی" کے ہندی ترجمہ کو چھاپنے میں جس معذوری کا اظہار کیا ہے۔ اُس کو

شبلی صاحب نے عذر لنگ کا ... دیا ہے۔ اور حوالہ کے لئے پریم چند کے خطوط صفحہ ۲۱۲ کا حوالہ دیا ہے۔ پہلی بات تو آپ یہ بتایئے کہ آپ نے اپنی ضرورت کے لئے ان خطوط کا حوالہ کیوں دیا ہے جبکہ یہ چٹھیاں "مکتوب الیہ کی جیبوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی" بہر حال حوالہ تو دے دیا ہے لیکن جان بوجھ کر نہیں دی۔ یہ تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

"......لیکن میں آپ کی کتاب کی اشاعت میں تاخیر کے لئے معذرت نہیں کروں گا۔ کتاب کے اصل مصنف چونکہ خواجہ حسن نظامی ہیں۔ اس لئے اندیشہ تھا کہ کہیں ہندی داں طبقہ تعصب سے کام نہ لے۔ چنانچہ ہم مناسب موقع کے انتظار میں تھے۔ اس کے بعد سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ اور سر بازار مندہ ہو گیا۔ اور آخر میں فرم کے مالک کے انتقال سے تو سارا کام ہی ٹھپ ہو گیا ہے۔ اس وقت حالت بالکل غیر یقینی ہے۔ جب تک حالات معمول پر نہ آجائیں مجھے اندیشہ ہے کہ اشاعت کا کوئی بھی نیا کام شروع نہ کیا جا سکے گا.......اس لئے اسے (مسودہ کو) بڑے افسوس کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔"

یہ تھا وہ خط جس کا انھوں نے حوالہ تو دے دیا لیکن تفصیل جان بوجھ کر نہیں دی تاکہ قارئین کو جان بوجھ کر فریب کی جھاڑیوں میں اُلجھایا جا سکے۔

(۱۲) شبلی صاحب فرماتے ہیں۔ ان افسانوں (وہ بارہ افسانے پریم چند کے جنہیں پکڑ کر شبلی صاحب اُن پر فرقہ پرستی کا الزام صادر فرماتے ہیں ــــ مانک ٹالا) کو پڑھنے کے بعد ہی اس اسپرٹ کا اندازہ ہو سکے گا۔ جسے منشی پریم چند نے ان افسانوں کے لکھتے وقت ملحوظ رکھا تھا۔ یقین ہے کہ ان افسانوں کے پڑھنے کے بعد مانک ٹالا صاحب کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ اور وہ تسلیم کر لیں گے کہ پریم چند واقعی جارحانہ فرقہ پرستی کے حامل تھے۔"

شبلی صاحب میں نے ان بارہ افسانوں میں سے بیشتر افسانے پڑھ لئے ہیں۔ باقی کے افسانے اُردو میں حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ اگر نہ مل سکے تو مجبوراً ہندی میں حاصل کر کے انہیں پڑھوں گا۔ ویسے جتنے افسانے (غالباً سات سے نو تک) پڑھے ہیں ان سے تو یہی تاثر حاصل ہوتا ہے کہ خود آپ کی آنکھوں پر تعصب اور جارحانہ فرقہ پرستی کی چربی کی موٹی موٹی تہیں چڑھی ہوئی ہیں بہر حال جلد ہی اپنی ناقص عقل و دانش کی روشنی میں ان پر ایک مضمون (یا ایک سے زیادہ مضامین) میں تفصیل سے بحث کروں گا۔

(۱۳) مولانا محمد علی کا پریم چند کو ۳۰ روپیہ یا ایک اشرفی فی افسانہ معاوضہ دینا اور نگم کا صرف آٹھ روپئے میں ٹرخا دینا یہ سب ضمنی اور فروعی باتیں ہیں۔ اس لئے مضمون کی طوالت کے ڈر سے نظر انداز کر رہا ہوں۔ بہر حال انھیں اس قدر بتا دوں کہ "اگر اپنے گھر میں قدر ہو تو کیوں دوسروں کا دست نگر ہوؤں" کو پکڑ کر شبلی صاحب نے بین السطور میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہندو اُنکی قدر کریں تو وہ مسلمانوں کے پاس کیوں جائیں۔ حالانکہ اسکا سیدھا سادھا مطلب ہے کہ اگر ان کا خاص الخاص دوست نگم ان کی قدر دانی کرے اور مناسب اور صحیح معاوضہ دے تو انھیں دوسرے اُردو پرچوں کے پاس بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔

اب شبلی صاحب میرے "نیم الہامی" جملے پیش کرتے ہیں۔

"اس اقتباس کے بعد مانک ٹالا صاحب کے یہ جملے الہامی سے معلوم ہوتے ہیں۔ جو انھوں نے منشی جی کے امتیاز علی تاج سے دوستانہ خط و کتابت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کئے ہیں۔ ــــ آپ مندرجہ بالا خط کو درخورِ اعتنا نہ سمجھئے اسے بس یہ ہی سمجھ لیجئے کہ

پریم چند کی کمزوریوں کو سمجھنے کیلئے اس میں شک نہیں کہ ایک ہندو مسلمان کے مقابلے میں زیادہ مصلحت کوش ہوتا ہے ۔ یقیناً یہ مصلحت کوشی پریم چند کی وجہ سے علی برادران ، رام لکھن ، کی جوڑی بنے تھے ۔ ایک اشرفی یا تیس روپے میں یہ اعزاز سستا تھا ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ذکر ۱۹۱۲ء ، ۱۹۱۲ء کا ہے ۔ جب پریم چند کے افسانے ہمدرد میں چھپتے تھے ۔ انھوں نے علی برادران کو رام لکھن کی جوڑی اُس مضمون میں (قحط الرجال ۔ زمانہ فروری ۱۹۲۴ء) بارہ سال بعد لکھا جس میں انھوں نے ہندو فرقہ پرستوں پر لعنت کے کوڑے برسائے تھے ۔ اور جس کی جزئیات کو پکڑ کر شبلی صاحب پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ بہر حال اگر پریم چند علی برادران کی قدر شناسی کو بارہ سال کے بعد بھی نہیں بھولے تو یہ بھی پریم چند کی شخصیت کی عظمت کی نشان دہی کرتا ہے ۔ میری مصلحت کوشی کو ایک مثال کے طور پر پیش کر کے (استدلال کی خاطر) پریم چند کے مندرجہ بالا الفاظ کو در خور اعتنا نہ سمجھنے کے لیے کیا تھا اسے پکڑ کر اپنا موقف ثابت کرنے کے لئے نہیں ۔

حالانکہ اس سے اُن کا موقف ثابت بھی نہیں ہوتا ۔

بہر حال شبلی صاحب نے پریم چند کے خلاف محاذ کھڑا کرنے سے پہلے ہندوؤں کی اس مصلحت کوشی کو ضرور بھانپ لیا ہوگا ۔ کہ اُردو کے نام پر پیسہ اور شہرت بٹورنے والے ہندو ادیب پچھلی ٹانگوں میں دُم دبا کر بیٹھے رہیں گے ۔ اور انہیں ادب کے نام پر بے ادبی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دیں گے ۔ لیکن شائد یہ بات اُن کے گمان میں بھی نہ ہوگی کہ مجھ جیسا ایک گمنام و غیر معروف ادیب انہیں گریبان سے پکڑ کر اپنے گریبان میں جھانکنے کیلئے مجبور کر دے گا ۔

(مانک ٹالا)

ہماری جدید شائع کردہ کتابیں

جلد خریدیں

	قیمت
۱۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی	9/-
۲۔ امیر خسرو اور اُن کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	7/-
۳۔ باغ و بہار میر امن دہلوی مع مقدمہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	6/-
۴۔ یادگار غالب ، حالی مع مقدمہ (جدید ایڈیشن)	6-
۵۔ ادب اور نظریہ ۔ آل احمد سرور	12/-
۶۔ دیوان غالب اُردو (فروغ اُردو طاہر اڈیشن)	6/-
۷۔ انارکلی ۔ امتیاز علی تاج	5/-
۸۔ سلور کنگ ۔ آغا حشر کاشمیری (مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالمغنی)	6/-
۹۔ اُردو کے قومی شاعر ۔ ڈاکٹر نورالحسن	5/-
۱۰۔ حسرت موہانی جدید ایڈیشن عبدالشکور	9-
۱۱۔ امراؤ جان ادا ۔ مرزا رسوا	6/-

ملنے کا پتہ

ادارہ فروغ اُردو ۱۲ امین آباد پارک لکھنؤ

۵۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ — ۱/۵۰
۶۔ دستۂ گل — -/۶۰
۷۔ دوشیزہ قاف (ناول) — خان محبوب طرزی — ۵/-
۸۔ دلربا — " — ۳/۵۰
۹۔ دکنی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید اڈیشن) — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۲۲/-
۱۰۔ دھڑکنیں — ذکی کاکوری — ۳/۵۰

(ڈ)

۱۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — -/۵۰

(ذ)

۱۔ ذوق جستجو — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۲/-
۲۔ ذوق ادب و شعور — سید احتشام حسین — ۸/-
۳۔ ذوق جنوں مجموعہ کلام — آل احمد سرور — ۱۱/-

(ر)

۱۔ روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — ۹/-
۲۔ رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ — سید امیر حسن نورانی — ۴/۵۰
۳۔ رہبر مضمون نویسی — شفاعت علی صدیقی — ۳/-
۴۔ راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — -/۵۰
۵۔ رخسار سحر — انصر کریم صدیقی — ۱/۵۰
۶۔ رفتار — وحشی محمود آبادی — ۳/۵۰
۷۔ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو — محمد شریف — ۴/-
۸۔ ریاض فارسی — منتخب کلام فارسی — ۳/-
۹۔ ریختہ ولی [illegible] اڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/-

(ز)

۱۔ زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ — مولانا تھانوی — -/۵۰
۱۳۔ زیتیوں کا بادشاہ حکیم پانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی — ۲/-
۱۴۔ زینب ساحرہ — وحشی محمود آبادی — ۳/-

(س)

۱۔ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۴/-
۲۔ سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۵/-
۳۔ سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیر — ۹/-
۴۔ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۴/۵۰
۵۔ سنگ گہر — سید احتشام حسین — ۵/-
۶۔ سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۷۔ سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۹/-
۸۔ سو (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۹۔ سیاحت زمین " — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
۱۰۔ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
۱۱۔ سنہرا حلقہ — -/۷۵
۱۲۔ سر سید احمد خاں — انوارالحسن صدیقی — -/۵۰
۱۳۔ سوشل اسٹڈیز — احمد محسن کاکوروی — ۱/۵۰

(ش)

۱۔ شعر نو تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۸/-
۲۔ شرح دیوان غالب مزاحیہ — غلام احمد فرقت — ۲۰/-
۳۔ شرح مسلک گہر — عبدالقوی دریابادی — ۴/-
۴۔ شاہ غمگین حضرت جی — پروفیسر عبدالشکور — ۳/-
۵۔ شرح ادب پارے مختصر — سعادت علی صدیقی — -/۵۰
۶۔ شرح ادب پارے نظم — ڈاکٹر محمود الحسن — ۵/-
۷۔ شرح منتخبات فارسی — عبدالقوی دریابادی — ۵/-
۸۔ شبلی نعمانی — امیر الحسن نورانی — -/۵۰
۔ شرح دیوان غالب جدید اڈیشن — نظم طباطبائی — ۱[illegible]
۔ [illegible] حاجی زندگی — عبدالعلی قادری — ۱/-
۱/۲۵

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۹	مطالعہ حالی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/-
۲۰	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۵۰
۲۱	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۲	مضامین پانڈے	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۳	مقدمہ شعر و شاعری مطابق نصاب بی۔اے۔	حالی	۲/۵۰
۲۴	مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
۲۵	محبوبۂ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۶	معمار	مائل ملیح آبادی	۲/۵۰
۲۷	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۵۰
۲۸	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی مہاراج علی مرزا شار لکھنوی		
۲۹		ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۳۰	مرزا ... نوک جھونک	عبدالعزیز حسن مجذوب	-/۷۵
۳۱	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۳۲	مصباح بلاغت مع مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۳۳	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۳۴	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خاں	۵/۵۰
۳۵	منتخب سوانح مولانا ...	نجم الغنی نقوی	۵/-
۳۶	مفتاح العربیہ شرح	محمد حسین شمس علوی	۲/-

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۲	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	
۳	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	[illegible]
۴	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/-
۵	نقش حالی حصہ اول و دوم یعنی حالی نمبر	مرتبہ احتشام حسین	۱۲/-
	دوم	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۲۰/-
۶		شجاعت علی سندیلوی	۲۷/-
۷	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۸	نغمات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۲/-
۹	نظم سائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۰	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر الدین جیانسی	۳/-
۱۱	نسرین نسترن	ذکی کاکوروی	۴/-
۱۲	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۱۳	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۱۵	نوائے سرور جہاں آبادی دیوان	ڈاکٹر حکم چند نیر	۴/۵۰
۱۶	نیا مالستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۱۷	نوروز	مائل ملیح آبادی	۱/۵۰
۱۸	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	۱۲/-
۱۹	نیلم	انتصار حسین	۲/۵۰
۲۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۲۱	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۸/-
۲۲	نصاب فارسی	مع مقدمہ فارسی عبدالاحد خاں	[illegible]
۲۳	منشی نولکشور نمبر		

(و)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	وعدۂ فردا	انگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-

(ہ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۲/-
۲	ہندوستان کے مسلمان شعرا	امیر حسن	

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۱	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
۱۲	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۱۳	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	"	۱/۵۰
۱۴	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی قریا	۱/۴۰
۱۵	" " حصہ ۲	" "	۱/۳۰
۱۶	" " حصہ ۳	" "	۱/۴۰
۱۷	ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی قریا	۱/۴۰

(ی)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	یادگار غالب	مولانا حالی	۸/-
۲	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰

ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

گذشتہ شمارے میں عرض کیا گیا تھا کہ "ابھی تک (۲۶ دسمبر ۱۹۸۱ء) وزیر اعلیٰ اترپردیش بار بار یقین دلا چکے ہیں کہ "مرد کی زبان ایک ہوتی ہے، وہ ۱۹۸۱ء کے خاتمہ تک اردو کو دوسری سرکاری زبان ضرور بنادیں گے"۔ بالآخر ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کو یہ بلند بانگ دعوے، اندرونی کش مکش اور چند وزرا کی علی الاعلان مخالفت کا شکار ہو کر، مبہم الفاظ میں مختصر اور بے جان اردو دنیا نے سنا لیکن اس کی کم سے کم توقعات بھی پوری نہیں ہوئیں ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ٭ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

وزیر اعلیٰ کو کیا معلوم تھا کہ کانگریس کے انتخابی منشور میں کئے گئے وعدے کو عملی شکل دینے میں، خود ان کے رفقا (جو اسی الیکشن مینی فسٹو پر منتخب ہو کر آئے، اسمبلی کے ممبر اور حکومت میں وزیر بنے) اردو دشمنی میں، فرقہ پرستوں سے بھی زیادہ سخت ہیں، لیکن یہ ذہنیت خود کانگریس کی پیدا کردہ ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد، اردو کے ساتھ اس کا جو رویہ رہا، اور جس طرح کانگریس جماعت اور اس کی حکومت نے، اردو اور اردو دنیا کو نیست و نابود کرنے کی منظم و مؤثر طور پر کوشش کی، اس سے اردو دشمنی کی ذہنیت کانگریس کے ایک طبقہ میں مستحکم ہوتی چلی گئی، یہی ذہنیت تھی اور ہے جس نے 'اردو والے غدار ہیں' پھانسی کے حقدار ہیں'، کا نعرہ لگایا، جس نے اردو کو غیر ملکی زبان قرار دیا، جس نے اردو کو زبان کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کیا، جس نے اردو کو ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) بتایا، جس نے اردو کا رسم خط بدل کر، ناگری لپ، اختیار کرنے پر زور دیا، کسی نے اس کو منگولوں، خونخواروں کی زبان قرار دیا، کسی نے اس کو فرقہ پرستی، نفاق، منافرت کا سرٹیفکیٹ عطا کیا، غرض لسانی سامراجیت کے دلدادہ، جمہوریت کی آڑ میں، اردو کو ختم کرنے کے لئے سیکڑوں، ہزاروں بے بنیاد الزامات لگاتے رہے اور اردو مخالف ذہن پیدا کرتے رہے، انھیں نہ تو ہندوستان کے دستور کے احترام کی پروا رہی، نہ جمہوری

قدروں کی، نہ ہمدردی نہ رواداری کی، ان کی اُردو دشمنی نے ان تمام حقوق کو بھی ختم کر دیا جو اُردو کو غیروں (انگریزوں) کی حکومت میں حاصل تھے۔ انھوں نے سب سے پہلا دیش بھگتی کا کام یہی کیا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو قومی جھنڈے کے نیچے لکھی ہوئی اُردو عبارت کو مٹا دیا۔ جو ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ اور لسانی سامراجیت ذہنیت کا ثبوت ہے۔ اعلان میں دوسری سرکاری زبان کے بجائے دوسری زبان رکھا گیا، اور بہار حکومت کے انداز پر مخصوص علاقوں کے لئے محدود کر دیا گیا۔ آرڈیننس کے بجائے بل پیش کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اخبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بل بھی پیش نہ ہو سکے گا کیونکہ ابھی تک بل کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے، ممکن ہے وزیر اعلیٰ، اعلان کی طرح بل کو بھی اجلاس کے آخری وقت میں پیش کریں۔ اس سے کم از کم یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ الیکشن کے منشور میں جو وعدے کئے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر ووٹ مانگے جاتے ہیں، اور کامیابی حاصل کی جاتی ہے، ان پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ وہ صرف وقتی اور سیاسی مصلحت سے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ ہر الیکشن کے موقع پر یہی ہوتا ہے اور اس کے بعد اقتدار کا نشہ سب کچھ بھلا دیتا ہے، اس لئے "اُردو دنیا" کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ آئینی اور جمہوری طریقوں سے اپنی جدوجہد اس وقت تک مسلسل منظم طور پر کرتے رہنا چاہیئے۔ جب تک کم از کم وہ تمام حقوق جو اس کو غلامی کے دَور میں حاصل تھے، نہیں مل جاتے۔ اس کے بعد آزادی کے دَور کے حقوق کے لئے سینہ سپر ہو کر آگے بڑھنا چاہیئے۔ یہ کام سب کا ہے، خصوصاً نوجوانوں کا، جن کے اندر جوش و ہوش، اور عمل جذبہ ہے، اس سلسلے میں اُردو کی کچھ وہ تنظیمیں جو نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہیں، تعمیری قدم اُٹھانے کا پروگرام جاری رکھیں ۲۴، ۲۵ جنوری کو مرادآباد میں، دو روزہ اُردو کنونشن ہوا۔ جس میں اُتر پردیش کی انتالیس اُردو تنظیموں اور ان کے نمایندوں نے حصّہ لیا۔ اور ہمدردان و محبان اُردو کی کثیر تعداد شریک ہوئی۔ "اُردو دوسری سرکاری زبان — مسائل اور ہماری ذمہ داریاں" کے موضوع پر مذاکرہ ہوا۔ مسٹر محمد عتیق صدیقی کنوینر نے اُردو تعلیمی جائزہ کمیٹی کی سرگرمیوں اور کامیابیوں پر روشنی ڈالی۔ اُردو محاذ اُتر پردیش کے سکریٹری سعادت علی صدیقی نے اُردو: دوسری سرکاری زبان بناؤ کے پس منظر اور پیش رفت کا جائزہ لیتے ہوئے اپیل کی کہ اُردو دوستوں کو تین محاذوں پر مسلسل و منظم جدوجہد کرنا ہے:

(۱) دوسری سرکاری زبان تسلیم کرانا۔

(۲) اُردو مخالف عناصر کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنا۔

(۳) نیک نیتی، عزم محکم، خلوص و ایثار کے ساتھ اُردو کی ترقی و بقا کے لئے اپنے فرائض کی ادائیگی۔

ان اُمور پر سبھی شرکا حضرات نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کئے اور متفقہ طور پر اُردو کے تحفظ، اس کی ترقی

اور بقا کے لیے عملی اقدام کرنے کی کل تجاویز پیش کی گئیں۔ مراد آباد کے یہ فرزندانِ اردو جس لگن اور ہمت کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اس کی مثال اتر پردیش میں نہیں ملتی، اگر دوسرے علاقوں کے نونہالانِ اردو بھی بیدار ہو کر منظم طریقے سے عملی قدم اٹھائیں تو اردو کا مسئلہ ابھی تک حکومت کو چشم و ابرو دکھانے والے اور سیاسی وفاداری ثابت کرنے والے، اردو کے رہنماؤں کے قبضہ میں رہا اور جس سے انھیں وفاداریوں کا صلہ بھی ملتا رہا، بہت جلد حل ہو جانے کی امید ہے۔ اردو کے رہنماؤں اور اس کی بدولت اقتدار حاصل کرنے والوں نے، نوجوانوں اور اردو کے مخلص و سرگرم کارکنوں کو ہمیشہ دور رکھنے میں اپنی عافیت سمجھی ان کا یہ طرز عمل ہنوز باقی ہے۔ اس لیے اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے، اگر اس کا کھویا ہوا حق اور وقار حاصل کرنا ہے تو نئی نسل کو آگے بڑھنا چاہیے۔ اور گھر گھر اردو کی آواز پہونچانا چاہیے اردو دنیا ان کا خیر مقدم کرے گی کیونکہ وہ نام نہاد اردو کے لیڈروں کی بے عملی، خودغرضی اور نمائشی ہمدردی سے بیزار ہو چکی۔

ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب خریدیے

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ اودھ مکمل دو جلد	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	70/-
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	25/-
تنقیدی نظریات۔ حصہ اول	سید احتشام حسین	15/-
" " حصہ دوم	"	15/-
تنقید اور عملی تنقید	"	9/-
ذوق ادب و شعور	"	8/-
روایت و بغاوت	"	9/-
تنقیدی جائزے	"	9/-
عکس اور آئینے	"	9/-
انتخاب جدید نثر اردو	"	5/-
سید احتشام حسین نمبر		30/-
نقش حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر ۲		20/-
" حصہ اول " حالی نمبر ۱		15/-
فروغ اردو [illegible] نمبر		10/-
فروغ اردو پریم چند نمبر		15/-
چکبست نمبر		12/-
امیر خسرو نمبر		15/-
عبدالماجد دریابادی نمبر		12/-
نول کشور نمبر		3/50
سالک نمبر	سید احتشام حسین	5/-

ادارہ فروغ اردو ہند لکھنؤ کی شائع کردہ کتب پر
۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک خصوصی رعایت

حضرات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی ادبی اور تنقیدی کتب جو کورس میں داخل نہیں ہیں پچاس روپیہ قیمت تک کی خریدیں گے اور درج ذیل کوپن اپنے آرڈر کے ہمراہ روانہ فرمائیں گے۔ ان کو پچیس ۲۵ پیسے فی روپیہ خصوصی کمیشن دیا جائے گا۔ لہٰذا یکم جنوری ۱۹۸۲ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک اس خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد از جلد مطلوبہ کتب کی فہرست اور کوپن اور اپنا صاف صاف پتہ لکھ کر ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے اس خصوصی رعایت کا فائدہ اٹھائیں۔

کوپن

نام ....

پتہ ....

قصبہ شہر ضلع ....

ابو محمد شبلی
لکھنؤ

باکمالوں کے درشن

مصنفہ

پریم چند

ایک تبصرہ

محترم ڈاکٹر [illegible] صاحب نے پریم چند اور "فرقہ واریت" کو ایک خوبصورت موڑ دینے کی غیر فنی سے نہیں اس غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کو اُن کے افسانوں اور ناولوں کی بنیاد پر فرقہ واریت کا مجرم قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔ جب تک کہ اُن کی دوسری تحریریں بھی اس سے ہم آہنگ نہ ہوں اپنے موقف کی تائید میں انھوں نے پریم چند کی دوسری تحریروں سے اقتباس بھی پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مضمون (مطبوعہ فروغ اُردو۔ مارچ ۱۹۸۱ء) کا جواب مجھ پر باقی تھا اور ہے۔ اسوقت منشی پریم چند کی ایک تصنیف "باکمالوں کے درشن" پیشِ نظر ہے جو شاید لکھنہ صاحب کی نظر سے نہیں گذری۔

منشی پریم چند کی اس اُردو تصنیف کو لالہ رام نرائن لال کٹرہ الہ آباد نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔ یہ کتاب ٹکسٹ بک کمیٹی میں پیش کی گئی مگر داخل نصاب نہ ہو سکی اس لئے کہ یہ فرقہ داریت اور علیحدگی پسندی کی علمبردار تھی۔ اس کے بعد ایسے نام جن کے بیان میں "مسلمانوں کی جارحیت اور مظالم" کے بیان کی گنجائش نہ تھی، خارج کئے گئے اور اول نا خواستہ [illegible] بدر الدین طیب جی، سر سید احمد خاں۔ وحید الدین سلیم اور عبد الحلیم شرر "باکمال" قرار پائے۔ اب یہ کون کس سے پوچھے کہ یہ پہلے باکمال نہیں تھے۔ بعد میں کیوں ہو گئے؟ ہمیں اس تبدیلی کی اطلاع منشی جی کے خط بنام منشی دیا نرائن نگم مورخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ملتی ہے۔ منشی جی لکھتے ہیں۔

باکمالوں کے درشن یہاں رام نرائن لال بکسیلر نے شائع کیا ہے۔ یہ آپکو معلوم ہے اس میں آٹھ

سوانح عمریاں ہیں (۱) رانا پرتاپ۔ (۲) راجہ ٹوڈرمل۔
(۳) مان سنگھ (۴) اکبر۔ (۵) بدرالدین طیب جی
(۶) سر سید احمد خاں۔ (۷) وحید الدین سلیم۔
(۸) مشر۔ (۹) گیری بالڈی (۱۰) رنجیت سنگھ
(۱۱) ووِیکانند۔

پہلے اس مجموعہ میں مسلمان مشاہیر نہ تھے۔
شاید اسی بنا پر کمیٹی نے اس پر التفات نہ کیا تھا۔
اب وہ کمی پوری کردی گئی ہے۔ اکبر تو میں نے عزیز مرزا
سے لیا ہے۔ وحید الدین سلیم اور مشر "زمانہ" کے
مضامین سے مقتبس ہیں۔ میرے خیال میں اب یہ اسکول
کے قابل ہیں۔ اب کہ یہ کتاب پھر پیش کی جائے گی۔
میں آپ سے اُمید کروں گا کہ اس کے حق میں ایک
کلمہ خیر کہہ کر اسے داخلِ نصاب کرا دیں۔ اسکے لئے
شکریہ ادا کرونگا" ——— (پریم چند کے خطوط ص ۲۴۴)

یہ ترمیم شدہ اڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا لیکن میری
نظر سے نہیں گزرا۔ پہلا اڈیشن اب بھی دستیاب ہے۔ ان
دونوں اڈیشنوں میں جو عظیم ترین شخصیتیں مشترک ہیں ان میں سے
ایک "درشن" کے کچھ اقتباس محترم طلعت صاحب کی خدمت میں
اُن کے مضمون کے جواب کی پہلی قسط کے طور پر پیش کئے جاتے
ہیں اُن کے اصل مضمون کا جواب اب بھی باقی ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ منشی جی نے ان مشترک
مضامین میں کسی قسم کی ترمیم و اضافہ کا ذکر اپنے درج بالا
خط میں نہیں کیا ہے اس لئے کہ شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی
کہ مشترک مضامین دونوں اڈیشنوں میں یکساں ہوں گے یوں تو
اس مجموعہ میں کئی مضامین محل نظر ہیں مگر پہلا مضمون "رانا پرتاپ"
جو شہنشاہِ اکبر کے حریف تھے خاص طور پر توجہ طلب ہے اکبر کے
بارے میں مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں۔

"اکبر کا شمار دُنیا کے عظیم الشان بادشاہوں میں ہے
فاتح، فرماں روا، مدبر اور بانی قوم کی حیثیت سے وہ
مشاہیرِ عالم کی صف اوّل میں جگہ پانے کے قابل ہے"
(اہل ہند کی مختصر تاریخ۔ اُردو اکادمی دہلی کا پہلا
اڈیشن ۱۹۶۹ء ص ۲۸۱)

مگر منشی پریم چند نے اپنی تصنیف "کرشمے" میں اکبر کو "باکمالوں" میں شمار نہیں کیا
تھا۔ اور پورے چار سال کام کا موقع ملنے کے باوجود وہ خود اکبر کے
بارے میں کچھ نہ لکھ سکے تھے۔ لیکن اس کے حریف رانا پرتاپ جنکے
بارے میں خود منشی جی کو اعتراف ہے کہ انھوں نے۔

"سلطنتوں کی بنیاد نہیں ڈالیں۔ فتوحات نہیں
حاصل کیں۔ نئی قومیں نہیں بنائیں"

پھر بھی وہ منشی جی کی نگاہ میں اکبر سے زیادہ "باکمال" تھے۔ بات یہیں
ختم نہیں ہو جاتی۔ انتہا یہ ہے کہ دربار اکبری کے نورتنوں میں سے
دو رتن راجہ ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ بھی "باکمال" تھے مگر اس
نورتن کا صدر نشین اکبر منشی جی کی عطا کردہ اس اعزاز کا مستحق نہ تھا۔
اب اگر میں کہوں کہ اس کا نام اکبر تھا اور اسلام اُسے وراثت میں
ملا تھا۔ اس لئے منشی جی نے [illegible] نہیں [illegible] تو فرقہ پرستوں
کے منھ کا ذائقہ خراب ہو جائے گا

اس سے پہلے کہ میں اس مضمون کے بارے میں کچھ لکھوں ایک
حقیقت کا پھر اعادہ کر دینا چاہتا ہوں کہ منشی جی روزِ اول سے
مرتے دم تک [illegible] فرقہ پرست [illegible] نہیں کہ وہ
سیاسی نقطۂ نظر سے کانگریس کے حامی تھے یا کمیونسٹ پارٹی
کے ہندوستان کی کوئی بھی سیاسی جماعت فرقہ پرستی کی لعنت سے

پاک بھی نہ ہے کھدر کے اُجلے کرتے پہن کر کوئی مہا گرو نہیں بن سکتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ منشی جی کا یہ مضمون (رانا پرتاپ) سب سے پہلے "زمانہ" اکتوبر ۱۹۰۳ء میں چھپا تھا جو اُن کے احیاپسندانہ خیالات کی قلمی شہادت ہے۔ اور یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ مہارانا پرتاپ کی عظمت اور شجاعت کے ... ہندو تہذیب کے علمبردار کی حیثیت سے "ہندو تہذیب کی ..." بندی کے اسباب مہیا کر رہے تھے۔ اس کے بعد یہی مضمون مجموعہ مضامین "باکمالوں کے درشن" ۱۹۲۹ء اور پھر ۱۹۳۲ء میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے شامل کیا گیا گویا منشی جی ۱۹۰۵ء میں جہاں تھے ۱۹۳۲ء تک وہیں نظر آئے۔ یہ کتنا سراسر غلط ہے کہ منشی پریم چند صرف چند برس بعد احیا پرستی کو فرقہ پرستی اور فیوڈل طرز فکر کی نقاب سمجھ کر اس سے بیزار ہو گئے "اگر دیکھیں) یا ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء میں وہ اپنے ... قومیت کے بنیادی روپ کی طرف لوٹ آئے ...

اس مضمون میں انھوں نے رانا پرتاپ کا تعارف ... جاندار لفظوں میں کرایا ہے کہ ہندو نوجوانوں کی رگ رگ میں تڑپ اور خون میں جارحانہ فرقہ پرستی کی گرمی پیدا ہو۔ اسکے پہلے ہی پیراگراف سے جو دو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے منشی جی کی نفسیاتی ساخت ذہنی پرداخت اور فکر و نظر کی سمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"راجستھان کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ... اور مردانہ جاں نثاریوں کے کارناموں سے مزین ہے۔ بھیا راول، رانا سانگا اور رانا پرتاپ ایسے ایسے ممتاز نام ہیں جو باوجود اس کے کہ زمانہ نے انھیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ابھی تک زندہ ہیں اور ابھی ہمیشہ زندہ اور روشن رہیں گے۔ ان میں سے کسی نے سلطنتوں کی بنیادیں نہیں ڈالیں۔ فتوحات نہیں حاصل کیں۔ نئی قومیں نہیں بنائیں۔ مگر ان بزرگوں کے سینوں میں وہ شعلہ روشن تھا جسے حب قوم کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ کوئی غیر شخص آئے اور ہمارے ملک میں ہمارا حکمراں ہو کر رہے۔ انھوں نے مصائب زندگی جھیلے۔ اپنی جانیں گنوائیں۔ مگر اپنے ملک پر قبضہ کرنے والوں کے قدم اکھاڑنے کی فکر میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتے رہے۔ وہ آزادی کے حامی تھے کہ میں بھی رہوں اور تو بھی رہ۔ انکے دعوے زیادہ مردانیت اور شجاعت کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ کہ رہیں تو ہم رہیں یا ہمارے ہم قوم۔ مگر غیر قوم ہرگز نہ قدم جمانے پائے۔ اُن کے کارنامے اس قابل ہیں کہ ہماری مذہبی تصانیف کا حصہ بنیں۔ اس وقت ہم صرف رانا پرتاپ کے سوانح زندگی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ جو اقبال اکبری کا جب تک زندہ رہا سامنا کرتا رہا۔ اس وقت جبکہ کوٹہ، جیسلمیر، آمیر، مارواڑ سبھی دیسوں کے فرماں روا یا تو دربار اکبری کے رتن یا گویا سرکار اکبری کے وظیفہ خوار بن چکے تھے یہ بیشۂ شجاعت کا شیر یہ دریائے استقلال کا نہنگ اور راہ ثبات کا کوہ رویکر و تنہا اُن کی مجموعی قوت کا مقابلہ کرتا رہا۔ پہاڑ کے دروں اور درختوں کے شگافوں میں چھپ چھپ کر اس انمول ہیرے کو دشمن کے دست تصرف سے بچاتا رہا۔ جسے قومی آزادی کہتے ہیں۔ اور جب مرا تو اسکے پاس بجز اپنی برق دم تلوار اور چند رفیقان جاں نثار کے

اور کوئی سامان شان و شکوہ نہ تھا جبکہ اور یار و مددگار تھے یا تو حق رفاقت ادا کر چکے تھے یا اقبال اکبری کا دم بھرنے لگے تھے۔ مگر یہ گمنامی اور بے سرو سامانی کی موت اس تخت زریں پر اور ان بدخواہوں کے جگمگٹ میں مرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے جو قوم کی آزادی۔ روح کی غلامی۔ اور ملک کی ذلت کے صلے میں ملے ہوں۔"

"نیشنل انٹیگریشن (قومی ہم آہنگی) کے خلاف اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ منشی جی کے یہ "الفاظ" وہ مبالغہ روی کے حامی نہ تھے .... ہماری مذہبی تصانیف کا حصہ بنیں" آج کے ہندو مسلم فسادات کے بنیادی اسباب کی تہہ تک پہونچاتے ہیں۔ منشی پریم چند اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ کو مذہبی رنگ دے کر فرقہ واریت کی آگ کو مستقل طور پر بھڑکانے کے لئے رانا کے کارناموں کو مذہبی تصانیف کا حصہ ہی قرار نہیں دیتے بلکہ گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں انکے نام کے مندر اور شوالے بھی بنوانا چاہتے تھے۔ مگر ایک مورخ کا تجزیہ کیا ہے وہ بھی پڑھ لیجئے ڈاکٹر تارا چند اپنی درج بالا تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"اگر مسلمان فاتح ہندوؤں کے مردوں کو قتل کرتے عورتوں کو قید کرتے، شہروں کو لوٹتے اور مندروں کو جلاتے تھے تو ہندو بھی فتح پانے کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ یہی سب کچھ کرتے تھے۔ مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ انکی لڑائی مذہبی لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ نہ تو مسلمان بادشاہ اسلام کی خاطر لڑتے تھے اور نہ ہندو راجہ اپنے دھرم کے لئے جنگ کرتے تھے دونوں کو ملک فتح کرنے اور اقتدار حاصل کرنے کی فکر تھی یہ بھی واقعہ نہیں تھا کہ لڑائی میں ہمیشہ ایک فریق مسلمان اور دوسرا ہندو ہو۔ بلکہ مسلمان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں میں آپس میں بھی لڑائیاں ہوتی تھیں مشکل سے کوئی ایسی جنگ ہوتی ہوگی جس میں ہندو سپاہی مسلمان سپہ سالاروں کی فوج میں نہ ہوں۔ یا مسلمان ہندوؤں کے جھنڈے تلے نہ لڑتے ہوں۔ ان لڑائیوں کا اثر غریب کسانوں اور پیشہ وروں پر بہت کم پڑتا تھا۔ خواہ وہ مسلمان بادشاہوں کی رعایا ہوں۔ یا ہندو راجاؤں کی۔ انکی حالت یکساں رہتی تھی۔

(تاریخ صفحہ ۲۴۸ - ۲۴۹)

مگر ہمارے منشی جی انگریزوں کی بھڑکائی ہوئی آگ کو ہوا دیکر اپنی الیجئی (LOYALTY) کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔"

(یہ الفاظ خود پریم چند کے ہیں)

مہارانا پرتاپ کے دادا رانا سانگا بابر کے حریف تھے۔ انکی تعریف و تعارف میں منشی جی کے قلم حقیقت رقم سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں۔

"گو رانا نے شکست کھائی مگر اپنے ملک کی محافظت میں اپنا خون بہا کر ہمیشہ کے لئے سرخ رو ہو گیا۔"

(باکمالوں کے درشن صفحہ ۳۳)

حالانکہ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں۔

"رانا سانگا نے بھی لڑائی کے لئے بڑی تیاریاں کیں۔ نہ صرف راجپوت فوجوں نے اس کا ساتھ دیا بلکہ افغان افسر بھی ابراہیم لودھی کے بھائی محمود کی سرکردگی میں رانا کے جھنڈے تلے لڑے ۱۵۲۷ء میں کھنواں (کنواہہ) کے مقام پر لڑائی ہوئی جسمیں راجپوتوں

اور افغانوں کی متحدہ فوجوں نے بُری طرح شکست کھائی۔ اگلے سال جب راتا اس شکست کا بدلہ لینے کی تیاریاں کر رہا تھا اس کے سرداروں نے جو جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اس کو زہر دیدیا۔ اس کے مرتے ہی میواڑ کی عظمت کا آفتاب غروب ہو گیا۔"

(ایضاً ص [illegible])

منشی جی نے انگریزوں کی لکھوائی ہوئی تاریخ کے سہارے ایسے بہت سے افسانے اور مضامین لکھے ہیں جن سے فرقہ وارانہ کی آگ بھڑکتی رہے۔ انھیں راتا سانگا کو ذہن میں رکھ کر انھوں نے اپنی سب سے پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" (سوز وطن کی پہلی کہانی) لکھی تھی۔ وہ راتا سانگا ہی کے دل کا لہو تھا جو دنیا کا سب سے انمول رتن قرار پایا تھا۔ اب ذرا بابر کی جاجیت کی کہانی بھی ڈاکٹر تارا چند ہی سے سن لیجئے۔

"۱۵۲۴ء میں پنجاب کا گورنر دولت خاں لودی خود مختار ہونا چاہتا تھا۔ اس نے ابراہیم لودی کی اطاعت چھوڑ دی اور بابر کو سلطان کے مقابلے میں اپنی مدد کے لئے بلایا۔ بابر تو خود ہی بہت عرصہ سے فتح کے منصوبے باندھ رہا تھا ـــــ اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سندھ ندی کو عبور کر کے سیدھا لاہور پہونچا۔ مگر اب دولت خاں کو گھبراہٹ ہوئی اور وہ بابر کے خلاف ہو گیا۔ ایسی حالت میں آگے بڑھنا غیر مناسب سمجھ کر بابر کابل واپس چلا گیا اور ہندوستان کو فتح کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ آخر اس نے ۱۵۲۵ء میں جاڑوں کے موسم میں پنجاب پر پھر فوج کشی کی اور دولت خاں کی فوج کو شکست [illegible] فاش دیکر وہ لاہور میں داخل ہوا۔ یہاں پہونچ کر اس نے دہلی پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی عرصہ میں اسے ابراہیم کے سرداروں کے اور راتا سانگا کے خطوط ملے جن میں امداد کا وعدہ تھا۔" (تاریخ [illegible])

لیکن راتا سانگا نے بابر کو دولت خاں اور [illegible] کی طرح دھوکہ دیا۔ مگر اب کے بابر ہر طرح تیار تھا۔ اس نے ابراہیم لودی کو پانی پت کے میدان میں [illegible] شکست دی۔ پھر راتا سانگا اور محمود لودی کی متحدہ فوج کو خانوان (فتح پور سیکری) کے میدان میں ۱۵۲۷ء میں شکست فاش دی۔ یہ تھے منشی پریم چند کے [illegible] مہارانا پرتاپ کے دادا راتا سانگا جو اپنے ملک کی حفاظت میں اپنا خون بہا کر ہمیشہ کے لئے سرخ رو ہو گئے۔"

جب [illegible] دہلی تو اس نے شہاب الدین محمد غوری کو بلایا۔ بہت بُرا کیا۔ راتا سانگا کو اپنوں سے کیا تکلیف پہونچی تھی کہ انھوں نے غیر کو دعوت دی اور مدد کا [illegible] دیا [illegible] میں یہ سوال میں ہر اس شخص سے کر رہا ہوں جو پریم چند کے [illegible] میں [illegible] دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ راتا سانگا کا بیٹا اودے سنگھ منشی جی کے نقطۂ نظر سے کپوت نکلا۔ چتوڑ جنگل کے حوالے کیا اور خود پہاڑیوں میں جا چھپا۔ جنگل کی کمان میں راجپوتوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ اور راجپوتانیوں نے آبرو کی حفاظت ناموس کے لئے آگ میں جل جانے کو ترجیح دی۔"

انگریزوں کی دہکائی ہوئی فرقہ پرستی کی آگ کو ایندھن فراہم کرنے کے لئے جتا کی کہانی بھی منشی جی بار بار دہراتے رہے ہیں۔ "راجپوتانی" (مطبوعہ زمانہ [illegible]) کے متن میں نہ لکھ سکے تو نوٹ لکھ کر اس کمی کو پورا کیا۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ چتوڑ کی ویرانی میں ستی ہونے والی راجپوت خاتونوں کی تعداد

سو ہزار تھی تو ۱۹۱۱-۲۵ء میں سارے راجپوتانہ کی آبادی کیا رہی ہوگی؟ ــــــ اس طرح منشی جی ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

اب "حب الوطنی" کی یہ جنگ تیسری نسل کی وراثت میں آئی۔ کمان مہارانہ پرتاپ کے ہاتھوں میں تھی۔ جنھوں نے "شیروں سے مردانگی اور پہاڑوں سے اٹل رہنے کا سبق سیکھا تھا جنہوں کے دلوں کو میواڑ کے دلیرانہ کاموں اور غیرت اور حمیت نے ٹھوکے دے دے کر ابھار رکھا تھا" جب میدانِ جنگ میں آیا تو اپنے مقابل "بانی قوم" اکبر کی طرف سے اپنے ہی عزیز واقارب کو پایا اور "حید حسنہ ٹی کی طرح پکار اُٹھا کیا میں اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑنے آیا ہوں"؟ گویا ہلدی گھاٹی کی لڑائی جس کی کمان راجہ مان سنگھ کے ہاتھوں میں تھی مہابھارت کی دوسری جنگ تھی۔ منشی جی کو اس سے بحث نہیں کہ اس دوسری مہابھارت میں کون کورو تھے؟ اور کون پانڈو۔ حق کس کے ساتھ تھا؟ فتح حق کی ہوئی یا ناحق کی؟ وہ تو بس انگریزوں کے "بی جمالو" تھے ؎

کریما بہ بخشائے برحال ما ۔۔۔ کہ ہستم اسیرے کمند ہوا

کا سبق پڑھنے کے بعد بھی مذہب کے تقدس کو پس پشت ڈال کر ہوا و ہوس کے اسیر تھے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ رانا اپنے وطن کی حفاظت اور اپنی "قوم" کو غلامی سے بچانے کے لئے جارح مسلمانوں سے جنگ آزمائی کرتے رہے جب کبھی ڈگمگائے تو بقول منشی جی دربار اکبری کے راجپوتوں ہی نے ہمت بندھائی اور وہ پھر گھوڑے کی پیٹھ پر نظر آئے۔ جب وقت موعود آیا تو کراہتے ہوئے فرمایا۔

"میری آتما کو تب چین ہوگا کہ تم لوگ اپنی اپنی تلواریں ہاتھ میں لیکر قسم کھاؤ کہ ہمارا یہ پیارا ملک ترکوں کے قبضے میں نہ جائے گا۔ تمھاری رگوں میں جبتک ایک قطرہ خون بھی باقی رہے گا تم اسے ترکوں سے بچاتے رہوگے۔ اور بیٹا امر سنگھ تم سے خاص طور پر التجا ہے کہ اپنے باپ دادوں کے نام پر داغ مت لگانا اور اپنی آزادی کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے رہنا مجھے خوف ہے کہ کہیں عیش پرستی اور آرام طلبی تمھارے دلوں پر غالب نہ آجائے اور تم میواڑ کی اس آزادی کو ہاتھ سے دیدو جس کے لئے میواڑ کے ہیروں نے خون بہائے ہیں"
(باکمالوں کے درشن ص ۲۴۰-۲۴۲)

اس طرح منشی جی نے مہارانہ پرتاپ کی خود ساختہ وصیت کو آج کی نئی نسل تک پہونچا دیا۔ جس کے نتیجے میں پوری نئی نسل اپنا توازن کھو چکی ہے۔ نام نہاد جمہوریت میں اکثریت کا غاصبانہ فائدہ اٹھانے کے باوجود "ترکوں" سے انتقام کا بازار آج بھی گرم ہے اور یہ خونخواری اتنی بڑھ چکی ہے کہ بھاگلپور، رامپور۔ دہلی اور سادھو پور میں "اپنوں" ہی کا خون پینے لگے ہیں۔ ایک دیوانہ اس قومی دیوانگی کی طرف جاہلوں کو نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کو متوجہ کرتا ہے تو اس کی بات کو یہ "دانشور" صرف اس لئے نہیں سنتے کہ وہ بھی "ترکی" ہے۔ اس کا انجام؟ ــــــ پھر غلامی جو ہر دروازے پر مزاحلوں سے لیس دستک دے رہی ہے۔ اللہ رحم فرمائے ہمارے حال پر۔ ہم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بودھوں کے ساتھ یہی سلوک ہو رہا تھا جو آج مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے

رہنے پایا۔ سماج میں ایسا خلفشار تھا کہ بھائی کی گردن بھی بھائی کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی تو غوری نے ترائن کی دوسری جنگ کی شکل میں قدرت کا فیصلہ نافذ کیا تھا۔ کیا یہ تاریخ کا زبردست المیہ نہیں کہ اسی ترائن میں ۱۱۹۱ء میں غوری ہار ہی کر نہیں بلکہ زخمی ہو کر جان بچا کر بھاگا تھا۔ مگر صرف ایک سال بعد اسی ترائن میں پرتھوی راج چوہان کا خاتمہ ہو گیا؟ آج بھی لوگ اپنے قومی کردار کا محاسبہ کرنے کے بجائے جے چند پر تبرّہ پڑھ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ قانونِ قدرت کو دو تہائی دوٹوں کی اکثریت سے بدلا نہیں جا سکتا۔ پٹھانوں نے جب اپنے مرتبہ اور منصب کو بھلا دیا تو مغلوں نے اُن سے یہ رتبہ چھین لیا۔ اور جب مغل بھول گئے تو انگریزوں نے شہزادوں سے دلی کے گلی کوچوں میں بھیک منگوا دیا۔ اور شہزادیاں جو کبھی زینتِ محل بنتی تھیں چکلہ خانوں کی زینت بننے پر مجبور ہوئیں۔ اور یہ کام اِس قوم نے کیا جس کو بقول مولانا ابوالحسن ندوی پیشاب کرنے کی بھی تمیز نہیں تھی۔

یہ قومی بدنصیبی ہی کی بات ہے کہ منشی پریم چند جیسے دانشور بھی اِس خدائی قانون کو نہ سمجھ سکے۔ سمجھا تو صرف یہ سمجھا کہ متحدہ قومیت کی کوشش فضول ہے۔ اور ساری عمر اِس متحدہ قومیت مشترکہ تہذیب اور اِس مشترکہ تہذیبی روایت کی جڑیں کھودتے رہے جسے مغلوں نے پروان چڑھایا تھا۔ جس کا ذکر ڈاکٹر تارہ چند کی زبان میں اُوپر آ چکا ہے۔

مضمون طویل ہو گیا۔ مگر جی چاہتا ہے کہ "راجہ ٹوڈر مل" اور "راجہ مان سنگھ" پر بھی دو چار جملے لکھ دوں راجہ ٹوڈر مل کی تعریف میں منشی جی لکھتے ہیں۔

"سپاہیوں کو ایسا بڑھاتا ہے ایسا للکارتا ہے کہ ہاری ہوئی لڑائی جیت لیتا ہے۔ یہ اُس کا گردہ ہے کہ ترک و تاتاری سپاہیوں کو بیوفائی جنکی گھٹی میں پڑی ہے کہیں دوستانہ فہمائش سے کہیں ڈرادے سے کہیں لالچ سے قابو میں رکھتا ہے۔" (باکمالوں کے درشن ص ۲۸)

میں نے اُوپر لکھا ہے کہ منشی جی فرقہ واریت کے شعلوں کو بھڑکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح وہ مسلمانوں کو ناقابلِ اعتبار اور بے وفا ثابت کرتے رہے ہیں "پنچ پرمیشور" (۱۹۱۶ء) میں کوؤں اور طوطوں کی علامت استعمال کی گئی ہے۔ "ڈگری کے روپئے" (۱۹۲۵ء) میں کیلاش کو نعیم پر مضحکہ خیز حد تک اعتبار نہیں ہے۔ اور "معافی" (۱۹۲۱ء) میں تو صاف صاف کہہ ہی دیا گیا ہے کہ "مسلمانوں پر جس روز اتنا اعتبار کرونگا۔ اس روز عیسائی نہ رہوں گا" اور جو دل کی بات افسانہ میں عیسائی بن کر کہی گئی تھی راجہ ٹوڈر مل کے بیان میں (۱۹۳۲ء) صاف صاف کہدی گئی کہ "بیوفائی مسلمانوں کی گھٹی میں پڑی ہے"۔

منشی جی تبلیغ اسلام کو محض تلوار کے سہارے بھی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو مبلغین اسلام کو زندگی کے ہر موڑ پر بڑی گھناؤنی شکل میں دیکھتے ہیں۔ کہیں مسلمان تانگہ والے سے ڈراتے ہیں کہ وہ ہندو سواریوں کو قاضی زور آور حسین کے سپرد کر دیتا ہے (دینداری ۱۹۲۶ء) اور کہیں مسلمان نام کی رنڈیوں سے بھڑکاتے ہیں کہ وہ پریم ناتھ کو الفت حسین بنا دیتی ہے (شدھی ۱۹۲۹ء) اور راجہ مان سنگھ کے بیان میں اکبر کو ان لفظوں میں ملزم گردانتے ہیں۔

"راجہ ٹوڈر مل کی طرح راجہ مان سنگھ بھی مرتے دم تک اپنے آبائی مذہب پر راسخ رہا۔ مگر تعصب سے اسکی فطرت کو ذرہ بھر بھی لگاؤ نہ تھا۔ متعصب آدمی کا دورِ اکبری میں عروج پانا ناممکنات سے تھا۔ اکبر نے راجہ

ایک بار تبدیلی مذہب کی تحریک کی تھی۔ مگر راجہ نے ایسا برجستہ جواب دیا کہ بادشاہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔" (باکمالوں کے درشن صفحہ ۵۲)

تاریخ شاہد ہے کہ اکبر کے مذہبی عقائد بے حد کمزور تھے۔ دلی کے تاج و تخت نے اُسے اسلام سے بہت دور کر دیا تھا۔ وہ قومی ہم آہنگی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں قومی یکجہتی کا داعی تھا اسی لئے ڈاکٹر تارا چند نے اُسے بانی قوم لکھا ہے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی وجود کو سیاست کی چکی میں پیس کر یک جان کر دینا چاہتا تھا مگر بادشاہ تھا فقیر نہیں اس لئے دین الٰہی دلوں میں جگہ نہ پا سکی بلکہ تاریخ کی زینت بن کر رہ گئی۔

منشی جی نے ایک تاریخی واقعہ کو بڑی خوبصورتی سے صرف دو لفظوں "تبدیلی مذہب" میں پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اکبر بھی اسلام کا مبلغ تھا۔ وہ دین الٰہی بھی کہہ سکتے تھے۔ مگر اس سے ان کے موقف کو نقصان پہونچتا تھا۔ اس لئے اس حقیقت کو چھپا گئے۔

تاریخ میں یہ واقعہ اس طرح آیا ہے کہ اکبر نے راجہ مان سنگھ کو دین الٰہی قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ (ممکن ہے راجہ ٹوڈرمل کو بھی دی ہو) اور راجہ مان سنگھ کا جواب تھا کہ اگر آپ اسلام لانے کا حکم دیں تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں مگر دین الٰہی قبول نہیں۔ بھلا اکبر اسلام لانے کا حکم کیوں دیتا؟ شاید ٹوڈرمل اور مان سنگھ جیسے اکابرین حکومت کے جواب سے ہی اکبر مایوس ہوا اور دین الٰہی کا خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ہم "مہابلی" بن کر بھی تخت سے نیچے آئے۔ مذہبی زینوں سے نیچے اُترے قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھے اور آپ سے قریب تر ہونے کے لئے ترک اسلام کیا مگر "منشی پریم چند" ہم سے دور ہوتے رہے۔ پریم چند کے قلم حقیقت رقم میں سیاہی کی ایک بوند بھی نہ تھی کہ وہ خود اسکولی بچوں کے سامنے اکبر کو پیش کر سکتے۔ ●●

۷۸۶

اُردو اور پریم چند

"مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نہ نقل کر لی۔ اُردو زبان پر ایسے ہی وقت فخر آتا ہے۔"

(ہم خرما و ہم ثواب)

"مجھ کو رہ رہ کر اپنے اوپر کرودھ آتا ہے کہ میں نے سارا اسپیچ کیوں نہ نقل کر لی۔"

(پریما)

اوپر دی ہوئی مثالوں سے اتنا تو صاف ہو جاتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مصنف نے اُردو اور ہندی کے قارئین کے مزاج کو خاص طور پر ذہن میں رکھا ہے۔ دوسری مثال میں ثواب والے کو جو غصہ اُردو پر آیا ہے وہ ہندی پر نہیں آیا۔ اس سے مصنف کے دل میں ہندی کے لئے نرم گوشے اور قرابت کا جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہی جذبہ ہمدردی ثواب والے کو آگے چل کر اُردو سے ہندی میں لائی ہو۔

(اقتباس یا تبرا ص ۱۲۴)

پریم چند نے "سوز وطن" کی ایک کاپی "سرسوتی" کے اڈیٹر پنڈت مہاویر پرشاد دیویدی کو بھیجی تھی۔ اور اُن سے ریویو شائع کرنے کی درخواست کی تھی۔ یہ نسخہ آج بھی کاشی ناگری پرچارنی سبھا میں محفوظ ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ۷۰ برس تک پریم چند کے کسی قاری یا محقق نے اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ورنہ پریم چند کی سوانح میں یہ لکھا جا سکتا تھا کہ انھوں نے سنہ ۱۹۰۷ء سنہ ۱۹۰۸ء سے ہی ہندی پڑھنے والوں سے قریب آنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

(کمل کشور گوئنکا۔ کادمبنی جولائی ۱۹۸۰ء)

مانک ٹالا ؛

پریم چند اور اُردو کا "ریپ"

میں نے اپنے پچھلے سارے مضامین میں جگہ جگہ اس بات کا ثبوت پیش کئے ہیں۔ اور ہر جگہ اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ جناب ابو محمد شبلی صاحب نے پریم چند کی تحریروں کو' اپنے جھوٹے۔ غلط اور گمراہ کُن موقف کی تائید میں جان بوجھ کر سیاق و سباق سے کاٹ کر اور اپنی طرف سے نئے معنی پہنا کر پیش کیا ہے۔

اُن کی اس انتہائی شرمناک حرکت کا ایک اور ثبوت پیش کرتا ہوں۔

شبلی صاحب نے عظیم آباد ایکسپریس (8 ستمبر ۱۹۸۱ء) میں اس طرح گوہر فشانی فرمائی ہے ـــــ " قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی وہ اُردو کے مخالف ہو چکے تھے۔ اُنکے ابتدائی ناول "ہم خرما و ہم ثواب" کے یہ الفاظ ثبوت کے لئے کافی ہیں ـــــ "جناب من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساوی تقریر کیوں نقل نہ کر لی۔ اُردو زبان میں ایسے ہی وقت میں غصہ آتا ہے ـــــ اور یہ غصہ انہیں پر بیا میں ہندی زبان پر نہیں آتا۔"

شبلی صاحب نے پریم چند کی جس قدر تحریر نوٹ کی تھی۔ اُسے پڑھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ پریم چند نے مکمل بات نہیں کہی ہے۔ اس سے آگے یا پیچھے ضرور کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔ جسے شبلی صاحب چھپا رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کی تحریر پڑھ کر میں نے عرض کیا تھا ـــــ "شبلی صاحب کی ایک چھوٹی سی خراب عادت ہے اپنی مطلب براری کے لئے وہ اکثر باتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں اس لئے وہ ہم خرما و ہم ثواب کے پہلے چار صفحے چھپوانے کی تکلیف گوارہ فرمائیں۔ تاکہ قارئین کو بھی پتہ چل جائے کہ انھوں نے غریب اُردو پر کس قدر دست درازی فرمائی ہے۔ ـــــ"

میں نے شبلی صاحب کو یہ بھی آفر دی تھی کہ اگر ہم خرما و ہم ثواب" اُن کے پاس ہے تو میں اُسے "نادر و نایاب" کتابوں کی قیمت پر خریدنے کو تیار رہوں۔

میرا مفصل مضمون عظیم آباد ایکسپریس میں 22 - 29، مارچ ۱۹۸۱ء) میں چھپا تھا اور میری استدعا پر یہی مضمون "فروغِ اُردو" کے نومبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع کیا

گیا تھا۔ اس مضمون کے جواب میں شبلی صاحب نے بہت سی بے معنی اور فروعی باتیں تو کہی ہیں لیکن مندرجہ بالا عرض داشت کو جان بوجھ کر گول کر گئے ہیں۔ کیونکہ اُن کے من میں کھوٹ تھا۔

شبلی صاحب فرماتے ہیں کہ پریم چند قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی اُردو کے مخالف ہو چکے تھے۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی خود شبلی صاحب نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پریم چند کو ہر ناجائز طریقے سے فرقہ پرست ثابت کر کے دکھائیں گے۔ پریم چند کو فرقہ پرست ثابت کرنے سے پہلے اُردو ادب یا صحافت میں شبلی صاحب کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے شہرت حاصل کرنے کی کوشش میں یہ بھی نہ سوچا کہ وہ شہرت کی بلندیوں کی طرف پرواز فرما رہے ہیں یا فرقہ پرستی کے قعرِ مذلت میں لڑھک رہے ہیں۔

پریم چند کا مندرجہ بالا اقتباس نوٹ کرتے وقت شبلی صاحب نے سوچا ہوگا کہ "ہم خرما و ہم ثواب" کی اس قدر پُرانی کتاب کسی کو کہاں سے دستیاب ہو سکے گی، اس لئے اُنکی اس غلط بیانی کی تردید نہ ہو سکے گی۔ لیکن شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے اسکی ایک فوٹو کاپی حاصل کر لی ہے۔

میری درخواست تو شبلی صاحب سے پہلے چار صفحے نقل کرنے کے لئے تھی۔ لیکن شبلی صاحب کے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑنے کیلئے صرف چار سطریں ہی کافی نکلیں۔ یہ سطریں نوٹ کرنے سے پہلے اس ناول کا پسِ منظر پیش کرنا چاہتا ہوں ——

امرت رائے (اس ناول کا ہیرو) ایک جذباتی انسان ہے۔ وہ اصلاحِ معاشرت کے بارے میں ایک انتہائی دھواں دھار تقریر ختم کر آیا ہے اور اپنے گھر کے برآمدے میں گھوم پھر کر انتہائی بے قراری کے عالم میں اس تقریر کے الفاظ پر غور کر رہا ہے۔ اور اصلاحِ معاشرت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس راہ میں اپنی محبت قربان کر ڈالنے کیلئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اتنے میں اس کا دوست دان ناتھ آتا ہے۔ اور وہ اس سے بھی اس قسم کی باتیں کہتا ہے دان ناتھ اس تقریر کا خلاصہ جاننا چاہتا ہے۔ امرت رائے نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اس کا خلاصہ نوٹ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ امرت رائے اس خلاصے کو انتہائی جوشیلے انداز میں پڑھ کر سُنانے کے بعد کہتا ہے ——

"جنابِ من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نقل نہیں کر لی۔ اُردو زبان پر ایسے ہی وقت غصہ آتا ہے۔ کاش انگریزی تقریر ہوتی تو صبح ہوتے ہی تمام روزانہ اخباروں میں شائع ہو جاتی۔ نہیں تو کہیں خلاصہ رپورٹ چھپے تو چھپے۔"

یہ ہے پریم چند کا وہ مکمل جملہ جس کے انتہائی ضروری آدھے حصے کو چھپا کر شبلی صاحب پریم چند کو اُردو کا دشمن ظاہر کر رہے ہیں۔ حالانکہ پریم چند نے اُردو زبان کی بے قدری کا رونا رویا ہے نہ کہ اُردو سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔

لیکن شبلی صاحب نے اپنی انتہائی تنگی فرقہ وارانہ ذہنیت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے پریم چند کی تحریر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا پریم چند نے بے چاری بے بسی و بے یار و مددگار اُردو کا سرِ بازار ریپ (RAPE — زنا بالجبر) کر دیا ہے۔

ایک طرف تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے افضل جہاد ہے۔ اور دوسری طرف شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگ جھوٹ اور فتنہ انگیزی کو ہوا دیکر مجاہد بننے کی دُھن میں اسلام اور اسلام کی

باقی صفحہ ۳۲

غافل انصاری سنسار پوری

پریم چند کے ناولوں کے سلسلے میں چند غلطیوں کا ازالہ

تحقیق کی کسوٹی پر

ادبیات پریم چند پر مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر رضا کی تصنیف "پریم چند فن اور تعمیر فن" کی ورق گردانی کا موقع ملا۔ اس کتاب میں سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ پریم چند اُردو کے ادیب تھے۔ انھوں نے اپنی تمام تخلیقات پہلے اُردو میں قلمبند کیں۔ اور بعد میں دوسروں نے انھیں ہندی کا جامہ پہنایا۔ بعض جگہ انھوں نے قیاس آرائی سے بھی کام لیا ہے۔ اور کہیں کہیں معترضین کے اعتراضات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ ہندی اُردو متنوں کے تقابلی مطالعہ میں بھی ان کی اسی ذہنیت کی عکاسی ملتی ہے۔ باوجود ان خامیوں کے اس کتاب میں بیش قیمت معلومات درج کی گئی ہیں۔

اگست ستمبر ۱۹۸۲ء کے ماہنامہ فروغ اردو میں ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کا ایک تحقیقی مقالہ "پریم چند کے ناولوں کے سلسلے میں چند غلطیوں کا ازالہ" شامل ہے۔ جس کے ابتدائی پیراگراف میں موصوف نے ایک خطرہ سے آگاہی دی ہے کہ ..... "بہت کچھ رطب و یابس تحقیق کے نام چھپ کر .... پریم چند تحقیق میں غلط سلط شامل ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں بعد یہی باتیں سند کے طور پر پیش کی جائیں۔" یا یہ کہ "بہت سے اُردو کے ماہرین پریم چند جو تفصیلات کی تلاش درکنار پریم چند کے اصل ناولوں اور کتابوں تک بھی نہیں پہونچے ہیں، ادھر اُدھر کے اقتباسات کو بنیاد بنا کر بہت حتمی فیصلہ کر دیئے ہیں جن سے پریم چند کا مطالعہ کرنے والا طالبعلم خاصہ بھٹک سکتا ہے۔"

مقالہ کے اول اقتباس کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ مضمون نگار پریم چند کے ناولوں کے اُردو مسودات پر مبنی اطلاعات پیش کر کے ماہرین پریم چند کے تمام مفروضات کا قلع قمع کر دیگا لیکن موصوف نے "ہم خرما و ہم ثواب" کے حد اڈیشنوں اور "پریما" کے ایک اڈیشن کے سرورق کی اطلاعات

درج کرنے کے علاوہ بقیہ پورے مقالہ میں وہی کیا۔ جو ابتک
ماہرین اور غیر ماہرین پریم چند کرتے آئے ہیں یعنی وہی کچھ جس سے
خبردار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا سارا زور قلم صفورضا
کی تصنیف "پریم چند فن اور تعمیر فن" میں درج مرکزی خیال کہ
پریم چند اُردو کے ادیب تھے، کے خلاف پریم چند ہندی کے
ادیب تھے، ثابت کرنے پر صرف کر دیا۔

سید صاحب نے اپنی سمجھ سے پریم چند کی ہندی
نویسی کی صلاحیت پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں پریما
کی اشاعت کو پریم چند کے سنہ ۱۹۰۵ء کے مکتوب سے ثابت کیا
اور جو ٹائیٹل پیج کی عبارت پیش کی۔ اس سے پریما کی اشاعت
سنہ ۱۹۰۷ء میں ہونا ثابت ہوا۔ موصوف نے ثبوت کو کمزور پاکر
یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پریما کی تخلیق سنہ ۱۹۰۴ء میں ہوئی اور
اشاعت سنہ ۱۹۰۷ء میں۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں پریما کی تخلیق کا ثبوت موصوف
پیش نہ کر سکے کرتے کہاں سے؟ پریم چند نے پریما کا سن تصنیف
سنہ ۱۹۰۴ء بتایا ہے۔ ونود شنکر ویاس کے نام لکھے مکتوب میں
پریم چند نے لکھا "پہلے سنہ ۱۹۰۴ء میں پریما لکھی" (پریم چند کے خطوط ص ۱۹۵)
اب اگر اس پریما کو ہندی کی تصنیف مان لیا جائے تو سنہ ۱۹۰۴ء کی
ابتدائی تصنیف ہندی میں لکھنے کے بعد وہ سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء تک دوسری
کسی تصنیف کو ہندی میں پیش نہ کر سکے۔ دوسرے یہ کہ سات
برس "پریما" کا مسودہ کس حال میں کہاں رہا؟

ڈاکٹر صاحب نے پریم چند کا جو سنہ ۱۹۱۳ء کے مکتوب
کا حوالہ دیا ہے کہ پریم چند کے نگم ہندی ڈیپارٹمنٹ کے اڈیٹر
بننا چاہتے تھے، سے ان کی ہندی ذہنیت کی تو عکاسی ہوتی ہے
ہندی نویسی کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۱۳ء کے مکتوب میں
پریم چند نے نگم کو لکھا "پنڈت وشو ناتھ جی اخبار نکالنے
والے ہیں اچھی خبر ہے۔ میں اپنی موجودہ حالت کے اعتبار سے
روزانہ اخبار کے لائق کسی طرح نہیں ہوں۔ پھر اُردو ہندی
دونوں کا بار مجھ سے کیونکر چلے گا؟" (پریم چند کے خطوط ص ۳۳)
پریم چند نے وشیہ دھنی اتک کے لئے جو مضمون ہندی میں لکھا تھا
اس کے بارے میں اپنی الگ رائے کا اظہار بھی کیا تھا، یہ
پریم چند کی صاف گوئی تھی جس کو سید صاحب نے انکا انکسار مان لیا۔

ڈاکٹر صاحب نے سنہ ۱۹۱۳ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے حوالے دینے
کے بعد پریم چند کے ۲۰ فروری سنہ ۱۹۱۵ء کے خط کا حوالہ پیش کیا
جس میں انھیں پریم چند کی ہندی نویسی کی جھلک دکھائی دی۔
بقول موصوف "جس میں ہندی کے ثقیل الفاظ کا خاصہ استعمال
کیا گیا ہے" وہ خط ذیل میں پیش ہے۔

"دو مہینے سے زیادہ ہوا کہ مجھے اپنے اپنیاس
بانند دیہی کی آپکے پاس اولوکن نارتھ بھیجنے کا سو بھاگیہ
ہوا تھا۔ اس آشا میں کہ آپ میرے لئے ایک پرکاشک
جٹانے کی کرپا کریں گے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ دسمبر کی
آٹھ تاریخ تھی جب میں نے کتاب آپ کے پاس بھیجی
تھی۔" (بحوالہ چٹھی پتری ج اول ص ۱: فروغ اردو ص ۲۷)

اب یہی خط "پریم چند فن اور تعمیر فن ص ۱۴۱ کے حوالہ سے پیش ہے:

"دو ماہ سے زائد ہوئے کہ مجھے اپنے ناول کا مسودہ
آپکی خدمت میں آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیجنے کا شرف
حاصل ہوا۔ امید کہ آپ میرے لئے ایک ناشر مہیا
کرنے کی زحمت کریں گے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ
وہ دسمبر کی ۸ تاریخ تھی جب میں نے آپکو کتاب
بھیجی تھی" (بحوالہ چٹھی پتری ج ۱ ص ۱ پریم چند
اور تعمیر فن ص ۱۴۱)

ڈاکٹر عقیل صاحب کی "فن اور تعریف" میں درج اس خط پر نظر
نہیں پڑی، ایسا سوچنا بدگمانی ہوگی۔ [illegible] ضرور ہے کہ انھوں نے
خط کے اس اردو متن کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ایک ہی حوالے سے
دو لوگوں نے یہ خط نقل کیا، ایک ٹھیٹھ ہندی میں دوسرا اردو
فارسی الفاظ سے بوجھل۔ عقیل صاحب نے اسے پریم چند کی ہندی
نویسی کے ضمن میں نقل کیا لیکن جعفر رضا نے اس خط کی اصلیت بھی
بیان کردی۔ اس خط سے قبل کی عبارت بھی ملاحظہ فرمائیے:

"منشی دیا نرائن نگم کو ۱۳ جنوری ۱۹۱۵ء کو لکھتے
ہیں بڑے اشتیاق سے منتظر ہوں کہ آپ نے میرا
ناول ابھی تک پڑھا ہے یا نہیں۔ اور پھر بیس دن
کے بعد الہ آباد سے انگریزی میں خط لکھا کہ دو ماہ
سے زائد ہوئے......"

اس صریح عبارت کے بعد یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے
کہ پریم چند کا مذکورہ مکتوب انگریزی میں تھا۔ جس کا ترجمہ جو
ہندی عبارت عقیل صاحب نے نقل کی ہے وہ پریم چند کی
نہیں، مترجم (امرت رائے / مدن گوپال) کی ہے۔ پریم چند کا
اصل خط انگریزی میں ہے جس سے نہ ان کی اردو نویسی کو تقویت
ملتی ہے نہ ہندی نویسی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

مضمون کا قاری عقیل صاحب سے یہ جاننا چاہتا ہے
کہ پریم چند نے کتنے مکتوب نگم کو ہندی میں لکھے، کیا یہ واحد
خط ان کی نظر سے گزرا یا اور بھی؟ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک کے
پریم چند کے ہندی مکتوب، ہندی تخلیقات، ہندی تراجم وغیرہ
جو ان کی نظر سے گزرے ہوں۔ ان کی فہرست مع تفصیلات
پیش فرمادیں تو یہ ان کے دعوے کی دلیل بھی ہوگی۔ اور پریم چند
پر مطالعہ کرنے والوں کو تشفی بھی۔ انھوں نے پریم چند کے ستمبر ۱۹۱۵ء
کے مکتوب کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی ناکام سعی کی ہے کہ وہ ہندی
میں مضامین لکھتے تھے اور نگم کو بھیجتے تھے کہ وہ ٹرانسلیٹ کر کے بھیج دیں۔
موصوف کو ایسے مضامین کی فہرست بھی پیش کرنا چاہیے تھی۔ احتمالات
ثبوت نہیں بن سکتے۔ پریم چند کے مکتوبات سے مستقبل کے صیغے
مثلاً "لکھوں گا"، "دوں گا"، "اگر راضی ہوں تو بھیج دوں"، "پورا
کر ڈالوں" وغیرہ وغیرہ سے احتمالات کا اظہار ہوتا ہے، ثبوت
نہیں۔ احتمالات پر ثبوت کا قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔ یہ پریم چند
کی ہندی نویسی کا مسئلہ نہیں، ڈاکٹر صاحب کی خوش فہمی ہے۔

"تجربہ" پر ہندی مضمون کا ترجمہ پریم چند نے اردو میں
کیا اور اسی طرح دوسرے تراجم ہندی سے اردو میں کیے یہ ان کی
ہندی نویسی نہیں، اردو نویسی ہے۔ جلوۂ ایثار کا جو ہندی ترجمہ
۱۹۲۱ء میں چھپا اس کے پریم چند کی ہونے کے بارے میں خود
موصوف کو اشکال ہے۔ "جلوۂ ایثار ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد
سے شائع ہوا جس کا ہندی ترجمہ بعد کو ۱۹۲۱ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ
کس نے کیا یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔"
(فروغِ اردو اگست ۱۹۸۱ء ستمبر ص ۱۱)

اس حقیقت کے اظہار کے بعد وہ ترجمہ کے بنیادی اصولوں کے
پیشِ نظر اسے پریم چند کا ترجمہ مانتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

"لیکن ہندی اردو ناولوں میں اتنی تبدیلیاں ہیں کہ
ان میں ترمیم و اضافوں کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا
ہے کہ یہ ترجمہ پریم چند کا ہو سکتا ہے کیونکہ ترمیم
و اضافے کا حق مصنف کی زندگی میں دوسروں کو نہیں
پہونچتا۔ اگر ترمیم و اضافے دوسروں کے کیے ہوئے ہیں
تو وہ ترجمہ دوسروں کی تصنیف ہوگی۔ صرف پریم چند
اس کے مصنف کیسے ہو سکتے ہیں۔ مترجم کا بھی اس میں

نام ہونا چاہیئے۔ (فروغ اردو صلا)

موصوف نے ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان کیا کہ مصنف کی زندگی میں ترمیم و اضافے کا حق مترجم کو حاصل نہیں۔ مصنف کے مرنے کے بعد ترجمہ کے نام پر ترمیم و اضافہ کا حق مترجم کو کہاں سے مل جاتا ہے جبکہ اس متن پر مصنف کی نظر ثانی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت موصوف نے پیش نہ کیا۔ ترجمہ پر مترجم کا نام ہونا چاہیئے بجا ارشاد ہے۔ لیکن کیا پریم چند کی اردو ہندی کسی کتاب پر مترجمین کے نام درج ہیں؟ کیا پریم چند کی کسی اردو تصنیف پر اقبال ورما سحر کا نام بحیثیت مترجم درج ہے؟ اگر نہیں تو ان کے بارے میں موصوف کی رائے کیا ہے؟

چونکہ ہستی پر سحر کا اور رنگ بھومی میں شیو پوجن سہائے کا تصرف پریم چند کے خطوط کی روشنی میں ثابت ہے۔ بہتر ہے ہندی تخلیقات شیو پوجن سہائے کے نامۂ اعمال میں درج کرا دی جائیں اور اردو تخلیقات سحر کے حوالہ کر دی جائیں۔ ویسے پریم چند کی ہندی تخلیقات کے متنوں میں ترمیم و اضافے کا عمل بھی ملتا ہے اور مترجمین و معاونین کے نام بھی غائب ہیں۔

ڈاکٹر عقیل صاحب نے ان اردو تخلیقات کے اردو تخلیقات ہونے پر اشکال ظاہر کیا ہے۔ جن کے حتمی ثبوت ابھی محدود ہیں۔ فرماتے ہیں "معلوم نہیں کشنا اردو میں تھا یا ہندی میں..."
(فروغ اردو صلا)

جعفر رضا لکھتے ہیں۔ "ہمارے نزدیک کشنا ان کا تیسرا ناول ہے۔ جو ۱۹۰۷ء میں بنارس کے میڈیکل ہال پریس میں طبع ہوا۔ کشنا کا پہلا اشتہار اگست ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں شائع ہوا۔"
(پریم چند فن اور تعمیر فن ص ۱۴۲)

جعفر رضا کے مندرجہ بالا بیان کو "زمانہ" اگست ۱۹۰۷ء" سے ملا کر اس کی تصدیق یا تردید کی جا سکتی تھی۔ کشنا کے اردو یا ہندی تصنیف ہونے کا خدشہ بھی رفع ہو جاتا۔ موصوف نے نہ جانے کیوں چشم پوشی کی۔

"ہم خرما و ہم ثواب" کے سرورق پر "مصنفہ منشی نواب رائے صاحب مصنف کشنا وغیرہ" درج ہے۔ یہ "وغیرہ" "روٹھی رانی" کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جس کی اشاعت "زمانہ" میں اپریل ۱۹۰۷ء سے اگست ۱۹۰۷ء تک قسط وار ہوئی۔ جعفر رضا نے بتایا۔ (پریم چند فن اور تعمیر فن ص ۱۴۷) البتہ مسیدا صاحب نے جس "روٹھی رانی" کے دو قسط کئے اس پرسن اشاعت نہ ہونے کی اطلاع دی ہے۔ راقم الحروف کے پاس "زمانہ" کا اپریل مئی ۱۹۰۷ء کے شمارے میں شائع "روٹھی رانی" کی اول قسط کے صفحات ہیں۔ جو اس شمارے کے ص ۲۸۱ سے ص ۳۱۲ پر مشتمل ہیں۔ اس میں سات عنوانات ہیں (۱) شادی کی طیاری (۲) شادی (۳) رنگ میں بھنگ (۴) رانی کی ہٹ دھرمی (۵) مالدیو اور اسکی سوکنیں (۶) منانے کی کوششیں۔ (۷) رانی پھر روٹھ گئی۔ کل سات باب ہیں۔ آخری صفحہ پر داہنی جانب قوسین میں "باقی آئندہ" لکھا ہے اور بائیں طرف کچھ جلی قلم سے "نواب رائے" تحریر ہے۔ اندر کے صفحات پر فٹ نوٹ بھی ہیں بلکہ ص ۳۰۲ اور صفحہ ۳۰۳ پر غلطی سے ص ۲۹۴ اور ص ۲۹۵ چھپ گیا ہے۔

عقیل صاحب کی یہ گرفت صحیح ہے کہ "گوشۂ عافیت" کے اصل مسودہ کا ماخذ جعفر رضا کو ضرور بتانا چاہیئے تھا جس سے جعفر رضا نے پہلو تہی کی ہے۔ پریم چند چٹھی پتری ج ا ص ۱۳۱ کے حوالہ سے جعفر رضا نے "پریم چند فن اور تعمیر فن" ص ۱۸۲ پر ذیل میں درج اطلاع پیش کی ہے:

" میری کئی کتابیں نکلنے کو تیار ہو گئیں۔ پریم پچیسی ختم

ہوگی۔ گوشۂ عافیت محض اس لئے ناتمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں۔"

اس بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے گوشۂ عافیت ادھورا پڑا ہے۔ لیکن گوشۂ عافیت میں کیا ادھورا ہے، اس پر روشنی نہیں پڑتی۔ پریم چند کا دوسرا مکتوب بھی ناتمام ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ لیکن ناتمامی کیفیت کی صراحت اس سے بھی نہیں ہوتی:

"........ اگر وہ راضی ہوں تو گوشۂ عافیت بھی ان سے پورا کرا ڈالوں اور کچھ نئی کہانیوں کا ترجمہ بھی" ... (پریم چند کے خطوط ص ۲۷۹)

اس خط میں درج بیان "کہانیوں کا ترجمہ بھی" قاری کے ذہن کو گوشۂ عافیت کے ترجمہ کی طرف موڑتا ہے۔ لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اگر لفظ "ترجمہ" گوشۂ عافیت کے ساتھ ہوتا اور کہانیوں کی بابت نہ بھی ہوتا تو کہانیوں کا ترجمہ ہی مراد لیا جاتا لیکن گوشۂ عافیت کا فعل "پورا کرانا" اور کہانیوں کا "ترجمہ" ایک زمرے میں نہیں آتے۔ پریم چند کے دوسرے مکتوبات سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ پریم چند نے ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء کو نگم کو جلوۂ ایثار کی تخلیق کی اطلاع کے ساتھ "بازارِ حسن" کے تخلیق کا سن لکھا تھا:

"۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار لکھا اور ۱۹۱۸ء میں بازارِ حسن لکھا" (پریم چند کے خطوط ص ۱۲۵)

انھوں نے نگم ہی کو سیوا سدن کے بارے میں اطلاع دی تھی: یہ اطلاع ۴ر اپریل ۱۹۱۹ء کی ہے:

"یہ بازارِ حسن کا ترجمہ ہے۔ بازارِ حسن اب صاف کر رہا ہوں" (پریم چند کے خطوط ص ۷۹)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بازارِ حسن کی تخلیق ۱۹۱۸ء میں ہوئی اور اس کا مسودہ ۱۹۱۹ء میں صاف کیا گیا۔ جو پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے سال سوا سال ادھورا پڑا رہا۔ گوشۂ عافیت کے بارے میں بھی یہی ہوا۔

اگر "ناکام" کا متن اردو میں گوشۂ عافیت اور ہندی میں پریم آشرم بند تو دونوں ہی تخلیقات پریم چند کی طبع زاد تصنیف ہیں۔ امتیاز علی تاج کے نام پریم چند کا مکتوب مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۲۲ء ثبوت میں پیش ہے۔

"...... کیا کروں کئی کام چھیڑ رکھے تھے۔ سبھی ادھورے پڑے ہوئے ہیں۔ "ناکام" نامکمل۔ اس کا ہندی ترجمہ مکمل ہے۔ چار مختصر کہانیاں ادھوری پڑی ہیں اور ایک ڈرامہ زیر تجویز" (پریم چند کے خطوط ص ۱۱۱)

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوشۂ عافیت (ناکام کے نام سے) اردو میں لکھا گیا۔ ساتھ ہی اس کا ہندی ترجمہ خود پریم چند نے کیا۔ ناکام کے ہندی متن کا ڈرافٹ صاف کر کے پریس کے حوالے کر دیا گیا لیکن پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے گوشۂ عافیت کا مسودہ صاف نہ کیا گیا یا تھوڑا بہت صاف کیا گیا۔ تھوڑا بہت ادھورا پڑا رہا۔ بعد میں اسے پریم چند سحر سے پورا کرانا چاہتے تھے۔ اس سے آگے کیا ہوا قطعی طور پر خاموش ہیں۔ سحر راضی ہوئے یا نہیں، پریم چند ان کے مطالبہ پر ان سے گوشۂ عافیت پورا کرا سکے یا نہیں، کچھ پتہ نہیں۔ احتمال کو ثبوت مان لینا تحقیق نہیں ہو سکتی۔

جو گانِ ہستی کو رنگ بھومی کا ترجمہ ثابت کرنے والے پریم چند کے دو مکتوب نقل کرتے ہیں۔ اول وہ جس میں سحر کے ہندی صفحات پر آٹھ آنہ فی صفحہ کی اجرت کا مطالبہ کا ذکر ہے۔ دوئم وہ جس کے مطابق حضرت سحر دو سو روپیہ (یعنی تین آنہ چار پائی فی صفحہ) اجرت پر راضی ہو گئے۔ ان خطوط کا حوالہ پیش کرنے والے پریم چند کا مکتوب بنام نگم مورخہ ۱۷ جولائی

کا نصف ثانی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جو پریم چند نے ترجمہ کے حق المحنت کے سلسلہ میں تحریر کیا تھا:

"اردو تاریخ کے ترجمہ کے متعلق کیا عرض کروں۔ آپ کا فیصلہ میرے فیصلہ سے بہتر ہوگا۔ اگر زمانہ کی تقطیع کے صفحات ہیں تو دو روپیہ فی صفحہ اجرت کسی طرح زیادہ نہیں۔ اس سے کم میں ترجمہ کرنا میرے حق میں نقصان کا باعث ہوگا۔ اگر منظور فرمائیں تو میرے پاس مسودہ بھیج دیں۔ اپنا ناول جاڑوں میں شروع کروں گا۔ برسات میں ترجمہ ختم کر ڈالوں۔" (پریم چند کے خطوط ص [illegible])

اس خط کا آدھا نصف کا حوالہ ڈاکٹر عقیل صاحب نے اپنے مقالہ میں نقل بھی کیا ہے۔ یہ حصہ بھی ان کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ جس کو انھوں نے نظر انداز کر دیا۔

پریم چند نے حق المحنت کے طور پر دو روپیہ فی صفحہ کا مطالبہ کیا جبکہ سحر کو آٹھ آنہ فی صفحہ دینے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دو روپے فی صفحہ سے کم پر ترجمہ کرنا پریم چند کے نزدیک خسارے کا کام تھا اور سحر نے تو مطالبہ ہی آٹھ آنہ فی صفحہ رکھا تھا اور بلآخر تین آنہ چار پائی پر راضی ہو گئے۔ اگر دونوں حضرات ترجمہ کی اجرت مانگتے تھے تو مطالبہ میں یہ فرق کیوں؟ زمانہ کی تقطیع کے صفحات چوگانِ ہستی کی تقطیع کے صفحات تقریباً مماثل ہیں۔ اجرت کا یہ فرق ترجمہ کی نوعیت کا مظہر ہے۔ سحر نے ترجمہ نہیں کیا۔ چوگانِ ہستی کا مسودہ صاف کیا اور قلیل مطالبہ کے بعد قلیل تر اجرت پر راضی ہو گئے۔ جبکہ پریم چند واقعی ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔

سید محمد عقیل صاحب نے پریم چند کی ہندی نویسی کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا "اب یہاں سے میری دوسری مشکل شروع ہوتی ہے۔ پریم چند کی ہندی لیاقت کی بحث ہم اوپر کر چکے ہیں کہ ان میں ہندی کی تخلیقی صلاحیت شروع ہی سے تھی۔"

(فروغ اردو ص ۱۲) اس سلسلے میں پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ موصوف کا یہ دعویٰ ہنوز ثابت نہیں ہو سکا۔ ۱۹۲۳ء کی تصنیف پریما کو ۱۹۰۷ء کی تخلیق ماننا، ۲۰ فروری ۱۹۲۲ء کے انگریزی مکتوب کو ہندی مکتوب تسلیم کرنا، ہندی اڈیٹر بننے کے احتمال کو ثبوت مان لینا، پریم چند کی صاف گوئی کو انکسار پر محمول سمجھنا، ہندی ناولوں میں اغیار کے تصرفات کو نظر انداز کرنا اور زبردستی اسے پریم چند کی ہندی نویسی کہنا تحقیقی انحراف ہے۔ تحقیق کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جعفر رضا نے جو ثبوت پیش کئے ہیں، پہلے قوی دلائل سے ان کا رد کیا جاتا تب اپنے دعویٰ کے ثبوت میں وہ شواہد پیش کرتے۔ تجاہل عارفانہ تحقیق کے تقاضہ کو پورا نہیں کر سکتا۔

شیو پوجن سہائے کے نام پریم چند کا مکتوب ۲۰ فروری ۱۹۲۴ء رنگ بھومی میں شیو پوجن سہائے کی معاونت کا مظہر ہے:

"لیجئے جس پستک پر آپ نے کئی مہینے دماغ ریزی کی تھی وہ آپ کا احسان ادا کرتی ہوئی آپ کی خدمت میں جاتی ہے۔ اور آپ سے بنتی کرتی ہے کہ مجھے دو چار گھنٹوں کے لئے ایکانت کا سمے دیجئے۔ اور تب میری نسبت جو رائے قائم کریں وہ اپنی منوہر بھاشا میں کہہ دیجئے..... میں رنگ بھومی پر آپ کی آلوچنا کا بڑی بے صبری سے انتظار کروں گا۔" (بحوالہ چٹھی پتری ج ۲ ص ۲۲۲؛ پریم چند فن اور تعمیر فن ص ۱۹۴)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالہ میں اس خط پر کوئی اظہار خیال نہ کیا۔ اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے لئے مسلسل

چوگانِ ہستی پر اُتر آئے"۔ اب ذرا پریم چند کے اس خط کی عبارت
کو اپنے ذہن میں دہرائیے جس میں انھوں نے ہندی سے اُردو میں
ترجمہ کرنے کی بات حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی کی تھی جس کا
ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان دنوں حقیقت میں قطعی اس نتیجہ پر پہونچا
ہوں کہ رنگ بھومی جیسی کہ موجود ہے، … ہندی میں تھی …
چوگانِ ہستی جو بعد کو اُردو میں چھپی، اس ہندی رنگ بھومی کا ترجمہ
ہے جو اقبال ورما سحر کا کیا ہوا ہے۔" (فروغِ اُردو ص …)
اردو سے تحقیق ہو سکنے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس طرح کی
حتمی رائے قائم کرنے کا حق نہیں پہونچتا۔ ان کو اُردو ترجمہ پانے
سے قبل رنگ بھومی کے استناد کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ چوگانِ
ہستی میں سحر کے تصرف سے پہلے اگر بھومی میں شیو پوجن سہائے
کا تصرف شامل ہے۔ اس طرح تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ
شیو پوجن سہائے کی رنگ بھومی کو سحر نے چوگانِ ہستی کا قالب
عطا کیا۔ چوگانِ ہستی اور رنگ بھومی کا پریم چند سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے جو چوگانِ ہستی
قلمبند کی وہ شیو پوجن سہائے نے ہندی میں منتقل کی۔ ترمیم و
اضافے جو بھی کیے، پریم چند نے انھیں تسلیم کر لیا۔ اسی طرح
چوگانِ ہستی اول اور رنگ بھومی کی روشنی میں دوبارہ سحر کی
قلم سے چوگانِ ہستی ثانی نے جنم لیا جو بھی ترمیم و اضافے ہوئے
انھیں پریم چند نے قبول کر لیا۔ اس طرح یہ دونوں تصانیف
پریم چند کی تصنیف ہیں۔ خواہ ان میں سہائے یا سحر کا کیسا ہی
اور کتنا ہی تصرف شامل ہو۔ مترجمین دونوں نہیں تھے اس لئے
مترجمین کی حیثیت سے ان کے نام نہ آئے۔

اب آئیے کربلا کی طرف۔ کربلا کی تصنیفی ہیئت کے بارے
میں عقیل صاحب نے پریم چند کا مکتوب ۲۰ اگست ۱۹۲۴ء نقل
کیا ہے۔ اس خط میں کربلا کے اُردو مسودے کے ضمن میں پریم چند
نے منیر حیدر قریشی کے تعاون کا اعتراف کیا ہے۔ جس سے یہ
ثابت ہوتا ہے کہ کربلا کے کسی حصے میں قریشی نے اپنی طرف سے
ترمیم و اضافے کئے ہیں لیکن اس خط کی بنا پر عقیل صاحب
نے اس کے ہندی تصنیف ہونے کا جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اغلاط
پر مبنی ہے۔ یہاں بھی انھوں نے ۲۸ جون ۱۹۲۴ء اور ۲۳ جولائی
۱۹۲۴ء کے مکتوبات کو نظر انداز کر دیا، جو اخذ نتائج میں خاص
معاونت کرتے ہیں۔ ۲۸ جون ۱۹۲۴ء کے مکتوبات کو نظر انداز
کر دیا، جو اخذ نتائج میں خاص معاونت کرتے ہیں۔ ۲۸ جون ۱۹۲۴ء
کے مکتوبات میں پریم چند نے نگم کو لکھا "کربلا کا تھوڑا مسودہ روانہ
کرتا ہوں پسند آئے تو دے دیجئے" ص ۱۶۱ ان کا مطلب تھا کہ "زمانہ"
میں شائع کر دیجئے۔ پھر ۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء کو لکھا "بھائی جان
تسلیم۔ بہتر ہے کربلا نہ نکالیے، میرا کوئی نقصان نہیں" ص ۱۶۱
یا یہ کہ "براہ کرم مسودہ واپس فرما دیجئے" (پریم چند کے خطوط ص ۱۶۴)
غور فرمائیے "زمانہ" میں اشاعت کے لئے جو تھوڑا
مسودہ ارسال کیا جا رہا تھا وہ اُردو میں تھا یا ہندی میں؟

جیسا کہ اس سے قبل ثابت کیا جا چکا ہے۔ پریم چند
اپنی اُردو تخلیق کے ساتھ ساتھ ہندی ترجمہ کا کام بھی کرتے رہتے
تھے۔ اور ڈرافٹ صاف کرنے کے لئے معاونین سے خدمت
بھی لیا کرتے تھے۔ یہ معاونین بھی اپنی جانب سے ترمیم و اضافے
وغیرہ کر دیا کرتے تھے۔ کربلا کے ضمن میں منیر حیدر قریشی یا جعفر
علی خاں صاحبان کے ذریعہ کی گئی اصلاح و ترمیم کو …
میں جب پریم چند کو باک نہ ہوا تو ناقد کو کیوں ہو لیکن … سے
نہ نتیجہ نکالنا کہ ہندی تصنیف پریم چند کی ہے اور کربلا متذکرہ بالا
معاونین کا تصرف، یہ غلط ہے۔ گو کہ کربلا کے زمانہ تصنیف تک

منشی پریم چند ہندی نویسی میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر چکے تھے۔

پردۂ مجاز، نرملا، بیوہ اور غبن کے بارے میں شاید موصوف کو اُردو تصنیف ہونے کا یقین ہے۔ اس لئے ان پر تبصرہ کئے بغیر سید صاحب نے قدم آگے بڑھا دیا۔ کرم بھومی پریم چند کی تصنیف ہے جو پردۂ مجاز کے ساتھ لکھی گئی۔ اس کا اُردو متن بعد کو تیار ہوا کس نے تیار کیا ؟ قطعی شواہد نہیں ملتے۔ موصوف کو بھی اشکال ہے۔ لکھتے ہیں، "میدانِ عمل کا اُردو ترجمہ کس نے کیا خود پریم چند نے یا کسی اور نے ؟ پریم چند نے کہیں اس کی وضاحت نہ کی۔ نہ اپنے کسی خط میں اس کا اشارہ کیا۔ صرف قیاس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ زیادہ تر تراجم اقبال ورما سحر نے کئے ہیں اس لئے یہ ترجمہ بھی انھیں کا ہو سکتا ہے۔ اقبال ورما سحر نے اپنی تحریروں میں اس کے اشارے بھی کہیں کہیں کئے ہیں۔ اور دیویندر پرساد سکسینہ نے بھی سحر کی سوانح عمری میں یہ بات لکھی ہے۔" (فروغِ اُردو ص ۱۷)

ڈاکٹر عقیل صاحب نے میدانِ عمل کا سہرا سحر کے سر پر باندھ دیا اور "زیادہ تر تراجم" ان سے منسوب کر دیئے حالانکہ چوگانِ ہستی کے علاوہ سحر کا کوئی تصرف وہ پریم چند کی تصانیف میں ثابت نہ کر سکے۔ چوگانِ ہستی کا تصرف بھی ترجمہ کے ضمن میں نہیں آتا۔ گوشۂ عافیت کے بارے میں سحر کی رضامندی تک ثابت نہیں۔ تصرف درکنار۔ دیویندر پرشاد سکسینہ یا سحر کی خود بیانی تسلیم نہیں ہو سکتی۔ سحر نے منشی پریم چند کے متعدد قصے اور ناولوں کے تراجم کرنے کا اعلان ایک جگہ پر پریم چند کی وفات کے کئی برس بعد کیا۔ ان کی کوئی تاریخی یا ادبی اہمیت نہیں۔ سحر کے بیانات تو کیا خود پریم چند کے بیانات جانچے پرکھے بغیر اعتماد کے قابل نہیں۔ ہندی اُردو کا کام پریم چند خود کرتے تھے۔ مسودہ کو صاف کرانے کے لئے معاونین سے خدمات لیں۔ سید صاحب کو تراجم کے سلسلے میں بیان کردہ کلیہ "کہ تراجم پر مترجم کا نام ہونا چاہیئے" یہاں آکر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

گئودان تک آتے آتے ڈاکٹر صاحب کا سارا تحقیقی جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ انھوں نے اپنی بیش بہا معلومات سے قاری کو مستفیض فرمانے کے بجائے خود کو پروفیسر مسعود حسین خانصاحب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مسعود حسین خانصاحب نے گئودان کے سلسلے میں جو خارجی اور داخلی شواہد پیش کئے ہیں جنکو عقیل صاحب نے طویل اور فکر انگیز مقالہ کا نام دیا ہے، خاصے گمراہ کن ہیں۔ راقم الحروف نے ہماری زبان ۲۲ اگست ۱۹۸۱ء اور ۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ان کا جائزہ لیا ہے۔ اور مدلل پیش کیا ہے۔

گئودان کے پہلے اڈیشن کے بارے میں فراہم کردہ معلومات بھی قاری کو شبہات میں مبتلا کرتی ہیں۔ پہلے صفحہ کی عبارت میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی، لاہور اور لکھنؤ درج ہے۔ لاہور اور لکھنؤ سے کیا مراد ہے ؟ پروفیسر مسعود حسین خانصاحب نے بھی گئودان کے پہلے اڈیشن کی نشاندہی کی ہے لیکن ان کی اطلاعات عقیل صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات سے مختلف ہیں۔ دونوں حضرات نے ناشر جامعہ لمیٹڈ ہی کو بتایا ہے۔ مسعود صاحب نے جس گئودان کی نشاندہی کی وہ ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۱۴ھ (دونوں سنین) میں طبع ہوا ہے۔ (ہماری زبان یکم و ۸ مئی ۱۹۸۱ء ص ۲) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جامعہ لمیٹڈ نے الگ الگ پریس میں "گئودان" کی طباعت کرائی۔ اور ہر پریس نے اسے پہلا اڈیشن لکھا۔ کیا تعجب جو لکھنؤ یا لاہور سے یا دہلی

ہو کہ کسی تیسرے پریس نے گئودان کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۶ء سے پہلے کبھی چھاپا ہو۔

ڈاکٹر عقیل صاحب نے "پلشتم" کی جو وضاحت پیش کی ہے وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ حالانکہ قطعیت کے ساتھ اسے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ قمر رئیس نے پلشتم کا ذکر کیا ہے اور موصوف نے پلشتم پر اظہار خیال کیا ہے۔ دونوں مختلف الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

پریم چند کی ہندی نویسی اور ہندی صحافت مسلم ہے۔ اس سے انکار کرنا تحقیقی بد دیانتی ہوگی لیکن ۱۹۱۴ء-۱۵ء سے قبل ان کی ہندی نویسی کے قطعی شواہد بہرحال ابتک قیاس کے دائرے سے باہر نکل سکے ہیں کے دوران قیام منشی دیوی پرشاد بجوری نائب تحصیلدار قطعہ میاں گنج کے ایما پر پریم چند ہندی نویسی کی طرف راغب ہوئے۔ اس سے پہلے ان کے نام سے ہندی تخلیقات، قصے، تراجم اور ناولوں کا تلاش کرنا لاحاصل ہے۔ اگر کوئی افسانہ کسی ہندی رسالہ میں مل بھی جائے تو وہ پریم چند کا اپنا نہیں۔ پریم چند کا واضح بیان ملاحظہ فرمائیے:۔

"۱۹۰۷ء میں اُردو میں افسانے لکھنے شروع کئے ۔ اور ان کی کامیابی سے حوصلہ پا کر اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ ۱۹۱۴ء میں میرے افسانوں کا دوسروں نے ترجمہ کیا۔ اور وہ ہندی رسالوں میں شائع ہوئے تب میں ہندی کے رسالہ سرسوتی میں لکھنے لگا۔"

(پریم چند کے خطوط ۲۴۳)

اس وضاحت کے بعد پریم چند کی ہندی نویسی کے بارے میں ادھر اُدھر بھٹکنے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس سے پہلے اس کا سرا تلاش کیا جائے۔

جعفر رضا نے اپنی تصنیف "پریم چند فن اور تعمیر فن" میں پریم چند کو اردو ادیب ثابت کیا اور ہندی سے انکے رشتہ کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ تقابل اسی کی ضد میں ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب نے انھیں ہندی ادیب ثابت کرنے کی جی توڑ کوشش کی۔ دونوں نے راہ اعتدال سے انحراف کیا ہے۔ اور پریم چند ادبیات کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ معاندین کے تصرفات کے باوجود اُردو ہندی تخلیقات خود پریم چند کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔

حوالہ جات

کتب : مدن گوپال : پریم چند کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، جون ۱۹۶۸ء
جعفر رضا : پریم چند فن اور تعمیر فن، ہسبستان الہ آباد طبع اول ۱۹۷۷ء

رسائل : ہماری زبان دہلی، یکم ۸ مئی ۱۹۸۱ء، ۱۵ اگست ۱۹۸۱ء اور ۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء
زمانہ کانپور اپریل مئی ۱۹۰۷ء
فروغ اُردو اگست ستمبر ۱۹۸۱ء

جہان غالب
از — محمد حسین شمس علوی
مرزا غالب کے ادبی خطوط کا انتخاب جس سے ان کے انداز تحریر و اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔
فروغ اُردو لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔
قیمت :- 2/50

جمیل مہدی
ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ

اردو کے یہ ترجمان

انقلاب فرانس کے دوران کسی پیشہ ور لیڈر کا یہ واقعہ تاریخ میں محفوظ رہ گیا ہے کہ اس نے اپنے گھر کی بالکنی سے ایک زبردست ہجوم کو کسی طرف جاتے دیکھا تو اپنے نوکر کو چلا کر حکم دیا:

• ذرا دیکھنا یہ مجمع کہاں جا رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے یہ جاننا میرے لئے ضروری ہے کیونکہ مجھے اس مجمع کی قیادت کرنی ہے۔ کیونکہ بہر حال میں ان کا لیڈر ہوں"۔

اردو کے مسئلہ میں بھی رویہ کچھ ایسے لوگ بھی اپنانا چاہتے ہیں جن کے پاس بالکنی بھی نہیں ہے۔ نوکر بھی نہیں ہیں۔ تاہم قیادت کی خواہش ان نام نہاد فرانسیسی امیر انقلابی سے کم نہیں ہے جو نوکر کو بھیج کر مجمع کا پروگرام معلوم کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے یہ بیچارے خود ہی دربدر رہ کر حالات کا رُخ معلوم کرتے۔ اور اس رُخ کے مطابق ہوئے بدلتے رہتے ہیں۔

ان میں ایک گروہ تو وہ ہے جو ابھی دسمبر کے شروع میں وزیر اعلیٰ کے سامنے اقلیتی نمائندوں کا مظاہرہ کر کے انہیں دھمکی دے رہا تھا کہ اگر حکومت نے اردو کو دوسری زبان تسلیم کئے بغیر عالمی کانفرنس کا خیال بھی کیا، تو ان کی تو حیثیت کیا ہے وہ اندرا گاندھی تک کی عزت اور وقار کو نمائندوں کے ذریعے مجروح کر کے رکھ دیں گے۔ اس گروہ کے لوگوں کو صرف روزنمائی خود نمائی اور [illegible] کا شوق [illegible] ہے اور وہ اس سے مختلف کام لیا کرتے ہیں۔ ان [illegible] میں تقریباً سلطانی [illegible] گروہ جا بجا دربانی تک کے سبھی کام شامل ہیں۔ اسی لئے اس گروہ میں شامل لوگوں کو کسی اصول یا کسی مقصد سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ان کا مقصد ہمیشہ ان اردو سے مختلف ہوتا ہے جو وہ مقصد کی نمائش کی خاطر لگایا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب تک اردو کے بارے میں کوئی اعلان نہ ہوا تھا۔ تو یہ گروہ اس اعلان پر اصرار کر رہا تھا اور

عالمی کانفرنس کی تجویز کی مخالفت کے نام پر ڈنڈوں اور بازوؤں کی نمائش کے ذریعہ خودنمائی اور خودستائی اور شخصی نمائش میں مصروف تھا ایک اور ایسی انقلابی تحریک کے نام پر جو کبھی پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو تحریک اردو کا انقلابی بازو ثابت کرنے کے لئے زور باندھ رہا تھا اور اردو کے بارے میں تمام سرکاری احکام اور اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے اعلان کا متن اور مضمون تک پیش کر کے اس پر عمل درآمد کی شرط اپنی حمایت کے لئے پیش کر رہا تھا لیکن جوں ہی اردو کے بارے میں سال کے آخری دن ایک ایسا چار سطری اعلان وزیر اعلیٰ کی اپنی شخصیت تو کجا، ان کی وزارت کے کسی نائب وزیر کی حمایت اور کسی پریس کانفرنس میں شمولیت کی زحمت تک سے محروم ـــــ ایک سرکاری پریس نوٹ کی شکل میں آیا جس نے ابہام اور تشنگی ـــــ ادھورے پن اور ناکافی ہونے کا یہ عالم تھا کہ اس کی حیثیت قانونی تو کیا رسمی بھی قرار نہیں دی جا سکتی تھی ـــ یہ گروہ اچانک اپنے سابقہ موقف کو بھول کر اس اعلان کو اردو کے لئے پروانۂ نجات ثابت کرنے کے لئے تحسین کے پھول اور تعریف کے گلدستے وزیر اعلیٰ کے سر پر تصدق اور وار نے نیار نے کے لئے سب سے آگے کی صفوں میں جا کھڑا ہوا۔ تہنیتی وفود ترتیب دیئے گئے ـــ اور شکر گزار پارٹیوں کے جلوس منظم ہوئے اور ان وفود اور جلوسوں کی قیادت میں بھی اسی گروہ کے وہی لوگ پیش پیش نظر آنے لگے جو اس اعلان سے صرف دس دن پہلے وزیر اعلیٰ کے خلاف آستینیں چڑھائے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔

صرف وعدے پر شکر گزاری ـــ وعدہ کی تاریخ کی ہر روز یاد دہانی ـــــ اور پھر وعدہ ایفائی کے دن وعدہ کو لفظوں کے خول میں لپیٹ کر ہوا میں اچھال دینے کے عمل پر تحسین و آفرین کا جشن ـــــ یہ رسمیں سیاسی تاریخ میں پہلی بار اردو کے نام نہاد علمبرداروں کو قائم کرتے دیکھا گیا۔ اردو ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوتے دیکھا گیا۔ جن کا اردو کے ساتھ تعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ پریس والے کا پوسٹر چھپوانے والے سے ہوتا ہے۔

وزیر اعلیٰ کے وعدے اور اس کے بعد مبہم اعلان پر مسلم مجلس نے کچھ نہیں کہا، مجلس مشاورت نے کچھ نہیں کہا، مسلم لیگ نے کچھ نہیں کہا، جنتا پارٹی کے کچھ نہیں کہا کی جدو جہد اور مطالبات نے اردو کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے دروازے تک پہونچایا اور اس کانگریس (ا) نے کچھ نہیں کہا جس کے مینوفیسٹو کے وعدہ کے مطابق ـــــ اس اعلان کے وعدہ اور وعدہ کی ایفا تک کے مرحلے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس وزیر اعلیٰ تک نے اس اعلان کے بعد، اس کی نوعیت اور مستقبل کے بارے میں اس انجام کے بارے میں کچھ نہیں کہا جن کی اصل کوشش اور مضبوط رویہ کی بدولت ـــــ یہ اعلان ـــ جیسا کچھ بھی تھا ـــ الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کا اردو سے کوئی تحریکی تعلق نہیں، ترجمانی کی کوئی نسبت نہیں، نمائندگی کا کوئی استحقاق نہیں اور اس اعزاز کہ سال نو کا بیش قیمت تحفہ، انقلابی واقعہ، اور داری جاؤں قربان جاؤں کی آرتی کا مستحق اعلان قرار دے رہے ہیں۔ اور مقصد اس وقت بھی اس کے سوا دوسرا نہیں کہ ان کے چہرے، لوگوں کے اور حکومت کے اہم منصب داروں کے لئے مانوس اور شناسا بن جائیں۔

(باقی صفحہ ۲۹)

پروفیسر عبدالمغنی
صدر انجمن ترقی اُردو بہار

بہار میں اُردو کا سرکاری استعمال

بہار میں اُردو آبادی عام طور پر اور انجمن ترقی اُردو بہار کے ارکان و کارکنان خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آزاد ہندوستان میں اُردو کے متعلق گویا ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور ان کی عظیم جد و جہد کے نتیجہ میں خدا کے فضل و کرم سے اُردو پوری ریاست کی سرکاری زبان اصولی و قانونی حیثیت کے ساتھ بن گئی۔ اس مقصد کے لیے دستور ہند کی متعلقہ دفعات کے مطابق باضابطہ ایک مسودہ قانون "بہار آفیشیل لنگویجز (امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۸۰ء" کے نام سے تقریباً دونوں ایوانوں سے اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ اس کے مطابق "بہار آفیشیل لینگویجز ایکٹ ۱۹۵۰ء" میں ہندی کے بعد اُردو کا اضافہ بحیثیت سرکاری زبان کر دیا گیا۔ اس تاریخی قانون پر عمل درآمد کیلئے

پہلے مرحلے پر انتظامی سہولت کے پیش نظر ریاست کے تینوں ضلعوں میں سے پندرہ۔ (۱) پورنیہ (۲) کٹیہار (۳) دربھنگہ (۴) سیتامڑھی (۵) بھاگل پور (۶) مدھوبنی (۷) بیگو سرائے۔ (۸) مظفر پور (۹) سہرسا، (۱۰) مشرقی چمپارن (۱۱) نوادہ (۱۲) دھنباد (۱۳) مغربی چمپارن (۱۴) گیا۔ (۱۵) سمستی پور میں حسب ذیل سات امور کے لئے اُردو کے سرکاری استعمال کے احکام، ۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء کو گورنر بہار کی طرف سے جاری کر دیئے گئے۔

۱۔ اُردو عرضیوں اور درخواستوں کی وصولی اور اُردو میں ان کا جواب۔
۲۔ اُردو میں لکھی دستاویزوں کا رجسٹریشن آفس کے ذریعہ منظور کیا جانا۔
۳۔ اہم سرکاری قواعد، حکم ناموں اور اعلانوں کی اُردو میں اشاعت
۴۔ عوامی اہمیت کے سرکاری احکام اور ہدایات کا اُردو میں بھی جاری کیا جانا۔
۵۔ اہم سرکاری اشتہارات کی اُردو میں بھی اشاعت۔
۶۔ ضلع گزٹ کے اُردو ترجمہ کی بھی اشاعت۔
۷۔ اہم سائن بورڈوں کا اُردو میں بھی لکھا اور لگایا جانا

مذکورہ بالا پندرہ اضلاع اور سات امور کیلئے اُردو کے سرکاری استعمال کی خاطر وزیر اعلیٰ بہار نے پندرہ سو اُردو داں عملے کی بحالی کا اعلان کیا ہے۔ جس میں سے بردست چھ سو بیالیس کے لئے حکومت کے راج بھاشا وبھاگ کی طرف سے اشتہارات اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں، مگر ان میں ایک نقص یہ ہے کہ امیدواروں کی اُردو دانی کا تعین کرنے کے لئے کسی تسلیم شدہ ادارے کی ضابطہ سند کی شرط نہیں لگائی ہے جس سے

احتمال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کے نام پر چور دروازے سے
غیر اُردو داں عملے کی بحالی کثیر تعداد میں کی جائے گی۔ گرچہ
وزیر اعلیٰ نے ذاتی طور پر صدر انجمن ترقی اُردو بہار کو ان کے
احتجاج پر یقین دلایا ہے کہ ایسا ہونے نہیں دیا جائے گا اور
سبھی بحالیاں اُردو داں امیدواروں کی ہوگی لیکن ان ذاتی
یقین دہانیوں کا نتیجہ بحالیوں کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔ اور
اسوقت انجمن صورتحال کے مطابق اقدام کرے گی۔

حکام کی سستی کے سبب تقریباً ایک سال اس کی منظوری
گذر جانے کے باوجود بہار میں اُردو کی سرکاری حیثیت کے
قانون پر عمل درآمد ہنوز نہ ہوسکا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں ایکٹ
پاس ہوا۔ اپریل ۱۹۸۱ء میں عمل درآمد کے لئے حکم نامہ جاری
ہوا اور اکتوبر ۱۹۸۱ء تک عمل درآمد کے لئے درکار اُردو داں
عملے کی بحالی بھی نہ ہوسکی ہے، بہر حال حکم نامہ جاری ہونے کے
بعد متعلقہ اضلاع میں سے بعض میں اداروں کے خاص خاص محکموں
میں جہاں کچھ فرض شناس حکام اور ان سے کام لینے کے لئے فعال
اردو دوست موجود ہیں۔ اُردو کا سرکاری استعمال آہستہ آہستہ
ہونے لگا ہے، جبکہ بعض مقامات پر بعض نا فرض شناس حکام
ایسے بھی ہیں جو سرے سے اُردو کے سرکاری استعمال کے لئے کسی
حکم نامے کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ اور بیشتر مقامات پر
اگر حکم نامہ پر عمل ہو بھی رہا ہے تو نہایت سست رفتاری کے
ساتھ۔ یہ صورتحال اُردو آبادی کے لئے وقت کا سب سے بڑا
چیلنج ہے۔ اور انکی مادری و تہذیبی زبان اپنے شیدائیوں سے
مطالبہ کرتی ہے کہ جب ایک جد وجہد کے بعد انھوں نے اُردو
کو سرکاری زبان بنوالیا ہے تو اب دوسری جد وجہد کا آغاز متعلقہ
قانون پر عمل درآمد کے لئے کریں، اس لئے کہ موجودہ عوامی دور
میں جمہوری جد وجہد کے بغیر کسی کو اس کا حق نہیں ملتا۔ لہذا عموماً
تمام اُردو دوستوں کو اور خصوصاً انجمن ترقی اُردو بہار کے
کارکنوں کو حسب ذیل خطوط پر میدان عمل میں آگے بڑھنے کیلئے
کمربستہ ہونا چاہیئے۔

(۱) ہر ضلع میں تنظیم کے صدر مقامات سے ایک ایک
بلاک تک جو زبان اُردو اپنے ایک تحریکی قوت کی حیثیت سے
منظم کیا جائے اور اداروں، محکموں اور دفتروں میں اُردو کا
سرکاری استعمال کرانے کے لئے پوری جرأت و تدبر کے ساتھ
سنگھرش و دلیری اور [illegible] ضروری ہے کہ جہاں انجمن
ترقی اُردو کی شاخیں ہیں وہ پوری طرح سرگرم عمل ہو جائیں
اور ضروری اقدامات کریں اور جہاں شاخیں نہ ہوں وہاں
انجمن کی نئی شاخیں بن جائیں جو ایک طرف اُردو کیلئے جہد و جہد
کرے اور دوسری طرف انجمن کی ممبر سازی اور انتخابات قواعد
وضوابط کے مطابق کر کے شاخ کی تشکیل کرے۔

(۲) انجمن کی تمام شاخیں اور ایڈہاک کمیٹیاں انجمن
صدر دفتر و ہیڈکوارٹر کے ساتھ پیہم رابطہ رکھیں اور مستعدی
کے ساتھ وقتاً فوقتاً جاری کیجانے والی ہدایات پر عمل کریں۔
اُردو تحریک کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنے ہی کے لئے انجمن نے
ہر ڈویژنل ہیڈکوارٹر میں باضابطہ اپنا دفتر قائم کر لیا
ہے اور ڈویژنل آرگنائزر بھی مقرر کر دیئے ہیں جن کے تمام کاموں
میں ہر قسم کا تعاون کرنے کے لئے ڈویژنل ہیڈکوارٹر کی ضلعی
شاخوں کو ہدایت کے ساتھ وسائل بھی دیئے گئے ہیں۔

(۳) جن اضلاع میں اُردو کے سرکاری استعمال کے لئے
حکومت نے اعلان جاری کر دیئے ہیں وہاں حکام سے جو بھی
کوتاہی ہو اس کی شکایت براہ راست وزیر اعلیٰ بہار کو اور

اسکی نقل باضابطہ صدر انجمن ترقی اُردو بہار کو ارسال کیجائے۔
(۴) اُردو کی سرکاری حیثیت کے قانون پر عمل درآمد کیلئے
ہر جگہ تمام سیاسی سماجی و مذہبی جماعتوں اور علمی و ادبی اداروں
اور ان سب کے سربراہوں اور کارکنوں کا تعاون بلا تفریق و
امتیاز حاصل کیا جائے۔ تاکہ پورے سماج میں اُردو کے عام استعمال
اور ترویج و اشاعت کے لئے ایک جمہوری فضا بن جائے اس
مقصد کے لئے انجمن کی شاخیں موقع کے مطابق سیمینار، سمپوزیم،
کنونشن، کانفرنس مشاعرہ وغیرہ تقریبات کا انعقاد کریں جن
میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے نمایندہ افراد کو دعوت شرکت دیں۔
(۵) بلاک سے ضلع تک اُردو کے مسائل کے حل کی تگ و
دو ٹھیک اس طرح کیجائے جس طرح سے مقدمات کی پیروی کیجاتی ہے
چنانچہ سرکاری قوانین و ضوابط کے حوالے سے حقائق و اعداد
و شمار پر مبنی یادداشتیں مرتب کی جائیں، حکام کے یہاں مناسب
و موثر طریقے سے اپنے کیس کی وکالت کرائی جائے اور درجہ بدرجہ
دفاتر میں نیچے سے اوپر تک اُردو کا مقدمہ لڑا جائے اور اس کو
اعلیٰ ترین سطح تک لیجا کر اسوقت تک لڑائی جاری رکھی جائے۔
جبتک فتح حاصل نہ ہو جائے اور اس مقصد کے لئے محکماتی،
عدالتی، سیاسی اور سماجی ہر دائرے میں جدوجہد کی جائے۔
(۶) جب کبھی اور جہاں کہیں حکومت کے وزراء یا مخصوص کیلئے
وزیر اعلیٰ نے اپنے سرکاری دورے پر یا عوامی جلسوں میں شرکت
جائیں انجمن کے کارکن وفد کی شکل میں یادداشتوں کے ساتھ ان سے
ملاقات اور گفتگو کریں انکے سامنے شکایات و مطالبات رکھیں۔
اسی طرح حلقۂ انتخاب کے اُردو دوست اسمبلی اور پارلیمنٹ میں
منتخب ہوکر جانے والے اپنے نمائندوں سے رابطہ رکھیں اور انھیں
اُردو کے مسائل اور اُردو عوام کے جذبات سے آگاہ کرکے ان سے
مطالبہ کریں کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں حکومتوں اور متعلقہ قانون ساز
اداروں کے سامنے ان مسائل کی تشریح اور جذبات کی ترجمانی
کرکے ضروری فیصلے کرائیں۔
(۷) جن پندرہ اضلاع میں اردو کے سرکاری استعمال کیلئے احکام
جاری ہوچکے ہیں، وہاں ان پر عمل درآمد کی جدوجہد کے ساتھ
ساتھ باقی جن اٹھارہ اضلاع میں اُردو کے سرکاری استعمال
کے لئے احکام ابھی جاری نہیں ہوئے ہیں، خاص کر وہاں کے
اُردو دوست ہر ممکن جمہوری ذریعے سے اور ہر موقع پر زوردار
مطالبہ کریں کہ وہاں بھی اُردو کے سرکاری حیثیت کے قانون کا منشا پورا
ہو۔ اور اس کا نفاذ ایکٹ کے مطابق پوری ریاست میں ہوجائے۔
اسلئے کہ جب قانون بنانے ہی میں ۳۰ سال کی دیر پہلے ہو چکی ہے
تو اب اس پر عمل درآمد میں مزید تاخیر نہ ہو۔
حکومت کے محکموں، شعبوں اور دفتروں میں اُردو کے
سرکاری استعمال کے علاوہ تعلیم اور روزگار میں بھی اُردو کے
مسائل ہیں۔ گرچہ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ سب ہی سطحوں پر
تعلیمی اداروں میں اُردو کے لئے وسیع انتظامات بہار میں پہلے
سے پائے جاتے ہیں مگر بعض مقامات پر ان انتظامات میں خامیاں
اور کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ جو اہل اُردو کے لئے تشویش اور
پریشانی کا باعث ہیں لہذا کافی تسلی بخش بندوبست کے لئے
ضروری ہے کہ حسب ذیل اس پر پوری توجہ دی جائے اور اس
سلسلے میں بھی منظم جدوجہد ہر ممکن جمہوری و آئینی طریقہ سے کیجائے۔

تعلیم کا مسئلہ:۔

سب سے اہم معاملہ ابتدائی تعلیم کا ہے۔
جس کے لئے دستور ہند کی دفعہ ۳۵۰ (الف) میں ہر زبان کے لوگوں
کو بنیادی حق بھی ملا ہوا ہے، بلا شبہ ۱۹۷۷ء سے قبل کی جگن ناتھ
مشرا وزارت نے پڑھنے والوں کی قید ہٹاکر اور اس کی جگہ بولنے والوں
کی کم سے کم تعداد مثلاً ڈیڑھ سو افراد کی آبادی کی بالکل معمولی اور

رسمی سی شرط لگا کر ریاست میں اُردو کی ابتدائی تعلیم کے مسئلے کو اصولاً حل کر دیا ہے اور احکام جاری کر دیئے ہیں کہ ہر جگہ جہاں کم سے کم اُردو آبادی بھی ہو اور وہاں اُردو کی تعلیم کے لئے پرائمری ایجوکیشن کا ایک یونٹ لازماً منظور کیا جائے لیکن ان احکام پر ہر جگہ جیسی علی نہیں ہو رہا ہے اور بعض اُردو دشمن حکام ان احکام کے وجود تک سے انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا اُردو دوستوں کا مطالبہ اور کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ:

(۱) حکومت بہار دوبارہ یہ احکام جاری کر کے اپنے حکام کو عمل درآمد کے لئے سخت تاکید کرے۔

(۲) بہر حال قبل کے احکام کے حوالے سے بھی ہر ہر بستی میں احکام پر عمل درآمد کے لئے مجبور کیا جائے۔

(۳) احکام کی عدم تعمیل کی صورت میں نیچے سے اوپر تک باز پرس کی جائے۔

تعلیم بالغان :-

دوسرا اہم معاملہ تعلیم بالغان کا ہے حکومت ہند نے ایک "قومی تعلیم بالغان پروگرام" جاری کر رکھا ہے مگر اسمیں اُردو کا حصہ گویا نہیں ہے اور یہ بہت ہی سنگین بات ہے، اُردو کے خلاف ایک سازش ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو بولنے والوں کو بھی تعلیم بالغان اُردو کے ذریعہ نہیں دی جائیگی اور اسطرح مردم شماری میں اُردو آبادی کی تعداد زیادہ گھٹا کر دکھانے کے پرانے منصوبے پر زیادہ ٹھوس طریقہ سے کام آگے بڑھایا جائے گا۔ اس مکروہ سازش کا توڑ کرنے کے لئے اُردو دوستوں کو کرنا یہ ہے کہ:-

(۱) ہر ہر بستی، گاؤں، اور شہر میں تعلیم بالغان کا مرکز چلانے والوں کو مجبور کر دیں کہ وہ اُردو بولنے والوں کو اُردو زبان اور اُردو رسم خط ہی کے ذریعہ تعلیم دیں۔

(۲) جن مراکز پر اُردو کے ذریعہ تعلیم نہ دی جا رہی ہو اسکا مکمل بائیکاٹ پوری اُردو آبادی موثر طور پر کرے۔

(۳) حکام کو مجبور کیا جائے کہ پرائمری ایجوکیشن کے یونٹ کی طرح اڈلٹ ایجوکیشن کے لئے بھی اُردو کا یونٹ لازماً منظور کریں۔

(۴) حکومت سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اُردو کے اداروں بالخصوص انجمن ترقی اُردو بہار اور اسکی شاخوں کو تعلیم بالغان کے سرکاری طور پر منظور شدہ وسائل رجسٹریشن وغیرہ کی شرطوں میں نرمی پیدا کر کے دے اور انھیں باقاعدہ اس قومی پروگرام میں شامل کرے ورنہ اُردو کے بغیر قومی یکجہتی کا کوئی تصور سماج میں اُبھر نہ سکے گا۔

بسلسلہ مضمون صفحہ ۲۵ "اُردو کے ترجمان"

کل کیا کیا تھا، آج کیا کر رہے ہیں، کل کو کیا کرنا پڑیگا۔ اس بات کی طرف ان لوگوں کی توجہ ہے نہ ان لوگوں کو اس بات کی فکر ہوتی ہے۔ اس طرح کی فکر میں تو وہ لوگ پڑیں جنھیں کسی کو جواب دینا ہو اور اپنے متضاد رویہ سے پہونچنے والے نقصان کے احتساب کا خوف ہو۔ ان لوگوں کو اپنے علاوہ کسی کی فکر نہیں۔ یہ لوگ اپنے علاوہ کسی کے ترجمان نہیں، اپنے علاوہ کسی کے نمائندے نہیں، تو انہیں کردار کی اس بوقلمونی ابن الوقتی کے اس ناگوار اور بدنما مظاہرے کے سلسلے میں احتیاط برتنے فکر مند ہونے اور شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟

عام لوگوں کی اطلاع کے لئے ہم کہے دیتے ہیں کہ اُردو کے بارے میں مذکورہ اعلان کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس پر شہد بھی نہیں لگایا گیا ہے کہ لوگ اسے چاٹ کر ہی اپنے ذائقہ میں تبدیلی کر لیں۔ اور جو کچھ ہو گا وہ ۱۸ تاریخ کے بعد طئے ہو گا۔ جبکہ مجوزہ اُردو مخالف یو پی بند کے نتائج سامنے آ چکیں گے۔

جو لوگ اس اعلان پر بغلیں بجا کر اپنی بے بضاعتی کا ثبوت دے رہے ہیں انھیں تو ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس سلسلے میں انکی اپنی اغراض ہیں باقی لوگوں کیلئے ہم کہے دیتے ہیں کہ جد و جہد کا ایک نیا مرحلہ انکے سامنے آگیا ہے۔ اس کے لئے انھیں تیاری کر لینی چاہیئے۔ ●●

پروفیسر مسعود حسین خاں

پریم چند کے مترجم
اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی

اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی نے ۱۹۴۳ء میں تصنیف کردہ
اپنے مختصر سی خود نوشت حالات میں پریم چند کے "متعدد قصوں" اور
آخری دور کے ناولوں" رنگ بھوم (چوگان ہستی) کرم بھوم (میدان
عمل) پریم آشرم (گوشۂ عافیت) نرملا۔ اور گئودان (گئودان)
وغیرہ کے مترجم ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ آج سے ٹھیک دس سال
قبل جب میں نے ہندی اردو متون کے تقابلی مطالعہ کے بعد
لسانی شہادتوں کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو گئودان پریم چند
کے قلم سے نکلی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ہندی گئودان کا ترجمہ ہے،
تو میری تائید میں فوراً جناب دیریندر پرشاد سکسینہ (بدایوں)
نے ہماری زبان کو ایک مراسلے کے ذریعہ مطلع کیا کہ یہ بات صحیح ہے
اور سحر ہتگامی کے "مختصر خود نوشت حالات" کے مسودے سے
جس تک ان کی رسائی تھی وہ اقتباس دیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا
ہے اور جسے میں اپنے مضامین میں بارہا نقل کر چکا ہوں۔

بھوپال اور علی گڑھ کے پریم چند صدی تقریبات کے
سمیناروں میں بعض حضرات نے اس دعوی اور اس کے ناقل دونوں
کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا اور مجھ سے شہادت طلب کی۔ سحر ہتگامی
کے دعوی کی صحت کے ثبوت میں "گئودان" اور "چوگان ہستی" پر دو
مفصل مضمون سپرد قلم کر چکا ہوں۔ ناقل کی صداقت کا ثبوت
آج دیا جا رہا ہے۔ ذیل میں ناظرین کی خدمت اتمام حجت کیلئے
سحر ہتگامی کے ان "مختصر خود نوشت حالات" کا مکمل متن پیش
کیا جا رہا ہے۔

میں اس کے لئے جناب دیریندر پرشاد سکسینہ صاحب
کا ممنون ہوں جنکی وساطت اور عنایت سے یہ حاصل کیا
گیا ہے۔ یہ سحر ہتگامی مرحوم کے صاحبزادے جناب کیلاش
ورما شائق ہتگامی کے قلم کی تحریر ہے ان کے تحریر کردہ ایک خط
سے (جو میرے پیش نظر ہے) معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت جگر
بریلوی کی فرمائش پر انھیں مع انتخاب کلام ۷ جنوری ۱۹۴۴ء
کو ارسال کیا گیا تھا۔ وہ حسب ارشاد والد صاحب بزرگوار
نیز اپنے حالات نیز نمونۂ کلام بھیج رہا ہوں"۔

سحر ہتگامی کا انتقال شائق صاحب کے نوٹ کے
مطابق ۷ ستمبر ۱۹۴۳ء کو ہوا تھا۔ تاریخ پیدائش کا علم نہیں
لیکن صورت میں انکا قیاس ہے کہ انتقال کے وقت انکی عمر تقریباً

پچپن چھپن سال کی رہی ہوگی۔"

مختصر خود نوشت حالات

"پورا نام اقبال بہادر ورما، تخلص ساحر ہتگامی مگر مختصراً اقبال ورما ساحر لکھتا ہوں۔ والد کا نام شیو نرائن ورما مرحوم، رئیس و زمیندار، سکونت قصبہ ہتگام، ضلع فتح پور، جہاں صدہا سال پہلے کائستھوں کی آبادی تھی جو سب کے سب عموماً زمیندار تھے۔ مگر اب یہ قدیم قصبہ ایک اُجڑی ہوئی حالت میں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قصبے کو راجہ جے چند والیٔ قنوج نے آباد کیا تھا۔

میرے والد بزرگوار پرانی وضع کے رئیس تھے شاعر تو نہ تھے۔ مگر اردو علم و ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے بہت مختصر حالات کے بعد اپریل ۱۹۴۷ء میں انکا سورگ باش ہوگیا تھا۔ والدہ بڑی دھارمک خیال کی تھیں والد کی موت کے کوئی چار سال بعد وہ بھی وفات پا گئیں۔

میں سریواستو دوسرے فرقہ کا کائستھ ہوں اور میرا تعلق یہاں کے ایک نہایت قدیم و معزز خاندان سے ہے۔ یعنی میرا شمار یہاں کے اب بھی "بگڑے رئیسوں" میں ہو سکتا ہے۔

میں بچپن میں پڑھنے لکھنے سے جی چراتا تھا اس وقت کارکنانِ قضا و قدر کیا کیا ہنس رہے ہوں گے کہ یہ بھی کیسا احمق ہے کہ جو کام عمر بھر کرنا ہے۔ اسی سے بھاگنا چاہتا ہے۔

پہلے ۹-۱۰ سال کی عمر تک مکتب میں پڑھایا گیا گلستاں بوستاں تک فارسی پڑھی، پھر انگریزی کی طرف ڈھکیلا گیا۔ کسی طرح جنوری ۱۹۰۲ء میں انگریزی مڈل کے آخری امتحان میں پرائیوٹ شریک ہوا۔ اور تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ بے دلی سے تھوڑا بہت پڑھتے ہوئے یہ بھی غنیمت تھا۔

کچھ وقفے کے بعد آخر ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ اسکول، فتح پور میں داخل ہوا۔ اور ۱۹۰۶ء قدیم الہ آباد یونیورسٹی کا انٹرنس والا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اب پڑھنے سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ کالج جانے کی زبردست خواہش تھی۔ الہ آباد تک گیا بھی مگر وہاں دفعتاً پیچش و بخار سے ایسا بیمار پڑا کہ داخلے کی نوبت نہ آئی اور مکان لوٹ آنا پڑا۔ بیماری نے طول پکڑا اور تعلیم کا خاتمہ ہوگیا۔

آخر ۱۹۰۸ء میں لوئی کوہنے کے پانی والے علاج سے صحت کچھ بحال ہو چلی۔ اور ۱۹۰۹ء میں سنسکرت کے زندۂ جاوید شاعر کالیداس کے مشہور و معروف ناٹک "شکنتلا" کے اپنے مثنوی نما ترجمے کو ختم کیا جو پہلے ۱۹۱۱ء میں زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا تھا۔ حقیقتاً اسے ترجمہ نہیں بلکہ ایک ایسی طبعزاد مثنوی ہی کہنی چاہیئے۔ جو اس ناٹک پر مبنی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدا ہی سے خواہ مخواہ شاعری کا شوق ہوا تلمذ کسی سے نہیں بہت سا ابتدائی کلام چاک کر ڈالا جس کا اب افسوس ہے۔ البتہ ۱۹۰۵ء میں پرنس آف ویلز (ملک معظم جارج پنجم آنجہانی) کی تشریف آوری پر ایک قطعہ لکھا تھا جس کے پانچ اشعار یاد رہ گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

ہر ہر [illegible] ہے دمبدم ترے آنے کی شتابی!
ہر سمت نگاہوں میں کھُبا جلوۂ راحت

ذرات زمیں مردمکِ چشم بنے ہیں
ہر نقشِ قدم آنکھ ہے ہنگامِ سیاحت

تاروں کو منتظر ہے سپیدیٔ سحر کا
رکھتا ہے ترا حسنِ ملیح ایسی صباحت

تو صاف دلی سے ہو اگر دافعِ دہشت
انداز لطافت سے بدل جائے قباحت

تو شورشِ دریا کو دریا سے کرے سلب
مصری کا ذخیرہ ہو ہر اک کانِ ملاحت

۱۹۱۰ء کے اُدھر والے زمانے کے کلام میں چند غزلیں محفوظ ہیں۔ پہلے ان ہی سے میری شعر گوئی کی شروعات ہوئی۔ اس زمانے میں دیوانِ مومن سے بڑی ہی دلچسپی تھی۔ اب غالب کو بہتر سمجھتا ہوں۔ ابتدائے ۱۹۱۱ء سے میرا کلام "زمانہ" (کانپور) اور "ادیب" (الہ آباد) میں شائع ہو چلا۔ غزل لکھنا قریب قریب ترک ہوا۔ اور نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کم و بیش اب بھی جاری ہے۔ مگر اب تو بہت ہی کم لکھتا ہوں، بہت لکھ چکا۔ کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ بالکل چھوڑ دوں۔ مجموعہ کلام چھپنے کی اب تک نوبت نہیں آئی اور نہ کوئی اُمید نظر آتی ہے۔ خود چھاپ لینا تو آسان، مگر بیچنا مشکل کیا بالکل ناممکن ہے۔

۱۹۲۰ء سے دس سال کے مطالعہ کے بعد ہندی بھی لکھنے لگا۔ زیادہ تر نثر۔ جیسے ملک کے کتنے ہی مشہور ہندی رسالوں میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن سے معاوضہ کی صورت بھی کچھ روپئے مل جاتا ہے اردو سے اتنی بھی اُمید نہیں۔

عمر خیام کی تقریباً پانچسو رباعیوں کا ہندی نظم میں ترجمہ کیا جسے انڈین پریس الہ آباد نے خرید کر ۱۹۲۷ء میں بڑی سج دھج کے ساتھ مصور شائع کیا۔ اس سے کئی سال قبل "کریا" کا منظوم ہندی ترجمہ بھی پرکاش پُستکالیہ کانپور نے خرید کر شائع کیا تھا۔

منشی پریم چند آنجہانی کے متعدد قصے اور کئی ناول، مثلاً رنگ بھوم، کرم بھوم، پریم آشرم، نرملا وغیرہ وغیرہ ہندی سے اُردو میں لکھے۔ جو چھپ چکے ہیں۔ ابھی ان کا آخری ہندی ناول "گئودان" بھی جامعہ ملیہ سے شائع ہو چکا ہے جس کا اُردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے۔

اسی طرح ہندوستانی اکیڈمی یو پی الہ آباد نے بھی تلسی داس نامی ہندی کتاب، مجھے اُردو ترجمے کے لئے دی تھی۔ ترجمہ پہنچے ہوئے تو کئی سال ہو چکے مگر کتاب اب تک چھپی نہیں۔

اُردو، ہندی، انگریزی نظم و نثر کی ہزاروں کتابیں پڑھ چکا۔ کبھی سوچتا ہوں شروع سے کتابوں کے نام کہیں نوٹ کر جاتا تو اچھا ہوتا۔

ہر چیز کو ٹھیک جگہ پر رکھنے اور دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے، جس میں پوری صفائی کا خیال رہتا ہے۔ زندگی بھی کچھ قاعدے کے ساتھ چل رہی ہے۔ سادہ کھانا، سادہ رہنا اپنے کسی کپڑے پر کسی رنگ کا ایک ٹکڑا بھی مجھے پسند نہیں یہ کپڑے کھدر ہی کے ہوتے ہیں۔ اس (۱۹۴۱ء) میں پچاس سال سے زیادہ عمر ہونے پر بھی تھوڑی بہت دیسی ورزش کئے جاتا ہوں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جاڑا ہو یا گرمی ایک دو کپڑوں سے زیادہ پہننے کی کبھی ضرورت نہیں۔ EXPOSURE وغیرہ کا سارا خیال محض وہم ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

مارچ ۱۹۲۵ء میں اہلیہ کی وفات کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاعرانہ الہام رخصت ہو گیا۔ مگر صبر و شکر سے کام لینے پر جلدی ہی طبیعت میں توازن پیدا ہو گیا۔"

بقیہ مضمون "پریم چند اور اردو کا ریپ" صد ۱۴

(بقیہ صد ۱۴)

تعلیمات کا مظہر جتا رہے ہیں۔ پریم چند پر مسلمان اسلام اور اردو دشمنی کا الزام لگانے والے شبلی صاحب سے عرض ہے کہ اگر انکی سوچ سمجھ اور صلاحیتوں پر فرقہ وارانہ ذہنیت کا لقوہ پوری طرح نہیں مارا گیا ہے۔ تو اپنے گریبان میں منھ ڈال کر سوچنے کی کوشش کیجئے کہ اپنے پریم چند کا گریبان پکڑ کر مسلمانوں اسلام یا اردو کی کیا خدمت کی ہے۔

ہوئے تم دوست جسکے دشمن اُسکا آسماں کیوں ہو

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۹	مطالعۂ حالی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۹/-
۲۰	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۵۰
۲۱	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۲	مثنوی میانگہ	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۳	مقدمۂ شعر و شاعری	مع مطابق نصاب بی۔ اے حالی	۲/۵۰
۲۴	مرثیۂ غالب	حالی	-/۲۵
۲۵	محبوبۂ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۶	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۷	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۵۰
۲۸	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی مہاراج علی سرشار لکھنوی		
۲۹		ڈاکٹر حسن فاروقی	۲/۵۰
۳۰	مرزا ملا نوک جھونک	خواجہ عزیز حسن مجذوب	-/۷۵
۳۱	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۳۲	مصباح بلاغت مع مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۳۳	مطالعۂ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۷/۵۰
۳۴	مقدمات و مقالات	عبد الاحد خاں	۵/۵۰
۳۵	منتخب سوانح ابو ضیاء کے	نجم الدین نقوی	۵/-
۳۶	مفتاح العربیہ شرح	محمد حسین شمس علوی	۲/-

(ن)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندانِ دار العلوم کے نام	عبد الماجد دریابادی	-/۱۰
۲	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	
۳	نشاطِ غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴/-
۴	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۳/-
۵	نقش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین	۱۲/-
		ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی دوم	۲۰/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۶	شجاعت علی سندیلوی		۲۸/-
۷	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۸	نغمات الہند مع مقدمۂ اردو	محمد شریف	۳/
۹	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۰	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۳/-
۱۱	نسرین نسترن	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۲	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۶/-
۱۳	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندانِ اسلام کے نام	عبد الماجد دریابادی	-/۸۰
۱۵	نوائے سرور جہاں آبادی دیوان	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/۵۰
۱۶	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۱۷	نوروز "	مائل ملیح آبادی	۱/۵۰
۱۸	نئے اور پرانے چراغ مع اضافۂ جدیدہ	آل احمد سرور	۱۲/-
۱۹	نیلم	انتصار رحیم	۲/۵۰
۲۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۷/۵۰
۲۱	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۸/-
۲۲	نصاب فارسی	مع مقدمہ فارسی عبد الاحد خاں	۱/-
۲۳	منشی نولکشور نمبر		

(و)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	وعدۂ فردا	انگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-

(ی)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۲/-
۲	ہندوی کے مسلمان شعراء	امیر حسن	

کتاب	مصنف	قیمت
ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
ہندوستان کا تعمیری منصوبہ	"	۱/۵۰
ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی [illegible]	۱/-
" " حصہ ۲	" "	۱/۳۰
" " حصہ ۳	" "	۱/۴۰
۹۔ ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی [illegible]	۱/۴۰
(ی)		
۱۔ یادگار غالب	مولانا حالی	۸/-
۲۔ یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۔ یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) [illegible] مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
محمد حسین شمس علوی

رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو / این پی ۹۲
لائسنس نمبر ۹۲ - ۲۰۰۸ / ۴۴۸۷ / ۲۰
دفتر فون : ۳۶۱۲۵
فون رہائش گاہ : ۳۵۵۵۴

ادارۂ فروغ اردو کا ترجمان
زیر پرستی پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

ایڈیٹر :- محمد حسین شمس علوی
قاسمی کاکوروی فاضل دیوبند

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

مجلس ادارت :-
عبدالقوی دریابادی (بی . اے)
سعادت علی صدیقی (ایم . لٹ)
محمد حسین علوی (ایم . اے)

شمارہ (۱۱) مارچ ۱۹۸۲ء جلد (۲۸)

مجلس ادارت :-

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی ریڈر شعبۂ اردو	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
" ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی
" ڈاکٹر اکبر الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
" پروفیسر حکم چند نیر	بنارس یونیورسٹی
" ڈاکٹر سید محمود الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
" ڈاکٹر فضل امام	راجستھان یونیورسٹی

ترتیب

زر سالانہ اعزازی :- بیس روپئے
عوام سے :- پندرہ روپئے
فی پرچہ :- ایک روپیہ پچاس پیسے

پتہ
دارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید افضال حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا ۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

اردو کو دوسری زبان کا اعلان کئے ہوئے دو ماہ گزر گئے مگر اسمبلی کے اجلاس میں ابھی تک اس کے متعلق کوئی بل، وزیر اعلیٰ نے پیش نہیں کیا۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا مسئلہ معلق رہے گا۔ اول تو اعلان میں تھا ہی کیا، اردو والوں کی اشک شوئی بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن لسانی تنگ نظری اور تعصب کی جڑیں اتنی مضبوط کر دی گئی ہیں کہ زبانی ہمدردی بھی برداشت نہیں ہو پاتی اور اردو کے خلاف طرح طرح کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ کوئی وزارت سے عہدہ چھوڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔ ہندی کے وہ ادیب بھی، جنھیں کشادہ قلب اور کھلے ذہن کا سمجھا جاتا تھا، مخالفت پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ تحریکیں چلانے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے، چھوٹی موٹی تحریکیں شروع بھی کر دی گئیں، کبھی یو پی بند کا نعرہ دیا جاتا ہے کبھی گھیراؤ کرنے کا، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، کیا جمہوریت کا یہی مفہوم ہے کہ وہ اقلیت کے حقوق کی پامالی کرے، کیا اقلیت کو اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے مذہب کا تحفظ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اس کو سب کچھ اکثریت کی خوشنودی کے لئے تج دینا چاہیئے۔ ایک باشعور اور حقیقی جمہوریت کبھی اس قسم کے خرافات کی اجازت نہیں دیتی، وہ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرتی ہے، اور حق کے لئے بڑی بڑی مخالفت کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے، عدل و انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ کمزور سے کمزور انسان پر اگر ظلم کیا جا رہا ہو تو اس کو آہنی ہاتھوں سے ختم کر دیا جائے۔ اردو پر مسلسل تینتیس ۳۳، چونتیس ۳۴ سال سے ظلم کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے دستور کی اہانت کی جا رہی ہے، اور با اقتدار یک جہتی اور قومی یک جہتی کے مدعی حضرات یا تو بے بس ہیں یا ان کے اشارے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، صرف زبانی وعدوں اور اعلانات سے کچھ نہیں ہوتا، جو کچھ کہا جائے اس پر عمل کرانے کی قوت اور صلاحیت بھی ہونا چاہیئے، ورنہ یہ وعدے اور اعلانات صرف فریب دینے اور طفل تسلی دینے کے لئے کئے جاتے ہیں، جن سے وقتی طور پر خود اردو والے خوش اور مطمئن ہو جائیں، مگر نہ پورے ہونے کی صورت میں ان کے اندر بددلی، بے چینی، پیدا ہونا فطری بات ہے۔ اکثریت و قوم اگر غیر مطمئن، پریشان اور بددل رکھی جاتی ہے تو قومی یک جہتی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ دیکھنا ہے کہ وزیر اعلیٰ کب بل پیش کرکے "مرد کی زبان" کو سچا ثابت کرتے ہیں۔

فروری کا مہینہ اردو دنیا کے لئے بڑا جانکاہ ثابت ہوا، اس مہینہ میں ۔ مادرِ اردو کے دو مایۂ ناز سپوت ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ ۱۱ فروری ۱۹۸۲ء کو شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق استاد، ملتِ اسلامیہ کے پُرخلوص خادم، ممتاز محقق، اور نقاد ڈاکٹر عبد الاحد خاں خلیل نے چند ماہ بستر علالت پر رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی شخصیت بڑی دلآویز تھی۔ ان کا اخلاق، تعلیمی و سماجی کاموں میں ان کا انہماک مثالی تھا۔ مرحوم متعدد تعلیمی و اصلاحی اور سماجی اداروں سے آخر وقت تک منسلک رہے، ادارہ فروغ اردو، انجمن اصلاح المسلمین، ممتاز کالج، اسلامیہ کالج، جلسۂ تہذیب لائبریری، انجمن ادب اطفال اور نہ جانے ایسے کتنے ادارے تھے۔ جن کے مرحوم باقاعدہ ممبر اور عہدہ دار رہے۔ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دہلی نے مرحوم کی خدمات، تدریس و تحقیق کے لئے حاصل کر لی تھیں، اس کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ایڈیٹر کے لئے مرحوم کو انتخاب کیا، تقریباً ۶، ۷ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ دوسرے علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی، کام بھی کرتے رہتے تھے۔ جو کام بھی کرتے تھے انتہائی مستعدی، باقاعدگی اور خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔ افسوس کہ ایسی ہمہ گیر شخصیت اور خوش صفات ہستی ابدی نیند سو گئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین

دوسرا عظیم سانحہ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو اسلام آباد پاکستان میں ہوا، شاعر انقلاب و حریت حضرت جوش ملیح آبادی کے انتقال سے، ملک و بیرون ملک میں ماتم بپا ہو گیا، وہ جس کے نغموں نے حریت و آزادی، بے خوفی و بے باکی، اور حب وطن کا جذبہ ہر دل میں پیدا کر دیا تھا، وہ جس نے قصر بکنگھم کے کنگورے ہلا دیئے۔ جس نے دنیا کی عظیم ترین حکومت کو تنبیہ کی تھی کہ۔

وقت لکھنے کو گیا فی آیا۔ نئے مضمون کی، جس کی ترقی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی اور

یہ کہ موت ٹل سکتی ہے پر زبان ٹل نہیں سکتا۔

ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، اور ہندوستان کا یہ مایہ ناز سپوت۔ غربت میں ایک مجبور انسان کی طرح خاموشی سے زندگی گذار کر رخصت ہو گیا۔ وہ فخر روزگار نہیں رہا جس نے، عمر بھر اپنے انقلاب آفریں، اور حریت پسند افکار و خیالات سے اردو ادب کے سرمایہ کو مالا مال کیا، افسوس لفظوں کا جادوگر، شبستانِ سخن کا خوش نوا، انسانیت کا علمبردار، مشرقی تہذیب کا نمائندہ، ہم سے جدا ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

ادارہ فروغ اردو مرحومین کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

غزلیں

شوکت جلالی ایم۔اے

نظر نواز ہیں یوں رنگ اب بہاروں کے
بلندیوں پہ مقدر ہیں بادہ خواروں کے

نگارِ شب نے جو یادوں کو زلف لہرا دی
تو حوصلے بڑھے کچھ اور بیقراروں کے

جھکا ہے سر جو ہمارا تو کیا تعجب ہے
گرے ہیں تاج ترے در پہ تاجداروں کے

جہاں میں کوئی نیا انقلاب آیا ہے
بڑھے ہیں حد سے ستم جب ستم شعاروں کے

سنا ہے جب سے کرم ہیں ترے ستم سے سوا
گناہ اور بڑھے ہیں گناہ گاروں کے

قدم قدم پہ جلا کر چراغِ عزم و عمل
نصیب ہم نے جگائے ہیں رہگذاروں کے

خزاں کے راز نہاں انکے دل میں تھے شوکت
زباں سے ذکر جو کرتے رہے بہاروں کے

آفتاب عالم اجمیری

اُن کو اے دل سلام کروں کیا؟
عشق رسوائے عام کروں کیا؟

خانۂ دل میں اُن کو دے کے جگہ
دل کو عالی مقام کروں کیا؟

رُخِ روشن سے زلف کہتی ہے
روزِ روشن کو شام کروں کیا؟

اُن کا رُخ یاد آئے جب واعظ
ذکرِ ماہِ تمام کروں کیا؟

اے اجل کیا خیال ہے تیرا
اور کچھ دن قیام کروں کیا؟

زیست سے آکے تنگ دنیا کو
آخری میں سلام کروں کیا؟

اُن پہ اے آفتاب جان دے کر
میں بھی جینا حرام کروں کیا؟

نکہت قریشی (بریلی)

حسن بریلوی

داغ کے تلامذہ کی تعداد بے شمار تھی ان میں بعض بہت مشہور ہوئے بعض کم مشہور ہوئے۔ اور بعض گمنام ہو گئے ولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی کا شمار داغ کے ارشد تلامذہ یں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کی زندگی میں ہی ہندوستان یں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

حسن جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا

اسوقت پورے ہندوستان میں مشہور ہوئی تھی۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنے ماہنامے اُردوئے معلیٰ ابت ماہ نومبر ۱۹۱۱ء میں حسن بریلوی کے دیوان غزلیات سمی "ثمر فصاحت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا "شاگردان رزا داغ میں حسن بریلوی مرحوم کا پایۂ شاعری بہت بلند ہے۔ وہ بجائے خود استاد مستند تھے۔ انھوں نے اپنے انداز فن کو استاد کے رنگ کلام سے مشابہ بنانے میں اس قدر میابی حاصل کی ہے کہ اکثر موقعوں پر داغ و حسن کی شاعری ں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

حسن رضا خاں حسن بریلوی ۱۹ اکتوبر سنہ [illegible] کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش بریلی کے ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو دینداری اور علم و فضل میں شہرت رکھتا تھا آپ کے والد مولانا نقی علی خاں اور آپ کے دادا مولانا رضا علی خاں جید عالم دین تھے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا احمد رضا خاں بھی اس عہد کے بے مثل عالم دین گزرے ہیں۔

حسن بریلوی کے زمانہ میں داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ اسوقت داغ رامپور میں تھے حسن بریلوی رامپور جاکر ان کے شاگرد ہوئے۔ وہ اپنے استاد کی توجہ سے بہرہ ور ہوئے۔ اور شاعری میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ داغ ان کو "پیارے شاگرد" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

حسن بریلوی نے مرثیہ [illegible] میں لکھا ہے ؎

پیارے شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اب پیار کا مزا کہیے

حسن بریلوی نے داغ کی خصوصیات شاعری کو برقرار رکھا۔ پھر بھی ان کے ذاتی اوصاف کا عکس انکی غزل پر پڑا جس کی

قاضی سید ظہور الحسن۔ شعبۂ اُردو
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی ۷

حضرت موسیٰ علیہ السّلام ہندوستان میں

مورخہ دسمبر ۱۹۸۱ء کے قومی آواز نئی دہلی میں شائع شدہ مضمون میں مورخ کشمیر فدا حسین نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزار مبارک کشمیر میں موجود ہے اور بعض آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے آخری ایام اسی خطے میں گذرے ہوں گے۔ ان باتوں کی تصدیق یا تکذیب تو آئندہ کا مورخ ہی کرے گا۔ مگر ہمارے خیال میں سری کرشن جی کے حالات اور واقعات جو کچھ بھی بیان کئے جاتے ہیں وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کی مسخ شدہ صورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک لمبے عرصے کے بعد جب بنی اسرائیل کشمیر کی گھاٹیوں اور ہندوستان کے میدانوں میں محصور ہو کر رہ گئے اور عرب و ایران اور مصر کے ماحول سے صدیوں تک قطعاً کٹ کر رہ گئے تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام کو احتراماً استعمال نہیں کیا، بلکہ غلو محبت میں ان کی نمایاں صفت کالے رنگ کو ہی حرف عام بنا دیا۔ یعنی بھاشا میں کرشن جی کہنے لگے۔ اور سبھی اہل علم جانتے ہیں کہ کرشن کے معنی کالے رنگ کے ہیں اس کے علاوہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مویشی بھی چرائے تھے۔ اس لئے گوپال اور مرلی دھر بھی صفاتی نام رکھے گئے مگر اسم "کرشن جی" بے حد مقبول ہوا۔ اتنا کہ اصل اسم ذات بھی بھلا دیا گیا چنانچہ آج کوئی بھی کرشن بھگت سری کرشن جی کے اسم ذات سے واقف نہیں ہے ان کے اصل اسم ذات کے بارے میں کوئی نشاندہی نہیں کر سکتا آج بھی ہندو قوم میں کرشن جی جس شخصیت گرامی کا نام سمجھا جاتا ہے اس نام کو بھی اسم صفاتی ہی مانا جاتا ہے۔ اہل علم اور خصوصاً مدیر روزنامہ ملاپ نئی دہلی کے بقول بھی سری کرشن جی کا اصل اسم ذات وشنوک سین ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وشنوک سین نام سے کوئی بھی واقف نہیں ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ وشنوک سین بھی مدیر ملاپ اور چند اہل علم کا دیا ہوا نام ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رنگ کالا تھا لہٰذا ان کے ہندوستانی ماننے والوں اور خصوصاً کشمیری قوم نے سنسکرت بھاشا میں ان کا صفاتی نام "کرشن" استعمال کیا

ہوگا۔ جو ابتداء میں اجتہاداً اور غلو عقیدت کے سبب [illegible] گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مہابھارت کی لڑائی ۱۸ دن تک جاری رہی۔ اور کرشن جی کا اس جنگ میں ایک اہم رول رہا۔ [illegible] اس اٹھارہ دن کی خونریز جنگ میں کرشن جی نہ صرف بیچ معرکہ میں رہے بلکہ شری ارجن کو آمادہ جنگ بھی کرتے رہے، نیز اس دوران جو مکالمہ ہوا، گیتا کہا گیا ہے۔ جو انتہائی اہم اور مذہبی کتاب بن کر مشہور ہوئی۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس اٹھارہ دن کی جنگ میں شری کرشن جی خود خونریز اور قتال میں شریک نہیں ہوتے۔ البتہ ایک ایسا واقعہ ضرور ملتا ہے کہ جب ارجن بالکل ہراساں ہو اٹھا اور شری کرشن جی اس کو جنگ کے لئے ابھارتے ابھارتے تھک گئے تو وہ خود ہتھیار لیکر ارجن کے سامنے ہی میدان جنگ میں کود پڑے۔ اس منظر کو دیکھ کر شری ارجن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور بڑھ کر ان کو روکا اور خود ارجن جنگ میں شریک ہوگئے۔

اس واقعہ کو ہندو فلاسفر کرشن جی کی ڈپلومیسی پر محمول کرتے ہیں اُن کی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کرشن جی ایسے اعلیٰ ڈپلومیٹ اور جوڑ توڑ کے ماہر تھے کہ باوجود اٹھارہ دن کی جنگ میں پورے [illegible] ادا کرتے رہے جنگ [illegible] دور رہے، حالانکہ ہمارے نزدیک اس جنگ سے بچنے کی توجیہ کچھ اور ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ بزرگ اگر نبی یا رسول تھے تو انکے عقیدت مندوں نے ان کے واقعات میں انکی جنگوں کا بھی ذکر کیا ہوگا۔ اور چونکہ نبی یا رسول بذاتِ خود جنگ میں حصہ نہیں لیا کرتا ہے۔ اسی لئے ان بزرگ نے بھی حصہ نہیں لیا ہوگا۔ پس اس کو جب مہابھارت والے قصہ میں جوڑ توڑ کر بیان کیا گیا۔ تو اصل ایم کو تو بیان نہ کر سکے۔ کیونکہ اس زمانہ تک نبی یا رسول

کے اس فریضہ سے ہندو قوم عاری ہو چکی ہوگی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے شرکت جنگ کا تو ذکر کر دیا مگر اس کی وجہ "ڈپلومیسی" بیان کی جو اصل رتبہ پر کسی طرح بھی مناسبت نہیں رکھتی، اور نہ ایسی عظیم شخصیت کو زیب دیتی ہے۔

اسی طرح ہندو عقیدتمندوں نے سری کرشن جی کے واقعات میں وہ واقعہ بھی بیان کیا ہے جس میں رشی دُرواشا کا ذکر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ سری کرشن جی کے زمانہ میں ایک مہرشی دُرواشا نامی تھے۔ وہ بڑے غصیلے اور نک چڑھے۔ مگر تھے ایسے سدھی کہ جو زبان سے کہہ دیتے تھے وہی ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی بددعا کے ڈر سے لوگ ان سے وحشت کرتے تھے۔ مہرشی نے اعلان کر رکھا تھا کہ میں کسی بھی راجہ کے یہاں مہمان رہنا چاہتا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ میں جو چاہوں کروں [illegible] دخل اندازی نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر ہوئی تو میں سراپ دیدوں گا۔ لہذا اس زمانہ کا ہر راجہ [illegible] اس جلال کے اندیشے سے ان کی آؤ بھگت کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر شری کرشن جی نے انکی ناز برداری کا بیڑا اٹھایا۔ اور ان کو اپنے یہاں بطور مہمان [illegible] ان مہمانی کے دنوں میں مہرشی جی کبھی کھیر مانگتے اور جب وہ آتی تو اسے کھانے سے انکار کرتے اور پھینک دیتے پھر کسی دوسری چیز کا مطالبہ کرتے کبھی کبھی وہ محل کی قیمتی اشیاء کی توڑ پھوڑ کرتے آخری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ مہرشی جی نے شری کرشن جی سے کہا کہ میں رتھ میں [illegible] ہوں اور تم خود اپنے کاندھوں پر جوا رکھ کر [illegible] چنانچہ سری کرشن جی نے حلم اور انکساری کے سبب یہ بھی کیا اور جب رتھ کھینچ کر کرشن جی چلنے لگے تو مہرشی دُرواشا جی رتھ میں سے کود کر بھاگ گئے اور کہہ گئے کہ میں ہارا تم جیتے۔ اس واقعہ میں سری کرشن کے حلم اور بردباری کی فتح دکھائی گئی ہے۔

جب ہم اِس واقعہ پر غور کرتے ہیں تو اِس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جب کوئی قوم اسلام۔ توحید۔ رسالت۔ اور وحی وغیرہ کی روح سے عاری ہو جاتی ہے تو اچھے خاصے واقعہ کی توجیہ ایسی ہی من گھڑت باتوں سے کرنے لگتی ہے کیونکہ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں سے ایک واقعہ میں ایک مخصوص بندہ خدا سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اُس کے ہمراہ سفر کرنا۔ اور اِس کے محیر العقول اور معروف واقعات کے خلاف افعال کا ذکر ہے جس میں اِس مخصوص بندۂ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اِس کے افعال خلاف واقعہ پر نہیں ٹوکیں گے جس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کر لیا۔ مگر دو چار واقعات کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ بندۂ خدا جُدا ہو گیا۔ جو خلاف واقعات ہوئے تھے اِن کی صحیح صورتحال سے واقف کرا گئے۔ یہ واقعہ قرآن پاک کی سورہ کہف میں موجود ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہندوستانی یا کسی اور شخصیت سے منسوب ہندو دانشوروں نے اِس واقعہ "بندہ خدا" کی اصل روح کو تو بھلا دیا البتہ اس سے ملتا جلتا دنیادارانہ واقعہ سری کرشن جی کے مہمان مخصوص مہرشی دُرواسا کے روپ میں بنا دیا مگر احتیاط یہ رکھی کہ اُس اصل واقعہ کے کچھ نہ کچھ آثار رہ جائیں مِل جائیں۔ چنانچہ مہرشی کا لفظ خود بتاتا ہے کہ یہ شخصیت مذہبی اور خدا پرست ہے اور اِس شخصیت کا اسم ذات بھی وہ نہیں جانتے تھے۔ جس طرح کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے "بندۂ خدا" کا اسم ذات نہیں جانتا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ حضرات مفسرین کرام نے اسرائیلی روایات کے زیر اثر حضرت خضر علیہ السلام کا نام بیان کیا ہے۔ بہرحال قرآن پاک میں سورہ کہف میں "عبداً من عبادنا" کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی مخصوص بندگانِ خدا میں سے ایک بندہ اور اسکی اصل وجہ امتیاز جو قرآن نے بھی اُجاگر کی ہے وہ ہے خلاف معمول اور محیر العقول کام کرنا۔ جس کے سبب ظاہر بین شخص سوالیہ نشان بن جاتا ہے، اسی لئے اِس بندۂ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے صاف صاف وعدہ لے لیا تھا۔ کہ اِس کے افعال غیر واقعہ پر اعتراض نہ کریں۔ اور کہا اگر تم صبر نہ کر سکے تو میرا تمہارا ساتھ زیادہ دیر تک نہ نبھ سکے گا چنانچہ تین چار واقعات کے بعد یہ ساتھ چھوٹ گیا۔ اسی حالت کو ممیز کرنے کے لئے "مہرشی دُرواسا" نام دیا جس کے معنی ہیں مشکل سے ساتھ رہنے والا رشی۔ یا اجنبی مہرشی۔ اِس طرح اِس کے اصل اسم ذات کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ہی حکومت وقت کے فرماں روا کو نجومیوں کا انتباہ۔ اُن کے والدین کا جیل میں ڈلوا دینا۔ بچے کا رات میں تولد ہونا صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دینا۔ راجہ کے گھرانے میں پرورش پانا۔ بہن کا ایک اہم رول ادا کرنا۔ دوسرے بھائی کا ہونا۔ اور اِس کا زندگی بھر معاونت کرتے رہنا۔ جیسے واقعات سری کرشن جی کی پیدائش کے سلسلے میں بھی ملتے ہیں۔ بس فرق یہی ہے کہ یہاں کے [illegible] خوش عقیدگی اور وحی کی محرومی کی وجہ سے ذرا بدلے ہوئے ہیں مثلاً بہن کا اہم رول حضرت موسیٰؑ کے سلسلے میں یہ تھا کہ وہ فرعون کے گھر پہونچ کر دایہ کا پتہ دیتی [illegible] بھائی زندہ رہ سکے اور اسکی پرورش ہو جائے۔ اور سری کرشن جی کے واقعہ میں جب جلاد سری کرشن جی کے بجائے ایک نوزائیدہ لڑکی کو پاتے ہیں اور اِس کو پتھر پر پچھاڑ کر مارنا چاہتے ہیں تو وہ لڑکی ہاتھوں سے چھوٹ کر آسمانوں میں چلی جاتی ہے اور پکار کر خبردار کر جاتی ہے کہ تمھارا

مارنے والا تو پیدا ہو چکا ہے۔

حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے بجائے کرشن جی کے یہاں ان کا بھائی بلرام نامی ہوتا ہے جو شاید صفاتی نام سے ہی مشہور و معروف ہے کیونکہ بل رام کے معنی اللہ کے ولی یا اللہ کی طاقت کے ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت ہارونؑ کو باقاعدہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ولی اور مددگار بنایا تھا۔ شاید اسی انتخاب کے اظہار کے لئے سنسکرت میں بل رام یعنی رام کا بل کہلایا جو سری کرشن جی کے معاون و مددگار رہتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں مویشیوں کا چرانا بھی شامل ہے جو سری کرشن جی کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ و نیز ان مویشیوں میں گایوں کا ذکر بہت کثرت سے ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں گایوں کے چرانے کا تو ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ بنی اسرائیل کے نزدیک گایوں کے نزدیک گایوں کے تقدس کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ قرآن پاک کی سورہ بقرہ میں کئی مقامات میں اس کا تذکرہ ہے۔ اور گائے کے بچھڑے کی پوجا کا ذکر بھی ملتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے سلسلے میں لکھا ہوا ہے کہ آپ بمعہ اہلیہ خسرال سے مصر تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک رات سردی محسوس ہوئی جنگل میں بھلا آگ کہاں؟ نظر دوڑائی دور سے روشنی نظر آئی۔ آپؑ وہاں پہونچے تو آپ وادیٔ سینا میں تھے وہاں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ ہوا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے کوہ طور کے ایک درخت سے اپنی تجلی دکھائی اور اپنا تعارف "انا ربکم الاعلیٰ" یعنی میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں جیسے الفاظ میں کرایا۔ اور مزید کلام بھی ہوا۔ اسی طرح ایکبار بنی اسرائیل کے سرداروں کو جمع کرکے توریت پر مستحکم ہونے کے لئے حکم دیا گیا۔ اور ان پر ایک خاص ڈر اور خوف کا ماحول پیدا کرنے کے لئے کوہ طور کو زمین کے اوپر اٹھا دیا گیا۔ (جیسا کہ قرآن میں "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ" آیا ہے۔

اسی طرح کا واقعہ مگر بالکل ہی مسخ شدہ صورت میں و نیز رسالت۔ توحید اور وحیٔ الٰہی سے عاری ذہن کی پیداوار کے بطور سری کرشن جی کے عقیدت مندوں نے بھی بیان کیا ہے کہ ایک بار برج میں بارش کثرت سے ہوئی لوگوں نے ہاہاکار مچایا اور سب نے جمع ہو کر سری کرشن جی کے پاس جا کر شکایت کی۔ کرشن جی فوراً ہی "گوبردھن" گئے اور انہوں نے دھان کے پہاڑ کو جس کا نام آج بھی گرراج ہے۔ چھنگلیا "انگلی" پر اٹھا لیا اور اس چھتر چھایہ میں سارے لوگ مع مویشیوں کے آ گئے اس طرح بارش سے بچ گئے اور پھر کرشن جی نے گرراج پہاڑ پر اپنے وجود کو اتنا بڑھایا کہ وہ تمام پہاڑ پر چھا گئے اور لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ "میں گرراج ہوں"۔

سری کرشن جی کے اس واقعہ میں جو اشارے ملتے ہیں وہ اسی طرح ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں طور اٹھانے کا ذکر ہے جبکہ کرشن جی کے واقعہ میں گرراج پہاڑ اٹھانے کا تذکرہ ہے۔ لفظ گرراج بھی صفاتی نام معلوم ہوتا ہے کیونکہ لفظ گرراج دو الفاظ کا مرکب ہے گری + راج۔ یعنی پہاڑوں میں سب سے مقدس اور بڑا پہاڑ۔ ظاہر ہے کہ تقدس کا سبب کرشن جی کے اٹھانے کے سبب پیدا ہو گیا۔ جبکہ ہند میں کسی اور پہاڑ کو یہ شرف نصیب نہیں ہوا۔ اسی طرح کرشن جی کا لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا کہ "میں گرراج ہوں" اس کے معنی بالکل وہی ہیں جو "انا ربکم الاعلیٰ" کے ہوتے ہیں۔ یعنی میں گری + راج ہوں یعنی میں راجاؤں کا پہاڑ ہوں یعنی سب سے بڑا راجہ ہوں۔ اور یہ بھی کہ میں اس پہاڑ کا بھی راجہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ عقیدت مندوں نے

سری کرشن جی کو الوہیت کا درجہ دے رکھا ہے۔ اسی لئے یہ لفظ آج تک چلا آ رہا ہے۔

اس واقعہ کے سلسلے میں مزید یہ عرض کرنا ہے کہ میں گوبردھن کے اطراف کا رہنے والا ہوں میں نے اس گرآج پہاڑ کو غور سے دیکھا ہے یہ کوئی پہاڑ نہیں ہے بلکہ یہ ۵ میل میں پھیلا ہوا پتھروں کا ڈھیر ہے جو شاید کسی راجہ نے راجستھان کی طرف سے متھرا اور برج کے نشیبی علاقے میں برساتی پانی کو روکنے کے لئے ڈیم بنایا ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ گرآج پہاڑ کے اطراف میں جو زمین اور کھیت ہیں ان میں کنواں کھودنے پر زمین کے اندر سے پتھر نہیں نکلتے ہیں۔ بلکہ پیلی مٹی نکلتی ہے۔ اس طرح اس مخصوص [illegible] کے ڈیم کے علاوہ کوئی سلسلۂ کوہ نہیں ہے۔ رہی برسانہ کی ارادلی کی پہاڑیاں تو وہ مڑ کر مغرب کی طرف راجستھان میں چلی گئی ہیں۔ گوبردھن تک نہیں گئیں۔ مقامی روایات میں کہا جاتا ہے کہ جب ہنومان جی جیون بوٹی کے لئے ایک پہاڑی لنکا کی [illegible] راستہ میں اس پہاڑی کا ایک حصہ یہاں گر گیا [illegible] پہاڑ [illegible] اس قسم کی روایتیں [illegible] کی بیان کی ہوئی ہیں۔ حقائق سے دور معلوم ہوتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو عرصہ دراز کے بعد ہندوستان میں بیان کیا گیا تو لوہ طور کا نام بھلا بیٹھے۔ اور گوبردھن کے پہاڑ کو صفاتی نام گرآج سے پکارنے لگے۔ یعنی صاحبِ عظمت پہاڑ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں سانپوں سے جنگ کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح سری کرشن جی کے واقعہ میں بھی سانپوں سے لڑنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ہندوستان کی فضا کے اثر سے دلچسپ واقعات کے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے بچھڑے کی پرستش کے واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ نافرمان بنی اسرائیل کو تہ تیغ کر دیں یعنی باایمان اسرائیلیوں نے کافر بنی اسرائیل کو مرتد ہو جانے کے سبب قتل کر دیا۔

اس واقعہ کو بھی کرشن جی کی اولاد ہونے کے دعویدار جادوں قبیلہ جو متھرا کے اطراف میں بستا ہے بیان کرتا ہے کہ ایک بار سری کرشن جی نے اپنی اولاد یعنی جادووں کو دوارکا میں کسی تالاب کے کنارے میلے کے لئے جمع کیا۔ وہ لوگ تالاب میں نہانے لگے۔ نہاتے نہاتے تالاب میں پائے گئے پانی کے پودے نرکلوں کو توڑ کر ایک دوسرے کو مذاق میں مارنے لگے یہاں تک کہ وہ نرکل لوہے کے خنجر کی طرح کام کرنے لگے اور باہم کافی خونریزی ہو گئی۔ یہ واقعہ ان کے نزدیک "جادو دنگی" کہلاتا ہے یعنی جادووں کا باہمی یدھ۔ جو گویا ان کے قبیلے کی تقسیم میں پڑا ہوا ہے۔

اسی سلسلے میں متھرا کی وجہ تسمیہ پر بھی غور کر لیں۔ متھرا شہر کا انتساب کرشن جی کی جائے ولادت سے ہے اور ہندوؤں کے نزدیک مقدس معلوم شہر مانا جاتا ہے۔ اسی کے اطراف میں کرشن جی کی لیلا کے مقامات بنے ہوئے ہیں۔ اور چوراسی میل کا علاقہ اصل "برج" مانا جاتا ہے۔ جو متھرا۔ گوکل۔ مہابن برندرابن۔ مانٹ کوٹ بن۔ برسانہ۔ نندگاؤں ہوتا ہوا گوبردھن کے اطراف سے گزرتا ہوا متھرا پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا طواف یعنی [illegible] پرکرما بھی [illegible] یا [illegible] تا ہے۔

اس مقدس خطے کا اصل [illegible] متھرا ہے متھرا شہر کی وجہ تسمیہ میں صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ یہاں قدیم زمانہ میں ایک جنگل

تھا اس میں شہد بکثرت پایا جاتا تھا اور سنسکرت میں شہد کو مدھ کہا جاتا ہے اس لئے اس شہر کا نام مدھوبن پڑ گیا اور بعد میں آگے بگڑ کر متھرا ہو گیا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ متھرا جو کہ سنسکرت میں بھی تلفظ "متھرا" ہے مدھوبن سے بگڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اصل لفظ "مَطہَرہ" ہے جو عربی کا لفظ ہے جس کے معنی پاک جگہ کے ہیں۔ چونکہ یہ عربی کا لفظ ہے اس لئے اس کی ادائیگی کے لئے سنسکرت کا لفظ "متھرا" استعمال ہونے لگا کیونکہ سنسکرت میں "ط" کے تلفظ کے لئے کوئی الگ سے آواز نہیں ہے یا اگر قدیم سنسکرت میں تھی تو بعد کی سنسکرت میں نہیں رہی۔ اسی لئے اس کی ادائیگی کے لئے "ت" کر دیا گیا اور "ہ" سے "ھ" کو ملا کے ہندی بنا دیا گیا۔

قیاس کہتا ہے کہ قدیم زمانہ میں بنی اسرائیل کے ذریعہ یہ "مطہرہ" عبرانی یا جبرونی یا عربی یا قدیم ترین سنسکرت کا لفظ تھا اور جب کرشن جی کے عقیدت مندوں نے یعنی ہمارے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہندوستانی عقیدتمندوں نے اس علاقہ میں اپنی پرانی روایتوں کو قائم اور دائم رکھنے کے لئے اس کو چنا تو مرکزی مقام کو مطہرہ کہا۔ یہاں سے بگڑی شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام واقعات کو منسوب کر دیا۔

اس کے علاوہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کافر گر سامری کی زبانی اچھوت۔ اچھوت کے الفاظ استعمال اور بنی اسرائیل کے لئے قرآن پاک میں فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِين کا مضمون بیان کرنا بھی ہے جس کی بگڑی صورت میں چھوت چھات کا رواج اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور خصوصاً برہمنوں فضیلت و برتری کا احساس بھی انھیں قدیم ہندوستانی یہودیوں کی دین ہے۔

ان قدیم ہندوستانی یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلوہ طور کی آگ کے سے بھگوے رنگ کو اپنایا۔ اور اس کو مقدس سمجھا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ خانہ کعبہ میں عبادت کے لئے جس طرح احرام کا استعمال ہوتا آیا ہے اس کی نقل ہی میں آج تک ہندو سادھو سنت اپنا لباس اسی رنگ کا پہنتے ہیں۔ اسی لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سنگ اسود کی یاد میں کالے پتھر کی پوجا بھی ہے اور یہ باتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی رائج ہیں۔

اس مقالہ سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کا قدیم ترین مذہب یعنی سناتن دھرم اور اس کی شاخیں اسی قدیم یہودی مذہب کی روایات پر قائم ہیں جن کو یہودی یا دوسری ایسی قومیں جو ایران عرب اور مصر سے یہاں منتقل ہوئیں اپنے ساتھ لائیں یا یہاں کے لوگ ہی وہاں جا کر لائے۔ اور پھر یہاں کی فضا اور مقامی ماحول میں ایک عرصہ دراز کے بعد وہ روایات کیا سے کیا بن گئیں۔

مورخین کے ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ سندھ میں پائی جانے والی قدیم ترین تہذیب جو ہڑپا موہن جوڈرو میں پائی گئی ہے وہ سمیری تہذیب ہے جس کا اصل مرکز میسوپوٹامیہ ہے اور اس قدیم ترین تہذیب کے آثار اب راجستھان میں بھی پائے جا رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ سمیری تہذیب جو عراق کی تھی۔ اور سرزمین عراق حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد رسول اللہ تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات کا گہوارہ رہی۔ لہذا یہ روایات اور کہانیاں دوسری جگہ بھی منتقل ہوئیں اور ہندوستان میں بھی سمیریوں۔ ایرانیوں۔ یونانیوں۔

اور خود اہل عرب اور مصریوں کے ذریعہ بھی یہاں پہونچے۔ یہ بات تو ہم سبھی کو تسلیم ہے کہ ہندوستان کے بجز دو دریاؤں نربدا اور تاپتی کے سبھی دریا شمال اور مغرب سے نکل کر مشرق اور جنوب کی طرف بہتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان میں انسانوں کا ریلا بھی شمال مغرب سے مشرق، جنوب کی طرف ہمیشہ بہا ہے اس کے برعکس ایک بھی واقعہ نہیں ہے اور یہ انسانی رَو کبھی درہ خیبر سے اور کبھی بلوچستان کے راستہ سے اور کبھی عربی قوم تبع کے ملک تبت کی پہاڑیوں سے نکل کر اور کبھی مالابار کے ساحلوں کی طرف سے آتی ہو۔

اسی تہذیبی رَو نے کبھی ہندوستان کے شہر ملتان کو مرکز بنایا ہوگا اور کبھی پر بلاد بھگت کی کہانی کے روپ میں کسی اسلامی بزرگ کے واقعہ کو پیش کیا ہوگا۔ اور کبھی متھرا کو مرکز بنا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کی لیلائیں ہوگی۔ اور کبھی یہاں سے آگے بڑھ کر جنوب مصر کی یاد میں "مدورا" نامی جگہ کو مرکز بنایا ہوگا۔

مذکورہ بالا مقالے میں جو کچھ کہا گیا ہے صرف قیاسات ہیں عقیدہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف اس لئے لکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے ماحول پر اور یہاں کی قدیم روایات کو اس طرح بھی سوچا جائے شاید صحیح بات کا سراغ لگ جائے (اور یہ تہ کی بات مل جائے۔

سو صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے؟

نقش حالی

از پروفیسر احتشام حسین۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

قیمت حصہ اول و دوم کامل =/۳۵

ہماری جدید شائع کردہ کتابیں

جلد خریدیں

		قیمت
۱۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	8/=
۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	7/=
۳۔ باغ و بہار میر امّن دہلوی	مع مقدمہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	6/=
۴۔ یادگار غالب، حالی مع مقدمہ	(جدید ایڈیشن)	6/=
۵۔ ادب اور نظریہ۔	آل احمد سرور	12/=
۶۔ دیوان غالب اُردو۔	(فروغ اُردو طاہر ایڈیشن)	6/=
۷۔ انار کلی	امتیاز علی تاج	5/=
۸۔ سلور کنگ۔ آغا حشر کاشمیری	مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالغنی	6/=
۹۔ اُردو کے قومی شاعر۔	ڈاکٹر انوار الحسن	5/=
۱۰۔ مقدمہ شعر و شاعری حالی	(زیر طبع)	5/=
۱۱۔ حسرت موہانی۔ جدید ایڈیشن۔	عبدالشکور	9/-
۱۲۔ امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	6/-

ملنے کا پتہ

ادارہ فروغ اُردو ۳۷-۱۲ امین آباد پارک لکھنؤ

علیم جہانگیر:

طنز و مزاح

دعوتیں اور ہم

اُردو کے قدیم محاورہ "شاعر اپنے دور کی عکاسی کرتا ہے" کے مطابق ہمارے خیال میں اکبر الٰہ آبادی کے دور میں نہ تو دعوتیں ہوتی ہونگی اور نہ گھروں میں پکایا جاتا ہوگا۔ ورنہ وہ ببانگ دہل یوں نہ کہتے کہ :

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

دعوت بظاہر کتنا پیارا اور مختصر سا لفظ ہے۔ لیکن اس مختصر اور خوبصورت لفظ میں رحمت اور زحمت دونوں ہی پوشیدہ ہیں۔ رحمت ان لوگوں کے لئے ہیں جنھیں "تناول طعام کا" رقعہ پہونچتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ صاحب خانہ کے لئے تو ہمیشہ باعثِ زحمت رہا۔ پہلے دعوت کے لوازمات میں گرانی کے دور میں زیر بار ہونا۔ دوسرے دعوتیوں کی آؤ بھگت اور سربراہی میں وہ تگنی کا ناچ ناچنا پڑتا ہے کہ بیچارے کو نانی کا دودھ یاد آجائے۔ اس پر طرہ یہ کہ مہمان لوگ دستر خوان پر ہی پکوان کی خامیاں اور خوبیاں گنوا دیتے ہیں۔ اگر صاحب خانہ غائب دماغی یا کثرت کار کی وجہ سے کسی کو بھول جائے تو گلہ شکوہ الگ۔

جس طرح نبی نوع انسان ذات۔ پات' بھید بھاؤ کے چکر میں ہیں اسی طرح دعوتیں بھی "اعلیٰ" "اوسط" اور "مختصر" پیمانوں میں قید ہیں۔ اعلیٰ اقسام کی دعوتیں ہوٹلوں، گیسٹ ہاؤس اور باغ باغیچوں میں باادب' باڈریس اور ٹرینڈ سرونٹس کے زیر اہتمام بحسن و خوبی انجام پاتی ہیں۔ اس قبیل کی دعوتوں میں بھید بھاؤ نہیں ہوتا۔ اوسط درجہ کی دعوتیں گھروں میں اور بالخصوص گھروں میں مشتمل افراد کی سربراہی اور نگرانی میں ہوتی ہیں۔

بڑھتی ہوئی آبادی سے گھر میں جگہ کی تنگی ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گھر کے سامنے سڑک پر یا گلی کوچہ میں بلا اجازت میونسپل کارپوریشن کے ایک عدد شامیانہ تان دیجئے۔ اس قسم کی دعوتوں میں صورت، پوشاک اور جان پہچان کا بھرپور خیال رکھا جاتا ہے۔ مختصر دعوتیں چائے پانی پر منحصر ہوتی ہیں۔

کہتے ہیں انسان سوشل قسم کا جانور ہے۔ حالانکہ اسکی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ بہترین قسم کا جانور نہیں۔ سوسائٹی میں رہتے ہوئے دعوتوں سے دامن بچا [illegible] نکلنا [illegible] بلکہ ناممکن ہے۔

نہیں۔ آپ کتنے ہی جیالا جو ہوں، مصروف ہوں بلکہ دعوتوں سے
چڑ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ آپکی بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چاپ
دعوتوں میں شرکت کریں ورنہ رشتہ دار روٹھ جائیں گے۔ دوست
احباب سوشل بائیکاٹ کر دیں گے اب آپ میں اتنی جرات کہاں
کہ تن تنہا ان تمام خطرات کا مقابلہ کر سکیں۔

ہمارے اندازے کے مطابق عمر عزیز کا نصف بلکہ کچھ زیادہ
ہی حصہ دعوتوں کے نذر ہو جاتا ہے ہفتہ کا کوئی دن ایسا نہیں
کہ آپ یا ہم اپنی مرضی سے کوئی پروگرام مرتب کر سکیں۔ آئے دن
چھلہ چھٹی، سالگرہ، تسمیہ خوانی، عقیقہ، روزہ رکھوائی،
نذر و نیاز، عید تہوار، شادی بیاہ، گھر بھرائی، استقبالیہ،
الوداعی پارٹی، دسواں، بیسواں، چہلم اور برسی جیسی دعوتوں
کا ایسا لامتناہی چکر چلتا رہتا ہے کہ سانس لینے کی فرصت نہیں ملتی۔

افتادہ طبع کے اعتبار سے ہم گوشہ نشین [illegible]
یہ بات نہیں کہ ہم اسٹین کلر دنیا سے بیزار ہیں جب تک محفل
میں ہمارے ہم مزاج یا ہم خیال نہ ہوں تب وہ محفل رونق پھیکی
بلکہ بے جان نظر آتی ہے۔ اس کا کیا کیا جائے کہ ہمیں تو [illegible]
دعوتوں سے پالا پڑتا ہے جہاں ع

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

پچھلے ہفتہ ولیمہ کی دعوت تھی۔ صاحب خانہ
صدر دروازے کے بیچ میں کھڑے مہمانوں کے لائے ہوئے
پھول مالائیں پہنے پُرزور استقبال کر رہے تھے۔ اندر
صف جاری تھی۔ طعام سے فارغ ہو کر دعوتی باہر نکلنے
کی کوشش کر رہے تھے۔ اور باہر کے دعوتی اندر داخل
ہونے میں مصروف تھے۔ درمیان سے اہل خانہ کی چیخ و پکار
کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

وہ تو غنیمت ہوا کہ ہم موجود تھے۔ فوری جائے واردات پر پہنچ کر
موصوف کو جم غفیر سے کھینچ نکالا۔ اس کھینچا تانی میں ہمیں پانچویں
صف میں جگہ نہ مل سکی۔ مجبوراً ایک کونے میں کھڑے انسانوں
کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ رہے تھے۔ کسی شخص کے بچے نے رنگی
برنگی قمقموں سے متاثر ہو کر پوچھنے لگا۔

" پپا
ہاں بیٹا
شادی پر کتنا خرچ آتا ہوگا۔
پتہ نہیں بیٹا۔ ہم آج تک آپکی ممی کی شادی کا قرض
ادا کر رہے ہیں"

ہمارے آفس میں ایک بابو کو پروموشن ملا۔ اسٹاف کے
بے حد اصرار پر انھوں نے ایک شاندار پارٹی کی حامی بھرلی۔ ہمیں
ساتھ لئے وہ شہر کے بڑھیا ہوٹل میں منیجر سے پوچھتاچھ کرنے لگے۔
"فی پلیٹ کس حساب سے"
سفید پلیٹ: فی مہمان کے اسی روپے۔ پیلی پلیٹ بغیر
[illegible] کے چالیس روپے۔

سفید پلیٹ اور پیلی پلیٹ سے کیا مراد؟
پیلی پلیٹ پیتل کی، سفید پلیٹ اسٹیل کی۔

ہمیں آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ پارٹی انجام پائی
پائی یا نہیں۔ ہم اس ہوٹل کے اونچے دام سنتے ہی ایسے غائب
ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

پچھلے دنوں کا ذکر ہے ہمارے پڑوسی کے لڑکے کی تسمیہ خوانی
تھی ہمارے پڑوسی خالص بیوپاری قسم کے آدمی ہیں۔ انھیں
شعر و ادب سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ان کا تقاضہ تھا کہ ہم
ان کی تقریب میں شرکت ضرور کریں۔ دعوت نامہ کے مطابق ہم

کہ ایک آواز سنائی دی "پانی" ہم نے ملازم سے کہا "ذرا رشید میاں کو پانی پلانا"۔ کسی نے کہا "بریانی" ہم نے دوسرے ملازم سے کہا "امجد میاں کو بریانی ڈالنا"۔ ایک اور آواز بارِ سماعت سے ٹکرائی "پانی" ہم پانی سے بھرا جگ اُٹھایا ہی تھا کہ کسی نے ہانک لگائی "قورمہ" ہم نے پانی سے بھرا جگ کسی مہمان کے سر پر چھوڑتے ہوئے قورمہ دینے کے لئے...... کسی نے آرڈر دیا "فرنی" گھبراہٹ میں قورمہ کا کٹورا ہاتھ سے ایسا چھوٹا کہ ہمارا گیروا کلر بڑھیا سوٹ ٹیکنی کلر بنتا چلا گیا۔ مہمانوں کی متواتر فرمائش پر ہمیں اچھا خاصہ رائک۔ این رول کرنا پڑ رہا تھا۔ نتیجے میں کبھی ہم ملازم سے تو کبھی ملازم ہم سے جا ٹکراتا۔

غرض اُچھل کود، بھاگم بھاگ میں ہم اتنا تھک گئے کہ آخری صف کے مہمانوں کو الوداع کرنے صدر دروازے تک تو پہونچ گئے لیکن دوبارہ صحن میں آنا نصیب نہ ہوا۔ وہیں چکرا کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو بیگم مست خراٹے لے رہی تھیں، شاید وہ بھی زنانہ مہمان نوازی میں تھک گئیں ہوں۔ ہم بھی غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے دھڑام سے بستر پر گر کر مست خراٹے لینے لگے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب خریدئے

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ اودھ مکمل دو جلد	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	7/-
اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	15/-
تنقیدی نظریات حصہ اوّل	سید احتشام حسین	15/-
" حصہ دوم	" "	15/-
تنقید عملی تنقید	" "	9/-
ذوقِ ادب و شعور	" "	8/-
روایت و بغاوت	" "	9/-
تنقیدی جائزے	" "	9/-
عکس اور آئینے	" "	9/-
سید احتشام حسین نمبر مصور	" "	30/-
انتخاب جدید نثر اُردو	" "	5/-
ملک گہر	" "	6/-
نقشِ حالی حصہ دوم یعنی حالی نمبر ۲	"	20/-
" حصہ اول " " نمبر ۱		15/-
اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	9/-
سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	5/-
فروغِ اُردو جگر نمبر		10/-
فروغِ اُردو پریم چند نمبر		15/-
چکبست نمبر		12/-
امیر خسرو نمبر		15/-
عبدالماجد دریابادی نمبر		12/-
محسن کاکوروی نمبر		3/60
منشی نولکشور نمبر		4/-
خان محبوب طرزی نمبر		4/-
فرقت کاکوروی نمبر		5/-
جنگ آزادی نمبر ۲ بابت ۱۸۵۷ء		6/-
گاندھی نمبر		2/-

پروفیسر:
سید احتشام حسین نمبر
سید احتشام حسین کی شخصیت اور اُنکی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے یہ نمبر خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

قیمت: ۳۰/- روپئے

احمد فرقت کاکوروی (مرحوم)

مزاحیہ مشاعرہ اور اردو زبان

جب سید حبیب الرحمٰن صاحب غزنوی کا خط میرے
ں پہونچا کہ مجھے اس مزاحیہ مشاعرہ کی صدارت کرنا ہے جو
مدآباد کے لوگ فلسطین کے عرب شہدا کے پس ماندگان کے
ے کر رہے ہیں تو یقین مانئے میرا بے اختیار دل چاہا کہ امام
امع مسجد سے بقرعید کا خطبہ لے کر پڑھ دوں اور صدارت
ں جملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاؤں بقرعید کا خطبہ
یں نے اس لئے پسند کیا کہ :—

رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے۔

اور وہ یوں کہ اوّل تو یہ عربی زبان میں ہوگا۔ جو عربوں کی مقدس
ترین زبان ہے دوسرے یہ عید سے متعلق ہوگا اور اسرائیلیوں
نے عربوں کے ساتھ بھیڑ بکری جیسا سلوک بھی کیا ہے۔ تیسرے
ہندوستان میں ہم بھی ماشاءاللہ فسادات کے ناتے بقرعید
والی منزل سے دوچار ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ تمام سامعین
کچھ نہیں تو احتراماً ہی اسے سننے کے لئے بیٹھے رہیں گے پھر اپنے
ملک کی سیاست کے پیش نظر مجھے یہ خیال آیا کہ دیکھو تو کتنا
خراب وقت آلگا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ

مارنے پر اتر آئے ہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کس طرح مستحق
کو غیر مستحق اور غیر مستحق کو مستحق قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

ورنہ جنگ کی تباہ کاریوں سے احمد آباد والوں کا کیا
واسطہ، وہ بیچارے تو ان مظالم کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو عرب
کے رہنے والوں کو اسرائیلیوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑے۔ اور تصور
کریں بھی تو کیسے جبکہ یہ بیچارے آج تک نہ کسی سے لڑائی دنگے میں
پڑے نہ انھوں نے کسی کے پھٹے میں پیر ڈالا۔ نہ انھیں کبھی فسادات
سے دور کا واسطہ رہا ورنہ گزشتہ ۴ سال سے کسی بڑے پیمانہ
پر فرقہ دارانہ فسادات کرنے کی انھیں توفیق ہوئی لہٰذا یہ جنگ
کے مصیبت زدگان یا فسادات میں مرنے والوں کے پس ماندگان
کی امداد کرنا کیا جانیں۔ اس لئے ان کے سامنے جب امدادی
مشاعرہ کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ تو ان کو چاہئے تھا کہ وہ صاف
صاف کہہ دیتے ؎

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

پس ماندگان اور مظلومین کی امداد کے سلسلے میں مشاعرہ کرنے
کا حق تو انھیں لوگوں کو پہونچتا ہے جنھوں نے جنگ یا فسادات

کئی تباہ کاریاں دیکھی ہوں۔ مرنے والوں کی چیخیں سُنی ہوں اور بے گناہ اور معصوم بچوں کو دم توڑتے دیکھا ہو یا بے گناہ اور باعزت عورتوں کی عصمت دری کا مشاہدہ کیا ہو۔ بھلا انھیں رہنگ کشا کر جھگڑوں میں شامل ہونے کا حق کدھر سے پہونچتا ہے۔ ایسے امدادی مشاعرے منعقد کرنے کا حق تو کلکتہ، جبل پور، رانچی اور گورکھپور وغیرہ وغیرہ کو تھا جو ماشاء اللہ اس قسم کے مظالم برداشت کئے بیٹھے ہیں یا پھر اس کا حق ان ہزاروں شہروں، قصبوں اور بستیوں کو پہونچتا ہے جو گزشتہ بیس سال سے ان مقدس تجربات سے گزر رہے ہیں۔ آپ کون ہوتے ہیں اس قسم کے امدادی مشاعرہ کرنے والے جبکہ آپ نہ تو خان میں ہیں اور نہ خان کے اونٹوں میں۔ ہاں رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، جنتا کا پیٹ کاٹ کر اپنے پیٹ بھرنے کے سلسلے میں اگر آپ کوئی مشاعرہ کرتے تو وہ کسی حد تک آپ کو ضرور زیب دے سکتا تھا کیونکہ اس میں ماشاء اللہ ہمارے ملک کا گوشہ گوشہ برابر کا شریک ہے۔ اور اس سلسلے میں بلیک کرنے والے بھی کھل کر دامے، درمے، سخنے آپ کی مدد کرتے اور آپ کی خلاف توقع حوصلہ افزائی بھی ہوتی۔ اب اگر آپ یہ کہیں کہ ہم تو انسانی ہمدردی کے ناتے عربوں کی مدد کر رہے ہیں تو یہ بات بھی اصولاً غلط ہوگی کیونکہ اس دورِ ابتلا میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہمدردی کرنا کیا معنی؟ جبکہ اس دور میں انسانیت اور شرافت ایک سنگین جرم بن چکی ہے اور آپ اخلاق، ہمدردی، انسانیت اور چاہت کا سبق اس دور میں دینے بیٹھے ہیں جبکہ ان سب کا چلن دنیا سے اٹھ چکا ہے۔

نباہ مدت ڈھونڈھا [illegible] بدلے

[illegible]

آپ کو نہیں معلوم کہ پرانی قدروں کی جگہ اب نئی قدروں نے لے لی ہے۔ اب اہنسا کا نام جور و تشدد اور قتل و غارت گری پڑ چکا ہے۔ ہمارے ملک کا نظام بھی اب شروع سے آخر تک خالص سیکولر یعنی لادینی ہے جس کا دین ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا اگر خدانخواستہ آپ کے مشاعرہ میں کوئی دینی نیت کو دخل ہے تو آپ تالاب میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کر رہے ہیں۔ اور لادینیت کے ڈانڈے دین سے ملا رہے ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ

رپٹ لکھوائی ہے اغیار نے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مجھے صدمہ تو رونا آپ کی لاعلمی کا ہے کہ آپ گزشتہ بیس سال سے آزاد چلے آ رہے ہیں مگر آج تک آپ اپنی آزادی کا مفہوم ہی نہ سمجھے درحقیقت آپ کی آزادی دنیا کی تمام آزادیوں سے مختلف ہے۔ سچ پوچھئے تو آپ کو صرف بلیک مارکٹنگ کی آزادی ملی ہے گرانی اور رشوت ستانی کی آزادی ملی ہے، ذخیرہ اندوزی، اخلاقی قدروں سے بے نیازی، مفسادات اور عہدہ پرستی کی آزادی ملی ہے۔ لہٰذا آپ کو کوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہیئے جس پر دنیا ہنسے۔ آپ اس ملک میں مزاحیہ مشاعرہ کرنے چلے ہیں جہاں بیس سال سے خوشی اور مسرت کی نس بندی کی جا چکی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارا ملک ایک متین اور سنجیدہ ملک ہے۔ ہم ہر چیز کو اس کی حدود میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آزادی پاتے ہی جب جنتا مارے خوشی کے اپنے آپے سے باہر ہونے لگی تو ہم نے ان تمام چیزوں کی نس بندی کر دی جو خوشی کا سرچشمہ بنی ہوئی تھیں تاکہ دنیا ہمیں [illegible] لہٰذا سب سے پہلے ہم نے آزادی کی نس بندی کی اور جب ہم خوشی

اور مسرت سے دستکش ہو کر جنتا آبادی بڑھانے پر اُتر آتی اور اس نے ایک نیا دھندا شروع کر دیا۔ تو ہم نے آبادی کی نس بندی شروع کر دی اور چونکہ بڑھتی ہوئی آبادی کا تعلق پرانی اور فرسودہ قدروں یعنی آداب و اخلاق دیانتداری اور ثقافت سے تھا اس لئے ہم کو سب سے پہلے اس زبان کی نس بندی کرنا پڑی جس کی آغوش میں یہ ساری قدریں پروان چڑھ رہی تھیں۔

آج جو لوگ ہم پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ ہم یا ہماری حکومت اُردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کر رہی ہے وہ ہماری سیاسی سماجی اور ملکی دشواریوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری تہذیب کو آوارہ گردی پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی بھلا ہم ایک ایسی جوان جہان لڑکی کو اپنے سینے سے لگا کیسے سکتے تھے جس کی دل تک شکوے ہو۔ مگر اس کے بعد بھی ہماری رواداری اور فراخدلی من بہن ملاحظہ ہو کہ ہم نے اسے آپ برابر کی چودہ زبانوں میں جگہ دے دی۔ اور چودھواں نمبر اس لئے دیا کہ وہ ہماری جنتا کو چودہ سال قبل معلوم ہو رہی تھی۔ ورنہ ایک ایسی سیانی زبان جس کو کسی ایک گھر میں قرار نہ ہو جس کی حرکات و سکنات سے دیس کا بچہ بچہ واقف ہو اور جس کی یاد اشت بیرونی ممالک کے رہنے والوں تک سے ہو اسے ہم اپنی بہو بیٹی کیسے بنا دیتے اگر بنا بھی تو وہ بیٹھنے والی کب تھی لہٰذا ہم نے اس بیوانی نس بندی کر دی کیونکہ ہم کو ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو صرف ہماری گود میں پلے ہمارے رسم و رواج اختیار کرے اور شریف زادیوں کی طرح اپنے کنبے ناتے والوں کے علاوہ کسی سے دو بدو ا[illegible] تدام کی نحوست دیکھ کر اس نے کم سنی ہی میں ایسے ہاتھ پاؤں نکالے اور آوارہ گرد اور آوارہ منش شاعروں سے اپنے تعلقات پیدا کئے جنھیں اس کی کم سنی کے زمانے کے پڑھے لکھوں نے منھ نہ لگایا۔ ان میں ایک نادر کی نظیر اکبر آبادی تھا جس نے ہمارے سماج کے سارے رسم و رواج سارے تہوار سارے مذہبی تقریبات اور سارے رشتوں اور پیشوں کے کارنامے سو کر اپنے کچھ ایسا ہندوستانی سماج کا نقارہ ملا اور ایسی دھاک بٹھائی ایسا سینہ زوری سے عوام میں اس کی رعنائی کا طوطی بولنے لگا۔ اس کے بعد انشا اور آرزو لکھنوی نے تو حد ہی کر دی کہ اس کو خالص ہندوستانی کا لباس پہنا کر جنتا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ گاندھی جی جیسے جہاں دیدہ اور مہاتما جی جیسے سنجیدہ بھی اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اور آزادی سے قبل انھوں نے اعلان کر دیا کہ آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان اسی کو بنایا جائے۔

غلام احمد فرقت کو سمجھنے اور ان کی زبان کا چٹخارہ حاصل کرنے کے لئے مرحوم کی درج ذیل تصنیف ملاحظہ فرمائیے۔
کون گلفروش۔ سرد و برف۔ قند پیچ۔ غلام احمد فرقت کاکوروی
ملنے کا پتہ: "ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ"

جانِ غالب
(از محمد حسین شمس الدین)
مرزا غالب کے ادبی خطوط کا نمائندہ انتخاب جس سے ان کے انداز تحریر اور اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔
قیمت :- ۳/- روپے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (مرحوم) کے غیر مطبوعہ خطوط

واحد پریمی کے نام

مکتوب ۱

ORIENTAL COLLEGE BOMBAY

Principal,
Dr. A.A Nami
M.A, B.T, Ph.D

60, Patca Manzil
Bhindi Bazar
Bombay-3

۲۴، مارچ ۱۹۶۶ء

مکرمی۔ تسلیم

گرامی نامہ سے سرفرازی ہوئی۔ غزلیں بھی ملیں[1]۔ حضرت آپ نے ایک بہت ہی غلط شخص کا انتخاب کیا ہے۔ میں نہ شاعر ہوں اور نہ کبھی اس کوچہ سے گزرا ہوں۔ میرا موضوع اردو تھیٹر ہے اگر تھیٹر، اسٹیج یا ڈراما کے متعلق آپ نے کچھ لکھا ہوتا تو میں ضرور اپنی رائے دیتا۔ معافی چاہتا ہوں۔ کلام واپس ہے امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام نیازمند۔ نامی

مکتوب ۲

D.R. A.A. Nami

60, Patca Manzil
Bhindi Bazar Bombay-3
21-8-1967

مکرمی تسلیم

"گلِ نو" ملا اور آج آپ کا گرامی نامہ۔ میں اپنی کتاب Bibliographie Urdu Drama کی جلد دوم کے سلسلہ میں بے حد مصروف تھا اس لئے مطالعہ نہ کر سکا۔ اب کل دہلی جا رہا ہوں۔ غالباً ۱۰ ستمبر تک واپس آؤں گا۔ بعدہٗ "گلِ نو" کا مطالعہ کروں گا۔ خدا کرے آپ بخیریت تمام ہوں۔

والسلام نیازمند۔ نامی

مکتوب ۳

DR. A.A. Nami

60, Patca Manzil
Bhindi Bazar Bombay-3
24-12-67

مکرمی واحد پریمی صاحب۔ تسلیم

تبصرہ میرا کام نہیں اور نہ میرا موضوع ہے لیکن آپ بضد ہیں کہ

---

(۱) ۲۔ میں نے اپنے پہلے مجموعۂ غزلیات "گلِ نو" میں شامل کرنے کے لئے غزلیں بھیج کر رائے طلب کی تھی (واحد)

میں تاقیامت خیالات خود بیان کردوں۔ آپ نے کم دیش نصف سطر بار لکھا اور بیمار میں نے خاموش معذرت کی اگر میرے چند الفاظ سے آپکو سکون ملتا ہو تو حاضر خدمت ہیں۔

والسلام، نیازمند ــــ نامی

(رائے)

بھوپال کے غزل گو شاعر واحد پریمی صاحب کا مجموعۂ کلام "گُلِ نو" اسوقت میرے سامنے ہے اور میں نے ابھی اس کا مطالعہ ختم کیا ہے وہ اپنے کلام میں عام انسانوں کی طرح ابھی گوشت و فرش اور اسی زمان و زمین کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں ارمانوں اور حسرتوں کا خوف اسی قدر ہے جتنا قدر کہ مسرتوں سے محرومی کا احساس ان کے تلخی کلام سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کلاسیکل شعراء کا مطالعہ بغور کیا ہے اور بڑی حد تک آدابِ شاعری سے واقف ہیں وہ اصغر کی طرح یہ نہیں کہتے ؎

غزل میں دردِ رنگیں تو نے اصغر بھر دیا ایسا
کہ اس میدان میں روتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں

بلکہ اس طرح خامہ فرسا ہوتے ہیں ؎

ستارے سو گئے شمعیں بھی ہو گئیں خاموش
نہ جانے کتنی شب انتظار باقی ہے

بقول کسے، اگر غزل گوئی کا قصر جگر پارہ ہائے خون آلودہ کے رقص اور شاہدِ رعنا کی نگاہ کی سحر طرازی پر قائم ہے تو کہنا پڑے گا کہ اس نوجوان شاعر واحد پریمی نے اپنا قیمتی مسکن آپ بنا لیا ہے۔

عبدالعلیم نامی

مکتوب ۴

DR. A. A. Nami

60 Patca Manzil
Bhindi Bazar Bombay-3
16-12-67

مکرمی۔ تسلیم

گرامی نامہ سے سرفرازی ہوئی۔ یہ میری سُست روی تھی کہ جو کچھ مجھے دو مہینے پہلے لکھنا چاہئے تھا وہ میں نے دو مہینے بعد لکھا اس میں کسی کا ذکر کلام ہے کہ آپ لکھتے ہیں۔ اور خوب لکھتے ہیں آپ اگر اپنی ساری توجہ اس شاعری کی طرف مبذول کریں تو چند سال کے اندر جیدہ شعراء میں شمار ہو سکتے ہیں۔ میں اُسی دن کا منتظر اور دُعا گو ہوں۔ خدا آپ کو عمر اور صحت دے کہ آپ اپنا کام جاری رکھ سکیں۔

والسلام
نیازمند نامی

مکتوب ۵

DR. A. A. Nami

60 Patca Manzil
Bhindi Bazar
Bombay-3
9-1-1968

مکرمی، تسلیم

رات کو لیٹے لیٹے خیالات تھے آپ کا بھوپال کیا اور پھر وہاں سے اُس نے سرکاری لائبریری[۴] میں حسبِ عادت کی۔ چند سال قبل بھوپال گیا تھا اور ایک بوہرہ کے ہوٹل[۵] میں جو ایک منزلہ سڑک پر دُور تک چلا گیا ہے۔ قیام کیا تھا اس ہوٹل کے قریب ہی ایک سینما[۶] ہے۔

۳۔ اسی طرح درج ہے۔ (واحد)

۴۔ مولانا آزاد لائبریری جو کسی زمانہ میں ملک کی ایک اہم لائبریری تھی لیکن اب سرکار کی بے توجہی سے اپنا ماتم آپ کر رہی ہے۔ (واحد)

۵۔ ملا فخرالدین، بانی سیفیہ کالج بھوپال ملا غلام حسین مرحوم کے صاحبزادے ہوٹل کا نام کیپٹل ہوٹل ہے (واحد)

۶۔ سنیما کا نام بھارت ٹاکیز ہے (واحد)

مبصر: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
محلہ دلودھر پور، ٹکاری، گیا

نئی کتابیں

(۱)

آئینہ ایام۔ مجموعہ کلام ذکی اورنگ آبادی
صفحات۔ ۱۰۴
ناشر۔ عبدالقیوم ذکی، گنج پر اورنگ آباد، بہار
طابع۔ دی آرٹ پریس۔ سلطان گنج پٹنہ۔
قیمت۔ آٹھ روپئے۔

جناب الحاج عبدالقیوم ذکی اورنگ آبادی اگرچہ اسکول کے نمایندہ شاعر ہیں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں ہیں۔ آئینہ ایام ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جناب ذکی اورنگ آبادی کی شخصیت اور شاعری دونوں محتاج تعارف ہیں، اس کی وجہ جہاں خود ان کی گوشہ نشینی خلوت گزینی اور نام و نمود سے احتراز کی فطری و طبعی عادت ہے وہیں اہل اورنگ آبادی کی بے حسی اور بے توجہی بھی، جنھوں نے اس گوہر آبدار کی قدر نہ کی اور دنیائے ادب سے انہیں روشناس کرانے کی کوئی کوشش کی نہیں کی۔ مجھے یاد ہے کہ بہت عرصہ قبل برادر محترم پروفیسر مظفر اقبال نے شاعر کے حوالے سے انہیں دنیائے ادب میں روشناس کرانے کی ایک سعی مشکور کی تھی۔ ان کی غزل کے بعض اشعار برادر محترم پروفیسر ابوذر عثمانی کی کوششوں کے صنم بہار نمبر کی زینت بنے تھے، بہر کیف ہم جناب پروفیسر مظفر اقبال کے شکر گزار رہیں کہ انھوں نے جناب ذکی کے کلام کو مرتب کر کے بہار اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک و تعاون سے اسے شائع کرانے کی سعی مشکور کی اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

جناب ڈاکٹر عبدالمغنی نے تعارف کے زیر عنوان جناب ذکی کی شخصیت و شاعری کا مختصر لیکن جامع جائزہ پیش کیا ہے۔ گو موضوع ان سے طوالت کا متقاضی تھا۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب موصوف کے تعارفی صفحات ذکی اورنگ آبادی کی شخصیت و شاعری کی مختلف اور گوناگوں خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں۔

جناب ذکی کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے ذوق تھا۔ ابتدا میں انھوں نے احسن مارہروی سے رجوع کیا لیکن جناب ذکی کو فنی دسترس اور کمال علامہ سیماب کی شاگردی میں حاصل ہوا۔ جناب ذکی کو تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے۔ آئینہ ایام، غزلیات منظومات رباعیات، قطعات، قطعات تاریخ پر مشتمل ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جو صاحب فن کی بیدار مغزی اور حساس ذہن کا شاہد ہے۔ ان کے وسیع متفرع اور ہمہ گیر محسوسات و مشاہدات کا واضح اشاریہ ہے۔ ان کی زبان۔ روانی۔ دوانی، شیریں، شگفتہ، سلیس اور دلکش ہے۔ ان کی غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار اسکے شاہد ہیں۔

سمجھا رسوا اے ذکی گر ہو تو ہو ۔ حُسن کو لیکن نہ رسوا کیجئے

معلوم کیا کہ منزل مقصود کہاں ہے
بس دیکھتا جاتا ہوں کہیں جارہا ہوں میں

ارماں مرا امید و آرزو اندوہ اور الم
دل کیا ہے ایک مرکز آفات نہ پوچھئے

مخمور آنکھیں مست ادائیں وہ بانکپن
اٹھتی ہوئی جوانی اُبلتا ہوا شباب

پھولوں میں لالی آتی ہے میرے ہی خون سے
لیکن بہار اب مجھے پہچانتی نہیں

کانٹوں کے ساتھ پھولوں کا حسن سلوک دیکھ
پہلوئے خیر میں بھی انھیں بار ہی نہیں

کانٹے رہ حیات پہ ہر ہر قدم پہ ہیں
پھولوں کی سیج اے دل یہ زندگی نہیں

ملے گی لذتِ کام و دہن جب خون ناحق سے
بڑھے گا اور بھی یہ ذوق عصیاں ہم نہ کہتے تھے

چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا مگر پھر بھی
اداسی کیوں یہ اہل گلستاں معلوم ہوتی ہے

بہار آئی تو کیا آئی کہ گل ہیں سینہ چاک اب بھی
چمن میں آج بھی فصل خزاں معلوم ہوتی ہے

زدِ گل پھر بجلیوں کی زد میں میرا آشیانہ ہے
نگاہ نیرنگی میری قدر داں معلوم ہوتی ہے

غمانے روزگار رقیب خوشی بھی ہیں
وہ کون سی ہے شب جو اپنی سحر نہیں

ہے ساکنانِ دشت کی سوکھی ہوئی زبان
کانٹوں کو ایک آبلہ پا کی تلاش ہے

ہائے اس راہی پر غم کی شکستہ پائی
دامن کوہ میں جو بیٹھ کے پتھر مانگے

جس شاخ گل پہ برق کی یورش ہے پھر وہیں
تعمیر آشیانہ کئے جارہے ہیں ہم

ذکی کی نظمیں خیال انگیز اور فکر خیز ہیں۔ ان کی رباعیات وقطعات جاندار اور معنی افروز ہیں۔

سرورق خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ کتابت وطباعت اچھی ہے اُردو اکادمی کی مالی اشتراک وتعاون کے شائع شدہ یہ مجموعہ جس کی ضخامت ۱۴۰ صفحات ہے۔ محض آٹھ روپئے میں دستیاب ہے۔ کتاب مصنف کے علاوہ بک امپوریم۔ اور کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ کے جاسکتی ہے۔

(۲)

نام کتاب : یادِ وطن

مصنف : ڈاکٹر عبدالمجید شمس

ناشر : سائنٹفک پبلشرز

صفحات : ۱۲۶

قیمت : دس روپئے

ڈاکٹر عبدالمجید شمس کی شخصیت اور شاعری محتاج تعارف نہیں۔ "حیات وکائنات" "جلوہ صد رنگ" "رزم وبزم فطرت" کے مصنف کی حیثیت سے ان کی ادبی حیثیت مسلم ہوچکی ہے۔ اگر جناب شمس اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی صرف "حیات وکائنات" ان کو بقائے دوام بخشنے کے لئے کافی تھی۔ یہ وہ معرکہ آرا تصنیف ہے جس نے اُردو شاعری کو نئے امکانات، نئی وسعتیں، اور نئی بخشی ہیں۔

"یادِ وطن" جناب شمس کی تیسری طویل مثنوی ہے۔ پیش گفتار، گاؤں کے جغرافیائی پس منظر، مسلمانوں کے تہذیب اور زبان کی خصوصیات، خصوصیات ساکنان شاہ بیگہہ، ترک وطن کا تاریخی پس منظر اور پس گفتار کے عنوان کے تحت مثنوی کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

عرض حال عنوان کے تحت مصنف نے اپنی مثنوی نگاری پر روشنی ڈالی ہے اور مختصراً یاد وطن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ لکھتے ہیں "میں نے اپنی طویل مثنوی "حیات وکائنات" میں دنیائے طبقاتی اور تمدنی ارتقا کا جائزہ پیش کیا تھا جس کا موضوع بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ اپنی دوسری مثنوی "جلوہ صد رنگ" میں نے اپنے کے دائرہ کو محدود کردیا اور اپنے دلکش کے اور خاص اپنی بود و باش کے اردگرد کے علاقوں کے ماہ بماہ بدلتے ہوئے جلوہ ہائے قدرت ہائے قدرت اور ان کے انسانی ردعمل سے ہم آہنگی کے نظارے پیش کئے۔ میری تیسری طویل مثنوی "یاد وطن" ان بڑے دائروں سے سمٹ کر ایک نقطے پر آگئی ہے۔ یعنی ایک گاؤں کے خرد بینی مکالمہ پر۔" "یاد وطن" میں کیا ہے اسکی صراحت بھی مصنف نے خود ہی کی ہے۔" اس مثنوی کا پیش گفتار میرے نالہ دلخیوں سے شروع ہوتا ہے اور شاید وہ لوگ جنھیں اپنے وطن کے چھوٹ جانے کا میری طرح شدت سے احساس ہے میرے ہم نوا ہوں گے اس کے بعد اس گاؤں کا محل وقوع، اس کا سائز اس کے مختلف ٹولوں کی ترتیب ان کی معاشرتی حالات ان کے دھندے اور اس کے کھیت اور باغیچے مختلف موسموں میں اسکے مختلف بوقلموں مناظر اور قرب و جوار سے واسطے بیان کئے گئے ہیں پھر مسلمانوں کے ٹولے کا حال اور اس کے باشندوں کے معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو اس مثنوی کا خاص مقصد ہے اسی ٹولے میں میرے سارے عزیز و اقارب ۱۹۴۷ء کے فسادات سے پہلے آباد تھے۔ اور بدقسمتی سے اب ان میں سے دو چار ہی افراد اس پر آشوب کو رہ گئے ہیں"

اس مثنوی کی تصنیف کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد ہے، اس گاؤں کی آپ بیتی سنانا۔ ہندوستان میں اس گاؤں کے جو لوگ رہ گئے ہیں۔ ان میں اب میں ہی عمر میں سب سے بڑا ہوں۔ اور میرے بعد شاید کوئی اس اجڑے دیار کی آپ بیتی کہانی نہ سنا سکے۔" مصنف کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے اس اجڑے دیار کی آپ بیتی جس خلوص اور صداقت کے مصنف نے سنائی ہے مثنوی کے مطالعہ کے بعد ہی اس کا احساس ہوتا ہے۔

کسی شاعر نے یاد ماضی کو عذاب کہتے ہوئے خدا سے دعا کی ہے کہ اس کا حافظہ چھین لیا جائے۔ لیکن جناب شمس اس فراری ذہنیت کے نہیں۔ انھوں نے اپنی یادوں کے خزانے کو سنبھال کر رکھا ہے کہ یہ خزانہ انھیں اپنی نوجوان نسل کو منتقل کرنا تھا۔ آپ ان کی یادوں کے دریچے میں جھانک کر دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ اسکی خاکستر میں کیسی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ اور کس کس طرح کی بھولی بسری یادوں کا سلسلہ بندھ کر یاد وطن میں تبدیل ہو گیا ہے۔

یاد وطن جناب شمس کے گاؤں مسرت انگیز داستان اور دلدوز و عبرتناک کہانی ہے [illegible] کے کنارے پر یہ چھوٹا سا گاؤں کبھی شرفا اور زمینداروں کا مسکن ہوا کرتا تھا جہاں ہر فرقہ اور طبقے کے لوگ ایک دوسرے کے رنج و غم اور حسرت و خوشی میں شریک تھے، اس گاؤں [illegible] فرقہ کے جذبے کی کہیں کوئی جھلک نہیں ملتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں اس معصوم کو کس کس کی نظر لگ گئی کہ غلام ہندوستان کا یہ گاؤں بھی اپنی عصمت و آبرو نہ بچا سکا اور ۱۹۴۷ء کے فسادات کا شکار ہو گیا اور اس طرح ایک ہرا بھرا خوشحال گاؤں اجڑ گیا۔ اور اس طرح اجڑا کہ پھر ویسے نہ بسا۔

اسی گاؤں کی گلیوں میں کھیل کر مصنف نے اپنا لڑکپن بتایا اور اپنی جوانی نے خوش آئند مستقبل کے سپنے بنے لیکن حالات کا کس کو پتہ تھا؟ ایک ایسا طوفان آیا جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ مصنف بھی اس طوفان میں بہہ کر اپنے وطن سے دور ہو گئے۔ اور [illegible]

کو گزرے [illegible]

اب بھی ان کے سینے میں دفن تھی۔ اور رہ رہ کر انہیں اپنی داستان
سنانے کو کہتی رہتی تھیں، مگر طوفان کا شکار مصنف دل سکون کی
تلاش میں انگلینڈ، امریکہ، ہالینڈا، بلجیم، اٹلی، سوئٹزرلینڈ،
کینیا، زمبیا، مصر، نیوزی لینڈ، تنزانیہ، پاکستان،
فرانس، سعودی عرب ہر جگہ مارا مارا پھرا لیکن۔

باتیں ہر ملک کی نرالی تھیں۔
کیا کہوں دل مگر لگا نہ کہیں۔
ایسے کہ۔۔ کہیں اپنے وطن کی بات نہ تھی
ایسا دن اور ایسی رات نہ تھی
وہ مسرت نہ ملی نہ وہ راحت
وہ محبت نہ ملی نہ وہ چاہت

مشرق و مغرب، یورپ امریکہ افریقہ اور ایشائی ملکوں میں سکون
متلاشی شاعر کو وطن کی یاد ہمیشہ ستاتی رہی اور اب بھی ستاتی

ہے سہ اے وطن تجھکو میں نہ بھولا ہوں۔
تجھ کو ہر لحظہ یاد کرتا ہوں۔
میں جہاں بھی رہوں تیرا ہی رہوں
یاد ہی سے ہے تری دل کو سکون
اب خزاں دیدہ ایک باغ ہوں میں
جھلملاتا ہوا چراغ ہوں میں

یہ مثنوی دل سے نکلی ہے اس لئے دل کو چھوتی ہے۔ اس کا ہر
انسان اس غم سے دوچار ہے جس سے جناب شمس کو سابقہ پڑا ہے۔
اس لئے یہ مثنوی جناب شمس کی آپ بیتی ہوتے ہوئے بھی جگ بیتی
بن گئی ہے۔ جناب شمس کی زبان رواں، شگفتہ اور سلیس ہے۔
مثنوی کی ابتدا میں عکاکاکوی، اور آخر میں سید حسن ترمذ
کا قطعۂ تاریخ طباعت ہے اور ضمیمہ کے تحت حضرت شاہ فضل
اور ان کے [illegible] ہے جو اس مثنوی کی معنویت و
افادیت میں اضافہ کا سبب ہے اور بالکل آخر میں جناب شمس کی سابقہ
مطبوعہ مثنویوں اور دیگر کلام پر اہل علم و نقد حضرات کی بیش قیمت
رائیں ہیں جن سے جناب شمس کی شاعری کے مختلف جہات کو سمجھنے میں
مدد ملتی ہے۔

۱۴۴ صفحات پر مشتمل یہ مثنوی ساہتیہ کلا پبلشرز نے شائع
کی ہے جس کی قیمت دس روپئے بہت مناسب ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔

(۳)

نام کتاب = حکایت ہستی
مصنف = سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی مرحوم
مرتب = سید شاہ مہدی حسن، سید شاہ ہادی حسن
ناشر = سید شاہ اختر حسن
صفحات = ۱۴۸
قیمت = بیس روپئے۔

سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی مرحوم کی شخصیت گو محتاج تعارف
نہیں لیکن ان کی شاعری محتاج تعارف ضرور ہے یہ ہماری بدنصیبی ہے
کہ بسمل جیسا شاعر ہمارے ادب میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کے
وہ مستحق تھے ممکن ہے اس میں ان کی گوشہ نشینی اور نام و نمود سے بے پرواہی
کو دخل رہا ہو۔۔ جو شاعر جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، پرویز
شاہدی [illegible] بسمل کے دوسرے شعراء کا ہم عصر ہو، اپنی ایک منفرد
اور الگ آواز رکھتا ہو ایسی آواز جو دور سے ہی پہچانی جا سکے۔ اسے
شہر و ادب میں نمایاں مقام نہ ملے یہ باعث حیرت و استعجاب ہے

"حکایت ہستی" بسمل مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو ایک
نظم، ۱۲ قطعات، ۳۰ رباعیات، تقریباً ۸۰ غزلیات، ایک
نعت اور ۲۸ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں سید شاہ اختر حسن کا پیش لفظ ہے اس کے بعد
"ایک تعارف" کے عنوان کے تحت علامہ جمیل مظہری مرحوم

نے بسمل کی انفرادیت اور ان کی شعری خصوصیات پر مختصر لیکن جامع روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں علامہ کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں۔
"ایک مستقل انفرادیت کا، مالک ہم لوگوں میں سوائے بسمل کے کوئی نہ تھا۔ آپ بے تکلف میرے شعر کو اختر کے شعر کو میرا شعر کہہ کے سنا سکتے ہیں۔ اور بڑے بڑے نقاد کو دھوکہ دے سکتے۔ لیکن بسمل کا ایک شعر بھی ہزاروں اشعار کے ہجوم میں پکار پکار کے نہیں چیخ چیخ کے کہتا ہے کہ بسمل کا ہوں اور بسمل کے فنکارانہ ذہن کی پیداوار ہوں"
یہ محض ایک شاعرانہ بات نہیں، اسے عاجزی وانکساری پر بھی محمول نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انکشاف واعتراف حقیقت ہے جس کا اظہار ایک عظیم شاعر نے اپنے ایک معاصر کے سلسلے میں کیا ہے۔ اس کے بعد بسمل عظیم آبادی کے زیر عنوان حکاکاکوی نے اختصار کے ساتھ بسمل کے خاندانی حالات اور ان کی زندگی کے نشیب وفراز پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے شاعرانہ محاسن کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد چھبو بھائی کے عنوان کے تحت سید شاہ جعفر حسن ایڈوکیٹ نے تفصیل سے بسمل مرحوم کے خاندانی حالات ان کے اپنے تعلقات، بسمل کے روزمرہ مشاغل۔ ان کے شب وروز کی کیفیات ان کی ابتدائی زندگی سے لے کر ان کی موت تک بے حد دلکش اور دل نشیں انداز میں بیان کی ہے۔ انھوں نے فرید بسمل کی تعلیم ان کی خانگی زندگی اور گھریلو ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی مشاغل کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ مندرجہ بالا تینوں مضامین بسمل کی شخصیت، شاعری اور ان کے فن کو سمجھنے میں معاون ومددگار ہوتے ہیں۔

بسمل شاد کے شاگرد تھے۔ اور مبارک عظیم آبادی سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں جہاں شاد کے اثرات نمایاں ہیں وہیں مبارک عظیم آبادی کے اثر سے داغ کی خوبیاں بھی بادی النظر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن بسمل کی یہی خصوصیت نہیں۔ بلکہ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے شاد و داغ کو ایک دوسرے میں ہم آمیز کر کے اپنے لئے ایک تیسری منفرد اور جداگانہ راہ نکالی ہے جو بقول جمیل مظہری صرف ان سے ہی منسوب ہے اس روایت کا پاسدار بسمل کے بعد کوئی نہیں۔ وہ اس انداز تکلم کے خود ہی بانی بھی تھے۔ اور خاتم بھی۔ بسمل کو میدان ادب میں مقبولیت تو ملی لیکن شہرت نہ مل سکی۔ اس کی وجہ بسمل کی گوشہ نشینی اور نام ونمود سے نفرت تھی، اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ان کی یہ مشہور غزل۔ "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے"
ایک عرصہ تک اور رام پرساد بسمل کے منسوب رہی۔ اور بسمل نے یہ گوارا نہ کیا۔ اس راز کا انکشاف خود کر دیں جب تک کہ دوسروں نے خود ان کے سلسلے میں رجوع نہیں کیا۔ بہرکیف حکایت ہستی کے مکالمے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بسمل کو خدا نے زبردست شعری صلاحیتیں بخشی تھیں۔ جس سے انھوں نے کام بھی لیا۔ ان کو تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ بسمل کی غزلیں سادہ اور پرکار ہیں۔ ان میں جذبات تپش ہے۔ احساسات کی ہمہ گیری ہے۔ تخیلات کی بلند پروازی ہے۔ شاد کی سنجیدگی اور داغ کی شوخی ہے۔ حکاکاکوی نے ان کی شاعری کا صحیح تجزیہ کیا ہے "بسمل کی غزلوں میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہے۔ زبان صاف ستھری ہے۔ لب ولہجہ میں بے ساختہ پن ہے۔ انداز بیان میں حلاوت اثرانگیزی میں شدت ہے۔"

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اب ایسا جینا بھی جیتے ہیں کوئی جیتا ہے
نہ آپ بس میں نہ دل اپنے اختیار میں ہے

چمن میں تھے تو ستاتی تھی فکر دانہ و دام
قفس میں ہیں تو دل اٹکا ہوا بہار میں ہے

ہم تو بسمل ہی رہے خیر ہوئی
عشق میں جان چلی جاتی ہے

تمہاری یاد کو اللہ رکھے
جب آتی ہے تو پھر جاتی نہیں ہے

جلے چراغ سے پہلے چراغ جلتے تھے
اب آدمی سے بھی جلتا ہے آدمی اے دوست

جو میرے جام سے ٹپکے وہ مے حرام سہی
جو تیری آنکھ سے ٹپکے وہ مے حرام نہیں

جو بات سارے فسانے کی جان تھی بسمل
بہ اتفاق کہ آئی وہ داستاں ہی نہیں

شکست جام سے سنئے کہانی دل کے ٹکڑوں کی
مرے ساغر کا گرنا دل کا چکنا چور ہو جانا

دنیا کی حقیقت کھیل نہیں سمجھا ہے کوئی جو سمجھو گے
اک روتے روتے تھکتا ہے، ایک ہنستے ہنستے گاتا ہے

مسکراتے رہے پھولوں کی ہنسی پر غنچے
کوئی ہم پر بھی ہنسے گا یہ رہا یاد نہیں

برہمن کی نظر مل جائے تو دیکھیں حرم والے
بتوں کے حسن میں پرچھائیاں اس روئے زیبا کی

میری نگاہ کام نہ دے اور بات ہے
جلوہ ترا بقدر ضرورت کہاں نہیں

بڑھا کے ہاتھ سے خود اپنے ڈھال کو رندو
پھر اک بافصل صراحی کے تا بہ جام لیں۔

اور بسمل کی اس غزل کا تو جواب ہی نہیں جس کا مطلع و مقطع حسب ذیل ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارماں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دل بسمل میں ہے

حکایت ہستی کے مرتب اور ناشر لائق صد تحسین و آفرین ہیں کہ انھوں نے بسمل کا مجموعہ کلام شائع کرکے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ امید ہے حکایت ہستی کے ذریعہ بسمل کی حکایت شاعری عام ہوگی۔ اور ان کے شاعرانہ مقام کے تعین میں آسانی ہوگی۔ توقع ہے اہل علم حکایت ہستی کی پذیرائی کریں گے۔

۸۴ صفحات کے اس مجموعے کی کتابت خوشنما اور طباعت دیدہ زیب ہے۔

کاغذ عمدہ ہے قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

ذوق و جستجو

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔

جو انشاء عالیہ ہی کا گرانقدر نمونہ نہیں بلکہ اس کے ذریعہ اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے گوشے منور ہو گئے ہیں۔

قیمت ۲۰ روپئے۔

ملنے کا پتہ: فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ

بیان متعلق ماہنامۂ فروغ اردو
فارم ۴

(۱) شائع ہونے کی جگہ : نعمت اللہ بلڈنگ نعمت اللہ روڈ لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت : ماہنامہ

(۳) پبلشر و پرنٹر کا نام : سید انصار حسین

قومیت : مسلمان

پتہ مقبرہ عالیہ گولا گنج لکھنؤ

ایڈیٹر کا نام : محمد حسین شمس علوی

قومیت مسلمان

پتہ ادارۂ فروغ اردو نعمت اللہ بلڈنگ
نعمت اللہ روڈ لکھنؤ

میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ جہاں تک میری اطلاع
و علم ہے مذکورہ بالا حقائق بالکل صحیح ہیں۔

پبلشر و پرنٹر کے دستخط
سید انصار حسین

شاعر بننا آسان ہوگیا

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

کی ناپ ناز کتابیں جو کہ شاعر بنانے کی
مکمل صلاحیت رکھتی ہیں اور عرصے نایاب
ہیں ، شائع ہوگئی ہیں۔

جلد طلب فرمائیے

شاعری کی پہلی کتاب	قیمت دو روپیہ
دوسری کتاب	دو روپیہ پچاس پیسے
تیسری کتاب	تین روپے
چوتھی کتاب	دو روپیہ پچاس پیسے
مکمل سٹ	دس روپیہ

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو

۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب پر ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک خصوصی رعایت

جو حضرات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی ادبی اور تنقیدی کتب جو کہ کورس میں داخل نہیں ہیں ، پچاس روپیہ قیمت تک
کی خریدیں گے اور درج ذیل کوپن اپنے آرڈر کے ہمراہ روانہ فرمائیں ۔ ان کو پچیس ۲۵ پیسے فی روپیہ خصوصی کمیشن دیا جائے گا ۔ لہٰذا
یکم جنوری ۱۹۸۲ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک اس خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد از جلد مطلوبہ کتب کی فہرست
اور کوپن اور اپنا صاف صاف پتہ لکھ کر ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد لکھنؤ سے اس خصوصی رعایت کا فائدہ اٹھائیں۔

کوپن

نام ....

پتہ ....

	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	"	۱/۵۰
	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ احسن علوی	۱/۴۰
	" حصہ ۲	" "	۱/۲۰
	" حصہ ۳	" "	۱/۴۰
۹	ہمارا سماج حصہ ۴	ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی	۱/۴۰

(ی)

۱	یادگار غالب	مولانا حالی	۸/-
۲	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۲۷ امین آباد پارک لکھنؤ

Accession Number.
83885
7-11-85

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔